

تذکرہ حکماء

غلام محمد

إِنَّ هَذِهِ تَذَكُّرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝

سلسلہ مطبوعات (۴)

از سلیمان گیر اخلاص عمل

داں توندوی را منترہ از دغل

(مترجمہ نقانوی)

تذکرہ سلیمان

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے آدوار زندگی کا جائزہ ان میں ایسے
روحانی ارتقاء اور آوج کی تفصیل، اُن کے چند خصوصی کمالات
اور اصول تربیت کا ذکر اور آخر میں طریق تربیت کا کامل مرقع؛

از

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلہ

خلیفہ مجاز حضرت اقدس علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(مجلہ حقوق بحق ادارہ نشر المعارف محفوظ ہیں)

طبع ثانی ۱۹۸۴ء

کتابت ناصر حسین

پریس احمد بلورس پریس۔ ناظم آباد، کراچی

تعداد اشاعت

قیمت مجلد

ناشر

ادارۃ نشر المعارف

۸۳۔ ایس۔ بلاک نمبر ۲ پی۔ ای سی یچ سٹوڈنٹس

کراچی ۲۹

فہرست مضامین

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۳۸	ابتدائی تعلیمی دور		حصہ اول
۳۹	اس دور کی متانت	۸	تجربہ تشکر
۴۱	مولانا محمد علی مونگیری کی خدمت میں	۱۴	تہذیب
۴۲	ندوہ میں داخلہ	۱۵	تحدیثِ نعمت
۴۳	طالب علمانہ امتیاز	۲۲	اعتراف
۴۴	عطائے سند اور آغازِ شہرت	۲۳	اعتماد
۴۶	استاد کی نظر میں شاگرد کا مقام	۲۴	توضیح اختصار
۴۸	شاگرد کے دل میں استاذ کی عظمت	۲۵	مناجاتِ سلیمان پر درگاہِ حق
۵۰	علامہ کی ایک سندِ حدیث	۲۶	عرضِ ندوی بحضورِ نبوی
		۲۷	مقامِ سلیمانی
	باب دوم		باب اول
۵۲	(شباب سے آغازِ نچہ نری تک)		(ولادت سے شباب تک)
۵۳	شکوہِ سلیمانی	۲۸	نسب
۵۴	الندوہ اور علمی شہرت	۲۹	خاندان اور وطن
۵۵	ممتاز معلم	۲۹	ولادت
۵۷	ضیاء بخش الہلال	۳۳	سلیمان کی وجہ تسمیہ
۵۸	جلیل القدر پروفیسر	۳۴	لفظِ ندوی جزو نام کیوں بنا؟
۶۰	مایہ ناز ریسرچ اسکالر	۳۵	روکین میں تخمِ معرفت کی کاشت
۶۱	سید الطائفہ	۳۶	توحیدِ خالص کی تلقین
۶۳	علامہ اقبالؒ کی گرویدگی	۳۷	

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۱۰۸	رکاوٹ	۶۴	دیوبند و علی گڑھ کا اعتراف
۱۰۸	پہلی ملاقات اور شیخ کا تاثر	۶۵	اجتماعیات میں سر بلندی
۱۰۹	غوغائے تکفیر	۷۰	اس دور کے معنوی امتیازات
	مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب	۷۰	اخلاص نیت
۱۱۱	مرحوم پر غوغائے تکفیر	۷۲	پاکی مشرب
۱۱۲	مولانا شبلی کی تکفیر	۷۵	حُسن اخلاق
۱۱۳	مولانا شبلی کے عقائد	۷۸	حُب نبوی
۱۱۳	الجواب	۸۱	ایک نعمت
۱۱۵	مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر	۸۲	سیرۃ النبیؐ کی مقبولیت کا خردہ
۱۱۷	حضرت مولانا تھانویؒ کا رجوع	۸۳	سیرۃ عائشہؓ
۱۱۷	ضمیمہ ثانیہ رسالہ الايضاح لسانی الافصاح	۸۴	خطبات مدراس
۱۱۹	ایک اور ناخوشگوار واقعہ	۸۶	امام مالکؒ سے خصوصی تعلق
۱۲۱	الحاصل	۸۷	مجدد الف ثانیؒ سے برزخی ملاقات
۱۲۱	اس دور کا ایک روحانی کرشمہ		باب سوم
		۹۱	(تلاش شیخ)
	باب چہارم	۹۱	اضطراب روحانی
	(حضرت تھانویؒ سے بیعت و خلافت	۹۲	تلاش شیخ
۱۲۳	اور حضرت کی ولایت)	۹۳	حکیم الامتؒ سے مراسلت کی غیبی صورت
۱۲۴	حکیم الامتؒ سے رجوع اور بیعت	۹۵	مکتوب میلانی (۱)
۱۲۴	حضرت حاجی صاحب کی زیارت	۹۶	جواب اشرف
۱۲۴	انتخاب شیخ	۹۹	مکتوب میلانی (۲)
۱۲۶	عزم تھانہ بھون	۱۰۱	جواب اشرف
۱۲۷	لکھنؤ میں مرشد تھانویؒ سے رجوع	۱۰۴	مراسلت (۳)

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۱۵۰	ملک سلیمان اور زہرِ عیسٰی	۱۲۷	ایک مجذوب کا افشائے راز
۱۵۲	سلیمان کا پھیرا	۱۲۸	خود حضرت والا کی تصدیق
۱۵۲	انتباہ	۱۲۸	مشابہت کا فوری اثر
۱۵۳	خلافت سے سرفرازی	۱۳۰	تبدیلی احوال
۱۵۳	استخارہ و استشارہ	۱۳۵	درخواست نصیحت
۱۵۳	جواب	۱۳۶	درخواست بیعت
۱۵۳	عطائے خلافت	۱۳۷	بیعت پر شیخ کا اظہارِ شکر
۱۵۴	شیخ الشیوخ کا تاثر	۱۳۷	بیعت کا اثر مرید پر
۱۵۴	خلیفہ مجاز کا حال	۱۳۸	خصوصی تربیت
			پیرِ حقانوی اور مریدِ ندوی کا بے مثل
		۱۴۰	ربط و تعلق
۱۵۶	سلسلہ سند	۱۴۰	کمال ارادت
	استاد العلماء کا اعلان رجوع اور حکیم الامتؒ	۱۴۲	انقیاد کا میل
۱۵۸	کی تبریک و تحسین	۱۴۳	نئی معاملات میں تعلق شیخ کی رعایت
۱۵۹	رجوع و اعتراف	۱۴۳	ڈاکٹر پیٹ کی قبولیت برضائے شیخ
۱۶۳	شیخ کی تبریک و تحسین	۱۴۵	تھانہ بھون کی بار بار عاضری
		۱۴۶	خود اپنی طرف سے جواب شیخ کی تعیین
		۱۴۷	شیخ کا کمال مہر و کرم
۱۶۶	شور و غوغا اور حضرت والا کی استقامت	۱۴۷	غایت کرم
۱۶۷	عمومی جواب	۱۴۷	فرط محبت
۱۶۷	ایک اور حکم جواب	۱۴۸	عطائے عصا اور کمال دِلنوازی
۱۶۷	عم محترم کو بصیرت افروز جواب	۱۴۸	دعاؤں کی سوغات
۱۶۸	مولانا ابوالکلام آزاد کا استعجاب	۱۵۰	عطائے سہم

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۲۰۸	نواب بھوپال کا کامیاب اصرار	۱۷۰	اب تک اعتراض
۲۰۸	نواب صاحب کی قدردانی	۱۷۰	جواب خاتم
۲۰۹	عوام کی گردیدگی	۱۷۱	محققین کے لئے سامان تشفی
۲۱۰	خانقاہ سے ربط	۱۷۳	آخری حاضری اور رحلت شیخ
۲۱۰	رشد و ہدایت کی مساعی	۱۷۳	پیری آخری حاضری
	فیض سلیمانی کا کرشمہ یادگار العلوم	۱۷۸	رحلت شیخ
۲۱۵	آج المساجد	۱۷۹	حضرت والا کا گہرا تاثر
۲۱۷	تبلیغی جماعت کی سرپرستی	۱۷۹	تاثر کے قلمی آثار
۲۱۷	ادعائے ملحد کی شکست		
۲۱۸	ہفتوں جو شش		باب پنجم
۲۱۹	جواب عارف ندوی	۱۸۶	(دارالمصنفین سے بے تعلقی اور قیام بھوپال)
۲۲۰	بھوپال سے دل برداشتگی	۱۸۷	تواضع بالحق کا عزم نو
	باب ششم	۱۸۷	گھر کا ہائرہ
		۱۸۹	رفقائے دارالمصنفین کی طرف توجہ
۲۲۲	(سفر حج، ہجرت پاکستان اور رحلت)	۱۹۲	عام شاگردوں کا خیال
۲۲۳	آخری سفر حج		دارالمصنفین میں خلفائے اشرفیہ کا تاج
۲۲۳	ملکہ مکرمہ کی حاضری	۱۹۲	اجتماع
۲۲۴	بندہ کمال اپنے رب کی بارگاہ میں		دارالمصنفین سے ہجرت یا صبر کا تلخ ترین
۲۲۶	ایک نجدی عالم کا اقرار تصوف	۱۹۵	گھونٹ
۲۲۷	غزل عارفانہ	۲۰۲	ایک شدید مرض اور اعلیٰ ترین کرامت
۲۲۸	علمائے مجاز سے ایک استفاء	۲۰۵	دارالمصنفین سے جدائی کا فیصلہ
۲۲۹	دو تقریریں	۲۰۷	قیام بھوپال
۲۳۰	مدینہ منورہ کی حاضری اور تفریح حال	۲۰۷	جسہ آباد کی پیش کش

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۲۶۶	نشر فیض	۲۳۱	حصول تمکین
۲۶۱	رودادِ علالت	۲۳۳	حضرت کا اعتراف
۲۶۷	آخری سفر ہندیا زخموں کی تازگی	۲۳۵	واپسی
۲۷۹	مرض الموت اور اسکے دوران میں	۲۳۶	قیام پاکستان کے تین سال پانچ ماہ
۲۸۳	آخری احوال	۲۳۶	آنے کی تمہید
۲۸۹	رحلتِ شفا	۲۴۰	آمد
۲۸۹	یوم وداع کی کرامات	۲۴۱	مستقل قیام کی صورت
۲۹۲	شام وداع کا منظر	۲۴۳	شدائدِ ہجرت اور توکل و استغناء
۲۹۵	پیرانی صاحبہ کی حالتِ رفیعہ	۲۴۳	معاشی پہلو سے
۲۹۷	راقم کا حال	۲۴۹	فرق ماحول کے اعتبار سے
۲۹۷	تجہیز و تکفین اور جنازہ	۲۵۲	دو شرمناک مثالیں
۳۰۱	تدفین کا دلگداز منظر	۲۵۶	تصویر کا دوسرا رخ یعنی اعزاز و اکرام
۳۰۲	ماتم سلیمانی	۲۵۶	بحیثیتِ علمائے اسلام کی طرف سے استقبال
۳۰۷	”دریغ اسید سلیمان ندوی“	۲۵۸	علماء کی انفرادی قدر شناسی
۳۰۸	”عقیدت کے چند آنسو“	۲۵۹	ہسٹاریکل سوسائٹی کی رکینیت
۳۱۰	آہ اسید صاحب	۲۶۰	یونیورسٹی سینٹ کی رکینیت
۳۱۵	چند مبشرات	۲۶۰	بیرون ملک اکرام
۳۱۵	مقامِ اخروی	۲۶۱	عالم اسلام کا اعلیٰ علمی اعزاز
۳۱۶	وسعتِ برزخ	۲۶۱	حضرت دالہ کی بعض خدمات
۳۱۷	برزخ میں نماز سے شغف	۲۶۱	۳۱ علماء کی کیٹی
۳۱۸	حیاتِ ناسوتی کی منزلت	۲۶۲	لاکیشن کا قیام
	حیاتِ ناسوتی ہی میں نیابتِ رسول اکرمؐ	۲۶۳	احتفالِ علماء
۳۱۸	کی بشارت	۲۶۵	مدرسۃ القرآن اور دائرۃ المصنفین

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۳۶۱	نماز	۳۱۹	ایک اور تصدیق
۳۶۳	ذکر	۳۲۱	زائرین مرقہ سیلانی کے تاثرات
۳۶۵	حضرت شیخ رحمہ اللہ اصول تربیت	۳۲۴	خانوادہ سیلانی
۳۶۵	اصول متعلقہ ذات مرشد اقدس	۳۲۷	قیام "یادگار علمی" کی کوشش ناتمام
۳۶۵	برکت و صرف ہمت	۳۲۷	پہلی کوشش
۳۶۶	فیضانِ توجہ	۳۲۸	دوسری کوشش
۳۶۷	شفقت		
۳۶۸	طریق عشق		باب، مفہم
۳۶۹	تطہیر فکر و تعین ماہ	۳۳۱	(خصوصی کمالات اور اصول تربیت)
۳۶۹	انفرادی مزاج اور مرض کی رعایت	۳۳۲	ضروری بات
۳۷۰	ملکات کی اصلاح	۳۳۳	حلیہ
۳۷۰	توحیدِ افعالی سے توحیدِ ذاتی تک	۳۳۳	لطیفہ
۳۷۲	(اصول متعلقہ ذات مرید)	۳۳۴	لباس
۳۷۲	اپنے معائب پر آپ نظر	۳۳۶	محاسنِ گفتار
۳۷۲	تدریجی طور پر عشقِ ذکر	۳۴۱	محاسنِ تقریر
۳۷۳	سارا زور لطیفہٴ قلب ہی پر	۳۴۲	مزاج کا کمال توازن
۳۷۳	بر غیر مقصود سے صرف نظر کی تاکید	۳۴۵	مالی ایثار
۳۷۶	صرف طلبِ رضا مقصود ہے	۳۴۷	حُسنِ ذوق
۳۷۶	اسی علاقہ کا استحکام نسبت ہے	۳۴۸	مدرج و ذم ایک
۳۷۶	کمال اتباعِ سنت کا مفہوم اور اس کی تاکید	۳۵۰	خلوت و جلوت کی یکسانی
۳۷۶	فراغتِ قلبی کی ہدایت	۳۵۱	رنگ اور مذاق
۳۷۷	تقلیلِ مبامات	۳۵۸	شانِ محبوبیت
۳۷۷	علم کا حصول عمل کی نیت سے	۳۶۱	حضرت شیخ کی نماز اور ذکر

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۳۱۳	فہرست مہنہاج سیلانی	۳۴۷	مواعظ و ملفوظات اشرفیہ کے مطالعہ کی تائید
			دوسرے سلسلہ کے طالبین کے ساتھ
		۳۴۸	اصول اصلاح
		۳۴۸	اصول بیعت
۴۷۹	تذکرہ پرچند اکابر عصر کے تاثرات	۳۸۱	خصوصیات بیعت
		۳۸۲	حضرت کی دو وصیتیں
			یاب ہشتم
۴۹۵	مرتبہ لطیف اللہ صاحب	۳۸۳	(عارفانہ دور کا کلام اور تحسیریں)
	استاذ ادبیات اُردو	۳۸۴	غزل الغزلات
	※ ※ ※	۳۸۶	سفر نامہ کی حیثیت سے کلام کا جائزہ
			مسائل تصوف کے اعتبار سے کلام پر
		۳۹۷	نظر
		۴۰۲	(عارفانہ تصانیف)
		۴۰۲	علم معاش و معاد
		۴۰۳	حیات اشرف
		۴۰۶	مقدمہ جامع الحمد دین
		۴۰۸	مقدمہ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت
			حصہ دوم
		۴۱۱	مہنہاج سیلانی
		۴۱۲	حاصل و نتیجائے تصوف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تجدیدِ تشکر

تذکرہ سلیمان جو سیلمانی ذوقِ اخلاص کے ساتھ، اشتہاری رسمیات سے بچتے ہوئے، سادگی و عاجزی سے ہدیہِ ناظرین ہوا تھا، خدا کا بے پایاں شکر ہے کہ مولفِ نابینہ کے تصور سے زیادہ صوری اور معنوی اعتبار سے مقبول خاص و عام ہوا۔ پاک و ہند کے حدود سے گزر کر اردو دنیا کے دور دراز گوشوں تک اس کا نفوذ پہنچ گیا۔ ایک طرف ہند و پاک کے علمی ماہناموں اور جہدوں نے کھل کر اس کی داد و تحسین دی دوسری طرف اللہ والوں نے اپنے قلبی تاثر اور منامی اور معاملہ و معانیہ والی بشارتوں سے اس تالیف کی عند اللہ قبولیت کے خزانے سناٹے، ایک بزرگ نے حضور نبویؐ تک میں اس کی پسندیدگی کی خبر جانفزاہستانی، خط کہاں میں اور کہاں بینکھت گئی۔

یہ بشارتیں ان مبشرات کے علاوہ رہیں جو خود اس بے استحقاق کو تذکرہ کے دوران تحریر اور تکمیل پر ملتی رہی، فالحمد للہ۔ یہ سب حضرت مرشدی نور اللہ مرقدہ کی محبوبیت کا اثر ہے۔

تذکرہ کی افادیت کے تین رخِ قدرت نے دکھائے، ایک یہ کہ اہل قلم معاصر نے اسی چہرہ پر اپنے اپنے شیوخ کے تذکرے مرتب فرمائے دوسرے یہ کہ اس کے مطالعہ کرنے والوں میں دینی انقلاب کی خوشخبریاں سننے لگیں اور خاص کر کتاب کا دوسرا حصہ یعنی ”منہاجِ سلیمانی“ بڑا انقلاب آفریں ثابت ہوا، تیسرے یہ کہ اچھے اچھے سائنسین طریقت کے لئے یہ تالیف روحانی عقودوں کی گرہ کشا اور ان کے منازلِ تہذیب میں رہبر و رہنما ثابت ہوئی اور مستفید ہونے والوں نے جذبہٴ احسان مندی سے اس کی اطلاعات راقم الحروف کو دیں۔ یاد آ یا کہ گرامس قدر جناب بشیر احمد صدیقی مرحوم سابق پرنسپل شبلی کالج انظم گڑھ نے جو غالباً قطب آفاق حضرت

شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی قدس سرہ کے کسی خلیفہ سے بیعت اور راہِ طریقت کے صاحب
استقامت مالک تھے، کئی مرتبہ اس عاجز سے تذکرہ سے نفع اندوزی کا ذکر فرمایا اور جب ان
کی آخری علالت میں مزاجِ پُرسی کے لئے حاضر ہوا تو بیٹھے ہی فرمانے لگے:

”دیکھئے سب کتابیں ہٹا دیں، صرف تذکرہ سلیمان ہے جو سونے رکھا ہے
کیا بتاؤں کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات سے کیسی عقدہ کشائی
ہوتی ہے، اور کس قدر طاعتِ قلبی حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جو انے خیر
دے بڑا احسان فرمایا۔“

الحمد للہ کہ جس طرح حضرت والاد کی ذات تمام سلاسلِ تصوف کے مشائخ میں محبوب تھی ان کا
تذکرہ بھی سب کی نگاہ میں معتبر رہا اور خود سلسلہ امدادیہ کے اکابر بھرنے بھی مولف کی بڑی ہمت
افزائی فرمائی۔ آج سے کوئی آٹھ دس برس پہلے اسی شہر کراچی میں جب مجھ و محمد امجد علی کو شیخ المشائخ
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا اور حضرت کو مصافحہ
کی معادت پالتے ہوئے جب میں نے اپنا نام لیا تو حضرت نے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط فرما کر
نظر بھر کے دیکھا اور تبستم ہو کر فرمانے لگے:

”میں نے تذکرہ سلیمان کو لفظاً لفظاً دو مرتبہ پڑھا ہے اور اس کے حوالے

اپنی کتاب میں دیے ہیں۔“

یہ میرے لئے بڑا انعام ہے، ورنہ نہ

کہاں ان کی بزمِ طرب کے تھا قابل یہ بہ شوریدہ سر، تلخ کامِ محبت

اس سے قبل اپنے دو ایسے بزرگوں سے بھی شاباشیاں مل چکی تھیں، جن کے تاثرِ خاطر کا انتظار

لے اس پہلو پر اب ایک مبسوط کتاب بعنوان ”سلوکِ سلیمانی یا شاہِ مدہ معرفت“ بھی خراب گئی

ہے، اس کے مولف ہیں ہمارے خواجہ تاج بخش مولانا محمد اشرف خاں صاحب زاد قیصر۔

لے ملاحظہ ہر شیخ کی تصنیف ”تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات“:

خود اپنے قلبِ حویں کو بھی تھا، یعنی مرفائے ربانی حضرت اقدس مفتی محمد حسن اور حضرت مولانا عبد الباقی ندوی رحمہما اللہ۔۔۔۔۔ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ نے وصولی کتاب کی اطلاع کے ساتھ اپنے مرید رشید و خلیفہ الحاج نور محمد بٹ مرحوم کی ربانی احقر کو مطلع اور مطمئن فرمایا کہ

”کتاب کو جگہ جگہ سے مطالعہ کیا، قبولیت کا اثر محسوس ہوتا ہے۔“
پھر حضرت گرامی مولانا عبد الباقی ندوی نور اللہ مرقدہ کے بڑے والہانہ مکتوبات ملتے رہے،
(۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ء) ایک مکتوب کا متعلقہ جزویہ ہے:-

”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ مرابا ایں گیاہ ضعیف ایں گماں بنود۔ یہ کتاب آپ نے نہیں لکھی، لکھائی گئی ہے اور جس نے لکھائی ہے اس کے سامنے تو کوہ بھی کاہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ حضرت مرحوم کے اس حق کو کوئی دوسرا آپ کے پاسنگ بھر بھی شاید ادا کر پاتا۔ جزاک اللہ وبارک اللہ۔“

(۵، ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ)

حضرت سلیمانؑ کی نسبتِ عالی نے اس مودنا تو ایں کے تعارف کا دائرہ چونکہ بہت وسیع کر دیا تھا، اس لئے قدامت اور ہمت افزائیوں کا ایک دفتر کا دفتر فراہم ہو گیا، پھر بھی ادب اب قلم و رقم جانتے ہیں کہ اپنی تحریر وقت گذرنے پر خود اپنی نظر سے گر جاتی ہے اور اس میں رد و بدل ناگزیر محسوس ہونے لگتا ہے، مگر تذکرہ کی طبع حاضر میں طبیعت اور قلم دونوں اس پر آمادہ نہیں اور یہ اس لئے نہیں کہ اپنی تحریر نگاہ میں کوپ گئی ہے بلکہ احساس و ایقان یہ ہے کہ جس کیفیت و تاثر میں اس کا لفظ لفظ لکھوایا گیا تھا، وہ ذاتِ حق کی نامکد عنایت تھی، جس کا احتساب واجب ہے، حضرت محترم پیر شمس جان سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تصدیق میرے بھانجے رفیع الزماں سلمہ جن کے ذریعہ تذکرہ کا نسخہ ان کی خدمت میں پہنچا ہوا تھا، یوں فرمائی:

”آپ کا خط پہنچا اور غلام محمد صاحب کی بھیجی ہوئی کتاب تذکرہ سلیمان“ بھی ملی

ایک عرصہ سے حضرت سید صاحب کے حالات کا اشتیاق تھا، اللہ سبحانہ تعالیٰ
بھائی غلام محمد صاحب کو اجر خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے اپنے شیخ کی خدمت کی
ہے اور عذوبہ کی حالت میں یہ کتاب لکھی ہے، یہی وہ چیز ہے کہ جس سے ایک
سالک برسوں کی راہ لٹوں میں طے کر جاتا ہے۔

سیرِ دلہر ہے یک روزہ راہ
سیرِ عارف ہر گہے تا تخت شاہ

(۱۳، ربيع الاول ۱۳۸۸ھ)

بہر کیف تذکرہ سلیمان کی اشاعت کے بعد اس سلسلہ کی دو اہم کتابیں منظرِ مآب ہوئیں
ایک تو مولانا دیوبادیؒ کی مرتبہ ”مکتوباتِ سلیمانی“ (۲ جلدوں میں) اور دوسری دارالمصنفین
آعظم گڑھ کی سیرتِ سلیمانی ان دونوں کتابوں سے اس نئے ایڈیشن میں خال خال اضافہ یا
ترمیم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کسی معتبر گوشہ سے کوئی قابل ذکر بات ملی ہے تو اس کو بھی حوالہ کے
ساتھ نقل کر دیا گیا ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے شذراتِ جبرائیل نے حضرت والاؒ
کی رحلت پر معارف میں تحریر فرمائے تھے اور جو گرائی، گہرائی اور پُر تاثیریری میں ان کی مؤلفہ
سیرتِ سلیمانی سے متنازع ہیں، جزو کتاب بنائے گئے ہیں۔ سب سے نادر اور قیمتی اضافہ حضرت والاؒ
کی ایک سندِ حدیث کا آگیا ہے جو انہوں نے شیخ الاسلام الشیخ عبدالقادر توفیق الحنفی المدنی قدس سرہ
سے حاصل فرمائی تھی، اس اظہار کا شرف قدرت نے اس خادمِ خاص کے حصہ میں رکھا تھا۔
فالحمد للہ۔ اس کے علاوہ نظر ثانی میں سندِ سلسلہ چشتیہ صابریہ امدادیہ کے ہر بزرگ کے معتبر ترین سنی
وفات اور جہانے وفات کو امکان کی کاوش سے دریافت کر کے درج کر دیا گیا ہے، نیز حضرت والاؒ
کی رحلت کے بعد ان کی یادگار کے طور پر دو مرتبہ علمی و تعلیمی، تحقیقاتی و تصنیفی ادارے کے
قیام کے جو خاکے بنے مگر وہ عمل نہ آ سکے، ان کا بابتوق ذکر پہلی مرتبہ اس طبعِ جدید میں زیرِ نظر
آئے گا۔ اس کے علاوہ بھی بعض قابلِ قدر اضافہ ملیں گے، ولادت کی عیسوی تاریخ

ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں چند اکابر عصر کے مکاتیب ملاحظہ میں آئیں گے جو تذکرہ پر ان کے تاثر کا آئینہ ہیں۔ ماہناموں اور جریدوں کے تبصروں کو شامل کیا جاتا تو کتاب کا توازن بگڑ جاتا، ویسے بھی راولپنڈی تبصروں سے زیادہ تاثرات کی پُر غلوں کو کسی نجی مکتوبات ہی میں دیکھی جاسکتی ہے، اس لئے بھی اسی پر اکتفا کیا ہے!

تذکرہ کی تحریر کے وقت راقم عاجز کے جو نہایت شفیق اور مہربان بزرگ زندہ تھے اور جن کا ذکر اس تالیف میں موقع بہ موقع آیا ہے، آج وہ سب تاریخ ابرار و اختیار کا حصہ بن چکے ہیں۔ آہ! کیا استیساں تھیں، حضرت مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ حمید آبادی، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری، حضرت مولانا عبدالرحمن کالمیلپوری، حضرت مولانا عبدالباری ندوی لکھنوی، حضرت مولانا عبدالمجید دیابادی، حضرت پیراشم جان سرہندی وغیرہم سب گنج ہائے گراں مایہ زیر زمین ہو چکے اعلیٰ اللہ مقامہم۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی کے ساتھ جہاں مدظلہ کا لفظ آجائے تو قارئین یتمکین اب دل کی گہرائی سے رحمۃ اللہ علیہ کہہ لیں اور مجھ سے خاکپائے اصفیاء کے حق میں دعا فرمائیں کہ آخرت میں انہی پاکان حق کے ساتھ الحاق میسر آجائے اور اُس وقت فرط مسرت اور وفور شوق سے یہ حضرات کہہ اٹھیں، غلام آیا محمد کا غلام آیا محمد کا

آخر میں اس تہی مایہ کی دل و دماغ سے کہ جن مخلص و بے ریا احباب کی مستعدی اور ایثار و سہ سے تذکرہ کی طبع نواس معیار سے ہوئی ان سب کو اور خصوصاً عزیز قلبی حافظ محمد یحییٰ صاحب کو جو اس مہم کے سرخیل رہے اور محب قدیم محمد یوسف صاحب (مالک یونین پیپر مارٹ) کو جو ایثار مالی میں سنا ہے سب پر فائق رہے، ریت رحیم داریں کی کامرانیوں عطا فرمائے۔ والسلام۔

پیرامید رحمت، غلام محمد کان اللہ ۲۹، دیتہ انشانی ۱۳۰۲ھ ۲۴، فروری ۱۹۸۲ء

لے ایک مرتبہ یہ خادم خدمتِ سلطانی میں حاضر ہوا، میرت نگار نبوی کی روح اس وقت شاید روح پاکِ محمدی کے قرب خاص سے متذوق تھی، سلام عرض کیا تو نظر اٹھا کر جوابی سلام کے ساتھ ہی فرمایا "ایک مسلمان کا مقصد اس کے سوا ہر بھی کیا سکتا ہے کہ وہ غلام محمد بن جائے۔" اور پھر دیر تک متفرق رہے۔

ع این چنینی اسراء و اشرف و بیان دیگر است



حصہ اول

تہذیب

لَسَنَ _____ اسکی خدمت میں

كَانَ لَهُ قَلْبٌ _____ جو دل آگاہ رکھتا ہو

أَفِ _____ یا (کم از کم)

أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ۔ کان دھر کر متوجہ ہو کر سنے!

تحذیر نعت

اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کروں اس نے ایک مورنا تو اس کو سلیمان ذی شان (قدس سرہ العزیز) کی خدمت میں پہنچایا، ان کا قرب بخشا، ان سے اتنا نزدیک کر دیا کہ مکلف کا کوئی حجاب حائل نہ رہا، میں نے اپنا سب کچھ ان پر ظاہر کر دیا اور اپنی ہر الجھن میں ان کے مشورہ کو سرمایہ تسکین اور سراسر خیر و برکت پایا، اُن سے عقیدت محبت میں بدلی اور یہ محبت بڑھتی ہی چلی گئی بلکہ آج تک اس میں ترقی محسوس ہوتی ہے اور ”المرء مع من احب“ کے نبوی مژدہ کو سن کر اس محبت کو اپنا بہترین توشہ آخرت سمجھتا ہوں۔

ادھر یہ ہوا اور ادھر سے انطاف و عنایات کی فراوانی کچھ ایسی رہی کہ حضرت والائے اس بے استحقاق کو اپنے اعتماد کا اہل سمجھا، اپنے خاص احوال سنائے، اپنے مذاق سے آگاہ فرمایا، اپنے مزاج میں دخیل فرمایا، یہاں تک کہ نجی معاملات بھی چھپے نہ رہے اظہار اعتماد اس درجہ بڑھا کہ حضرت والائے جن جن دست گرفتوں سے میری واقفیت تھی ان کی باطنی حالت و کیفیت کبھی مجھ سے دریافت فرماتے اور کبھی خود سنا کر اس میں مشورہ طلب فرماتے، پھر جو کچھ اپنی بصیرت خام کے مطابق عرض کیا جاتا اس کی تصدیق اور کبھی کبھی اس میں ترمیم و اصلاح فرمادیتے تھے۔

یوں تو روزِ اوّل ہی سے حضرت شیخ کی خصوصی توجہات میرے شامل حال رہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ انہی کی مقناطیسی توجہ نے اس ذرہ آہن کو اپنی طرف کھینچا تھا، مگر کراچی کا سہ سالہ قرب تو میری زندگی کا سب سے قیمتی حصہ تھا، اس پوری مدت میں حضرت والائے مجھے ہمیشہ اپنے دامن سے چمٹائے رکھا، گو میں ان کی کفش برداری کے لائق بھی نہ تھا، خلوت میں جلوت، سفر و حضر میں حتیٰ کہ جنتہ و عیدین ہی میں نہیں بلکہ تراویح کی نماز اور فریضہ قربانی کی ادائیگی میں ہمیشہ اپنے اس خادم کو

اپنے ساتھ ہی رکھا، یہ اُن کے کرم کی انتہا تھی اور میری خوش بختی کا اوج، اور انشاء اللہ آخرت کی دائمی رفاقت کی طمانیت بھی !!

حضرت والا کی ہریانیاں مجھ سے گزر کر میرے اہل و عیال، میرے والدین اور میرے بہن بھائیوں تک پھیل گئیں اور ان کے اس اندازِ کرم سے خالوادہ سلیمانی کا بچہ بچہ ہمارا فحش بن گیا اور آج بھی ان سب کے اشتقاق شفقتِ سلیمانی کی یاد گاہیں والحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرت اقدسؒ کی جامع کمالاتِ ہستی سے نزدیکی اور شبِ بھنگی نے میرے اندر ایک تشویش پیدا کر دی، میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ جانشینِ شعلیؒ بھی ہیں اور مسند نشینِ اشرف بھی، مگر اُن کے فیض یا فتوں میں نہ صرف یہ کہ علم و تقویٰ کی ایسی جامعیت عتقا ہے بلکہ اس جامعیتِ کبریٰ کی خاطر خواہ ان میں قدر بھی نہیں میں ڈر رہا تھا کہ حضرت والاؒ کے بعد جو حضرات بھی ان کی سوانح نگاری کا بیڑہ اٹھائیں گے، ان کا قلم پیکرِ جامعیت کی سچی تصویر کھینچ نہ سکے گا، اسی اندرونی خلش اور اضطراب سے مجبور ہو کر ۲ اگست ۱۹۵۷ء کو ایک عریفہ خدمتِ شیخ میں پیش کر دیا، جو یہ تھا۔

”سیدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتکم و فیوضکم“

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گذشتہ ہفتہ سے یہ خیال قائم ہے اور زور پکڑتا جا رہا ہے کہ جس طرح خواجہ صاحبؒ نے حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کے سوانحِ حیات قلمبند فرمائے تھے، حضرت دالامدظلہ کی نگرانی میں احقر بھی اسی نوع کی اجازت چاہے۔ گو علما و علماء کرام میں کوئی صلاحیت موجود نہیں ہے، لیکن اندرونی جذبہ سے مجبور ہو کر عرض کی جسارت کی ہے، اگر توفیقِ باری

لے یعنی ”اشرف السوانح“ مولفہ خواجہ عزیز الحسن صاحب۔ مجذوب رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

شامل حال رہی اور حضرت والا مدظلہ نے اپنی کرائف قدر ہدایات سے سرفراز رکھا تو شاید یہ مشکل سہل ہو جائے حضرت والا کی آمادگی و اجازت کا منتظر ہوں!

اس سلسلہ میں یہ بھی عرض خدمت ہے کہ اگر نفس خیال سے حضرت والا کو اتفاق ہے اور حضرت والا اس پیمان کو اس خدمت کا اہل تصور نہ فرماتے ہوں تو کسی اور اہل استعداد خادم سے بھی یہ خدمت لی جاسکتی ہے اور احقر کا مقصد حاصل ہے۔ فقط تنگِ ضلّام غلامِ محمد

اللہ اللہ! اس عریضہ کا جواب کیا عطا فرمایا اپنا دل نکال کر صفحہ قرطاس پر رکھ دیا اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ تنہا یہی مکتوب حضرت والا کے مقامِ عبدیت کی شہادت کے لئے بہت کافی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حبیبِ مخلص و عزیزِ خالص زادِ کم اللہ تعالیٰ عرفاناً
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے حسن ظن کی قدر کرنے کے باوجود آپ کی اس تجویز سے مجھے بڑی شرمندگی ہوئی، کہاں میں اور کہاں میری زندگی کی یہ اہلیت کہ اس کے سوانح کوئی قلمبند کرے، آپ ہیں لکھنے کی سبب کچھ صلاحیت ہے لیکن میری زندگی میں لکھے جانے کی اصلاً صلاحیت نہیں ہے!

ظاہری حال تو آپ جانتے ہیں، مگر باطن کا حال تو علام الغیوب ہی کو معلوم ہے، میرے سوانح حیات موجب بصیرت تو کیا ہونگے، ہاں موجبِ عبرت ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور حسنِ خاتمہ کی دعا ہے اور آپ بھی آمین کہیں، ع من کہ باشم کہ در اس خاطر خاطر گذرم

بات بظاہر آئی گئی ہو گئی، مگر نہیں، اخلاص کا برزائے بارگاہِ درہ نواز نہیں مقبول اور
نتیجہ خیز ہے۔ حضرت اقدس اپنے وقت موعود پر وداع ہو گئے، اب اس کو امر اتقانی سمجھئے
یا کوئی الہامی حقیقت کہ اس سانحہ کے کچھ ہی عرصہ بعد محترم و محترم حضرت مولانا دریابادی رحمۃ
نے حضرت والاؒ کی سوانح نگاری کے لئے اسی گناہ کے نام کا پُر زور اعلان فرمایا۔ اس پر
دوسروں کو جو بھی تعجب ہوا ہو مگر میں خود بھی غرق حیرت ہو گیا کہ یا الہمی میرا قلم اور سیرت
سیلمانی کی مصوری؟ میری مدد و حاضری، قاصر نظر، ناقص فہم اور ان کے گونا گوں علمی و فکری
تاریخی و ادبی، قرآنی و حدیثی و افسانوی کمالات کا احاطہ؟ آخر میرے نام اور اس
عظیم الشان کام میں کوئی نسبت بھی ہے؟ ————— کاش میں اس قابل ہوتا، مگر اب
تو بہت حیا فحش جواب دے رہی ہے، دست و بازو شل ہو رہے ہیں کہ

بزم تابد کوہِ رایتِ برگِ کاہ !

سچ مانئے کہ عرصہ تک یہی حیرانی و درمانی رہی، مگر الحمد للہ کہ پھر
حلِ اینِ محنت ہم از روئے نگارِ آخر شد

معارف کے سیلمان نمبر میں ہر ایک مضمون نکلا جس کو پڑھ کر سراپا شفقت و کرم
مولانا گیلانی (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعہ) نے ایک الطاف نامہ سے سرفراز کیا، اس میں
سامانِ ہمت بھی تھے اور تلقینِ وصیت بھی، اسی بابرکت وصیت کو پڑھ کر میری شکل حل ہو
گئی، وہ عبارت یہ ہے۔

”آپ کا مضمون سیلمان نمبر معارف میں بھی اسی طرح ممتاز ہے جیسے ریاض

میں آپ نے سید صاحب مرحوم کا حق ادا فرمایا تھا، سچی بات تو یہ ہے کہ

زندگی کے آخری سالوں میں وہ جس راہ میں تیزی کے ساتھ رواں دواں تھے

ان دنوں میں جو لوگ ان کے آس پاس تھے، ان بے چاروں میں صلاحیت

ہی نہیں تھی کہ سید صاحب جو کچھ ہو رہے ہیں، ان کو وہ پاسکیں، یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ان حالات کے جاننے کے لئے جس ذوق کی ضرورت تھی اسی ذوق کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی زندگی کی یہ آخری منزل وہی ان کی زندگی کا خلاصہ تھا، اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی سوانح نگاری کا سلسلہ جب چھڑا تھا تو مولانا دریا بادی نے آپ کے نام انامی کو کیوں پیش کیا تھا۔۔۔۔۔

السید العلامۃ المرحوم کے سوانح حیات کی ترتیب آپ کی زندگی کا بڑا اہم فریضہ ہے، خدا کرے اس کی طرف سے آپ کی طبیعت نہ ٹپٹی ہو، دین و دنیا کا یہ سودا ہے، اپنی علمی و تحریری کوششوں میں چاہیے کہ اسی کو سب سے زیادہ اہم و اقدم قرار دیجئے!۔۔۔۔۔

اس کے بعد میں نے تائید الہی کی دعا کے ساتھ قلم اٹھایا اور اپنے امکان بھر حرم و احتیاط کے ساتھ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات صرف باطنی اور روحانی نقطہ نظر سے مرتب کر دیئے، اللہ تبارک و تعالیٰ اس کوشش کو حضرت شیخ قدس سرہ کی خوشنودی کا سبب اور میرے لئے وجہ سعادت بنائے۔

حضرت والا کے کمالاتِ احسانی اور شانِ ارشاد کے اظہار کا سب سے مستند اور بہترین ذخیرہ جو میرے پاس محفوظ تھا وہ میری حضرت شیخ سے دس سالہ مراسلت تھی، یہ مربوط مراسلت فیضِ سلیمانی کا چشمہ جاریہ بھی ہے اور ایک ایسا آئینہ بھی جس میں دو ہاضم کے ایک سالک طریق کے آثارِ سفر یعنی تزکیہ نفس کا عزم، اس کے نفس کی تڑاؤں اور باطن کے پیچ و خم اور پھر ان کی تادیب اور سلجھاؤ کی کوشش اور اس کے حسبِ صلاحیت طے نمازل یا نتائج و ثمرات کا عکس اُتر آیا ہے جو اس جیسے ہزاروں تعلیم نو کے آفریدیوں اور عقلیت کے ماروں کے لئے سرمایہ ہدایت اور وجہ تقویتِ ایمان ہے اس گنجِ سلیمانی

کو وقف عام کرنے کا اصرار بعض مخلصوں اور بزرگوں کی طرف سے ہوا اور پھر خود اپنا جی بھی اس کو چاہا تاکہ شیخ عالی مقامؒ کے بقائے فیض کی ایک صورت ہو سکے، لیکن اس معاملہ میں اہل ارشاد کی اجازت ضروری تھی، ویسے تو خود حضرت والاؒ نے اسکی شروط اجازت بہت پہلے عطا فرمادی تھی کہ :-

”بغرض افادہ نقل کے جاسکتے ہیں نہ کہ ریا اور استکبار کی راہ سے“ (مکتوب ۱۸)

مگر بعد کو کبھی مکر پوچھنے کا خیال نہ آیا اور اب میرے لئے یہ محال تھا کہ اپنے نفس کا اعتبار کر جاتا۔ ”وَمَا أُبْرِيْ نَفْسِيْ“ کا پیغمبرانہ اقرار بار بار یاد آتا رہا اور خیال کو ارادہ تک بڑھنے ہی نہ دیتا تھا، بالآخر اس کا فیصلہ شیخ عالی مرتبت حضرت مولانا محمد حسن صاحب علمؒ کے سپرد کر دیا جو حضرت مرشدی (نور اللہ مرقدہ) کی رحلت کے بعد میرے رہبر مشفق ہیں اور میرے معائب و تقصیرات سے واقف بھی، حضرت موصوف نے تحریر ابھی اور پھر بالمشافہ واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ :-

”یہ مکتوبات آپ ضرور شائع کیجئے، اس سے نفع ہوگا، آخر خواجہ صاحبؒ کے احوال اشرف السوانح میں اظہار نام کے ساتھ موجود ہیں“

صاحب ارشاد مدظلہ کے اس قول فیصل کے بعد تامل، تکلف بے جا تھا۔

چوں طبع خواہد ز من سلطان دیں

فاک بر فرق قناعت بعد ازیں

چنانچہ یہ گنجینہ فیض اس کتاب کا جزو اہم ہے جس کے مطالعہ کے بغیر حضرت والا کی عنایت قبولیت اور ان کا امتیازی مقام ارشد و ہدایت واضح طور پر معلوم نہیں ہو سکتا اور جس کے دوران مطالعہ کی باخداہستییوں کا تعارف اور ان کے اخلاص کا تذکرہ متعدد آیات و احادیث کی صحیح تغیرات اور بہت سے نازک مسائل احسانی سے آگاہی نصیب ہوگی اور خدا نے چاہا تو نظر میں نور اور قلب میں سرور پیدا ہوگا۔

یہ جو کچھ ہو سکا وہ محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل ہے، اس کام میں جتنی دیر لگ گئی اور اس کے باوجود جو نقص رہ گیا ہو وہ اس بندہ عاجز کا قصور ہے اور جس درجہ میں بھی حُسن و خوبی آگئی ہو وہ حسن ازل کی کرشمہ سامانی ہے جو ایک بے بضاعت و بے ہنر کے ہاتھوں ظاہر ہو گئی ہے، جس پر ہزار شکر کے ساتھ ساتھ عارف رومی کی زبان میں یہ اقرا ہے کہ

اینکہ شکرِ نعمتِ تو می کنم
 ایس ہم از تو نعمتے شد مغنم
 شکر ایس شکر از کجا آدم بجا
 من کیم از تست توفیقے خدا

طالبِ رحمت

غلام محمد

کراچی ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ

نمبر ۱۹۵۸ء

اعتراف

تذکرہ سلیمان کی ترتیب میں میں اپنے شیخ عالی مقام کے محب و محبوب حضرت محترم ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کے کمال لطف سے کئی باتیں جن کا تعلق حضرت والاؒ اور مرشد تھانویؒ کے باہمی ربط سے تھا، میرے علم میں آئیں۔

حضرت مفتی محمد حسن صاحب دام فیوضہ کا رہن منت ہوں کہ حضرت کی زبان صدق سے بہت سی معلومات کی توثیق ہوئی اور بعض نادر باتوں کا ان میں اضافہ ہوا۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا دل سے مشکور ہوں کہ مولانا کی کرم ارزانی سے مجھ کو حضرت والاؒ اور مرشد تھانویؒ کی ابتدائی مراسلت مل سکی۔

حضرت والاؒ کے رفقاء قدیم حضرت گیلانی خلد آشیانی ہولانا دیرا باری اور مولانا عبدالباقی ندوی مدظاہم کے لطف و کرم کا شمار ہی کیا ہے کہ انہی حضرات کے حسن ظن، تحریک، تاکید اور حوصلہ افزائی نے اس خدمت کے لئے میری ہمت بندھائی اور ان ہی کی دعائیں و شواہد راہ کو آسان کر گئیں۔ ان خاص کرم فرماؤں کے علاوہ ان سب حضرات کا دل سے ممنون ہوں جن کی زبان و قلم سے کمالات سلیمانی آشکار ہوئے اور مجھ کو ان سے استفادہ کا موقع ملا۔

سہ تمنع زہر گوشہ یا فتم
زہر خرمنے خوشہ یا فتم

لے مولانا نے حکم نہ کرم بالائے کرم یہ کیا کہ حضرت مرشدی کی ساری مراسلت میرے پروفراوی جس سے بڑی بہری ملی۔

توضیح اختصار

قطب الارشاد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی	حکیم الامت، حضرت تھانوی
قدس سرہ	عارف تھانوی، مرشد تھانوی
حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا گیلانی
حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی مدظلہ	مولانا دریابادی
صاحب "صدق"	
حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ (لاہور)	حضرت مفتی صاحب
خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامت	
حضرت محترم ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ (کراچی)	ڈاکٹر صاحب
خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامت	
خصوصی نمبر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (ہند)	سیلمان نمبر معارف
بابت می ۱۹۵۵ء	
خصوصی نمبر ماہنامہ ریاض (کراچی)	سیلمان نمبر ریاض
بابت مارچ ۱۹۵۳ء	

مناجات سلیمان بہ درگاہِ رحمن

صدق احساس کی دولت مرے مولیٰ دیدے غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دیدے
 دھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی دل دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے
 اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے دونوں ہاتھوں میں مے ساغر و مینا دیدے
 کھول دے میرے لئے علمِ حقیقت کے در دلِ دانا دلِ مینا دلِ شنوا دیدے
 قول میں رنگِ عمل بھر کے بنا دے رنگین لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دیدے
 دل بے تاب بلے دیدہ پُر آب ملے تپِ آتش مجھے دیدے نیمِ دریا دیدے
 دردِ دلِ سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
 جو نہ ٹھہرے مجھے وہ دردِ خدا یا دیدے

(۲۵، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

عرضِ ندوی بجنور نبویؐ

آدم کے لئے فخریہ عالی نسبی ہے	مکی، مدنی ہاشمی و مطلبی ہے
پاکیزہ تراز عرش و سما، جنت و فردوس	آرام گاہ پاکستِ رسولِ عربی ہے
آہستہ قدم، نیچا نگہ، پست صدا ہو	خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے
لے ڈانر بیتِ نبویؐ یاد رہے یہ	بیقاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ کے محبوبِ نبی کی	محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوبِ نبی ہے

بکھ جائے ترے چھینٹوں سے لے ابرکرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دہی ہے

(مدینہ منورہ، محرم ۱۳۶۹ھ)

مقامِ سلیمانی

اہل اللہ کی بزمِ اقدس میں جہاں تک اپنی نظر ڈھونڈ سکی تین
 ہی طرح کی ہستیاں پائی گئیں۔
 ایک وہ جن کی حیات تمام تر جذب و عشق اور معرفت الہی کا آئینہ
 ہے، جیسے بایزید بسطامی، شیخ عبدالقادر جیلانی، مجدد الف ثانی وغیرہ،
 (رحمہم اللہ تعالیٰ)

دوسری وہ جن کی سیرت گو ہمیشہ بے داغ رہی لیکن اُن کا جوہر
 عرفانی ایک عرصہ بعد کھلا ہے مثلاً شیخ فرید الدین عطار، عارف رومی،
 امام غزالی وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

تیسری وہ جن کی زندگی کبھی تو عام معیارِ اخلاق سے بھی پست تر
 تھی مگر جب انقلاب آیا تو رشک تقویٰ اور معیارِ معرفت قرار پائی،
 جیسے فضیل بن عیاض، بشر حافی، _____ وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مقام و مقامِ نذرہ
 میں نظر آیا۔

وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ وَعِلْمُنَا اَتَمُّ



باب اول

ولادت سے شباب تک

۱۸۸۴ء تا ۱۹۰۷ء

حسین اللہ علیہ السلام

نسب | حضرت والا سلسلہ سادات کی ایک مشہور کڑی سے منسلک تھے، آپ کا نامہال زیدی اور دوھیال حسینی تھا، حضرت والا کی ایک قلمی بیاض میں جدی بزرگوں کا تسلسل اس طرح درج ہے کہ :-

سید سلیمان (ندوی) ولد سید ابوالحسن ولد سید محمدی (حکیم محمدی) ولد سید عظمت علی ولد سید وحید الدین ولد سید رجب علی ولد سید محمد شیر ولد سید صدر الدین ولد سید سلیمان ولد سید عثمان ولد سید حسن ولد سید شمس الدین ولد سید غلیل ولد سید عرب ثانی ولد سید مالک ولد سید میر ولد سید محمد ولد سید شمس الدین ولد سید معین محمد ولد سید میر محمد ولد سید عرب اول ولد سید امیر سید برہان ولد سید احمد ولد سید محمد ولد سید یوسف ولد سید اسحاق ولد سید یعقوب ولد سید حسن ولد امام علی موسیٰ رضا ولد امام موسیٰ کاظم ولد امام جعفر صادق ولد امام محمد باقر ولد امام زین العابدین ولد امام حسین ولد علی مرتضیٰ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

خاندان اور وطن | دوسو برس کی بات ہے کہ حضرت والا کے اجداد جزیرۃ العرب سے نکل کر سندھ کے ساحل پر آ پہنچے اور یہاں سے اجمیر شریف کے راستے صوبہ متحدہ (پوپی) سے گذر کر بہار کو اپنا مسکن بنایا چنانچہ عظیم آباد چٹنہ کے نواح میں آج بھی سادات کی بارہ لے اموی شجرہ نسب بھی محفوظ ہے مگر میں نے اسکو بہار نقل نہیں کیا ہے کہ حضرت فرماتے تھے کہ حضرت میران خشک سواشیدہ جو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کے شہر سید وجہ الدین مشہدی کے بھتیجے تھے اجمیر شریف کی ایک پہاڑی پر مدفون ہیں حضرت کے اجداد میں سے تھے، اسی اعلق کے سبب جب ایک مرتبہ حضرت والا آئیں مزار مبارک پر حاضر ہوئے تو متولی حضرات گھبرائے کہ کہیں انکی تولیت بچھن جائے۔ یہ روایت میں نے خود حضرت والا کی زبان سے سنی ہے۔

بستیاں، جو عام زبان میں بارہ گادان کہلاتی ہیں موجود ہیں۔

حضرت والا کا وطن دینہ، بہار شریف (ضلع پٹنہ) سے شمال مشرق آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور سادات بہار کی برادری میں بہت ممتاز ہے۔ چنانچہ مولانا گیلانی بھی تصدیق فرماتے ہیں کہ :-

”علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ صوبہ بہار کے مشہور و معروف قریۃ السادات والملوک دینہ میں پیدا ہوئے، جو سادات کرام کے موطن و مسکن ہونے کے بعد اطراف و نواح کی ممتاز بستیوں میں شمار ہوتا رہا عموماً اہل علم اور صاحبِ دل بزرگوں کو ہر زمانہ میں اسی بستی میں ہم پاتے ہیں۔“

حضرت والا کے جد امجد جن کا اسم گرامی تو دراصل سید محمدی تھا لیکن معروف حکیم محمدی ہی کے نام سے رہے، اپنے وقت کے مشہور طبیب اور صاحبِ دل صوفی تھے، تصوف میں ایک تالیف ”نور محمدیہ“ کے نام سے ان کی یادگار ہے، جس میں ہر درویش سلسلہ کے بزرگوں کے کچھ احوال ہیں، اسی طرح فن طب میں ”قربا دین محمدی“ اور ”خزن الحکمت العلیا“ کے دو قلمی ترکے ہیں۔

حضرت سید والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالحسن (ف ۱۳۳۵ھ) اپنے خانوادہ کمالات میں اور بھی ممتاز تھے، وہ ایک سنجیدہ عالم دین، ریاست اسلام پور کے شاہی طبیب اور نقشبندی ابوالعلائی سلسلہ کے شیخ کامل تھے، نفاست و نظافت ان کی طبیعت کا غیر تھا، ان کا ظاہر بڑا وقار اور ان کا باطن کمال تقویٰ کا آئینہ دار تھا، میں نے حضرت والا کو یہ فرماتے سنا ہے کہ :-

”مضمون سید سلیمان ندوی مرحوم“ از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔ ماہنامہ چراغِ راہ دہرہ گراچی، ستمبر ۱۹۶۶ء
 ”مضمون مولانا گیلانی“ بعنوان سید الملت کا مکتبہ زندگی، شائع شدہ سلیمان نیر ریاض
 ”مضمون سید صلیح الدین عبدالرحمن صاحب شائع شدہ سلیمان نیر معارف۔“

”میں نے اپنے والد ماجدؒ اور حضرت مولانا تھانویؒ سے زیادہ باہمہ
وہ ہمہ مستیاں اپنی عمر میں نہیں دیکھیں، بے ہمہ تو ایسے تھے کہ اپنے ذاتی
معاملہ میں ان کو کسی سے کوئی تعلق نہ تھا اور باہمہ ایسے کہ دُور دُور کے
عزیز و اقارب کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق کی ادائیگی پر بھی نظر رہتی تھی اور
اس میں تاخیر گوارا نہ فرماتے تھے۔“

حضرت والدہ کی والدہ ماجدہ بھی ایک عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں اور عشق
نبوی سے ان کو خاص حصہ ملا تھا، اُن کے حُبِ نبوی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا
ہے جب وہ زیارتِ حرمین سے مشرف ہوئیں تو دیارِ حبیب کی محبت ان پر اس
درجہ غالب آگئی کہ اپنا ہندوستانی لباس ترک کر کے قریب قریب وہی لباس اختیار
فرمایا جو اس زمانہ میں عرب خوانین پہنتی تھیں، بقول مولانا گیلانیؒ جی عربی کے
وطن پہنچ کر ہندیہ مستعربہ بن گئی تھیں۔

حضرت والدہ کے حقیقی بڑے بھائی مولانا سید ابوالحبیبؒ (ف ۱۳۳۶ھ) جو
حضرت سے عمر میں ۱۸ برس بڑے تھے دیستہ کے مشہور طبیب، جمید عالم اور قطبِ
وقت شاہ ابو احمد بھوپالی قدس سرہ سے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں اجازتِ بیعت
رکھتے تھے، مولانا گیلانی کا بیان ہے ۔

”نقشبندی سلسلہ کے مجاہدات و ریاضات میں جو محنتیں انھوں نے برداشت
کیں ہم تو شاید ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کا یہ ایک معمولی مجاہدہ تھا کہ جہاز سے
اُترنے کے بعد رنج و زیارت کا سارا سفر پیادہ پا پورا فرمایا تھا، حضرت مجدد الف ثانی
رحمۃ اللہ علیہ کے تو عاشق زاد تھے، ایک دفعہ فرمانے لگے کہ ”مکاتیبِ طیبہ“ کے خاص

۱۔ مضمون مولانا گیلانیؒ بحوالہ سابق۔

پہلوؤں پر میں نے کچھ کھا لے! لیکن افسوس کہ وہ شائع نہ ہو سکا۔“ خود حضرت والا فرماتے تھے کہ ہمارے بھائی صاحب ”حافظ مکتوبات“ مشہور تھے، بغاوت سے ان کو سخت نفرت تھی اور سنت سے اس قدر شغف تھا کہ شاہ ابوالاحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب تک بھوپال جا کر اس نقطہ نظر سے خوب دیکھ اور پرکھ نہیں لیا اس وقت تک اپنی ارادت کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں نہیں دیا اور بعد ارادت بھی اپنے شیخ کی تعریف میں ہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کے عمل کو دیکھ کر سنت مطہرہ کی جزئیات تک نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔“

درویش عالم حافظ بھل حسین صاحب جو قطب آفاق شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی کے خلیفہ رشید اور خود صاحب حال بزرگ تھے حضرت والا کے رشتہ کے چچا تھے۔ حافظ صاحب نے گنج رحمانی اور فضل رحمانی کے زیر عنوان اپنے شیخ عالی مقام کے ملفوظات قلمبند فرمائے ہیں جو تقسیم ہند سے پہلے عام طور پر ملتے تھے، اپنے

لے مضمون مولانا گیلانی بحوالہ سابق

میرے علم میں مولانا ابو حبیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور قلمی متروکہ بھی ہے، مولانا نے اپنے سلسلہ نسب کے افراد کی پوری تاریخی فارسی زبان میں تحریر فرمائی تھی اور اپنے جراحہ کے حالات تک اس کو پہنچا سکے تھے بعد میں ہمارے حضرت والا نے اسی زبان میں اس کی تکمیل فرمائی ۱۹۵۲ء میں حضرت والا نے اس کا صاف شدہ مسودہ مجھے عنایت فرمایا تھا کہ میں اس کا اردو ترجمہ کروں، مگر بعض مصروفیات کی وجہ سے جو حضرت والا سے فحقی میں اس ارشاد کی تعمیل سے معذور رہا اور اس عرض کے ساتھ کہ وقت نکل آنے پر اس خدمت کو اپنی سعادت سمجھوں گا اس مسودہ کو حضرت والا ہی کے حوالہ کر دیا، مگر پھر توجہ وقت نکل گیا سو نکل گیا بہر حال ترتیب سوانح کی سعادت جس کسی کے حصہ میں بھی آئے اس مستند ماخذ سے استفادہ اس کے لئے ضروری ہے۔ (غ۔م)

دور کے علماء میں حافظ صاحب کی شخصیت خاصی معلوم و معروف تھی اور ان کے لطائف و ظرائف عام تھے، حضرت تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات میں بھی حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ملتا ہے۔

ولادت | جن بیدار مغز اور روشن ضمیر بزرگوں کا اجمالی تذکرہ اوپر کیا گیا، ان کے برکات ظاہری اور انوار باطنی سے معمور فضا میں جمعہ کے مبارک دن ۲۳ صفر ۱۲۳۵ھ (۲۴ ستمبر ۱۸۵۰ء) کی صبح کو حکیم سید ابوالحسن دہلوی کے گھر ایک پیکر جمال نمودار ہوا، دیدہ و درجہ اجدا (حکیم محرمی رحمۃ اللہ علیہ) کی نظریں نوزائیدہ پوتے پر پڑیں تو پیشانی کی چمک میں تا پیداستقبل کی رفعتیں دیکھ گئیں، نام امیں الحسن اور کنیت ابو نجیب رکھی اور فرط خوشی میں یہ قطعہ موزوں فرمایا۔

قطعہ

سعد حسن ہست فرزندن	شدہ بوالحسن نام نیکو خصال
خدایش عطا کرد نور بصیر	کہ یعنی پیر شد بہ حسن و جمال
بشہر صفروں شدہ بود سنہ	جو ان بخت آمد چو ماہ ہلال
بروز آدینہ بوقت سعید	بیامد مثال گل نو بہال
ز آزار و آشوب چشم بدش	نگہداشت آن ایزد لایزال
بدولت قوی باد و عرش دراد	کنندشادمانی بہ ہر ماہ و سال
بہ اقبال و دولت کند سرودی	سر دشمنانش شود پائمال
نہادیم نامش انیس الحسن	بود حافظش حضرت ذوالجلال

یہ یعنی حضرت ذوالاثر کے پد بزرگوار حکیم سید ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ قطعہ حضرت حکیم محرمی کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے۔ عہ یعنی جمعہ۔

چو چستیم تادریخ اود از خسرو یکایک مرو شے ز تار یخ و سال

بگفتا کہ بے داد شد مصرم

شدہ مہر تاباں ز بروج کمال

س ۱۳۰۲ھ

سیلمان کی وجہ تسمیہ | رکھنے کو تو روشن ضمیر دادا نے اپنے پوتے کا نام انیس الحسن

رکھا اور بعد میں دنیا نے بھی دیکھا کہ حسنی صلح جوئی، ان کا نمایاں خلق تھا، اسی طرح نسبی شرافت کے اعتبار سے ابو نجیب کی کنیت بھی ہر طرح ہی موزوں تھی مگر چشم قدرت کچھ اور دیکھ رہی تھی اور اس کے تقاضے اور ہی تھے وہ ایک ایسا نام چاہتی تھی جو نوموڑو کے آئندہ ادج و کمال کا ترجمان ہو۔ چنانچہ ایک ادنیٰ پہانے سے قدرت کا چاہا پورا ہو گیا۔

ہوایہ کہ عین اسی زمانے میں ایک رنگوئی تاجر سیلمانؑ نا خدا کا ایک جہاز بے سیرونی

سامان تجارت سے لدا ہوا فلج بنگال میں داخل ہوا اور اس کی آمد سے مشرقی ہندوستان

میں ایک دھوم مچ گئی، گھر گھر ایک کی زبان پر سیلمان کا نام آنے لگا، حکیم محمدی رحمۃ اللہ

علیہ کے گھر میں بھی اس کا چرچا ہوا۔ گھر والوں نے محبت سے ابو نجیب کو پکارا کہ ہمارا سیلمان

تو یہ ہے اور ایک دن اس کا شہرہ بھی گھر گھر ہو جائے گا۔ یہ دراصل اتفاقی

نہیں بلکہ ایک القائی چیز تھی، غیر شعوری طور پر انیس الحسن اور ابو نجیب کے الفاظ

ذہنوں سے موم ہو گئے اور جو نام اللہ تبارک و تعالیٰ کو پسند تھا وہی باقی رہا، مقبول ہوا،

شہرت پا گیا، پھر جب سیلمان شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنا نام سید سیلمان لکھا۔

لے جس نے کلکتہ کی شہر مسجد نا خدا تعمیر کروائی تھی۔ یہ وجہ تسمیہ میں نے خود حضرت والا سے سنی تھی اور بعد رحلت اسکی

مزید توثیق حضرت کے صاحبزادے جناب سید سلمانؒ ملکا اور برادر زادہ جناب سید الوہم صاحب سے حاصل کر لی جو مولانا الخضر

نروی نے جو حضرت والا کے برادر زادہ ہی میں جو جو تھیں اپنے مضمون (شائع شدہ سیلمان نمبر مخارف) میں لکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے

موصوف کو تسامع ہو گیا ہے۔

پھر دنیا کو ماننا پڑا کہ وہ سلیمان علم و عرفان تھے اور ان کے خزانہ علمی و عرفانی سے ملت اسلامیہ مالا مال ہوگئی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

لفظ ندوی جزو نام کیوں بنا؟ | سید سلیمان ایک پورا نام تھا، ہر سابقہ اور لاحقہ سے بے نیاز اور یوں بھی حضرت والدہ کے ذوق

لطیف پر رزوانہ بہت گراں تھے مگر جو چیز غریب سے بن آئے اور مقدّر ہو جائے اس کو نہ تو کوئی روک سکتا ہے، نہ اس میں کوئی ناگواری باقی رہ جاتی ہے کیونکہ وہ ایک طرح کی شانِ مقبولیت لئے ہوئے آتی ہے!

مشیتِ الہی کو یوں ہی منظور ہوا کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۶ء کے درمیان پانچ سلیمان پیدا ہوئے اور ان پانچوں کو عزت و عظمت کے لئے چن لیا گیا۔ عمر کے تفادات کے باوجود ایک ہی وقت میں سب کی شہرت عام ہوگئی، کوئی بختگی کی عمر کو پہنچ کر نمایاں ہوا تو کوئی نوعمری ہی میں چمک اٹھا، غرض آسمانِ شہرت پر آئے تو کہکشاں بن کر۔ مشہور عالم و اعظا اور صوفی شاہ سلیمان بھیلواری کو اولیت اور سید سلیمان دینوی کو خاتمت کا شرف ملا درمیان میں قاضی سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ اللعالمین) مولانا سلیمان اشرف بہاری (سابق صدر شعبہ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی) اور سر شاہ سلیمان (وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی) آئے۔ اس اجتماع کی وجہ سے تخصیص کسی کی غایت یعنی امتیاز و تعارف فوت ہوگئی تھی۔ ایک کا اہم گرامی سن کر دوسرے کی شخصیت کا ذہن میں آجانا بعید نہ تھا۔ لہ

لہ چنانچہ ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے، علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ میں کسی تقریب سے حیدر آباد تشریف لے گئے، اتفاق سے اس وقت درجنگہ والے استاد وہاں موجود تھے انہوں نے اخباریں پڑھا کہ مولانا سید سلیمان صاحب تشریف لائے ہیں اور فلاں جگہ مقیم ہیں تو وہ شاہ سلیمان بھیلواری کو کچھ کر ان سے ملنے آئے مگر ان کے بجائے ایک دوسرے ہی سلیمان کو پایا۔ (سلیمان نمبر معارف ص ۵)۔

حضرت والا نے اس ضرورت کے ماتحت اپنے نام کے ساتھ دینوی کے لفظ کا اضافہ فرمایا۔ چنانچہ ابتداء میں جو مضامین معارف میں چھپے ہیں ان میں سید سلیمان دینوی ہی لکھا ہے لیکن یہ خاکی نسبت نہ تو سلیمان کو زیرب دیتی تھی، نہ چل سکی، قدرت نے اس کو بہت جلد علمی نسبت سے بدل دیا، جس نسبت کو محبوبہ گوارا فرمالیا گیا تھا اس سے دل اتر گیا، دینوی کی بجائے ندوی لکھنے لگے۔ یہ نسبت معلوم ہوتا ہے قضا و قدر کی مجوزہ تھی، اس قدر مقبول ہوئی اور نام سے کچھ اس قدر میل کھا گئی کہ خود نام ہی کا جوڑ بن گئی، اب نام سید سلیمان نہیں رہا بلکہ سید سلیمان ندوی ہو گیا اور آج علامہ ندوی یا مولانا ندوی کے الفاظ کے ساتھ ہر وزن میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی تصویر اسی طرح بلا تکلف کھینچ آتی ہے جیسے مولانا دم کہتے ہی جلال الدین ندوی (قدس سرہ) کا خیال، یا امام غزالی کی صدا پر امام محمد غزالی کا تصور قائم ہو جاتا ہے!

لڑکپن ہی میں تخم معرفت کی کاشت | جس دور میں شعور سلیمانی نے پرورش پائی، اس میں یوں بھی علم و عمل اور ظاہر

و باطن کی دونی ایک بے معنی بات تھی۔ ”گر عمل در نویسند نادانی“ والا معیار ابھی قائم و برقرار تھا، پھر خصوصیت سے سلیمانی گرد و پیش تو آپ دیکھ ہی چکے کہ برکات روحانی اور انوار علمی سے جگمگا رہا تھا، ایسی صورت میں نو نہال سلیمان کو تعلیم و تربیت کے لئے گھر سے لے پڑیہ ہے کہ ندوی صرف وہی کہلانے کے مستحق تھے، انہی کی ذات اقدس تحریک ندوہ کی ترجمان تھی، انہوں نے اپنی علمی جامعیت اور اخلاقی فیضیت سے علمائے قدیم اور نو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا، ایک کو افادے کے ڈھنگ سکھاتے دوسرے کو ضرورت استفادہ کا احساس دلایا ان کا احسان ملت کے ہر فرد پر یکساں ہے اور وہ بلاشبہ سید اللہ میں خود ان کے معاصر شہر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی علامہ اعتراف فرمایا کہ ”آپ علماء اور تعلیم یافتوں کے درمیان ایک سفیر متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں۔“ (دیکھئے یاد رنگان ص ۴۵)

باہر قدم نکلنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اپنے برادر بزرگ مولانا ابو حبیب محمدی ہی سے اکتساب کا آغاز ہوا، بحیثیت استاد وہ حضرت دالاج کو میزان و منشعب پڑھاتے تھے اور بحیثیت پرطریقت اپنے حلقہ توجہ میں بٹھالیتے تھے، خود حضرت والا کا ارشاد ہے کہ:-

”میں اپنے بھائی صاحب کے فیض صحبت سے اپنے قلب میں پاکی محسوس کرتا تھا۔“

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قلب سلیمانی میں غم معرفت کی کاشت لڑکپن ہی میں ہو چکی تھی، البتہ اس کی آبیاری مرشد تھانوی قدس سرہ کے ہاتھوں انجام پائی!

توحید خالص کی تلقین | یہ حضرت ابو حبیب قدس سرہ کی فراست ایمانی کا کھلا ثبوت ہے کہ لڑکپن ہی میں انہوں نے اپنے سعادت آثار بھائی کے مزاج و رجحان کو سمجھ لیا تھا اور تربیت ایسے نبع سے فرمائی تھی کہ جو نقوش قلب سلیمانی پر مرتسم ہوئے وہ مدت دراز تک قائم رہے اور آخر عمر میں وہی گہرے ہو کر لافانی ہو گئے۔

مولانا ابو حبیب کو گاؤں کی مسلمان خواتین کے دینی اصلاح کی دھن تھی اور غالباً اس دور بینی کی وجہ سے تھی کہ ایک عودت کی اصلاح دراصل ایک گھر کا بناؤ ہے اس کے لئے مولانا نے ہفتہ وار مجالس وعظ کا سلسلہ جاری فرما رکھا تھا، اور باوجودیکہ خود ایک عالم تھے وعظ کی صورت یہ اختیار فرمائی تھی کہ جب خواتین جمع ہو جائیں تو مولانا بائبل شہیدؒ کی ”تقویت الایمان“ کتاب اپنے زیر تربیت بھائی کے ہاتھ میں دے کر ان کو پردہ میں خواتین کے سامنے بٹھا دیتے تھے، اب ہمارے حضرت دالاج اپنی معصومانہ زبان سے اس کو پڑھتے جاتے اور خود شاہ ابو حبیب صاحب پس پردہ اس کی وضاحت فرماتے جاتے تھے۔ یہ عجیب طریقہ وعظ و تلقین کا پیش فرمایا گیا تھا جس میں وعظ کا

حضرت والا اپنے والد ماجد کے پاس اسلام پور پہنچے، وہاں کچھ کتابیں ختم کی تھیں کہ ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف (پٹنہ) بھیج دیئے گئے۔ یہاں ایک برس خانقاہ مجبسی میں رہ کر مولانا محی الدینؒ (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف) سے کچھ اور کتابوں کی تکمیل فرمائی مگر خانقاہ کے مبتدعانہ رسوم اور ہفتہ وار قوالی وغیرہ سے بالکل مجتنب رہے، راقم سے ایک بار فرمایا کہ ”جو رنگ بھاتی صاحب کی مجالس میں چڑھ چکا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ طبیعت کو یہاں کے رسوم سے ذرا بھی مناسبت نہ ہو سکی۔“

پھلواری کے بعد حضرت والا مدرسہ امدادیہ درجہ نگہ بھیج دیئے گئے اور یہاں بھی ایک سال رہ کر درس نظامیہ کی بعض اور کتابیں ختم فرمائیں۔ اس وقت حضرت والا نے عمر کی سترہ منزلیں طے فرمائی تھیں۔

مولانا گیلانیؒ نے حضرت والا کے ایک ہم درس مولوی بہت اس دور کی متانت

صنیف صاحب کی روایت نقل کی ہے کہ، ”ایام طفلی ہی سے فطرۃً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے، بچپن کی عام شرارتوں سے ان کی طبیعت کو جہلۃً کسی قسم کی مناسبت نہیں تھی، اسی لئے شرارت وغیرہ کے قصوں میں سید الملت تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے۔“

ایک اور ہم درس اور بڑے تکلف ماسخ مولوی جواد علی خاں صاحب عالی کی شہادت بھی سنئے، لکھتے ہیں:-

”اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے کبھی سخت کلام یا لب ولہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب ولہجہ البتہ زوردار ہوتا اور بیان کی قوت و روانی سے شرکاء کے دل پر حکم کا رعب بیٹھ جاتا۔“

اے سلیمان نمبر ریاض:-

متانت ہر انداز پر غالب رہتی، کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے، بے تکلفی
میں ظرافت سے باز نہ آتے، اس میں بھی متانت قائم رہتی، اگر کوئی
ناگوار ہی ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے مگر زبان پر قابو رہتا

اسی طرح حضرت والا کے برادر زادہ مولانا ابو ظفر ندوی، جو حضرت سے چار ہی
بہن چھوٹے ہیں فقط ان ہیں۔

"علامہ موصوف پچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان
تھے اُن کے استاد ان کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے اور ان کے تیز زبان
ساتھیوں کو ذہین اور صاحب ذوق سمجھ کر ان کی طرف زیادہ توجہ
کرتے تھے۔"

پھر آگے چل کر لکھا ہے کہ "جب ان کا فضل و کمال ظاہر ہوا تو مکتب
کے اساتذہ کو حیرت و حیرت ہوئی۔ شاگرد کے کمال پر بھی اور اپنے اندازے
کی غلطی پر بھی۔"

اس بنییدگی اور متانت کا باعث افتاد طبع تو ہے ہی جو قدرت کا بے طلب
عطیہ ہے لیکن تربیت کے ہاتھ اس کو اور بھی صیقل کر دیتے ہیں، چنانچہ شاہ البصیبؒ
صاحب کی خصوصی تربیت کے ساتھ ساتھ خود حضرت والا کے والد بزرگوار کی توجہات کا
حال مولانا گیلانی نے یہ تحریر فرمایا ہے۔

"تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت پر بقول مولوی حنیف صاحب
سید الملت کے والد ماجد ہی کی کافی توجہ تھی، نشست برخاست، گفتار
و رفتار ہر مسئلہ میں دیکھتے رہتے تھے کہ کوئی نامناسب بات بچوں سے سرزد

لے سلیمان معارف نمبر ۳ ہجرت سیالانی کا امتیازی اور خاص وصف ہے جو ہر دور میں نمایاں رہا لے سلیمان نمبر معارف ۵۶

نہ ہو، اس باب میں ان کی نزاکت احساس کا حال یہ تھا کہ دسترخوان پر ایک دن جب سید الملت بھی اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کھانے میں مشغول تھے چہلتے ہوئے ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی، دیکھا گیا کہ بے ساختہ ایک چیت رسید کی گئی۔ سید صاحب کے والد ماجد کہتے جاتے تھے کہ آدمی کے بچوں کو آدمی کے بچوں کی طرح کھانا کھانا چاہیے۔ کھاتے ہوئے منہ سے آواز تو کتنے نکالتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ عادات و اخلاق کے جس شریفانہ معیار کو سید صاحب کی زندگی پیش کرتی رہی اس معیار کو قائم کرنے میں مکتبی زندگی کی ان کڑوی نگرانیوں کو بھی غائب و غفل تھا۔

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی خدمت میں حاضری | طالب علمی کے زمانہ میں

حضرت والاراح ایک مرتبہ حضرت مولانا سید محمد علی کانپوریؒ ثم مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو قطب آفاق حضرت شاہ فضل رحمن رکنج مراد آبادیؒ کے خلیفہ اجل تھے۔ اس زمانہ میں حضرت والاراح کو معقولات کی کتابوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ جب حاضر ہوئے تو مولانا مونگیریؒ نے پوچھا کہ مولوی سلیمان آج کل کون سی کتابیں زیر درس ہیں؟ جواب میں حضرت والاراح نے سارے نام معقولات کی کتابوں کے گنوائے تو ارشاد فرمایا، ان کتابوں کو پڑھ کر کیا فائدہ ہوگا؟ حضرت نے فوراً عرض کیا کہ ان کو دین کی خدمت کے لئے استعمال کروں گا! شیخ عارف نے فرمایا کہ دین تو بس قرآن و حدیث میں ہے اور وہ ان کتابوں پر منحصر نہیں مگر افسوس کہ جس کو دین نصاب کہا جاتا ہے اس میں تمام تر معقولات اور فلسفہ ہی پڑھایا جاتا ہے لے سلیمان نمبر۔ ریاض۔

اور قرآن و حدیث برائے نام! لے

حضرت مولانا مونگیری رحمہ اللہ کا یہ انتباہ آئندہ زندگی میں سلیمانی علمی خدمات کا طفرائے امتیاز بن گیا اور خود اپنی بات کو بھی کہ معقولات کو خدمت دین میں صرف کروں گا۔ حضرت نے ایسا پیر کر دکھایا کہ وہ جامع معقول و منقول علماء کے لئے دینی علمی خدمات کا ایک قابل اتباع نمونہ بن گیا۔ سیرت النبیؐ کی آخری چار جلدات سیرۃ عائشہؓ اور خطبات ممداس کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قرآن و حدیث پر بنیاد رکھتے ہوئے معقولات کو کس طرح دینی تفہیم و استدلال میں برتنا گیا ہے! مدرسہ امدادیہ و بھنگہ کے ایک سالہ قیام کے بعد ۱۹۱۹ء میں ندوہ میں داخلہ

حضرت والا از ذہن و فکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء کھنڈ میں داخل کرائے گئے اور پانچ سال رہ کر ۱۹۲۳ء میں سند فراغ حاصل کی۔

ندوہ پہنچ کر حضرت والا کو علامہ شبلی جیسے بے مثل ادیب و مورخ، فلسفی و متکلم

لے یہ روایت راقم الحروف نے حضرت مونگیری نور اللہ رحمہ اللہ کے پوتے اور خلیفہ محدث جلیل حضرت مولانا سید فضل اللہ الجیلانی مظاہر (صاحب فضل اللہ الصدیقی توضیح الادب المفرد) سے سنی حضرت ممدوح میرے شیخ حضرت علامہ ندویؒ کی علمی فضیلت اور روحانی قربت کے بڑے متعرف اور شاگرد اسی بہت سے راقم عاجز پر خاص نگاہ لطف قیام حیدرآباد ہی سے فرماتے رہے کبھی مرتبہ جب کراچی تشریف فرما تھے تو صفر المظفر ۱۳۹۱ھ ۲۴ اپریل ۱۹۷۶ء صبح کے وقت از خود احقر کے غریب خانہ پر تشریف لائے، اور بلا طلب کیا معنی بالکل بے سان و گمان احقر کو وضو کرنے کا حکم دیا۔ وضو کر کے حاضر ہوا تو احقر کا دہنسا ہاتھ اپنے دونوں دست مبارک میں پکڑ کر احقر کو سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ میں خلافت سے سرفراز فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ سیری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں اس لئے میرا جی چاہتا تھا کہ یہ کا آپ کے سپرد کروں۔ پھر جب کراچی سے ہندوستان مراجعت کا وقت آیا تو تحریری سند بھی (بہ زبان عربی) عطا فرمادی، اور بشارتوں سے سرفراز فرمایا کہ بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو بے عرض جو دیا، دیا تم سے

محقق و مفکر کی آغوش تربیت میسر آئی جس میں خدا داد صلاحیتیں خوب نشوونما پانگیں، لیکن جس جامعیت علمی کے وہ حامل تھے اس میں دارالعلوم کے اور اساتذہ کا بھی ناقابل نظر انداز حصہ ہے۔ شلا حضرت والا نے پورے تین سال تک امام معقولات مولانا محمد فاروق چرمیا کوٹی رحمہ سے منطق، فلسفہ اور عربی ادب کی تحصیل فرمائی جو خود مولانا شبلیؒ کے بھی استاذ تھے۔ علم حدیث اور ہیئت کی تکمیل مولانا حفیظ اللہ مدرس دارالعلوم ندوہ سے فرمائی جو مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے خاص شاگردوں کی آخری یادگار تھے۔ اسی طرح علم فقہ میں درست رس فقیہ کامل مولانا مفتی عبداللطیفؒ کے زیر تربیت بہیم پھنپانی البتہ کلام، تاریخ، اردو ادب میں تمام تر علامہ شبلیؒ سے مستفیض رہے اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کا اعلیٰ مذاق یہیں سے پایا۔ ان پلندہ پایہ اساتذہ کی توجہات کے علاوہ مہتمم مدرسہ شاہ سلیمان پھلواوی رح کی حوصلہ افزائی بھی حضرت والا کی علمی ترقی میں معاون رہیں، چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں خود حضرت والا کے قلم سے اس سلسلہ کا ایک واقعہ زیر تحریر آگیا ہے جو یہ ہے:-

طالب علمانہ امتیاز | یاد ہے کہ اسی زمانہ میں نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تھے شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہمدرس مولانا ظہور احمد صاحب وحشی شاہ جہانپوری کو امتحان پیش فرمایا تھا، میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں عربی میں ایک لہ حضرت تھانویؒ نے بھی مولانا چرمیا کوٹیؒ کا اعتراف ان الفاظ میں فرمایا ہے:- ”بڑے فاضل تھے، خصوصاً ادب و معقول میں بہت مشہور تھے۔“ (ملاحظہ ہو وعظ خیر الحیات و خیر المات) لہ یہ تفصیل میں نے حیات شبلی اور یاد رنگان کے اوراق سے اور سید صباح الدین صاحب کے مضمون محولہ سابق سے حاصل کی ہے!

قصیدہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے یہ کہہ کر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور آپ کو قصیدہ سنائیں گے۔ نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں امتحان نہیں لوں گا کہ امتحان سے پہلے ہی ان پر ایمان لا چکا، شاہ صاحب نے فرمایا یہ میرے ہم نام بھی ہیں، نواب صاحب نے فرمایا تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں میں نے اپنا قصیدہ پڑھا تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس پرانی ادب دانی کا قائل نہیں، عربی کا کوئی اخبار منگوائیے اس کو یہ پڑھیں تو البتہ!۔ اس زمانہ میں اللواء اور الموید عربی کے مشہور اخبار تھے، وہ منگوائے گئے، میں نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا تو بے حد خوش ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بے حد محفوظ ہوئے اور اس زمانہ کے اخبارات و کیل، وطن اور کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے اس معائنہ کی جو کیفیت چھپوائی، اس میں میرا ذکر خاص طور سے فرمایا، یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا، ان کی (یعنی شاہ صاحب کی) اس تحریر میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ صوبہ بہار ہر روز میں ایک ایمان پیش کرتا رہے گا۔

سند پانے کو تو سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں
عطائے سند اور آغاز شہرت | سند پاتے ہی رہتے ہیں مگر حضرت والا کا سند

پانا کچھ اور ہی مجھ و شرف کی شان لئے ہوئے تھا وہی ساعت جس میں وہ فارغ التحصیل ہونے کی سند پارہے تھے قدرت ان کے سر پر شہرت و عظمت کا تاج رکھ رہی تھی، یہ مستقبل کے سیلانی شکوہ کی طرف چشم قدرت کا اشارہ تھا، حضرت نے اُس حیات شبلی میں جس کی تصنیف مرشد تھا نووی قدس سرہ سے فیضیابی کے بعد ہوئی ہے عطائے سند کے واقعہ کو اس وجد آفریں فٹ نوٹ کے ساتھ تحریر فرمایا ہے:-

”یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اس لئے بے اختیار نوکِ قلم پر

پہنچا گیا اگر ناظرین کو اس سے خود ستائی کی بُرائی ہو تو چشم پوشی فرمائیں۔
اب اصل تفصیل سنئے۔

”دارالعلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گزر چکے تھے مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہئے نہیں ہوا تھا۔ اسی غرض سے مارچ ۱۹۰۷ء مطابق محرم ۱۳۲۷ء میں رفاہ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری مرحوم نے کی، جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی نہایت اچھی تعداد شریک تھی، جو دارالعلوم کے بلند پایہ دعووں کا امتحان کر رہا تھا۔

مولانا (رہمائی) نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند منہجی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لئے تیاری کی ہدایت فرمائی، اس ضمن میں محبی مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم۔ اے جسرانا انسپکٹر مدراس عربیہ الہ آباد) نے قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر اور راقم نے علوم جدیدہ و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی، اسی تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشا گاہ اور سامعین کو آمینہ حیرت بنادیا، عین راقم کی تقریر کے اثناء کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا حسب فائدہ جلسہ سے باہر چلے گئے، مولوی سید عبدالحی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ”تم کر سکتے ہو؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا۔ مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ ”اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟“ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولانا

نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں یہ اس پر تقریر کریں گے :

چنانچہ موضوع کے تقریر کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسہ میں موجود تھے، انھوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہو۔ میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے، ہر طرف سے احسنت و آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاد مرحوم نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے عروہ افتخار بن گیا۔

استاذ کی نظر میں شاگرد کا مقام | مذکورہ واقعہ سے مولانا شبلی رح کا فطر مسرت و محبت ظاہر ہی ہے مگر مولانا نے اپنے مایہ ناز

شاگرد کے کرشمہ علمی و سانی کی اطلاع مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کو جن الفاظ میں فرمائی ہے اس سے تاثر کی انتہا ظاہر ہوتی ہے، لکھا ہے :-

”... .. سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اسی وقت عربی زبان میں اس پر لکچر دوں گا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ مجروح رہا تھا اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفرین کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہوگئی۔“

اس کے بعد حضرت والدہ کی ہر تقریر، تحریر اور تحقیق استاد عال مقام کے دلیں

شاگرد کی عظمت کو بڑھاتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ ذاتِ سلیمانی علامہ شبلی کی نظر انتخاب کا حصہ بن گئی تھی، چنانچہ جب چل چلاؤ کا وقت قریب محسوس ہوا تو علامہ شبلی کو سب سے زیادہ رنج سیرت نبوی کی نامتائی اور فکر اس کی تکمیل کی تھی جب تھوڑی طاقت تھی، اسی وقت سیرۃ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام مسودات اور بیضے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کر دوائیئے اور عزیزوں کو جو تیار داری میں مصروف تھے یہ وصیت فرمائی کہ:

”یہ مسودے حمید الدینؒ اور سید سلیمانؒ کے سپرد کئے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں۔“ عہ

پھر وفات سے تین دن قبل حضرت والا کو پوچھا کہ پتہ پر تار دلویا کہ فوراً چلے آئیں، چنانچہ تار پہنچتے ہی حضرت والاؒ اعظمؒ گھر گھر مضطربانہ آپہنچے، پھر جو کچھ ہوا حضرت والاؒ کی زبان اقدس سے سنئے اور اس سے استاذ کی نگاہ میں شاگرد کے اعتماد و اختصاص کا اندازہ لگائیے، حیاتِ شبلی کے صفحہ (۷۲۲) پر لکھا ہے:-

”لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سر ہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ ”اب کیا رہا“ پھر زبان سے دوبارہ فرمایا ”اب کیا! اب کیا!“ لوگوں نے پانی میں جواہر مرہ گھول کر ایک چمچ ملا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی تو مجاہد کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا ”سیرت میری تمام عمر کی کمالی کوشش کا مجموعہ ہے“

لے مولانا حمید الدینؒ فراہمی رحمۃ اللہ علیہ جو مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان دنوں حضرت والا اپنے استاذی کے حکم سے دکن کالج پوز میں عربی و فارسی کے لیکچرار تھے۔ اس سے مولانا شبلیؒ کا ذات رسالت پناہ دہلی (اللہ علیہ وسلم) سے وابہانہ تعلق بالکل عیاں ہے۔ عہ حیاتِ شبلی صفحہ ۷۲۱، ۷۲۲

سیرت تیار کر دو“ میں نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا، ضرور! ضرور!۔“

شاگرد کے دل میں استاذ کی عظمت | استاذ کے تعلق خاطر کے بعد شاگرد کی وفا شعاری بھی لائق دید اور مثالی شان

کی ہے حضرت والا فرماتے ہیں کہ ”جب تک مولانا شبلی زندہ رہے میں نے اپنے نوجو ملاقات تک کو انہی کے ایماء اور حکم پر منحصر رکھا، ان کا ہر فیصلہ میرے لئے مفید اور تسکین بخش رہا۔“ اس گہرے تعلق کے بعد استاذ کی مفارقت شاگرد کے لئے جس قدر کٹھن اور دردِ روح فرسا رہی ہوگی اس کا اندازہ ہر حساس دل کو ہو سکتا ہے، حضرت والا فرماتے تھے کہ ”مجھ پر اتنا شدید غم بھی غم بھر طاری نہیں ہوا مجھے و غم سے اپنی زندگی کی کوئی توقع باقی نہ تھی، اور دیکھنے والے بھی محسوس کرتے تھے کہ میرا خون جل گیا ہے اور چہرہ ندر پڑ گیا ہے۔“ یہ بھی فرمایا کہ ”مولانا کی رحلت کے عرصہ بعد تک مولانا کا خیال ذہن و قلب پر اس درجہ چھایا ہوا تھا کہ جب میں مطالعہ میں غرق ہوتا اور کوئی مشکل مقام آجاتا تو بے خیالی میں کتاب لے کر مولانا کے کمرے کی طرف نکل پڑتا کہ یہ مقام حل کر لوں، لیکن دو تین قدم چل کر ان کی جدائی یاد آتی تو حسرت کے ساتھ لوٹ آتا۔“ یہ ارشادات تو خود راقم نے سنئے تائیداً حضرت والا کی تحریر بھی پڑھ لیجئے، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ایک مکتوب میں اپنے اس حال سے مطلع فرمایا ہے :-

”باوجود اس کے کہ میں مولانا مرحوم کی وفات پر تجسیم و تکفین میں شریک تھا

مگر بابر بھول جاتا تھا کہ وہ وفات پا گئے اور ان کی وہی ہیبت مجھ پر بعد

وفات بھی تھی جو زندگی میں تھی۔“ (مکاتیب سلیمان ص ۱۳)

حضرت والا کی اس شیفتگی اور وارفتگی کا اثر اس جاں گداز ”نوحۃ استاذ“ میں

آج بھی دیکھا جاسکتا ہے جو حیاتِ شبلی کے ختم پر موجود ہے اور ان کے جذبہ قدویت

کے ثبوت میں اسی کتاب کے آغاز میں مومن کی شکر گزاری کے زیر عنوان یہ برملا اعتراف

بھی ملتا ہے کہ ا۔

”اس حیات شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ امتداد مرحوم کے احسانات کے بارے میں سبکدوش ہو گیا تو یہ ناشکری ہوگی، کیونکہ میری حقیقتات پر ان کے جو احسانات ہیں وہ کیف و کم کے احاطہ سے باہر ہیں، ان کے تین سب سے بڑے احسانات تو ایسے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہی ہے۔ سب سے اول یہ کہ انہوں نے اس بے مایہ کو اُنکھی پیکر کر چلنا سکھایا، اور اس قابل کیا کہ دو حرف لکھ پڑھ کر اپنی استطاعت کے بموجب دین و ملت کی خدمت بجا لاسکے، دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو طالب علم کاسب سے نازک دور آتا ہے اس میں اس کی ایسی دستگیری فرمائی کہ حصول علم اور شوق مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بیکھنے نہ دیا اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سن کر طبابت کے خاندانی پیشہ سے ہٹا کر علم و فن کے آستانہ پر لا کھڑا کیا، اور سب سے آخر یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی یہ شکل و صفت اس کو سرزد کائنات، فخر موجودات، رحمت عالم سید اولاد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اول پہنچایا، یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیرت مبارکہ کے مطالعہ، جمع و تنقید اور تالیف و تحقیق کی خدمت ابتداء ہی سے سپرد فرمائی جو الحمد للہ یہاں اس کے لئے سعادت کا ذریعہ ہے اور وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی!“

یہ اعتراف جس تاثر کے ساتھ فرمایا گیا ہے اس کا صحیح اندازہ راقم کونہ ہو سکتا اگر اس کے سامنے ایک اور واقعہ پیش نہ آتا، وفات سے چند مہینے پہلے کی بات ہے، میں نے مولانا شبلی کا تذکرہ چھپڑا حضرت والارہ صوفیہ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے، فوراً سیدھے ہو بیٹھے

اور بھڑائی ہوئی آوازیں فرمایا: "مولانا کے احسانات کا شمار ہی کیا ہو سکتا ہے، میرے پاس جو کچھ ہے وہ انہی کار میں منت ہے۔" یہ دو جملے ابھی در بھری زبان سے ادا بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آنکھوں نے بھقت کی اور ہدیہ انک محسن کی یاد پر بچھاؤ کر دیے۔

احسان مندی کا یہی اثر اپنے شیخ عالی مرتبت کے ساتھ بھی دیکھنے میں آیا جس کا ذکر آئندہ آئے گا یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں نے تو صاف طور پر مشاہدہ کیا کہ علم و عرفان کی یہ دو نسبتیں ذاتِ سلیمانی میں یکساں مستحکم اور تادمِ آخر قائم رہیں، اور یہ حضرت والا کا کمال تھا کہ علم ہر مہوس نا کے نداندہ جام و سنداں باختن اڑے نادان میں وہ لوگ جو بہ زعم محبت کسی ایک ہی نسبت کو سیرتِ سلیمانی میں غالب دیکھنا یا دکھانا چاہتے ہیں، یہ اُن کی تمنا ہو تو ہو مگر حقیقتِ حال سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔

حضرت علامہ کی ایک سند حدیث تو وہی ہے جو اس وقت علامہ کی ایک سند حدیث | اکثر علمائے ہند کی ہے یعنی شاہ عبدالغنی محدث رحمۃ اللہ

علیہ کے واسطہ سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ سے ہو کر اوپر تک پہنچتی ہے اور معروف عام ہے، دوسری سند حدیث شیخ الاسلام مولانا الشیخ عبدالقادر توفیق الشبلی الطرابلسی الشامی ثم الدنی سے، ۱۰ محرم ۱۳۶۱ھ کو مدینہ طیبہ میں ماحصل کی تھی جو نہایت اعلیٰ ہے کہ بارہ واسطوں سے امام بخاری قدس سرہ تک مربوط ہے اور پندرہ واسطوں سے امام مسلم قدس سرہ تک پہنچتی ہے۔ ذیل میں دونوں سندیں تبرکاً درج ہیں:-

روایۃ صحیح البخاری

الشیخ عبدالقادر توفیق الدنی عن المصر عبد اللہ السکری الدمشقی
عن الوجیہ عبدالرحمن الکزبری الحفید عن المعمر صلّم الفلانی
عن المصر محمد بن سنہ عن المعمر احمد بن العجل الیمینی عن اللحر
مفتی حکمۃ قطب الدین محمد بن احمد النہروانی عن ابی الفتوح

لے سید سلمان عن ابراہیم بن محمد بن علی عن عبد الحمید بن محمد بن علی عن والدہ عبد الحکیم عن شاہ عبدالغنی الباج
الدنی (رحمہم اللہ اجمعین)

الطاودوسی عن المعمر بن یاسر^۹ عن النهری عن ابن شاذلیخت
الضاری الفرغانی بسماعه عن ابی لقمان یحییٰ بن عمار الختلافی
العمرائۃ والثلاثۃ وأربعین سنة وقد سمع جمیعۃ من محمد
بن یوسف الفریکی بسماعه عن مولفه الامام محمد بن اسبعلیل
البخاری (رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین)

فبین الخبر العلماء السید سلیمان الندوی نور اللہ مرقدہ و بین الامام
البخاری قدس سرہ اثنا عشر شیخا وهذا ف غایۃ العلو .

۱۹۷۰ آیتہ صحیح المسلسلہ

الشیخ عبدالقادر توفیق المدنی عن المعمر ابی النصر^۲ الخطیب عن
عبد اللہ القلی عن العارف عبدالعزیز النابلسی عن حسن العجیمی المکی
عن احمد بن العجل عن یحییٰ بن مکرم الطبری عن جدہ محب الدین
عن الزین المرغی عن احمد بن الحجار عن الانجب بن ابی
السعادات الحارثی عن مسعود بن حسین الثقفی عن الحافظ ابی
القاسم عبدالرحمن بن منذر عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبد اللہ
الجوزقی عن ابی الحسن مکی النیسابوری عن مولفه الامام مسلم الحجاج .
فبین الخبر العلماء السید سلیمان الندوی نور اللہ مرقدہ و بین
الامام مسلم قدس سرہ خمس عشر شیخا وهذا ایضا ف غایۃ العلو .

یہ اسناد مجھے حضرت مولانا محمد رفیع فرنگی محلی نے کراچی میں عطا فرمائیں جب وہ اپنے ترجمہ قرآن کی
طباعت کے سلسلے میں یہاں مقیم تھے اور فرمایا تھا کہ انہوں نے اور حضرت علامہ نے ایک ساتھ یہ سند حاصل
فرمائی تھی، مولانا فرنگی محلی سے میرا تعارف جولائی یا اگست ۱۹۶۱ء میں حضرت مولانا عبد الباقی ندوی کے
ذریعہ کھنویس کی قیامگاہ پہنچا تھا اور اسی وقت سے وہ بہت شفقت فرماتے لگے تھے، رحمۃ اللہ علیہ۔



باب دوم

شباب سے آغازِ پختہ عمری تک

۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۹ء

”شکوہِ سلیمانی“

تکمیلِ تعلیم سے چالیس برس کی عمر تک کا زمانہ حیاتِ سلیمانی کے سرتاسر علمی شغف، تحقیق، انہماک اور تصنیفی مصروفیت کا دور ہے گو درمیان درمیان میں اجتماعی کاموں میں بھی حصہ لینا پڑا، لیکن یہ محض اپنوں کے اصرار اور پاسِ مروت سے تھا در نہ مرکزِ توجہ کبھی بدلنے نہ پایا، چنانچہ جب ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کے اصرار پر وفدِ خلافت کے رکنِ خاص بن کر یورپ روانہ ہو رہے تھے تو ایک مکتوب میں اپنے عم محترم مولانا عبدالحکیم دینوی کو لکھتے ہیں:-

”ڈر ہے کہ میں پالیٹکس میرے علمی مشاغل کو تہ و بالا نہ کر دے۔“

اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کو اپنا متعینہ مقصد کس درجہ عزیز تھا اور اس سے کچھ دیر کے لئے دوری بھی نہیں بلکہ کم التفاتی کیسی شاق تھی، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں جہادِ علمی ہی کی خدمت حضرت والا کو عطا فرمائی تھی، چنانچہ اس محرکہ کے وہ شہسوار مکمل اور اس میدان میں اُن کو وہ نصرت اور غلبہ حاصل ہوا جو ہر زمانہ میں کسی کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔

یہ تو دیکھا جا چکا ہے کہ عطائے سند کے ساتھ ہی دفعۃً اہل علم کی ہزم نے محسوس کیا کہ ایک علم نواز آرہا ہے، یہ سلیمان عالی مقام کی آمد آمد کا چرچا تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملکِ سلیمانی کے حدود اتنے پھیلے اور ایسے پھیلے کہ نئی اور پرانی علمی دنیا سب زیرِ نگیں آگئی۔۔۔۔۔ یہ کوئی حسنِ عقیدت کی خوش تعبیری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو چکی، اب اس کو کوئی کیسے جھٹلائے؟ اس کی تفصیل گو ہمارے موضوعِ تالیف سے غیر متعلق ہے مگر احوالی تذکرہ ایسے ناگزیر ہے کہ آئندہ اس عزت و عظمت کے باطنی محرکات کو پیش کرنا ہے

اور یہ دکھانا ہے کہ اس علمی شہرت کے پیچھے یہاں اخلاص اور بے نفسی کی کیسی قوتیں کار فرما تھیں جو بڑے بڑے مجاہدات کے بعد بھی مشکل ہی سے عام طور پر میسر آتی ہیں چنانچہ دیکھتے چلتے کہ ۱۸۰۷ء برس کی قلیل مدت میں تحت سلطانی کن بلندیوں اور پہنائیوں کو عبور کرتا چلا گیا اور کس خدا واد دبیر اور شکرہ کے ساتھ۔ حج یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

الندوہ اور علمی شہرہ | ابھی فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہی تھے کہ الندوہ جیسے بلند پایہ خالص علمی ماہنامہ کے نائب مدیر (سب ایڈیٹر) بنا دیے گئے جس کی

”ادارت صحافت تو ہوائے نام ہی تھی، اصل میں یہ ایک شعبہ تصنیف و تالیف تھا اسی لئے ہما شاک ہمت ہی اس میں مقالہ نگاری کی نہیں پڑتی تھی“ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء کی مدت میں تین مرتبہ وقف وقفہ سے حضرت والا نے اس رسالہ کی ادارت سنبھالی اور اس شان سے کہ ان کے معاصر شہیر اور مدیر بے نظیر مولانا دریا بادی گواہ ہیں ”گزنگاہیں جس شوق اور بے تابی سے مولانا شبلیؒ کی تحریروں کی منظر پرستی تھیں اس سے کچھ کم اشتیاق حضرت سلیمان کے بھی علمی افادات کا نہیں رہتا تھا“۔ اور اس ڈھائی تین برس میں حضرت والا نے جدید و قدیم عقلی و نقلی علوم و فنون پر ایسے بلند پایہ مضامین لکھے کہ اس آغاز ہی میں جدید و قدیم دماغوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ صف علماء میں فروزید نظر آنے لگے، ذرا مضامین کی دقت پسندی اور گونا گونی ملاحظہ ہو، تفصیلاً نہیں صرف چند عنوانات کے ذریعہ :-

اشتراکیت اور اسلام، علم ہیئت اور مسلمان، اسلامی رصد خانے، مسئلہ ارتقا،
برناباس کی انجیل، مکرمات القرآن، طبقات ابن سعد کا تعارف، قیامت،
ایمان بالغیب وغیرہ۔

شاگردی اس علمی جامعیت سے خود علامہ شبلیؒ اس درجہ متاثر تھے کہ ۱۹۱۲ء کے اجلاس ندوۃ العلماء میں بر ملا فرما دیا :-

۲۰۱ دیکھو صدق جدید بابتہ ۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء سید سلیمان ایڈیٹر کی حیثیت سے ”از مولانا دریا بادی

”ندوہ نے کیا کیا کچھ نہیں کیا، صرف ایک سیلمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے۔“
 بلاشبہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے اور اس تخیل کی ایک جامع و مانع تعبیر جس کو
 لفظ ندوہ کی اصطلاح سے ادا کیا گیا تھا۔

ممتاز معلم | یہ کام ہو ہی رہا تھا کہ اور علامہ سید سلیمان ایک جامع العلوم صاحب قلم کی حیثیت
 سے مشہور ہوتے جا رہے تھے کہ عین اسی زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء (کھنؤ)
 میں علم کلام اور جدیر عربی کے ایک اعلیٰ استاد کی ضرورت پیش آئی اور مولانا شبلی نے یہ اہم مسند
 درس اپنے اسی جوان عمر بچتہ علم شاگرد کے سپرد فرمادی اور ان کا یہ انتخاب لاجواب ثابت
 ہوا، آناً فاناً حضرت علامہ کی تدریسی مہارت کا شہرہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل
 گیا اور تشنگانِ علم دور دور سے اس نازدہ چشمہ کی طرف لپکے، اور جنہوں نے اس مشرب سے
 پیا، سیراب ہو گئے۔

لے ملاحظہ ہو خطبہ شبلی اجلاس ندوۃ العلماء، ۱۹۱۲ء۔

لے محرمی مولانا محمد صابر صاحب حیدر آبادی (سابق پروفیسر عربی و شعبہ دینیات اورنگ آباد کالج) نے اپنے
 طالب علمی کے زمانے میں ملکہ کاظمہ ہندوستان کے چہ پیہ کی خاک چھانی ہے، مجھ سے ازراہ لطف فرماتے تھے کہ آپ
 کے شیخ دقتہ الشعلہ کا شہرہ تو خود مولانا شبلی ہی کی حیات میں اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ میں مولانا شبلی کے بجائے انہی کی
 خدمت میں حاضر ہوا اور منطق کی اونچی کتاب تسلیم پڑھانے کی درخواست کی مولانا (سید سلیمان ندوی) نے
 فرمایا کہ اگر آپ کا مقصود کتاب نہیں بلکہ فن منطق میں مہارت حاصل کرنا ہے تو اس کے بجائے فلاں کتاب
 (نام اب راقم پیمان کو یاد نہیں) پڑھ لیجئے دقت کم صرف ہوگا اور فن قابو میں آجائے گا۔

مولانا صابر فرماتے تھے کہ اس وقت میں نے اپنی تجویز پر اصرار کیا تو سید صاحب نے بھی پڑھانے سے
 انکار فرمادیا تو میں نے ایک اور جگہ وہ کتاب جا کر پڑھ لی، مگر جیب پورا فن پڑھ چکا اور اس میں کافی وقت
 ضائع کر چکا تو حضرت سید صاحب کی لائے عالی کی قدر محسوس ہوئی، اور ان کے مرتبہ علمی کا اندازہ ہوا اور
 اپنی نادانی پر ندامت ہوئی !!

لے مشہور استاد و فلسفہ مولانا عبد الباقی ندوی مدظلہ کا اعتراف بھی قابلِ شنید ہے جو ندوہ میں حضرت والد کے

یہ ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے جبکہ معلم حلیل کی عمر صرف ۲۵، ۲۴ برس کے قریب تھی، یہ سلسلہ تدریس کا دؤرِ اول تھا جو مختصر ہی رہا، مگر اسی دوران میں علامہ نے دروسِ الادب اور پھر بعد کو لغاتِ جدیدہ کے نام سے ایک عربی لغت تالیف فرمائی جو اہل علم میں مقبول ہوئی۔ اس کے چند برس بعد پھر کچھ عرصہ کے لئے ندوۃ میں تدریسی خدمت حضرت کے سپرد ہوئی مگر اس تعلق سے بہت کچھ بھی علامہ کا تدریسی شغل برابر جاری رہا اور اعلیٰ استعداد کے طلباء نے مختلف علم و فنون میں آپ سے ماہرانہ تعلیم حاصل کی، مثلاً تفسیر و علومِ قرآنی میں مولانا محمد اویس نگرانی (استاذ تفسیر ندوۃ العلماء) نے فلسفہ و کلام میں مولانا محمد ابو العرفان خان (استاذ معقولات ندوہ) نے اور عربی ادب و فلسفہ میں مولانا مسعود عالم مرحوم اور مولانا محمد ناظم ندوی (شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور) نے تاریخ و ادب میں مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی (مدیر معارف) نے!! ————— چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے۔

”۳۳ ستمبر ۱۹۳۳ء (جنوری ۱۹۳۳ء میں) دارالمصنفین بھی حاضری ہوئی تھی،
..... باضابطہ شاگردی کا موقع بھی نصیب ہوا، محمد ناظم صاحب .. اور

ہم زما ممتاز طالب علم تھے مگر فرق اتنا تھا کہ جب وہ درجہ اعلیٰ میں پہنچے تو حضرت والا استاذ مقرر ہو چکے تھے، اور اعلیٰ جماعتیں ہی آپ کے ذمہ تھیں۔ مولانا مظاہر نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ اور انکی علمی منزلت کا اظہار کس بلیغ انداز میں فرمایا ہے، لکھتے ہیں۔

”ندوہ میں صرف طالب علمانہ معیت و رفاقت ہی بلکہ جب استاذ مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی استاذ مرحوم و مفتور علامہ نعمانی کی مجاہد میں ساہا سال انکے پیچھے صفِ نعال میں شریک رہا مگر سید صاحب کے علم و فضل کا اتنا قائل تھا کہ اپنے شکوک و شبہات ان ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا۔ ایک مرتبہ جود قدر کے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ انہی کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہو گئی۔“

(مضمون سیرۃ السید سلیمان نمبر معارف)

ابواللیث صاحب بھی ساتھ تھے، ہم تینوں قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیتے، (سیلمان نمبر معارف)

انہی مولانا مسعود عالم کا یہ بھی بیان ہے کہ نامور شاگردوں کی جو تعداد اس دور میں حضرت علامہ کے حصّہ میں آئی ہے اور وہ ان کے معاصر مشاہیر علماء میں کسی کو... نصیب ہی نہیں ہوئی، ایک مضمون میں اپنے اس بیان کو انہوں نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے!

ضیاء بخش الہلال | حضرت والا علی مسند کو چھوڑنا پسند نہیں فرماتے تھے مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مجبوراً اس کو غیر باد کہنا پڑا۔ ۱۹۱۲ء میں ملکی سیاست میں اتحادِ اسلامی کا جوش اٹھا اور مولانا ابوالکلام نے جو کلکتہ سے ہفتہ وار ”الہلال“ نکال رہے تھے حضرت والا کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ مولانا شبلیؒ کے ایماء سے بالآخر حضرت والا کو کلکتہ پہنچنا پڑا۔ ”سید صاحب جب الہلال میں پہنچے تو ناگاہی اب بھی ہلاں ہی رہا لیکن اہل بعیرت دیکھ رہے تھے کہ ہلال بدر بن گیا ہے، اور اسی نور افشانی کلکتہ کے مطلع سے شروع ہو کر مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب کو مطلع انوار بنا رہی ہے، خود عربی کے قدیم و جدید دونوں طرح کے ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لئے دینی، تمدنی، سیاسی تاریخی ہر عنوان سے متعلق بہترین معلومات پیش کرنا، یہ کام تو سید صاحب کا تھا ہی، باقی خود ہندوستان کی سیاسیاتِ حاضرہ پر مقالہ لکھنے میں اپنے چیف ایڈیٹر (مولانا آزاد) سے پیچھے نہ رہے،“ البتہ الہلال پر نام چونکہ مولانا آزاد کا ہوتا تھا اس لئے بہت سوں کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ ”الہلال“ کس کی کرامت سے بدر کا مل بن گیا ہے، مگر جب ایک سال کی رفاقت کے بعد بعض وجوہ سے صاحب کرامت مستی بے تعلق ہو گئی تو جو بدر تھا وہ ہلال بھی نہ رہ سکا، محاق بننے لگا، مولانا آزاد گھر گئے ۹ جنوری ۱۹۱۵ء کو ایک طویل خط حضرت والا کی خدمت

میں تحریر فرمایا جس کا ایک اقتباس پیش ہے :-

”آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کر لی حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے، خدا کے لئے میسری سنیے میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طلبہ کو عربی فارسی سکھادی، آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھاسکتے ہیں۔

آپ اگر ”الہلال“ بالکل لے لیجئے اور جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے، صرف اپنے مضامین دیدیا کروں گا اور کچھ تعلق نہ ہوگا۔ آپ معاذیں استعفیٰ دیں اور کلکتہ چلے آئیں۔ (ابوالکلام کان اللہ!)

شکر ہے کہ حضرت والا کی حیات ہی میں (قیام بھوپال کے زمانہ میں) ”الہلال“ کے وہ مضامین جو سلیمانی قلم کی یادگار ہیں ”مضامین سید سلیمان“ کے نام سے شائع کئے گئے اور اس کی سعادت صورت بہار کے ایک قدر شناس کے حصہ میں آئی۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ سب وہ مضامین ہیں جن پر الہلال کی عظمت قائم تھی مثلاً

الحرمیت فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق قصص بنی اسرائیل اور شہد اکبر وغیرہ وغیرہ۔

الہلال کو دوداع کر کے حضرت والا پھر لکھنؤ علائقی شہر حرم جلیل القدر پروفیسر کے دفتر سیرت میں تشریف لائے لیکن قدرت نے یہاں سے

بھی بہت جلد یعنی ۱۹۱۳ء کے آخر میں بنی یونیورسٹی کے نامی گرامی وکن کالج پونہ میں

لے سید سلیمان ایڈیٹر کی حیثیت سے۔ از مولانا دریا بادی بکوالہ سابق

تہ دیکھو معارف دیکبر ۱۹۵۳ء

پہنچا دیا، اس کی تفصیل خود حضرت ہی کی زبانی سنئے۔

”انگریزی عہد میں کسی طلب و درخواست کے بغیر کسی سرکاری نوکری پانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا مگر میرے ساتھ یہ بھی ہوا میں انہی دنوں لکھنؤ میں مقیم تھا کہ مجھے بمبئی گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم کا سرکاری لفظ موصول ہوا کہ تم کو دکن کالج پونہ میں السنہ مشرقیہ کا اسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا میں سمجھا کہ میرے پتے پر غلط مراسلہ آگیا ہے کیونکہ میں نے تو اس کی درخواست بھی نہیں دی تھی، میں اسی جیسے جیسے میں تھا کہ اس مراسلہ کو کیا کروں کہ شام کی حاضری میں مولانا (شبلی) سے اس واقعہ کو بیان کیا، فرمایا کہ مراسلہ آگیا، اچھا ہوا۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب کو شکریہ کا خط لکھوا اور پونہ روانہ ہو جاؤ، میں نے کچھ معذرت کرنی چاہی، مگر ان کی خوشی اسی میں پائی اور شیخ صاحب کے پاس پونہ روانہ ہو گیا اور ڈھائی تین سال کے قریب ان کے ساتھ رہا۔

میں پونہ میں حضرت والدہ نے ایک یہودی عالم سے عبرانی زبان سیکھی اور س نیت سے یہ مشقت اٹھائی مگر عربی الفاظ کے عبرانی ماخذ پر عبور حاصل ہو جائے۔ اس اعتبار سے بھی صنفِ علما میں ان کی حیثیت انفرادی امتیاز رکھتی ہے۔

اسی دکن کالج کے دوران قیام حضرت والدہ نے اپنی مجتہدانہ تصنیف ارض القرآن کا آغاز کیا جو قرآنی نثر پرچم میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے اور جس کی وجہ سے متداول تفاسیر کی کئی تاریخی و جغرافیائی غلطیوں کا انزال ہوا۔ علمائے عصر نے اس کو ہاتھ لیا اور علمی دنیا غلام احسان سلیمانی کا برملا اعتراف کیا۔

۲۹۹
۵۰۰۔ ملاحظہ ہو مولانا غلامی کی مضمون مندرجہ سلیمان نیر معارف بعنوان تاریخ ارض القرآن نیز حواشی قرآن از مولانا شبیر احمد عثمانی میں بھی موقع بہ موقع اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ماہیہ نازیہ سیرت اسکا لہ

راقم آثم نے تو حضرت والاؒ سے ہی سنا ہے کہ اسی پروفیسری کے زمانہ میں مشہور فلسفی عمر خیامؒ پر لکھنے کا خیال پیدا ہوا اس لئے کہ یورپ نے خیامؒ کو نہایت غلط رنگ میں پیش کیا تھا اور اس کے فلسفہ کو بہت ہی مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ حضرت والاؒ نے اس موضوع کے مواد کی فراہمی اسی دور سے شروع فرمائی اور اولاً اس کو ایک مقالہ کی صورت میں دسمبر ۱۹۳۲ء کی اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں پیش کیا پھر بعد میں اس کو بڑھا کر "خیامؒ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع فرمایا، اس میں خیامؒ کے ان فلسفیانہ مقالات کی روشنی میں اس کی فارسی رباعیات کو سمجھایا گیا ہے جو اپنی گہرائی اور وقت پسندی کے علاوہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے عام فلاسفہ کے فہم سے بالاتر تھے اور جن کو نہ جاننے کی وجہ سے مشرق و مغرب کا ہر کس و ناکس خیامؒ کی من مانی تعبیر کر رہا تھا، چنانچہ جب یہ کتاب علمی افق پر نمودار ہوئی تو جہل سرنگوں ہو گیا مستشرقین یورپ نے جن کو اپنے سیرت پر بڑا ناز ہے تسلیم کر لیا کہ خیامؒ کی اس سے مستند اور صحیح تعبیر آج تک کسی نے نہیں پیش کی، خود ہمارے حکیم مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے حضرت والاؒ کو لکھا کہ:-

”عمر خیامؒ پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی شرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔“

بلاد اسلامیہ میں اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف بھیجے ان میں ایک تحفہ خیامؒ بھی تھا۔ کتاب کی اس مقبولیت کا سبب کیا تھا؟ اگر مصنف رحمۃ اللہ کی زبانی اس کے سبب معنوی کا پتہ نہ ملا ہوتا تو اس کا یقینی تعین دشوار تھا، لیکن خود مصنف باصفانے کراچی کے دوران قیام میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ:-

لے مکاتیب اقبال ص ۱۵۱

”میں نے تو یہ کتاب محض اس اظہار خیال کے لئے پیش کی تھی کہ اہل مغرب کو معلوم ہو کہ ان کو جس ریسرچ پر ناز ہے، مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا۔“

یعنی اس پیش کش سے مقصود ذاتی نام و نمود نہیں بلکہ طبقہ علماء کے وقاد کی بلندی تھی، تاکہ مسلمانوں سے فرضی مرغوبیت دور ہو جائے اور اختیار پر ان کی علمی دھاک بیٹھ جائے۔
ادب کے پردہ میں یہ دین اسلام کی بڑی خدمت تھی جس کی قدر دہی جان سکے، جس کو یہ شعور حاصل ہو کہ دودھ حاضر میں اسلام پر حملہ کس کس محاذ سے ہو رہا ہے؟

وَقَلِيلٌ مَّا يَشْعُرُونَ !

خیام کے علاوہ عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہان زانی، نقوش سلیمانی اور پکڑوں تاریخی، ادبی اور علمی مقالات جو سلیمانی قلم سے نکلے سب ریسرچ کی اعلیٰ یادگاریں اور اسلامی محاذ کے مستحکم مورچے ہیں۔

نومبر ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی نعمانی کا وقت آخر آ گیا۔ حضرت والا کو پونہ **سید الطائفہ** سے تار دے کر طلب کیا گیا اور وہ فوراً تشریف لے آئے، مسافر آخرت نے نہایت شفقت و محبت سے چھوڑے ہوئے کاموں خصوصاً سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کی فہیت شاگرد رشید کو فرمائی اور اس عہد کو مستحکم کر کے ۱۸ نومبر ۱۹۱۲ء کو کوچ فرمایا،

اب شبلی کی مسند خالی تھی، مگر کس کی مجال تھی کہ اس شہ نشین پر آنے کی جسارت کرتا، جلوس کا حقیقتاً اہل تھا بھی تو اس کے قلب و دماغ پر استاذ کی عظمت اور احترام مسند کا خیال سب سے زیادہ چھایا ہوا تھا بالآخر یہی ہوا کہ سب وابستگان شبلیؒ نے مل کر حضرت سلیمان ندوی کے سر پر استاذ حرم کی جانشینی کا تاج رکھا اور ”سید الطائفہ“ کا لقب عطا کر کے ان کی جلالت شان کا اعتراف کیا۔ یہ ۱۹۱۵ء کی روداد ہے، جب حضرت والا دکن کالج (پونہ) سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ پہنچ گئے تھے۔

”سید الطائف ثانی“ قدس سرہ جب اعظم گڑھ تشریف لائے تو نہ یہاں کچھ تھا، نہ خود ان کے ساتھ کوئی ظاہری سامان و اسباب آئے تھے۔ برس بھر پہلے مولانا شبلی نے دارالمصنفین کا ایک خاکہ ضرور تیار فرمایا تھا، لیکن یہ تو ایک تصور تھا جس کا خارج میں کوئی وجود نہ تھا، بلکہ اس کے آثار بھی پیدا نہ تھے، اس کو موجود کر دکھانا، ظاہر ہے کہ آسان کام نہ تھا، یہ تو حضرت ”سید الطائف“ کے اخلاص، ان کی بلند ہمتی اور توکلِ ایمانی کا کرشمہ تھا کہ دوچار رفقاء کو لے بیٹھے اور ان تھک کوشش اور بے مثل مالی و منزلی ایثار کے ساتھ دارالمصنفین کی بنا ڈالی۔ اپنے قلب و دماغ کی ساری صلاحیتیں اس میں لگا دیں اور چند برس میں اس کو اس قدر بلند و بالا کر دکھایا کہ ۱۹۲۲ء میں وہ علمی دنیا میں اپنی ہستی منوچا کھٹا اور پھر بعد کو جو مقام اس کو حاصل ہوا وہ بالکل منفرد تھا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں عالم اسلام کے موجودہ علمی اداروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ایک علمی اکیڈمی بھی دارالمصنفین کی ہمسر نہیں اور خود اسلافِ ہند کی گذشتہ تاریخ بھی اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔

اس عظیم الشان کارنامہ کی وجہ سے بانی دارالمصنفین کی عظمت سارے ممالک اسلامیہ میں مسلم ہو گئی، ان کی تصانیف کے ترجمے مشرقی اور مغربی زبانوں میں ہونے لگے، ان کو داخلِ نصاب کیا گیا، محققین نے ان سے استناد کا کام لیا، ملتِ اسلامیہ کو اس ذریعہ سے ایک شعور ملا، اور ہاں یہ بھی ہوا کہ جو لوگ ہر نعمت کو دنیا ہی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس ناہ سے دنیا بھی مل گئی، کسی نے مقالاتِ سلیمانی کا ترجمہ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں جرمنی اور انگلستان سے حاصل کیں۔ کسی نے اس

لے ملاحظہ ہوا ہمامہ ”چراغِ راہ“ کو اپنی بابت ماہ ۱۹۵۳ء۔

لے ایک صاحب تو ہمارے علم میں بھی ہیں جنہوں نے حضرت والا کے ایک تاریخی مقالہ کا نقطہ بلفظ جرمن زبان میں ترجمہ کر کے برٹن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر یا تو ضمیر کی چھین سے مجبور ہو کر یا

مقدس سر کو اپنی شہرت علمی کے لئے استعمال کیا اور واقعہً اس کو شہرت مل بھی گئی، مگر حقوق کی نگاہ میں سر بلندی کا خیال اور اس کے لئے یہ دوڑ دھوپ عقل کی کیسی گمراہی، ایمان کا ایسا ضعف اور انجام کا کتنا بڑا خسارہ ہے!

علامہ اقبال کی گرویدگی | مکاتیب اقبال جلد اول میں منظر اسلام علامہ اقبال مرحوم کے سرخطوطہ ہیں جو انہوں نے سید العلماء رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھے تھے۔ ان میں اقبال مرحوم نے مسئلہ زمان و مکان، ختم نبوت، حقیقت وحی، قرآن میں ناسخ و منسوخ اور اسلام میں خلیفہ کے اختیارات وغیرہ جیسے چوٹی کے فلسفیانہ اور متکلمانہ قرآنی اور فقہی مسائل میں استفادہ فرمایا ہے، اور اس بار بار کے اعتراضات کے ساتھ۔۔۔

افسوسہ کہ راز کے ڈر سے ہندوستان پہنچے ہی حضرت والا سے اس جسارت کی معافی چاہی حضرت والا نے یہی فرمایا کہ۔۔۔

”کچھ ہرج نہیں، میرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا اور آپ کا فائدہ ہو گیا“

یہ توضیح کہنے کو ایک دنیا دار انسان تھے، ایک دیندار کہلانے والے کی مثال بھی سنئے شہر حیدر آباد (دکن) کا، آنکھوں دیکھ حال ہے، حضرت والا کی رحمت عالم شائع ہوئی تو بریلی گروپ کے ایک عالم نے اس کی سرخیاں بل کر رحمت دو عالم از مولانا فلاں کے عنوان سے کتاب شائع کر دی اور اس جہالت پران کو نہ امدت بھی نہیں ہوئی۔ آخر اس کا قانونی تدارک کیا گیا۔

تہ مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک مرتبہ ملی سرتوں کا تذکرہ تھا مولانا فرماتے تھے۔۔۔

”بیچارہ نبی ز فتنہ خوری (تنہا اس میں بدنام ہے، حالانکہ چاروں بھی میں فلاں فلاں کتاب کو دیکھا اور میرۃ النبو کی پانچویں اور چھٹی جلدوں کے متعلقہ عنوانات سے اس کا مقابلہ کرو بخیر یہاں بیان کی تبدیلی کے ان میں اور کیا ہے؟ مگر کہیں کوئی حوالہ موجود نہیں، سارا بیان اپنی طرف منسوب کر دیا ہے! یہ ذکر ایک ایسے مشہور عالم کا تھا کہ اس کے ہم کے قلم میں خود اپنی زبان کو عادت ہے!“

”مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاد اعلیٰ ہیں۔ (مکاتیب اقبال ج ۸ ص ۸)
 ”علوم اسلام کی جوئے شیر کا فریاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی
 کے اور کون ہے“ (مکاتیب اقبال ج ۱۶ ص ۱۶)

یہ تو مرتبہ علمی کا اعتراف، عظمت کردار سے متعلق بھی اپنی عقیدت کا اظہار یوں
 فرمایا ہے۔

”آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے۔
 قلندر ان کہ براہ تو سخت می کو شنند ز شاہ یاج تانند و خرقہ می پوشند
 بجلوت اند و گندے بہر و مہ پیچند بخلوت اند و زمان و کاس و لا خوشند
 در یہ جہاں کہ جاں تو جلوه دادند ز فرق تا بقدم دیدہ دل و گو شنند
 برو ز بزم سراپا چو پرنیاں و حریر ایضاً ص ۱۲۹
 برو ز رزم خود آگاہ و تن فراموشند ص ۱۳۰

دیوبند و علی گڑھ کا اعتراف | حضرت دالاح کے تبحر علمی، ان کی وسعت فہم
 اور ان کی علمی دیانت و غیر جانب داری نے ان کو

دیوبندی مکتب خیال اور علی گڑھ اسکول میں یکساں افتخار و ادب و عزت و حظا فامانی بخشی چنانچہ
 ان کی ہمہ گیر شخصیت کے اعتراف میں دارالعلوم دیوبند نے ان کی خدمت میں نوبس سرکاری
 کی رکنیت پیش کی اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو اپنی سینٹ کا ممبر بنانے میں عزت محسوس
 کی اور پاکستان آنے تک وہ ان دونوں اداروں کے مشیر و معاون رہے۔

اس کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کر کے حضرت
 دالاح کی عظمت علمی کا اعتراف کیا۔ ادھر علمائے دیوبند کے سرخیل حضرت سیدہ امیر شاہ گنجی
 نور اللہ مرقدہ نے بعض مجلسوں میں حضرت دالاح کے تحقیقی کمال کی تحسین کے علاوہ اپنی صلیف
 عقیدۃ الاسلام میں سات یا آٹھ جگہ اس انداز توصیف کے ساتھ ارض القرآن کے حوالے

درج فرمائے ہیں کہ ”صاحب ارض القرآن نے اس مقام پر تحقیق ختم فرمادی ہے۔“
 اس طرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی اپنے شاہکار تفسیری حواشی میں ...
 ارض القرآن سے استناد کیا ہے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی اپنی خود نوشت مختصر
 سوانح حیات ”انوار النظمی آثار النظمی“ میں تجرہ کے زیر عنوان حضرت والارہ کی عظمت کا
 اعتراف یوں فرمایا ہے :-

”اساتذہ کرام جن سے سند حدیث حاصل کی ہے ان سے ہی زیادہ متاثر ہوا
 ہوں، ان کے علاوہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے بھی متاثر ہوا ہوں
 مولانا سید سلیمان ندوی علم تاریخ اور عربی ادب کے ماہر تھے میں
 اکثر اپنے اشعار عربیہ ان کے ملاحظہ کے لئے بھیجتا تھا“ (ص ۹)

اجتماعیات میں سربلندی | عرض کیا جا چکا کہ اجتماعات جس کی سب سے زیادہ
 جاذب توجہ صورت آج سیاسیات ہے اس سے
 حضرت والارہ کو علی طور پر کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر ایک مورخ اور مفکر اسلام ہونے کی حیثیت
 میں سے نطق سلیمانی کا ایک ایک جملہ اصابت رائے اور دور بینی و مآل اندیشی کا معیار ہوتا تھا
 اپنوں اور پراپوں میں سے جس کسی نے حضرت والارہ کو اس نگاہ سے دیکھا، ان کی فراست
 کے معترف ہو گئے، گاندھی جی جیسے شاہرہ سیاست نے حضرت والارہ کے متعلق یہ کہا کہ ”یہ بڑا
 چاتر مولوی ہے۔“

۱۰ یہ قلمی حواشی بطور خاص اپنی شفقت و محبت سے مجھ کو علامہ کشمیری کے جانشین محدث حلیل مولانا حمید روسف
 بنوری مظانے دکھلائے۔ ان کے پاس عقیدۃ الاسلام کا جو نسخہ ہے، اس پر حضرت مولانا کشمیریؒ کے قلم سے
 عربی زبان میں یہ حواشی تحریر فرمودہ ہیں۔ رہا یہ کہ مطبوعہ نسخہ میں یہ حاشیے کیوں حذف کر دیے گئے؟
 ظہ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

۱۱ یہ بات ماقم نے خود حضرت والارہ کی زبان سے بھی سنی اور جاننے والوں سے بھی یہی سن چکا تھا۔

اسی لئے مسلمان اہل سیاست نے بار بار حضرت والار کو اپنی طرف کھینچا مگر بقول خود حضرت
ہی کے :-

”میں نے کبھی اس خرقة سے آلود کو از خود نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا اور
کبھی شوکت علی نے اور جب کسی نے پہنا یا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا۔

حافظ خود نہ پوشیدہ این خرقة سے آلود

لیے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اور س گریزی و جہی خود ہی ایہ ارشاد فرماتے تھے کہ

”ڈپلومیسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس

کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانتدار

مانا جائے، اور ہر اس مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانت دار سمجھا جائے

اور پھر اگر اس کی بددیانتی ثابت ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کیا جائے۔“

اسی کی مشرب کی وجہ سے وہ علمی سیاست سے کنارہ کش تھے اور زیادہ سے زیادہ

مشورہ اور رائے کی حرکت وہ تعاون فرما لیتے تھے، اپنے مسلک کے متعلق ایک مرتبہ مزاحاً

فرمایا کہ :-

بھئی مجھے جمہور پر کیٹس تو آتی ہے پبلک پر کیٹس نہیں آتی۔

حضرت والار کے اس تمام مسلک و مشرب اور اپنی طرف سے پورے اجتماعاتی تحریز کے

باوجود حق تعالیٰ نے اجتماعی امور میں بھی وہ سر بلندی عطا فرمائی جو ان کے معاصر علماء میں کسی کو

نہ مل سکی، اس دعوے کے ثبوت میں صرف چند واقعات کی اشاراتی تفصیل پیش ہے :-

۱) حضرت والار نے ۱۹۱۷ء میں اجلاس مجلس علمائے بنگالہ (منعقدہ کلکتہ) کی صدارت

فرمائی اور باوجود حکومت کے جبر و تشدد کے ایک ایسا جرات آموز خطبہ عطا فرمایا کہ لوگوں

کے ذہن سے انگریز کی رعب و ہمت اٹھ گئی،

(۲) فروری ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالباقی فرنگی علی وغیرہ کے اصرار پر وفد خلافت میں علمائے ہند کے تہاننا مندے کی حیثیت سے یورپ تشریف لے گئے اور نمائندگی کا حق ادا فرمایا۔ عرب و دہرہ کا یہ عالم تھا کہ سرلانڈ جارج جیسے مسکتر وزیر انگلستان نے جب ڈنر پر مدعو کیا تو جو رقعے چھپے تھے اس پر یہ پرچی بھی چسپاں تھی کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی شرکت کی وجہ سے ڈنر میں شراب اور سور کا گوشت نہیں پیش کیا جائے گا۔

(۳) ۱۹۲۳ء میں صوبہ بہار میں خلافت کانفرنس کی صدارت فرمائی۔

(۴) ۱۹۲۴ء میں ابن سعود اور شریف حسین کی جنگ چھڑی اور دونوں نے مجلس خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس وقت مسلمانان ہند نے حضرت والارہی کی قیادت میں ایک وفد حجاز بھیجا تاکہ دونوں میں مصالحت ہو جائے، حضرت والارہی نے دوما قحک تحریر دے لندن سے ایک مکتوب میں حضرت والا اپنے عزیز دوست مولانا دریا بادی مظاہ کو بے تکلفانہ پیار میں تحریر فرماتے ہیں۔

..... آپ محمد علی صاحب کی تمام لندن تقریروں کو پسند کرتے ہیں، یہ کیا بوجھ ہے؟ اختلاف مقاصد کے ساتھ یہ اتحاد مذاق! مگر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف آپ بلکہ یہاں کے معتبر انگریز تک ان کا لوہا مانتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ خاکسار بھی اپنے درجہ میں نیچا نہیں، سعدی شازا غلول مع وفد مصری نوری سعید پاشا مع وفد شامی و مصری و دیگر اہل تونس میری عربی دان کا بھی لوہا مان گئے، (اما بنعمۃ ربک) حضرت میری عربی گفتگو پر ان کو تعجب ہوا، فرمایا کہ تم ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہو۔ ولا فخر۔ دوگ چتے تھے کہ عربی تقریر تحریر پر تمہاری محنت ضائع ہوئی لیکن یہی چھوڑنے کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ انگریزی کے بعد اسی نے بڑے وقتوں میں کام دیا۔..... (برید فرنگ)

(نوٹ) حضرت والا کی تفصیلی مساعی اور وفد خلافت کی کامیابی میں ان کی موثر خدمات کے لئے برید فرنگ کا مطالعہ ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس موقع پر حضرت والارہی کو لکھا تھا "ما اجبت مع الخیر مبارک، آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں عطا ہو گا۔ مکاتیب اقبال ص ۱۱۱

تقریر کے ذریعہ اس کی کوشش کی مگر نتیجہ خیز نہ ہو سکی تو پھر مصر کا رخ فرمایا اور وہاں کے اکابر
علماء کے سامنے اپنی تجاویز کھیں، شیخ آزہر نے ان تجاویز سے اتفاق فرمایا اور یہ ایسی کامیابی
تھی کہ عالم اسلام کے تمام اخباروں نے اس خبر کو نمایاں کر کے شائع کیا۔

(۵) مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیتہ العلماء کا جو اہم اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا، اس کی صدارت
کا شرف و امتیاز بھی حضرت دالاج ہی نے پایا، جب کہ اس کے شرکاء میں استاذ العلماء مولانا
محمد انور شاہ کشمیری بھی موجود تھے، اس اجلاس میں حضرت دالاج نے وہ خطبہ صدارت پڑھا، جو
مسلمانوں کی سیاست میں یادگار سمجھا جاتا ہے۔

(۶) ۱۹۲۶ء ہی میں سلطان ابن سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں ایک موثر عالم اسلامی
طلب کی، ترکی، افغانستان، مصر اور یمن سب ہی نے اس میں شرکت کی، ہندوستان کی
طرف سے جو وفد گیا اس کے رئیس حضرت دالاج ہی تھے اور راکین میں مولانا محمد علی اور مولانا
شوکت علی وغیرہ مکہ معظمہ پہنچ کر مالک اسلامی کے سامنے نمائندوں نے متفقہ طور پر حضرت دالاج اور
مفتی اعظم فلسطین کو نائبین صدر منتخب کیا اور بقول مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم "شریف
شرف عدنان" تو اپنی خاندانی سیادت و وجاہت کی بنا پر صدر مقرر منتخب ہوئے تھے لیکن
نائبین صدر کا انتخاب صلاحیت و ہر دلعزیزی کی بنا پر ہوا تھا۔

(۷) اسی سال خلافت کیٹی کے اجلاس خصوصی منعقدہ دہلی کی صدارت فرمائی۔

(۸) ۱۹۲۶ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر "عہد رسالت میں اشاعت اسلام"
کے عنوان پر تقریر فرمائی، اس اجلاس میں اور بابا ب علم کے علاوہ ڈاکٹر اقبال مرحوم بھی شریک
تھے اور مصروف ہو کر اٹھے۔

(۹) ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء میں ساردا ایکٹ (نابالغوں کی شادی پر امتناع) کے سلسلے میں مسلمانوں
میں سخت بیچان پیدا ہوا اور انہوں نے اس کی مخالفت بھی کی، لیکن بعض قانون دان

مسلمانوں نے فقہ اسلامی میں تحریف کر کے اس قانون کی حمایت کی کوشش کی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نابالغی میں نکاح کی بھی تردید کر دی، اس موقع پر حضرت والارح نے معارف میں نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر پر ایک محققانہ مضمون لکھا اور اس انداز سے پیش فرمایا کہ باطل سزنگوں ہو گیا۔ حضرت والارح نے اعلان فرمایا کہ نابالغوں کا نکاح تو شرعاً جائز ہے مگر ہر حال میں مستحسن نہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جتادیا کہ کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے قانون میں درست اندازی کا حق نہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت والارح کو اس اعلان کی اولیت کا شرف حاصل ہے کہ سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیش نظر جو معاملات ہیں ان میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آئینہ صومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علیحدہ انتظام ہونا چاہیے اور اس کے لئے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے۔ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کا انقلاب کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھ کو یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہیں کی گئی تو مسلمانوں کی متنازعیت اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی۔

غرض اجتماعی خدمات اور حضرت والارح کی اجتماعی عزت و منزلت کی داستان تو بہت طویل ہے اور زندگی کے ساتھ ترقی کرتی چلی گئی ہے مگر چونکہ ان چند واقعات سے ہمارا مدعا پوری طرح ثابت ہے اور جس دور سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے وہ بھی یہاں ختم ہو رہا ہے اس لئے قلم کو یہاں رک جانا چاہیے، اب ہم اس دور کے معنوی مشاہدے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہماری نگاہ کا مقصود اصلی ہے!

تشکوہ سلطانی کے ذریعہ جو معلومات بلا کسی حوالہ کے فراہم کر دی گئی ہیں وہ سب محترم سید صباح الدین

صاحب انب مدیر معارف کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو سلیمان نمبر میں چھپا ہے!

اس دور کے معنوی امتیازات اور مبنی احوال

اخلاص نیت | تاریخ تو مولانا شبلیؒ کے دسترخوان کی چٹنی تھی۔ یہ جملہ نطق سلیمانی کی شگفتگی اور بلاغت کی یادگار بن کر حافظہ پر نقش ہو چکا ہے، اس کی تفصیل "حیات شبلی" کے دیباچہ میں ملے گی، اس کا حال خود حضرت والدہ کے الفاظ میں یہ ہے :-

"ایک دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے۔ ایسے ہو شمنہ زلفوں کے لئے ساری دنیائے اسلام میں جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنہوں نے انہی کے طریقے سے انہی کے اسلوب پر جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرخ بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی؟"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ شبلیؒ کی نیت اسلام اور اس کے علوم کا احیاء ہی تھا اور یہی غذا انہوں نے مسلمان ذہنوں کے لئے تیار کی، لیکن اس کو قابل قبول بنانے کے لئے تاریخی اسلوب اختیار فرمایا جو عین مقتضائے حکمت تھا، یہی حسن نیت جان نشین شبلیؒ کو بھی استاذ عالی مقام سے ورثہ میں ملا۔ اور یوں بھی اسلام کی سر بلندی اور اس کا اظہار حضرت ﷺ

نی رنگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا، فرماتے تھے، اڑکپن میں بعض عیسائیوں سے دو ایک مناظرے اسی جوش میں کئے تھے، لیکن جوں جوں ہوش سنوڑنا اگیں مناظروں سے طبیعت مٹتی گئی اور طریق شبلی کو اپنا مسلک بنا لیا، چنانچہ عیسائیوں کے اس جواب میں کہ ”مسلمانوں کا خدا تو بڑا بجا بروقاہر ہے“ ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام ہی ”بشری“ رکھا یہ حضرت والارہ کے ابتدائی رسائل میں سے ہے لیکن اس کا حسن استدلال، اس کی اثر آفرینی اور خود مصنف کے سوز و درد کی چاشنی اس میں ایسی مل گئی ہے کہ یہ آخری دور کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

ان مضامین، رسائل اور کتابوں کے علاوہ جو حضرت مصنف نے قرآنی یا حدیثی عنوانات کے تحت تحریر فرمائے خود ان مضامین اور تصنیفات میں بھی جب بظاہر ٹھیکہ تاریخی اور جغرافیائی موضوعات پر مرتب کئے گئے ان کی نیت ہمیشہ یہی رہی کہ اس ذریعہ سے مسلمان قرآن اور اسلام سے روشناس ہو جائیں حضرت والارہ کو خود اقم نے یہ فرماتے سنا ہے کہ میں نے جب بھی قلم اٹھایا ہے تو میرا اصل مدعا مسلمانوں کو اسلام اور قرآن پاک سے قریب تر کرنا رہا ہے اس کے لئے عنوانات البتہ مختلف اختیار کئے، تاریخی بھی، جغرافیائی بھی اور سوانح و سیر کے بھی، اور بحمد اللہ یہ طریقہ تجربہ میں نہایت مفید و موثر ثابت ہوا۔ چنانچہ عربوں کی جہاز رانی اور عرب و ہند کے تعلقات کا اگر کوئی شخص مطالعہ کرے تو اندازہ ہوگا کہ وہ پڑھنے تو بیٹھا تھا تا رنج و جغرافیہ مگر جب پڑھ چکا تو قرآن سے متعارف ہو چکا تھا اور قرآن ہی کی کشش اس میں پیدا ہو چکی تھی۔

دورِ حاضر میں خدمتِ اسلام کے اسی حکیمانہ طرز اور اسی اخلاص نیت کا یہ اثر تھا کہ تو تعلیم یافتہ حضرات حضرت علامہ قدس سرہ سے انس محسوس کرنے لگے تھے اور ان

لہ یہ روایت بالمتن سے پورے الفاظ مجھے یاد نہیں، البتہ معنی بالکل مستحضر ہیں۔

سے قریب ہو کر اسلامی جذبہ اور محبت میں ترقی پاتے تھے، خود حضرت والاؒ فرمایا کرتے تھے کہ۔

”بھئی مجھ سے نو تعلیم یافتہ اصحاب جو وحشت محسوس نہیں کرتے اور محبت سے ملتے ہیں اس کی وجہ خدا نخواستہ یہ تو نہیں کہ میں ان کی مرضی کی باتیں کرتا ہوں بلکہ صرف یہ ہے کہ سچی بات کو ان کی زبان اور محاورہ میں سمجھا دیتا ہوں جس سے ان کو اجنبیت نہیں محسوس ہوتی۔“

غرض نیت کی یہ درستی اور اس کا یہ اخلاص تھا جو جانشین شہلی کی علمی و عملی جدوجہد کا اول سے آخر تک محرک بنا رہا، پھر تعجب کیلئے کہ قدم قدم پر خیر و برکت اسکا استقبال کرتی رہی، سلیمانی قلم کی ہر نگارش مقبول خاص و عام ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ اقلیمِ علم پر سلیمانی سطوت قائم ہو گئی۔

پاکی مشرب | حسن نیت کے بعد دوسری اہم چیز مشرب و مسلک کی پاکی ہے، جہاں ذوق میں نکھار نہیں وہاں حسن نیت کا نمود بھی بد نما ہی دکھائی دیتا ہے۔ _____ لعن طعن، سب و شتم، ادب ایراد و اعتراض ہمیشہ بذوق ہی کا تو نتیجہ نہیں ہوا کرتا، بلکہ اکثر نیک نیتی کے باوجود اختلاف نظر کا تقاضا نازیباائی پر مجبور کر رہتا ہے اور دراصل اس میں ذوق و مشرب ہی کا عیب چھپا ہوتا ہے۔

ہمارے حضرت والاؒ کا امتیازیہ ہے کہ ان کے یہاں حسن نیت اور پاکی مشرب کا بے نظیر امتزاج موجود ہے وہ حمیت دین میں سب سے پیش پیش ہیں، مگر مزاج کی نرمی اور خدا ترسی ہر مرحلہ اختلاف میں ان کو غلاف و جدال سے باز رکھتی ہے، وہ باطل کے پرچے اڑھاتے ہیں مگر کوئی طبقہ یا فرد ان کا نشانِ ملامت نہیں بنتا بلکہ اس نوعیت کے اشارے کنایہ سے بھی وہ پوری طرح احتراز فرماتے ہیں، ان کے اس کمال پر ان کی ہر تصنیف گواہ رہے گی، مثال کے لئے سیرۃ النبیؐ کی ضخیم جلدات ہی کو

دیکھ لیا جائے خصوصاً جو بھی اور پانچویں جلد جس میں مصنف عالی مقامؒ نے منصب نبوت، اور عقائد و عبادات کی تشریح فرمائی ہے، یہاں ان کو کتنی گمراہیوں اور فتنوں کا قلع قمع کر کے صراطِ مستقیم کی توجیہ کرنی پڑی ہے، مگر کمال اس کو کہتے ہیں کہ کہیں کسی گروہ یا فرد کا نام لے کر اس کی مذمت نہیں ملتی، اپنے اس جرم و احتیاط اور صفائیِ مشرب کی طرف اشارہ خود انہی مجلدات کے دیباچوں میں فرما بھی دیا ہے، چنانچہ جلد چہارم کے دیباچہ کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

”کوشش کی ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر (سلام علیہ السلام) کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے، قرآنِ پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اس کے پرتو میں احادیثِ صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، تاکہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو جائے۔۔۔۔۔ ان تکمیلی مباحث میں یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے۔ اس لئے اس خارزار سے کبھی آبلہ پا کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کر لوں، چلنے والا تو تھک کر چور ہے، اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی؟“

اہل نظر نے دیکھا کہ چلنے والا شرط رہروی میں بدرجہ اتم پورا اُترا اور منزلِ مراد

کو جا پہنچا ہلے

لے مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مدیرِ برہان کی تصدیق ملاحظہ ہو جو تحسینِ حق شناس کی ایک مثال ہے۔

لکھتے ہیں:-

”مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سیلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا

حضرت والارہ نے یہ مسلک سوچ کچھ کراختیار فرمایا تھا اور اس کو نہایت درجہ محبوب رکھتے تھے اور اپنے حلقہ بگوشوں کو اسی مشرب عالی سے سیراب کرنا چاہتے تھے، چنانچہ راقم پھر ان کو بھی اس کے اتباع کی تلقین فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس اتباع کے کسی فائدے میں مثلاً:-

- (۱) اس سے منفعت زیادہ عام ہو جاتی ہے (۲) فریق مخالف کے لئے بھی قبول حق آسان ہو جاتا ہے (۳) گمراہی یا فتنہ کی اہمیت بڑھنے نہیں پاتی (۴) نفسانیت کی آمیزش سے اپنی زبان اور اپنا قلم محفوظ رہتا ہے اور کلام میں تاثیر بڑھ جاتی ہے (۵) کسی فرد سے نہ امت اٹھائی نہیں پڑتی۔

واللہ کہ یہ مسلک سلیمانی تمام تر حق اور سراسر موجب خیر و برکت ہے مگر اس پر قدم اُسی کے جم سکتے ہیں جس کے جذبات عقل کے قابو میں ہوں اور خود عقل شریعت کی فرمانبردار ہو۔ ورنہ علماء اور تعلیم یافتہ حضرات بھی جب کسی سے کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں تو ان کی زبان اور ان کا قلم شخصی حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا چنانچہ حضرت والارہ کے خلاف نوگوں نے یہی کیا، مگر اس کا نتیجہ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہی دیکھا کہ رفتہ رفتہ حضرت والارہ سے معذرت خواہ ہونے والوں اور اظہارِ ندامت کرنے والوں کی ایک فہرست بن گئی جس میں علمائے عصر بھی ہیں اور نو تعلیم یافتہ بھی، صاحب ارشاد بھی ہیں اور اہل سیاست بھی، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کا احسان ہے کہ خود حضرت والارہ کو بھی اس صورتِ حال سے

شاگرد مل گیا جو مدتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ روی اور علم و فضل میں استاذ کا صحیح جانشین اور ساتھی اپنے اندر ایسی بہت سی خوبیاں اور گولائت رکھتا تھا جو اس کا اپنا حصہ تھیں۔ اس کا قلم بجائے گم مزاج ہونے کے نرم اور سبک خرام تھا جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادہ احتیاط و اعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا۔ اس کی طبیعت میں قنات و بنجیدگی اور حلم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کے خادم گوہر نشان کی پیشانی پر کبھی بھی ہتھیلا ہٹ اور غیظ و غضب کے تصور ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ (سیلمان نمبر معارف)

اسی طرح کی تصدیق حضرت والار کے ایک اور دیرینہ رفیق مولانا عبد الباقی ندوی کی زبانی بھی سنیے جن کی نظر طالب علمانہ دور سے لے کر حضرت والاک عارفانہ منزلت تک سیرت سلیمانی کا آذادہ مشاہدہ کرتی رہی ہے مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

”سید صاحب بطنی سیدی نہیں ماشاء اللہ بڑے بطنی سعید تھے۔۔۔۔۔
 مرحوم معصوم نہ تھے، لیکن ان کی زندگی کا جو رخ طالب علمی سے لے کر آخر
 تک کم و بیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ
 خود دانی و خود پسندی دور دور نظر نہیں آتی“ لے

یہی خود دانی و خود پسندی تو اباب بھیرت کے نزدیک اہم الامراض ہے جس کے علاج
 معالجہ میں مدتوں کی سعی و کوشش کے بعد بھی شفا نہ ملنے کی یقین خطرناک سمجھا جاتا ہے اور
 یہاں خلق سلیمانی میں سرے سے اس کا کوئی جزو نہ نہیں ملتا، اور اس پر حیرت کیوں ہو،
 جب کہ اِنَّ النَّفْسَ لَا تَاْذَنُ بِالْاَسْوْءِ كَلِيْهِ كَتَحْتَ اِلَّا مَا رَجَعَتْ بِیْ كَاَسْتَشْأُرُ
 خود قرآن کریم میں موجود ہے۔

خیر یہ تو حضرت والار کے احباب کی شہادتیں ہیں جن میں سے ایک بزرگ تو
 ندوی ہیں اور دوسرے بھی فکر و نظر اور تعلق خاطر کے اعتبار سے غیر ندوی نہیں سمجھے جاسکتے
 لیکن اگر مطالبہ مصدقوں اور شاہدوں کے تنوع کا ہو تو دیوبندی، جامعہ، علی گڑھ، بلکہ
 دینی اور غیر دینی افراد کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جو خلق سلیمانی کی تعریف و توصیف
 میں یک زبان نکلیں گے مگر طول بیان سے بچنے کے لئے اب یہاں صرف ایک دو غیر
 جانبدارانہ قدروں کی شہادت پیش کی جاتی ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری نے راقم عاجز کو بتایا
 کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری سید صاحب کے علم کا ایک واقعہ بڑی عظمت سے سنایا
 کرتے تھے وہ یہ تھا کہ جمعیت علمائے ہند کا کلکتہ والا اجلاس (۱۹۱۷ء) جس کی صدارت
 حضرت والار ہی نے کی تھی، اس میں قیام علامہ کشمیری اور حضرت والاک ایک ہی جگہ تھا،

راست کے سبکے علامہ شمیری جاگ اٹھے تو دیکھا کہ حضرت والا ٹھہل رہے ہیں، وجہ پوچھی تو بلا کسی ناگواری کے جواب یہ ملا کہ چارپائی میں کھٹمل بہت ہیں سویا نہیں جانا، علامہ شمیری فرمایا کرتے تھے کہ کوئی آدمی ہوتا تو گلہ شکوہ کا دفتر کھولتا، ہنگامہ مچاتا مگر سید صاحب نے یہ تکلیف برداشت کر لی، اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی، نرا کت طبع کے ساتھ یہ تحمل نادر ہے!

دیکھئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی (مدیر برہان، دہلی) جو ایم اے بھی ہیں اور فاضل دیوبند بھی، کس بائیکاٹ سے سیرت سلیمانی کا جائزہ لیتے چلے گئے ہیں اور اس کے ہر پہلو کے معترف ہو ہو گئے ہیں، ان کے ایک طویل مضمون کا صرف ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔

”مولانا شبلیؒ کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا جو وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق، دقتِ رسی اور علمِ فن میں استاد کا صحیح جانشین تھا اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا جو اسی کا اپنا حصہ تھیں، ... تشرع تدین بلکہ نقشب اس کے قبائے علمی کا نگارہ زمین تھا جس کے باعث کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود جماعت علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی، ... ان خداداد اوصاف و کمالات کے باعث وہ جس محفل میں بیٹھا، صدرِ ہزم ہو کر رہا جس انجمن میں بھی شرکت کی شمع انجمن کہلایا۔“

ایسے تین ایک اقتباس مختصر مگر نہایت موثر اور بلیغ انداز میں اردو کے مشہور صاحبِ طرائف، پرداز رشید احمد صدیقی، پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی کے قلم سے پڑھیں۔ دیکھتے ہیں سید صاحب کو کوئی شتعل نہیں کر سکتا تھا، وہ کسی حال میں بھی برہم یا

بے اختیار نہیں ہوتے تھے۔۔۔ شکل و صورت، وضع قطع، چال ڈھال ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دلاویز اور قابلِ احترام تھی، ان کو دیکھ کر ادباً کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے سوائے کریں گے اور جب تک ساتھ میں گئے زندگی میں بڑائی اور صلاح و محسوس ہوگی۔“

آخری جملہ میں کس اعلیٰ خلق کی ترجمانی کی ہے۔ یہ حسنِ اخلاق اور رفعتِ کردار کتنے زاہدانِ شب بیدار میں مل سکے گا۔ لاکھ اہتمام نہ ہر سہی پر جب تک غلظتِ قلب دور نہیں ہوتی شفقت و رافت سے دل مملو نہیں ہو جاتا، نیکی و سعادت کیسے عام ہو جائے گی؟ یہ اللہ کی دین ہے کہ قلب سلیمانی لینت، مروت اور گہرائی کے اوصاف عالیہ سے اس وقت بھی مزین تھا جب کہ وہ ابھی اہل دل کے زمرہ میں متعارف نہ تھے!!

حُبِ نبوی حضرت والاؒ نے اپنے استادِ خاص مولانا شبلیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم ترین احسانات کا شمار کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ اس منتِ پذیری کا اظہار فرمایا ہے کہ:-

”انھوں نے اپنی زندگی اور زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت اس کو سرورِ کائنات، فخرِ موجوداتِ رحمتِ عالم، سیدِ اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اول پہنچایا، یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے مطالعہ، جمع و تنقید و تالیف و تحقیق کی خدمتِ ابتداء ہی میں سپرد فرمائی جو بحمد اللہ یہاں اس کے لئے سعادت کا ذریعہ اور وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی۔“ (حیاتِ شبلیؒ ص ۱۱۱)۔

چنانچہ دارالمصنفین کے قیام کی پوری مدت میں مرکزِ توجہ یہی سیرۃ النبیؐ بنی رہی، ترتیب

سوانح کا کام تو مولانا شبلی بڑی حد تک کر گئے تھے لیکن جو کام دراصل کرنا تھا وہ تو حضرت والا ہی کو کرنا پڑا یعنی ”کان خلقنا القرآن“ کے تحت حیاتِ طیبہ کے ہر پہلو کو قرآن کی تفسیر ثابت کر دکھانا، اس کے لئے برسہا برس حضرت والا شب و روز قرآن و حدیث میں غرق رہے، اپنی قرآنی، حدیثی اور فقہی، متکلمانہ اور فلسفیانہ ساری صلاحیتیں اس کام کے لئے وقف فرمادیں اور تائیدِ الہی کے ساتھ ایسی سیرۃ النبیؐ تیار فرمادی جس کی نظیر سیرت کے سارے عظیم انسان لڑ پھر میں نہیں ملتی، بقول مولانا گیلانی کے نام ”سیرت النبیؐ“ ہے ورنہ دراصل یہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (یعنی اسلام کا دائرۃ المعارف) ہے۔“

اس سارے وقت کو جو محبوبِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک کے ایک ایک نقش کی تلاش و جستجو میں گزرا اس منہ سے کہا جائے کہ ارتقائے روحانی میں معاون نہیں رہا؟ حضراتِ صوفیاء کا تو اتفاق علیہ قول ہے کہ ایک عالم کے لئے حدیث شریف کا شغل سارے اشغال سے زیادہ نفع بخش اور صحبتِ رسولؐ کا قائم مقام ہے، پھر اس طویل شغل نہیں بلکہ شغف اور انہماک کو جو بختِ سلیمانی کے لئے مقدر ہو چکا تھا، کیسے باور کیا جائے کہ صفائے باطن اور کمالِ قربِ نبویؐ میں موثر نہیں رہا، یقیناً رہا، یہ بات اور ہے کہ اس انہماک کی وجہ سے کبھی اپنی حالت پر نظر نہ گئی ہو اور خود حضرت والاؒ کو اس کا اعتبار نہ رہا ہو، چنانچہ آگے چل کر ایک مکتوبِ سلیمانی میں یہ جملہ بھی ملے گا کہ:

”برہمِ باطل کا جس نے مدتوں کے لئے اس راہ (روحانی) سے ہٹا دیا۔“

یعنی جس تخم کی کاشت شاہِ ابو حنیب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے ہوئی تھی۔ اس کی آبیاری سے توجہِ سلیمانی ہٹی رہی، اس کے نشوونما کا قصہ نہ کیا جاسکا۔ مگر اسی مکتوب میں اس جملہ سے پہلے یہ فقرہ بھی آپ پڑھیں گے جو ہمارے دعوے کی دلیل ہے کہ۔

”سیرۃ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ کی تالیف ذندوین نے ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جذبہٴ محبت پیدا کر دیا ہے۔“
یہی جذبہٴ محبت تو وہ اصل ہے جو تکمیلِ ایمان کی ضامن ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لَا يَوْمَ أَحَدٍ كَرِهَتْهُ
أَكُونُ أَحِبَّ إِلَيْهِ مَنْ
تَمَّ مِثْلِي سِوَى كَرِهَتْهُ
تَمَّ مِثْلِي سِوَى كَرِهَتْهُ
لَدَى وَالِدِهِ وَالنَّاسِ
لَدَى وَالِدِهِ وَالنَّاسِ
أَجْمَعِينَ ۝
لَوْ كُنْتُ سِوَى كَرِهَتْهُ
لَوْ كُنْتُ سِوَى كَرِهَتْهُ

یہ جذبہٴ نبوی اس دور میں بھی جب کہ ابھی حضرت والاؒ نے طے سلوک کا باقاعدہ قصد نہیں فرمایا تھا، اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ منہ اور کسی کے قلم سے ذاتِ نبویؐ یا پیغامِ محمدیؐ کے خلاف ادنیٰ بے ادبی کا کلمہ سکلا اور اُدھر وہ مچل جاتے تھے اور اس وقت تک چین نہ پاتے تھے جب تک اس کا ترکی بر ترکی جواب نہ دیریتے تھے، یہی وہ مقام تھا جہاں ان کا نرم مزاج قلم، تیغِ بران بن جانا تھا، _____ مستشرقین یورپ نے جو محاذِ ذاتِ رسالت پناہ کے خلاف علمی روپ میں قائم کیا تھا، اس کی شکست و ریخت کا سہرا تو تمام تر اسی عاشقِ رسولِ سیدِ سلیمان ندوی کے سر ہے۔

اسی زمانہ میں حضرت والاؒ نے ایک مختصر سا رسالہ ”رسولِ وحدت“ کے نام سے تحریر فرمایا جس میں وحدتِ الہی، وحدتِ کتب، وحدتِ انسانیت اور آخر میں دینِ دنیا کی وحدت کو نہایت مدلل اور موثر انداز میں پیش کر کے پیغامِ محمدیؐ کے اتباع کی دعوتِ عام دے گئی ہے!

اس رسالہ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے وہ مقبولیت بخشی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسکا ترجمہ ہندوستان کی متعدد مقامی زبانوں کے علاوہ، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی

ہو گیا۔ کیا یہ قبولیت بلا قبولیت حق کے ہو گئی؟ اگر نہیں تو قبولیت حق کا ذریعہ نرا زورِ قلم ہا ہو گا یا صاحبِ قلم کا جذبِ دروں اور اس کی محبوبِ دو عالم کے ساتھ شیفقتگی؟
اس سوال کا جواب ایک صاحبِ ایمان کے لئے نہ تو مشکل ہے نہ غیر یقینی!

ایک نعت | سیرت نگار رسولِ عربیؐ کے عشقِ نبویؐ کا اعجازِ جن کو ابھی پوری طرح نہ ہوا ہوان کے لئے مدارِ نبویؐ کی ایک نعت درج کی جاتی ہے تاکہ سازِ محبت کے اس نغمے سے اُن کے احساس کی تشفی ہو جائے۔ — ذلذا اس کے مطلع پر ہی نظر ڈالیے اور پھر کہئے کہ کوئی نا آشنائے عشق و محبت وہ فتویٰ صادر کر سکتا ہے جو عاشقِ صادق حضرت سلیمانؑ کی زبان سے پورے زورِ ایمانی کے ساتھ نکل گیا ہے، فرماتے ہیں:

نقشِ جسِ قلب پہ نامِ شاہِ ابرار نہیں	سکہِ قلب ہے وہ درِ خور بازار نہیں
تو ہے مجموعہٴ خوبی و سراپائے جمال	کون سی تیری ادا دل کی طلب گار نہیں
مجلسِ شاہ میں ہے نغمہٴ تسلیم و درود	شورِ تسبیح نہیں شورِ شاذکار نہیں
ذره ذرہ ہے مدینہ کا تجسبی گہرِ نور	دشتِ امین یہ نہیں جلوہ گہرِ ناز نہیں
جان دے دے کے خریدنا بنے ہیں انصار	عشقِ زارِ مدنی مصعقہ کا بازار نہیں
شک نہیں مطلعِ الشمس ہے بطحا کی زمیں	کون سا ذرہ وہاں مطلعِ انوار نہیں؟
ہر قدمِ بادِ صبا حُسنِ ادب سے رکھنا	بوئے گیسوئے نبیِ نافہ ریتا نار نہیں

صیدِ مژگانِ محمدؐ میں غزالِ اب حرم

اس لئے ناوک و پریکاں کے طلب گار نہیں

اہلِ بصیرت دیکھ سکتے ہیں کہ اس نعتِ عال کا ایک ایک مصرعہ نعتِ گو کی محبت و

سکہِ قلب یعنی کھٹا مرکہ۔

تے تلخ: حضرت یوسف علیہ السلام کی سر کے بازار میں فروخت۔

معرفت نبوی کا آئینہ ہے اور باوجود روحانی تربیت کی طرف تعلق خصوصی نہ ہونے کے روحِ سلیمانی کا ذاتِ رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کتنا گہرا ربط قائم ہو چکا ہے۔ کیا چشمہ فیض سے اس تعلق کے بعد فیوضِ روحانی کا سلسلہ بند رہا ہوگا؟ نہ عقل اس کو باور کر سکتی ہے نہ واقعہ ایسا ہوا۔۔۔۔۔ بلکہ حُبِ نبوی برابر روحانی ترقی کا ذریعہ بنتی چلی گئی۔

سیرۃ النبیؐ کی مقبولیت کا اثر | سیرۃ النبیؐ کو جو قبولیتِ عام نصیب ہوئی وہ انہر من الشمس ہے، اور یہ قبولیت آج بھی

پرھتی ہی چلی جا رہی ہے، اس کی کئی جلدوں کے ترجمے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں خود حضرت مصنف علیہ الرحمۃ کی حیات میں ہو چکے تھے اور اب کئی زبانوں میں ہو رہے ہیں یہ قبولیت عام کتاب کی عند اللہ مقبولیت ہی کا ایک اثر ہے، اور اس کے ہوتے مقبولیت پر کسی اور شہادت کی حاجت نہیں رہتی، پھر بھی اس کا ایک اور یقینی ثبوت خود سیرت نگار کے قلم زرنگار سے سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کے دیباچہ میں فراہم کیا گیا ہے وہ رقم طراز ہیں کہ :-

”ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جنکی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا مجھ سے فرمایا:

”یہ کتاب وہاں قبول ہو گئی!“

کہاں قبول ہو گئی؟ یہ کس بزرگ کا مشاہدہ اور بیان ہے؟ میں نے خود حضرت والاؒ سے اس کی تفصیل پوچھی، فرمایا کہ یہ میرے والد ماجدؒ تھے، عالم رویا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور دیکھا کہ سیرۃ النبیؐ بارگاہِ رسالت میں پیش کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمایا اور اس پر اظہارِ خوشنودی سے مزید سرفرازی ہوئی حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی محنت ٹھکانے لگ گئی اور جیتے جی اس کی بشارت

لے فرزند کا تحققِ عقیدت پر بزرگوار کے کمالِ تقدس کی دلیل ہے، کیونکہ اس سے وہ فطری بے تکلفی بہ مغلوب ہو گئی ہے جو اولاد اور باپ کے درمیان ہوتی ہے اور جو محبت کے باوجود عقیدت کو قبول نہیں کرتی!

مل گئی۔ عہدہ یہ ترتیب بلند ملا جس کو مل گیا۔

یہ تالیف جو سمیرت نبوی کا دراصل تتمہ ہے حضرت علامہ کی محدثانہ
سیرۃ عائشہؓ عظمت پر شاہد عدل ہے۔ طبع اول کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں:-

”سوانح عربوں کے لئے عموماً تاریخ کی کتابیں کارآمد ہوتی ہیں، لیکن اس

وقت جس زمانہ کے واقعات لکھنا ہیں اس کی تاریخ صرف حدیث کی

کتابیں ہیں۔ یہ تمام ذخیرہ درحقیقت جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

امہات المؤمنینؓ و اولاد اصحاب کبارؓ کی مقدس زندگیوں کی علمی تاریخ ہے

اس بنا پر میری معلومات کا ماخذ صرف احادیث کی کتابیں ہیں.....“

اگے حدیثی ماخذ کی تفصیل ہے اور پھر تحریر فرماتے ہیں:-

”ادباً نظر جانتے ہیں کہ کتب احادیث خصوصاً بخاری میں حالات اس

قدر متفرق اور منتشر ہیں کہ ان کو ڈھونڈ کر یکجا کرنا چیونٹیوں کے منہ سے شکر

کے دانے چننا ہے تاہم مسلسل مطالعہ نے جو سرمایہ فراہم کر دیا وہ پیش نظر

اس کتاب کے طبع سوم کے موقع پر حضرت علامہ نے ”عین الاصابہ فیما استدرکتہ

السیدۃ عائشہؓ علی صحابہؓ“ جو علامہ سیوطی کا وہ بے نظیر رسالہ ہے جس میں انہوں

نے وہ حدیثیں جمع کی ہیں جن میں حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصرین کی غلطیاں یا غلط

فہمیاں ظاہر کی ہیں، تصحیحات اور تطبیقات مفیدہ کے ساتھ شامل فرمایا ہے، اس سلسلہ

میں یہ کمال تواضع تحریر فرماتے ہیں:-

”رسالہ عین الاصابہ کو بھی بطور ضمیمہ شامل کرنا مناسب معلوم ہوا تاکہ یہ نایاب

رسالہ منظر عام پر آجائے اور خاکسار کو حدیث شریف کی ایک ادنیٰ خدمت کا

شرف حاصل ہو“

معروف ہیں وہ درحقیقت حضرت والاؒ کی ایک زندہ و پابندہ معنوی کرامت ہے، دماغ و دل کا یہ حیرت انگیز امتزاج، زورِ استدلال اور جذب و اثر کی یہ دودھاری تلوارِ ادب و انشا، اور حسنِ خطابت کی یہ مثالی یادگار محض حضرت والاؒ کی فکر و کاوش کا کارنامہ نہیں بلکہ دل کی لگن اور موہبت و عطائے الہی کا کرشمہ ہے۔

میں نے خود حضرت والاؒ سے سنا ہے اور اس بات کے راوی بیسیوں معتبر اصحابِ ملیسؒ کے خطباتِ مدراس بالکل قلم برداشتہ تحریر فرمائے گئے تھے۔ مگر ایسے صیح و مکمل نسخے کہ حیات کے آخری لمحات میں بھی راقم نے حضرت والاؒ کو فرطِ مسرت سے یہ فرمانے سنا کہ بحمد اللہ آج بھی ان میں ایک لفظ کی کمی بیشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ایک مرتبہ اسی بے مثل کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، احقر کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور یہ شعر پڑھا ۛ

لختے بمرادِ دل گزردہر کہ زہِ بیشم
من قاش فروشِ دلِ صد پارہِ خوشم

روحانی منازل سے گزر چکنے کے بعد دورِ سابق کے خطبات کو اپنے دلِ صد پارہ کی قاشوں سے تعبیر فرمانا کم از کم میرے نزدیک تو اس امر کا صریح اشارہ ہے کہ خود حضرت مصنف کے نزدیک اس کتاب کی حیثیت قلبی دروہانی کرشمہ اور ربانی فیضان کی ہے۔ دیکھیں جس کو انکار ہو وہ خود خطباتِ مدراس کو پڑھ جائے اور دیکھے کہ جوں جوں نظر اس متبرک کتاب کے الفاظ پر پڑتی چلی جاتی ہے، دل کیفیات و اثرات کے مقدس تلاطم میں ڈوبنے لگتا ہے ۛ

آفتاب آمد دلیسل آفتاب
گر دلیش باز خواہی رومتاب

سیکڑوں زبانوں سے سنا اور کتنی مثالیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان خطبات

کو پڑھ کر زندگیوں میں انقلابِ ایمانی برپا ہو گیا — یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ بلکہ کرامت بھی "کرامتِ معنوی" جس کا درجہ کرامتِ حسی سے کہیں پڑھ چڑھ کر ہے! **امام مالک سے خصوصی تعلق** | ہمارے حضرت دارالرح کو امام دارالہجرت مالک بن انس (رحمۃ اللہ علیہ و قدس سرہ) سے جن کی فکر و نظر میں اور روح و قلب میں خالص مدنی تنویر تھی، خصوصی قلبی لگاؤ تھا، جس کا اظہار حضرت کی تالیف "حیاتِ مالک" میں جا بجا ملتا ہے — چند اقتباسات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

حیاتِ مالک کے دیباچہ میں تیسرے فقرہ کی پہلی سطر یہ ہے۔
 "مجھ کو علمِ حدیث کی ابتدائے طلب سے امام موصوف اور ان کی سوطا سے
 بدرجہ غایت عقیدت رہی ہے۔"

اصل کتاب میں "تلامذہ و مستفیدین" کے زیر عنوان جہاں محدث کبیر شمس الدین ذہبی اور امام نووی کے امام مالک سے قربِ نسبت پر ناز کا ذکر فرمایا ہے اس کے ذیل میں یلیخ جملہ بھی قلم سے نکل گیا ہے۔

"اگر بڑوں کے ساتھ چھوٹوں کا نام لینا سوءِ ادب نہ ہو تو اس ذرہ بے مقدار کو بھی اس آفتابِ کمال سے ایک قرب کی نسبت حاصل ہے۔"
 مگر اس کی تفصیل ظاہر نہیں فرمائی — آگے "اخلاق و عادات و حالات ذاتی" کے عنوان کے ختم پر یہ فقرہ کس شدتِ عقیدت و محبت کو ظاہر کر رہا ہے۔

"امام کو جو خصوصیاتِ شرف حاصل تھیں ان میں یہ کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاکِ پاک جسمِ مبارک کا غفرقی، لیکن اس سے بھی زیادہ مزید شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کا مکان تھا اور مجلس و نشست گاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دولت خانہ تھا۔ یہیں اکثر

املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اس بنا پر امام مالکؒ نہ صرف علم و معارف فاروقی کے وارث تھے بلکہ ان کی جائداد ظاہری کا بھی خدا نے انہیں وارث بنایا۔

امام مالکؒ سے یہ خصوصی عقیدت حضرت والارہ کو آخر دم تک رہی۔ _____ کا ش حضرت والارہ کے قلم سے حیاتِ مالکؒ کی تکمیل ہوگئی ہوتی!!

مجدد الف ثانیؒ سے برزخی ملاقات | اسی درمیانی دور میں غیر شعوری طور پر صفائیِ قلب اور پاکیزگیِ رُوح کا ایک

عجیب معاملہ حضرت والارہ کے ساتھ پیش آیا، جس کو سن کر اس بات میں کوئی شبہ نہ رہے گا کہ وہ اصطلاحی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر روحانیت کی ایسی منزل میں پہنچ چکے تھے کہ بڑی بڑی ریاضتوں کے بعد بھی اس درجہ تک رسائی یقینی نہیں ہوتی، واللہ یجتبیٰ الیہم من یشاء!

ایک مرتبہ حضرت والارہ کی خدمت میں میری زبان پر مولانا آزاد سبجانی مرحوم کا ذکر آگیا، تو حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ”ایک روز میں نے یونہی مولانا سے کہا کہ آپ، تو ماشاء اللہ نقشبندی سلسلہ کے شیخ ہیں ذرا میرے قلب کو تو دیکھئے کہ کیسا ہے؟ سم لوگ تو علم ظاہر کے سوا کچھ اد جانتے نہیں، مولانا آزاد سبجانی فوراً میری طرف متوجہ ہوئے اور کچھ دیر بعد یہ فرمایا کہ ماشاء اللہ آپ کا قلب بہت اچھا ہے، بس صرف ایک حجاب اور ترفع ہونا ہے اور وہ ہے حجابِ علم!

حضرت والارہ نے فرمایا کہ ”میں نے مزاحاً کہا کہ یہ بھی بڑی بات ہے، میں تو اتنا بھی نہ سمجھتا تھا۔“

یہ تو لطیف ہو گیا مگر اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ انہی مولانا آزاد سبجانی مرحوم نے حضرت سے فرمایا کہ ”آپ تو بڑے چھپے رستم نیکے، آپ کا قلب تو

بہت صاف ہے، مگر حضرت والا نے جواب میں پھر وہی فرمایا کہ ”میں تو کچھ بھی نہیں جانتا وہ بھی آپ ہی کا ارشاد تھا اور یہ بھی آپ ہی کا ارشاد ہے۔“

واقعہ یہ ہوا کہ سال ۱۹۸۷ء میں حضرت والا رحمہ اللہ کا پھور کے ایک نامی گرامی تاجر حافظ عبدالحلیم کی پرانے کے وطن بستی (سرہند کے قریب پٹیالہ ریاست میں ایک شہر ہے) ایک تیم خانہ کے افتتاح کی تقریب میں تشریف لے گئے تھے، وہاں مولانا آزاد سبجانی اور بعض اور حضرات بھی مدعو تھے، واپسی پر ان سب حضرات کا خیال ہوا کہ سرہند پہنچ کر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کی زیارت بھی ضرور کر لینی چاہیے، حضرت والا کو اس سفر زیارت سے کوئی خاص دلچسپی تو نہ تھی مگر فقائے سفر کے خیال سے ساتھ ہو لئے۔ حضرت مجدد صاحب کے مزار پُرانوار پر حاضری ہوئی حضرت والا فاتحہ مسنون پڑھ کر مزار مبارک سے ہٹ گئے اور متصل مسجد کے کٹرے پر جو تقریباً تین فٹ اونچا ہوگا، بیٹھ گئے، مولانا آزاد سبجانی مع احباب کے مزار پر مراقب تھے۔

حضرت والا نے مین عالم ہوش میں دیکھا کہ یکا یک ایک پُر نور ہستی اُن کی طرف چلی آ رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ذاتِ سراپا الوار قریب آ گئی اور اس نے حضرت کو خطاب کرتے ہوئے سوال فرمایا۔

”مکتوباتِ مبارک خواندہ؟“

حضرت نے عرض کیا ”بلے خواندہ ام!“

ادھر سے پھر سوال ہوا ”آن را فہمیدہ؟“

ادھر سے عرض کیا گیا ”ان کے اذان فہمیدہ ام!“

بس یہ سوال وجواب ہو رہا تھا اور حضرت والا غش کھا کر زمین پر گر چکے تھے مگر خود اس گر پڑنے کا ہوش ان کو نہ تھا۔ ایسے میں مولانا آزاد سبجانی وغیرہ پہنچے اور حیرت زدہ ہو گئے۔ حضرت والا کو جگایا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بے ہوشی کی وجہ پوچھی گئی مگر

حضرت والا نے سکوت فرمایا، پھر تخلیہ میں مولانا آزاد سجانی کے اصرار پر حضرت نے سارا
ماہر بیان فرمایا، مولانا مرحوم حضرت کے صفائے باطن اور عظمت روحانی کے معترف
ہو گئے اور فرمایا کہ :-

”آپ تو بڑے چھپے رستم تھے“

یہ واقعہ حضرت والا نے ایک مرتبہ حکیم نصیر الدین صاحب ندوی (اجپری) کی قیام
گاہ پر مولانا محمد ہاشم مجددی (المعروف بہ ہیر ہاشم جان) کو بھی ازراہ لطف سنایا تھا، جو
حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کی اولاد میں سے ہیں اور خود بھی ایک صاحب دل جید
عالم ہیں، اس محفل میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ بھی موجود تھے۔
اس برنجی واقعہ سے علاوہ روحانی مرتبت کے مجددی طریق اور لون سے حضرت
والا کی مناسبت تاہم بالکل ظاہر ہے۔

❖ ❖ ❖



باب سوم

تلاش شیخ

۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء

تلاشِ شیخ

اضطرابِ روحانی ظاہری علوم کب کسی مخلص شلاشی حق کا ساتھ دے سکے ہیں ، علامہ فہار جلال الدین رومیؒ برہا برس میدانِ علم کی بادیہ پیمانی کرتے رہے ، لیکن بالآخر ہارمانِ کرب جسے تبریز (قدس سرہ) کی رفاقت قبول کی ہے تب ہی منزل مقصود پر پہنچ پائے ہیں امام ہمام محمد بن محمد غزالیؒ نے معقول و منقول کے سمندر کھنگال ڈالے ، لیکن درِ مقصود کو نہ پاسکے ، یہ سراپہ دہریشان ہو کر جب بوعلی فارسی (قدس سرہ) کے آستانہ پر آئے تو یہاں حاصل جستجو کو موجود پایا ، مطمئن و سرشار ہو گئے ۔۔۔۔۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟

وجہ صرف یہ ہے کہ روح کو تسکین یقین سے ملتی ہے اور یقین کامل کسی حقیقت کے مشاہدہ ہی سے حاصل ہوتا ہے ، عقل بے چادری حقائق کا قائل کر بھی دیتی ہے تو ان کو دکھا نہیں سکتی ۔

عقل کو آستان سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں اسی لئے ہر کامل العقل انسان علم کتابی کے نقطہ کمال پر پہنچ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور اپنی روحانی تشفی کے لئے وہ ذرائع ڈھونڈھنے لگتا ہے جو اس کو حضوری بخش سکیں معلوم کا مشاہدہ کرا سکیں ۔۔۔۔۔ چنانچہ مولانا ابن عربیؒ سے گزرا کہ یہی اضطراب یگانہ نعم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی پیش آیا اور بڑی شدت سے پیش آیا ، یہ ان کے اخلاص علمی اور بلند نگاہی کا لازمی نتیجہ تھا !

لے ملاحظہ فرما ، غزالیؒ کی خود نوشت سوانح ” المنقذ من الضلال ” جس کا ترجمہ ڈاکٹر خالد حسین قادریؒ نے ” تلاشِ حق ” کے زیر عنوان کیا ہے (شائع کردہ محکمہ اذکار و اذکار پنجاب ۱۹۸۷ء)

عین اس اور علی پہنچ کر جو اس درویش ان کے لئے خاص ہو چکا تھا، حضرت والاؑ کا قلبی اضطراب اور روحانی تشنگی اور بڑھ گئی جو باہر و منزلت بھی زیر قدم آئی، ہمت عالی نے اس پر قناعت سے انکار کیا، ملک دانش زیر نگین آیا تو نظر میں مطلع عرفان کوتاہ کنے لگیں۔

ملکِ تسلیم اور بگردِ پادشاہ ہچمناں در بندِ تسلیم دگر
محبت اور معرفتِ الہی کی جو چنگاری لڑکپن ہی سے دل میں پڑی ہوئی تھی اور براہِ سگلتی جا رہی تھی اب اس نے قلب کو گرمادیا، حاسہ قلبی جاگ اٹھا، ضرورت محسوس ہوئی کس کے جنبشِ دامان کی۔

ظ آتشِ افتادِ بجاں جنبشِ دامانِ مدوے

تلاشِ شیخ | مگر دامن کہاں سے لاتے؟ کس کا تھامتے؟ گھر کے بزرگ رخصت ہو چکے تھے، البتہ سندھ میں خانوادہ مجددیہ کے ایک مرتاض شیخ مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ اس وقت حیات تھے، ان کے علم و تقدس کی تعریف سن سن کر حضرت والاؑ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا رہا کہ خاص ان ہی بزرگ کی زیارت کے لئے سندھ کا سفر اختیار کیا جائے اور اگر ”شہیدہ“ کی تصدیق مشاہدہ کر دے تو ان کو اپنا رہبر طریق بنایا جائے مگر یہ خیال رو بہ عمل نہ آسکا۔۔۔۔۔ اب اضطرابِ شوق جہاں جہاں لے گیا یا تو رسوم و برعات کا دورِ نظر آیا یا پھر کوئی پابندِ سنت شخصیت نظر آئی بھی تو طبیعت اور ذوق کا میل نہیں ملا اور دو دل ایک نہیں ہو سکے۔ مثلاً حضرت کے محب مخلص مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ان کے شیخِ عالی مقام مولانا محمد حسین حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے ارادتِ سیلانی قائم ہو جائے مگر عدمِ مناسبت کی وجہ سے یہ مخلصانہ کوشش بھی بار آور نہ ہو سکی۔

لے یہ روایت مجھ سے مولانا محمد ہاشم صاحب مجددی مدظلہ نے بیان فرمائی جو حضرت مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ خلف الصدق اور ہمارے حضرت والاؑ کے تربہ دانوں بلکہ عقیدت کیشوں میں تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ بات ان سے خود حضرت والاؑ نے فرمائی تھی۔

خود حضرت والا سے سنی ہوئی روایت ہے کہ وہ کسی ضرورت سے حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تھے، قیام مولانا گیلانی جی کے ہاں تھا، ایک روز مولانا نے حضرت والا کو اپنے شیخ قدس سرہ سے ملایا اور پھر تنہائی میں حضرت شیخ نے کوئی دو گھنٹہ تک وجودی رنگ کی تقریر فرمائی جس کا موضوع یہ آیت پاک تھی: "فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يَا مُوسَى إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ" _____ مگر ہمارے حضرت والا کا مذاق چونکہ اس رنگ سے مختلف تھا، اس لئے اس کا کوئی خاص اثر قلب پر نہیں ہوا۔

حضرت والا کو اصل کشش حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کی ذات سے تھی، مگر وہ اس عالم رنگ دلو میں موجود نہ تھے، اسی لئے تلاش شیخ ایک لائیکل سا مسئلہ بن گیا تھا، خود فرماتے تھے کہ:-

"کامل دس برس تک چپکے ہی چپکے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا لیکن کوئی ہستی ایسی نظر نہ آتی تھی جو میرے درد کی درمانی کر سکے، بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی، بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کاش حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حیات ہوتے!"

اللہ اللہ تلاش شیخ کی اس دس سالہ طویل مدت نے جذبہ شوق کو کس انتہا پر پہنچا دیا ہو گا اور حق نما کی اس جستجو میں غیر شعوری طور پر خود قرب حق کی کتنی منزلیں طے نہ ہو گئی ہوں گی!

حکیم الامت سے مراسلت کی غیبی صورت! | اسی دوران میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

تھانوی سے خط و کتابت کی ایک غیبی صورت پیدا ہو گئی _____ مفتی عبداللطیف صاحب اساتذہ تفسیر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے ایک رسالہ

مکتوب سلیمانی (۱)

حضرة العلامة المفضل متع الله المسلمين بطول بقائكم

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

رسالہ انور متضمن رسالہ کشف الدجے مع ہدایت نامہ سرفرازی کا باعث ہوا، میں اس کو اپنے لئے سعادت کا طعری سمجھتا ہوں کہ آپ اس علوم و فنون سے تقریظ لکھنے کو فرمائیں، خدا گواہ ہے کہ میں اپنے کو اس سے کمتر سمجھتا ہوں کہ آپ کی کسی تحریر پر تقریظ، لکھوں مجھے یہ بھی شک ہے کہ میرا طریقہ تحریر اور طرز استدلال پسند خاطر اشراف ہو، مگر بحکم الامر فوق الادب تمیل کروں گا۔ اگر میرا یہ عذر قابل پذیرائی نہ ٹھہرا ————— ساتھ ہی زبان کے متعلق فیصلہ ہو کہ عربی ہو یا اردو جواب کے لئے لفافہ و ٹکٹ کی حاجت نہیں۔

حضرت مستفتی میرے استاذ و شیخ ہیں یہ رسالہ انھوں نے مجھے حیدر آباد (دکن) میں خود دیکھنے کے لئے دیا تھا اور میں اس کو بغور پڑھنے کے لئے ساتھ لایا تھا، پڑھ کر ان کو میں نے ان الفاظ کے ساتھ اس کو واپس کیا کہ آپ جس کو مکروہ سمجھتے ہیں میں اس کو عین ربوا کہتا ہوں اور میرے نزدیک توقیل و قال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل علی سلف کلام ہے کہ یہ ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا اور نہ اس پر کبھی عمل کیا، لفظ بیع و دین و قرض کے اصطلاح سے بڑھ کر لغت کا فیصلہ ہے، رسالہ کشف الدجے کے مطالعہ سے بہرہ مند ہوا، طرز عبارت اور انشاء کی سلاست اور جاذبیت نور علی نور ہے۔

بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا اٹھتا ہے ادبے اختیار کسی سکینت و طمانیت کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے لیکن ڈرتھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بے گانگی سے میرے متعلق کیا کیا اب تک پہنچا ہوا اور آپ مجھے مخاطب

کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں! — میں تو اس رسالہ استغناء کا ممنون ہوں کہ اس اجنبیت
و بے گانگی کی جگہ اس کی بدولت انیت و یک جہتی کی صورت پیدا ہوئی، اب میں اس
کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے۔

دعا کا طالب و ہمت کا خواستگار ہوں۔ والسلام

سلیمان ندوی



اس مکتوب کے جواب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو دالانامہ لکھا،
وہ بھی ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ حضرت حکیم الامت کے ہاں ہر ایک کے حفظ مرتبت کا کس
قدر پاس و لحاظ تھا!

جواب اشرف

مولانا المحترم و امت فیضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عجب بات ہے کہ انبساط کا قصہ میرا تھا نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی
اس کے اسباب پیش آ گئے، اس کا واقعہ تو جناب نے تحریر ہی فرما دیا، اس طرف یہ واقعہ
ہوا کہ میں نے بالیقین کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا، دو وجہ سے :- ایک یہ
کہ مجھے بزرگوں کی فہرست ہی بہت غیر مکمل معلوم ہے، دوسرے کسی کو ایسی تکلیف دیتے

۱۔ حضرت دالامہ فرماتے تھے کہ بعض لوگوں نے حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کو مجھ سے اتنا بظن کرایا تھا کہ وہ

مولانا شبلی سے بھی زیادہ مجھ ہی سے ناراض تھے۔

کچھ اسی قسم کی شکایت ”حکیم الامت“ (مصحف مولانا دریا بادی) کے اوراق میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے
قلم سے بھی پڑھیں آتی ہے (ص ۳۵)، اسوس ہاں افراد چوکسی کے اعتماد سے ناچار نذرانہ اٹھائیں اور اسکو حسن
ظن اور اتصال کے بجائے بظن اور انفصال میں صرف کریں۔ ہر کہ شاہ آں کند کہ لوگوں پر بیخوف باشد کہ جز بگو گوید (سعدی)

ہوئے بہت نہیں ہوتی، خصوصاً اگر میرا کلام ہو تو بے حد حجاب ہوتا ہے، یہ رسالہ میرے ہمشیرہ زادے نے لکھا، اگرچہ میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ عام طبائع کی حالت پر نظر کر کے اس استفتاء کی حضرت عامہ کا قوی اندیشہ تھا، اس کے انداز کی سب سے انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے، اس لئے میں نے عزیز موصوف کو مصارف دیگر مشورہ دیا کہ جہاں مناسب ہو بھیج دیا جاوے میں ان کامنوں ہوں کہ انہوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ میں جناب کا مخاطب بن سکا، غرض یہ واقعہ ادھر سے ہوا۔

بہر حال حجاب برتفع ہونے کے بعد اب مضامین محبت کا جواب عرض کرتا ہوں جناب کی تواضع نے ضرور مجھ کو ایک معتدبہ درجہ میں معتقد بنادیا، اور غالب یہ ہے کہ آئندہ اس میں اضافہ اور قوت ہو، باقی طرز عبارت یا استدلال کی پسندیدگی و عدم پسندیدگی، سو اس کے متعلق اعتقاد دینی سے ایک نظیر عرض کرتا ہوں کہ سادے کپڑے پہننے والے کو کسی طرح یہ حق نہیں کہ رنگین کپڑے پہننے والے کو ناپسند کرے بشرطیکہ مقصود ستر بوجہ مشروع محفوظ رہے اور زبان کا فیصلہ سود و فلوں شفقوں کو اختیار کرنے سے مجھ کو ایک ایک غدر مانع ہے، اور دو زبان تو جناب کی شان سے گری ہوئی ہے اور عربی زبان سے میری شان گری ہوئی ہے کیونکہ میں عربی زبان پر قادر نہیں، اس لئے اس کو جناب ہی کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔

مسئلہ کے متعلق جس عنوان سے رائے سامی ظاہر فرمائی ہے اس سے سہل اور حکیم الامت قدس سرہ نے جب بھی کوئی کتاب چھوٹی ہو یا بڑی خود تحریر فرمائی یا اپنی نگرانی میں لکھوائی تو اس وقت ملت کی کوئی نہ کوئی ضرورت دینی اور منفعت انکے پیش نظر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ مصنفات اشرفیہ میں بیان القرآن اور اعلا الحسن عیسیٰ خالص علمی اور ضخیم کتابیں بھی ہیں، اور اصلاح الرسوم اور لفظ الحوام جیسے چھوٹے رسالے بھی شامل ہیں۔ یہ حکیم الامت کے جذبہ شفقت کی کھلی دلیل ہے! اعلیٰ اللہ مقادیر۔

دل میں اُتر جانے والا عنوان کم نظر آتا ہے۔ بارک اللہ فی معارفک۔

عبارت کے متعلق جوارث اور فرمایا ہے اس سے میں کاتب عبارت کا زیادہ معتقد ہو گیا کہ ماہر کی شہادت ہے باقی اپنی حالت تصور باع فی العربیۃ کو اور عرض کر چکا ہوں، اس لئے کاتب کے متعلق دینی اعتقاد کو بھی غیر ماہر کی شہادت ہونے سے شہادت ناقص سمجھتا تھا۔

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ موانع محتملہ کا ذکر فرمایا ہے اگر خانقاہ میں حضرت شیخ قدس سرہ رونق افروز ہوتے تو یہ سب مضامین حقیقت پر منطبق ہو سکتے تھے لیکن اب محض حسن ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس سے آگے بڑھ، البتہ زیادہ تکلف کرنے کو بھی اعادۂ حجاب سابق اور موہن انبساط لاحق سمجھ کر پسند نہیں کرتا، اس لئے بلا تکلف معاملہ کی سچی بات عرض کرتا ہوں کہ جناب کا چین ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے تو لایوثق یہ، اور اگر ذوقی و وجدانی ہے تو میں دوستی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھ کو علوم میں مخاطب نہ بنایا جائے کہ ان سے معرکہ ہونے کو اور ظاہر کر چکا ہوں۔ والصدق بخ، والسلام

التماس! جناب کا الطاف نامہ رکھ لیا ہے، اگر اجازت ہوگی، اس کے بعض جملے جن کا تعلق مسئلہ سے ہے، تقریظ کے ساتھ منضم کر دیئے جائیں گے، یہ کاتب کی درخواست ہے جس کے قبول فرماتے میں جناب بالکل آزاد ہیں، اگر مصلحت یا طبیعت کے ذرہ بھی خلاف ہو، ممانعت پر بھی وہی مسرت ہوگی جو اجازت پر ہوگی۔ فقط

ناکارہ، آوارہ، ننگِ انام اشرف برائے نام

از تھانہ بھون ۲۸ دسمبر ۱۹۲۹ء

اس پہلی مراسلت کے بعد جس کے سامان غیب ہی سے ہوئے تھے، ہمارے حضرت والا نے ایک اور ریضہ خدمت اشرف میں بھیجا جس میں نسخہ روحانی کی درخواست اور اپنے ابتدائی ماحول باطنی رجحانات اور فقی مسلک کا تذکرہ ہے، اس اعتبار سے یہ مکتوب بہت اہم ہے، ملاحظہ ہو۔

مکتوب سلیمانی (۲)

حضرت ہادیؑ طریقت متع اللہ المسلمین بطول بقائکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ جو لطف و عنایت سے بھرا ہوا تھا، درود فرما ہوا، اس سے ایکٹ نشان حال و متشتت البال کی سکینیت ہوئی۔

مولانا! میں آپ کی دعا و دعوت کا بہترین مستحق ہوں۔ مسائل علمی کی الجھن سے نجات کا خواستگار نہیں بلکہ روح کی الجھن سے نجات کیلئے دعا و ہمت کا طالب ہوں، میں نے اعتزال سے لے کر سلفیت تک بمذارج ترقی کی ہے، عقائد میں امام مالک کے اس اصول کا پیرو ہوں: الاستواء معلومہ والکیفیت مجهول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعت۔ سیرۃ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ کی تالیف و تدوین میں خواہ مجھ سے غلطیاں ہوتی ہوں مگر اس مصروفیت نے ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جذبہ محبت پیدا کر دیا ہے، ولہذا الحمد، فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں مگر اہم حدیث بالمعنی المتعارف نہیں ہوں، ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں گلیتہ اُن سے عدول حق نہیں سمجھتا،

لہ یعنی استوی معلوم ہے کیونکہ قرآن میں مذکور ہے) مگر اسکی کیفیت (کہ کیونکر ہے) نامعلوم ہے۔ اس پر ایمان واجب ہے اور اسکے بارے میں سوال بدعت ہے۔

میرا خاندان صوبہ بہار میں علم ظاہر و باطن کا جامع رہا ہے، والد مرحوم ابوالعلائی الشرب
تھے، بھائی صاحب مرحوم مجددی تھے اور دونوں صاحبِ حال و نسبت تھے، بچپن بھی ان
بزرگوں کی آغوش میں بسر ہوا، ذکر و مراقبہ اسی سن سے شروع کر دیا گیا، مگر بڑا ہو کر علمِ باطن کا
کہ جس نے مدتوں کے لئے اس راہ سے ہٹا دیا اور خدا جانے کہاں کہاں بھٹو کریں کھائیں،
اور اب جب مرحلہ اربعین سے گذر کر ہوش آیا ہے تو ان بزرگوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے میں
نے یہ کیفیت اس لئے لکھ دی تاکہ جناب میرے مستقبل کی اصلاح میں میرے ماضی سے
باخبر رہیں۔

میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت و ثنبت اور رغبت
الی الطاعت پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجد کی لذت
بھی پاتا ہوں۔ امام ربانی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے
سلسلہ سے عقیدت تاتمہ رکھتا ہوں، خرافات و طاماتِ صوفیہ کا دل سے منکر ہوں، صالح
نہیں لیکن صلاحِ حال کا دل سے خواستگار ہوں، یورپ کے مذہبی و علمی حملوں کے مقابلہ میں
اسلام کی خدمت کا دلولہ ہے اور اب تک یکس برس کا زمانہ انہی مشاغل میں گذرا۔ اب
آپ سے دعا کا طالب بہت کا خواستگار اور حصولِ اخلاص اور اصلاحِ قلب کے لئے کسی
نسخہ کا سائل ہوں۔

رسالہ کشف الدجے پر قلم نے جو یادری کی ہے، مولوی ظفر احمد صاحب کی خدمت میں
ارسال ہے۔

سلیمان ندوی

۲۱ شعبان ۱۳۳۵ھ

✽

اس رقیبہ سیلانی کا جواب حضرت تھانویؒ نے بڑے ہی انشراح سے تحریر فرمایا، جواب
سے پہلے یہ نوٹ ہے اور پھر اصل تحریر شروع ہوتی ہے۔

”عرض اطلاعی میں نے سہولت کے لئے یہ معمول جاری کر رکھا ہے کہ جواب کے ساتھ اصل خط بھی رکھ دیتا ہوں اور اسی طرح منگنا بھی پسند کرتا ہوں تاکہ انطباق میں آسانی ہو، موصوۃً یہ خلاف تہذیب ہے اور اسی لئے اور صحیفہ کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا، مگر اب کسی قدر بے تکلفی ہونے سے معنی کو صورت پر ترجیح دی۔ فقط“

اب اصل مکتوب ملاحظہ ہو، جو اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ اس کے آخری فقرے میں عطر تصوف کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔

جواب اشرف

از خاکسار اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی محترمی دام فیضہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الطاف نامہ نے مع تقریظ مسرور فرمایا اور تقریظ نے علوم مفیدہ میں اضافہ فرمایا،

اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو مسرور رکھے بمرت ظاہرہ و باطنہ۔

سب سے اول اس عنوان کے تبدیل کے متعلق درخواست کرنا ہوں جس سے مجھ

کو خطاب فرمایا ہے یعنی ”ہادی طریقت“ اس کو دیکھتے ہی ذہن پر یہ وارد ہوا۔ ع

ادخویشن گم است کراہری کند

اور یہ بھی ع اصلاح کار کجا دمن خراب کجا

اگر جامی کا یہ شعر ع بسیا جامی رہا کن مشمراری

ز صاف و درویش آرا نچہ داری

فورا ذہن میں نہ آتا تو عجب نہیں یہی عنوان خطابت غایت درجہ کے فحلت زا ہونے

سے عرض جواب سے غز مانع ہو جاتا، مگر اب صرف اس درخواست پر اکتفا کرتا ہوں کہ

جو عنوان خود میں نے آپ کے لئے اختیار کیا ہے اس سے تجاوز نہ فرمایا جائے، گو میں اس

کا بھی اہل نہیں مگر عرف کی روایت میں زیادہ اہلیت شرط نہیں۔ اس کے بعد الطاف نامہ کا جواب عرض کرتا ہوں مگر اس کے ساتھ یہ بھی شرط یاد خواست ہے کہ میرے معروضات کو قول فیصل خیال نہ فرمایا جائے بلکہ خُذ مَا صَفَا وَدَعِ مَا كَدَرَ پر عمل رہے اور اس انتخاب سے مجھ کو مطلع فرمایا بھی ضروری نہیں۔۔۔۔۔ اب بے تکلفی سے جواب عرض کرتا ہوں۔

مجھ کو اس سے خاص مسرت ہوئی کہ میرا معروضہ کسی درجہ میں موجب سکینت ہوا اور بالیقین یہ اثر میرے عریضہ کا نہیں، جناب کے حُسنِ ظن کا ہے اور عَادَةُ اللہ یوں نہیں جاری ہے کہ حُسنِ ظن کے محل سے عطایا تقسیم فرماتے ہیں اس حُسنِ ظن سے مجھ کو بھی انشاء اللہ اپنے نفع کی امید ہے، فصدق اللہ رجاء نَاجِمِیْعاً، اور یہی توقع نفع کی حُسنِ ظن کی بنا پر سبب ہے میری جراتِ مکاتبت کا ورنہ عَصِ صَلَاحِ کَارِ کجا و سِنِ خِرَابِ کجا۔ میں دل سے دعا کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں اور اس کا طالب بھی ہوں۔

جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا اس سے میری حقیقت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو گیا دو وجہ سے، ایک صدق و خلوص پر دال ہونے سے دوسرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے، کسی جزئی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی صرف رنگ بدلتا ہے، چنانچہ اس احقر پر دو جگہ دوسرا رنگ ہے، ایک یہ کہ میں بوجہ اپنی قلتِ روایت و روایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں، دوسرے یہ کہ صوفیہ کے احوال و اقوال کو محتمل تاویل سمجھتا ہوں الا من تحقیق بطلانہم بالقطع۔

مشرق و برکاتِ خاندانی سے حقیقۃ الحقیقت تک وصول کی بہت جلدی اور قوی

لے اس پورے فقرے سے کس قدر عیدیت اور شان تو اٹھ عیاں ہے

مے چنانچہ انکشف اور لہوار النواذ حضرت تھانوی کے اس رنگ کی آئینہ دار ہیں، اور ابھیہ الطرئی نے تہذیب ابن العربیؒ کو خاص اسی ضرورت کے تحت تحریر فرمائی ہے۔

امید ہو اور خاص طمانیت و مسرت حاصل ہوئی۔ اللہ عباد فعل وقد فعل انشاء اللہ
 تعالیٰ۔ اس ضمن میں میں نے بھی اپنا کچا چٹھا اس لئے عرض کر دیا کہ آپ کو خذ ما صفا د
 ما کد و پر عمل فرمانے میں سہولت ہو، دوسرے طبعاً یہ چاہتا ہوں کہ اپنے احباب سے
 اپنا کوئی راز مکتم نہ رہے، میری رائے میں اس سے تعلق بڑھتا ہے اور یہ خاص نعمت
 ہے اللہ تعالیٰ کی کہ دو مسلمانوں میں خاص اور خالص تعلق رہے، اور اسی مصلحت سے
 آج ہی ایک رسالہ جو میرے رسالہ کی تسہیل ہے روانہ خدمت کر رہا ہوں، اصل بھیجنے
 سے معذور رہا، اس وقت یہی موجود تھا، اس سے میرا مسلک جو طریق کے متعلق ہے ضروری
 درجہ میں واضح ہو گا۔ اس کے بعد جناب نے ایسے نسخہ کی فرمائش فرمائی ہے جو خاص آثار
 کے لئے مقرر ہو، اس کے صحیح عذر کو تو صفحہ اول میں عرض کر چکا ہوں کہ صلاح کا دار الہی و خوشن
 الہ لیکن اس کے ساتھ ہی جناب کا حکم اور جامی کا امر رہا کن شرمساری اور اپنی درخواست
 خذ ما صفا د اس مجموعہ نے حیا کو امثال امر سے مغلوب کر کے چند سطریں عرض کرنے
 کی جسارت دلائی اور یہ سطرین بطور اصول موضوعہ کے ہیں اگر پسند فرمائی جائیں گی تو آئندہ
 عرض معروض کرنے میں مجھ کو کمسوئی رہے گی کیونکہ ان کا اکثر حصہ انہی اصول کی فروع ہوں
 گی۔ ان اصول کا خلاصہ ایک ہی اصل ہے وہ یہ کہ۔

ما موریہ و جوبایا استجبایا اس طریق میں صرف افعال ہیں، انفعالات نہیں
 مثلاً استقامت و تثبت و رغبت الی الطاعات و التزام فرائض و تفرغ
 البدعات و لذت و ذوق و اخلاص و اصلاح قلب و امثالہا، ان میں جو
 چیزیں یا بعض چیزوں کے جو جاری افعال ہیں وہ ما موریہ ہیں کیونکہ وہی
 اختیار ہیں اور جو انفعالات ہیں وہ ما موریہ نہیں کیونکہ وہ غیر اختیاری
 ہیں، البتہ وہ انفعالات بعضے مطلقاً بعضے خاص احوال میں محمودہ ضرور

لے یعنی تسہیل قصداً السبیل۔

ہیں اور اسی درجہ میں مطلوب بھی ہیں مگر وہ سب آثار و ثمرات انہی افعال کے ہیں اور وہ افعال ہی ان کے اسباب ہیں کہ ان کی طرف فی الجملہ یا فی الاثر مفضی ہیں، ان کے علل نہیں کہ ان سے متخلف ہی نہ ہوں، اگر تخلف بھی ہو تو مضر نہیں کیونکہ اصل مقصود یعنی قرب و رضا کی وہ شرطیں نہیں۔ فقط والسلام

اس مکتوب اشرف کے تقریباً دو مہینے بعد ہمارے حضرت والا نے پھر ایک عریضہ لکھا اور اس کا جواب حکیم الامتؒ نے عطا فرمایا، یہ مکاتبت سہولت فہم کے لئے سوال و جواب کی شکل میں درج ذیل ہے حضرت والا کی تحریروں کے لئے (س) کا اشارہ اور حضرت تھانویؒ کے ارشادات کے لئے (د) کا اشارہ ذہن میں محفوظ رہے۔

مراسلت (۳)

(س) حضرت اقدس دام فضلكم السلام علیکم ورحمۃ اللہ
نادم ہوں کہ ویر کے بعد حاضر ہو رہا ہوں، رمضان المبارک سے کچھ دن پہلے والا نامہ مع رسالہ تسہیل قصد السبیل شرف افزا ہوا تھا، رسالہ تو اسی زمانہ میں ایک روز میں پڑھ لیا اور اس کے مطالب کو سمجھ لیا، رمضان المبارک کے ایام مبارکہ میں تکلیف دینے سے احتراز کیا اور مولوی ظفر احمد صاحب کو اس کی اطلاع اور رسالہ کی رسید بھیج دی، شوال میں خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر اوائل شوال سے آج سے چند روز پیشتر تک سفر میں گذرا اور موقع نہ ملا۔

لے کس قدر گھٹی ہوئی عبارت ہے اور معانی دیر پاہ کو نہ کر دیئے گئے ہیں۔ ایک بزرگ جو اس مکتوب کی تحریر کے وقت حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں حاضر تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ لکھ کر حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ میں نے مولوی صاحب کے لئے تصوف کا طرہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

(۳) از اشرف علی

خدمت مولانا دام مجیدم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دیر پرندامت کا ہستی غالباً احتمال ہے میری کلفت انتظار کا، اسی طرح رمضان المبارک میں خطاب سے سبکدوش رہنے کا ہستی بھی وہی احتمال ہے میری تکلیف کا اور ان احتمالوں کا سبب محض محبت اور اس محبت کا حق اپنے ذمہ یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو یہ اطلاع دے کر بے فکر کروں کہ مجھ کو بے حس کے سبب ایسا انتظار ہی نہیں ہوتا اور قلت اور او کے سبب رمضان میں بھی مکاتبت سے تکلیف نہیں ہوتی۔

(س) رسالہ تسہیل کو پڑھ کر سب سے پہلا اثر جو دل پر ہوا یہ تھا کہ یہ راہ سخت مشکل ہے دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ ان جزئیات فقہیہ کا جن کا اس میں ذکر ہے میرے لئے تحقیق طلب تھا۔ میں نے بات صفائی سے لکھ دی۔ ان اللہ لا یتحیی من الحق۔

(۱) تسہیل کا سبب تعبیر ہونا، اور جزئیات فقہیہ کا قابل تحقیق ہونا جو تحریر فرمایا گیا ہے اگر یہ اطلاع مکاتبت فی الباب کا خاتمہ ہے تو ط

صلاح ماہمہ آنست کاں تراست صلاح

اور اگر یہ اطلاع مکاتبت کی اطلاع اور اس کی مانعیت کا رفع مقصود ہے تو کسی قدر واضح تقریر کی حاجت ہے یعنی یہ کہ طریق میں کون امر دشوار معلوم ہوا اور کون مسئلہ سبب تبعاعد ہوا، تاکہ اذن جواب کا امثال کر سکوں۔

(س) رمضان المبارک کے عشرہ آخر میں بعد نماز صبح میں کچھ دیر کے لئے سوتا تھا میں نے اس میں دو خواب دیکھے، اپنے کو دیکھا کہ میں مدراس میں ہوں، حضرت والا بھی مع اپنے ہمراہیوں کے ایک مکان میں فروکش ہیں، آپ کے ہاتھ میں بہت بڑی تسبیح ہے آپ کے ایک ہمراہی مولوی ظفر احمد صاحب جو الگ بیٹھے ہیں جن کی وضع قطع، دار طھی کی تراش خراش اہل پنجاب کی سی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ اردو ادبیات پر گفتگو کی، مگر آپ

کے دوسرے ہر ایسی جو ضعیف العزم معلوم ہوئے وہ مصلیٰ بچھائے نہایت خضوع کے ساتھ مصروف نمازیں، ان کی نسبت معلوم ہوا کہ یہ آپ کے خادم خاص ہیں۔

اس کے دو دن بعد ۲۳ کو پھر اسی وقت خواب دیکھا کہ میں ریل میں سوار کہیں جا رہا ہوں کہ ایک جگہ گاڑی کھڑی ہو گئی، معلوم ہوا کہ یہ تھانہ بھون ہے، جی میں آئی کہ اتر جاؤں چنانچہ اتر گیا اور سامان لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا کہ یہاں تو جگہ بہت کم ہے یہاں نہیں ٹھہر سکتے، میں نے عرض کیا کہ اس کی فکر نہ فرمائیے میں نے راستہ میں ایک مسجد دیکھی ہے میں اس میں ٹھہر جاؤں گا۔

(۱) دونوں منقول خواب ذوقائشہرات میں مگر علمی کم مائیگی کے سبب باقاعدہ تعبیر سے قاصر ہوئے۔

(۲) میری حالت میں استقامت نہیں ہے اور اسی کی فکر مجھے رہتی ہے میری حالت یہ ہے، ۷

گئے برطانیہ اعلیٰ نشینم گئے برپشت پائے خود نہ بنیم
اس کے لئے دعا فرمائیے۔

(۱) استقامت کی نسبت جو تحریر فرمایا ہے اس کے امثال کے متعلق رقیہ سابقہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مقصود اور امور یہ اعمال ہیں، انفعالات نہیں۔ اگر یہ معروضہ رائے سامی میں مجمل ہو تو مفصل بھی عرض کر سکتا ہوں، دعا لاخوان کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

(۲) کسی مناسب دعا یا ورد کی تلقین فرمائیے۔

(۱) ورد کی تجویز میرے نزدیک اس کا درجہ تربیت میں مسائل زیر کلام کے بعد ہے

۷۷ تعبیر سے قاصر تو کیا تھے۔ البتہ اتم آثم کا گمان غالب یہ ہے کہ اول مرحل میں اس طرح کا رد کیا یا حقیقتاً اصولی جواب دینے میں حکمت یہ تھی کہ سالک کی نظر ابتداء تصوف کے غیر مقصود امور سے ہٹ رہے۔ واللہ اعلم۔

آگے جیسا ارشاد ہو، حاضر ہوں۔

(س) مولوی عبدالحی صاحب سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے دم آخر آپ کا ایک رسالہ بھیجا، "آئینہ تربیت" اور ساتھ دوسرے تیسرے دن وفات کی اطلاع ملی، غفرلہ الہد۔

والسلام

(د) رسالہ "آئینہ تربیت" مولانا کی یادگار ہے! مگر یہ صرف ایک مختصر فہرست ہے جو کہ مفصل مضامین دیکھنے کے بعد یادداشت کے لئے اشارات ہیں، وہ مفصل مضامین "تربیت السالک" میں ہیں۔ اطلاع عرض کیا۔ والسلام

ان تھانہ بھون۔ ۲۹ شوال ۱۳۴۸ھ

یہ مراسلت تمام تر صیغہ راز میں ہوئی تھی اور مناسبت کی جستجو اس کا محرک تھا، یکسوئی اب تک میسر نہیں آئی تھی، چنانچہ حضرت والا اپنے عم محترم سید عبدالحکیم مرحوم کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ بیتی کیفیت کا ایک زیر پردہ نظارہ باقی رہ گیا، روز بروز طبیعت کا رخ دوسری طرف ہوتا ہے، مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے خط و کتابت جاری ہے، خدا جانے توفیق ملتی ہے یا نہیں، معیار اتنا بلند ہے کہ نظر کہیں کم جاتی ہے، بہر حال کچھ نہ کچھ راز و نیاز کا سلسلہ جاری ہے یہ تمام تر راز ہے!"

۲ مئی ۱۹۳۰ء

غرض اس کیفیت قلبی کے ساتھ تین عریضے لکھے گئے، اور مرشد تھانوی نے ان کے جوابات عطا فرمائے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے پاس اس مراسلت کی جو نقل موجود ہے، اس کے ختم پر میں نے حضرت تھانویؒ کے قلم مبارک سے یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا کہ

لہ معارف بابت نومبر ۱۹۳۵ء

”پھر جواب نہیں آیا“

اس جملہ سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ قدس سرہ نے جواب کا انتظار ضرور فرمایا اور جب مدت تک خاموشی دیکھی تو یہ جملہ تحریر فرما کر نقل براسلت کو داخل دفتر فرمادیا،

رکاوٹ کیوں جواب نہیں آیا؟ اس کی وجہ میں نے حضرت والدہ سے یہ سنی ہے کہ اسی زمانہ میں تھانہ بھون سے رسالہ انور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے زیر ادارت نکلتا تھا اور اعظم گڑھ سے ”معارف“، جب جب حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں عرضہ لکھنے کا ارادہ ہوتا تھا، کوئی نہ کوئی اختلافی مسئلہ انور میں شائع ہو جاتا اور اس کی وجہ سے طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی ظاہر ہے کہ اس طرح کے مسلسل دوچار اتفاقات بھی پیش آگئے ہوں تو نفسیاتی طور پر مستقل تامل اور توقف کے لئے کافی تھے، کیونکہ اب تک نہ تو فریقین نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سمجھا تھا نہ جو خط و کتابت ہو گئی تھی وہ کسی عزم و ارادہ کے ماتحت تھی، جو کچھ ہوا وہ محض قدرت کا ایک لطیف اشارہ تھا کہ حق کے تلاشی کو آخر کار خفاقہ امدادیہ اور خاص دست اشرفی سے گوبر مقصود عطا ہوگا۔

پہلی ملاقات اور شیخ کا اثر ۱۹۳۴ء ختم اور ۱۹۳۵ء کے آغاز کا زمانہ تھا۔ حضرت والدہ اکبر اقبال مرحوم کی دعوت پر کسی

کیٹی میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے تھے، چونکہ اب تک حضرت مولانا تھانویؒ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لئے لاہور سے واپسی پر خیال آیا کہ تھانہ بھون کچھ دیر کے لئے اتر جائیں، چنانچہ یہ اندرونی تقاضا پورا ہوا اور مرشد تھانویؒ کی زیارت ہو گئی، اس ملاقات سے خود حضرت شیخ قدس سرہ نے جو اثر لیا اس کو خود انہی کے بچے تلے پر کیف الفاظ میں سینے، مولانا دیبا دی کے ایک مکتوب میں اس کا ذکر فرماتے ہیں۔

”مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے، میں مکان

پڑھتا، سنتے ہی حاضر ہوا، میرے ذہن میں ان کا جنبہ طویل و عریض تھا، ملا تو معتدل الخلق تھا پاکر قلب کو بہت اُنس ہوا۔ پھر ملاقات و مکالمت سے ان کو تواضع و سادگی و رعایتِ جلیس کو دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا۔ گیارہ بجے تشریف لائے تین بجے واپس تشریف لے گئے۔ مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا۔

یہ ثنا خوانی اور زبانِ اشرف سے جو حضرت سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کس کو نصیب ہوئی؟ یقین ہے کہ اس ملاقات سے جو اثر حضرت شیخ کے قلب مبارک پر ہوا، اسی طرح کا اثر حضرت والا کی طبیعت نے بھی قبول کیا ہوگا، اور اس کی وجہ سے امید کی جا سکتی تھی کہ جو رکاوٹ اختلاف مسائل کی وجہ سے پیدا ہو چلی تھی وہ دور ہو جاتی مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا، اس لئے اس اثر و تاثر کے باوجود ربط قائم نہ ہو سکا، طرح طرح کی مزاحمتیں پیدا ہوتی گئیں۔

غوغائے تکفیر | سرائے میر (اعظم گڑھ) میں ایک مدرسہ، مدرسۃ الاصلاح کے نام سے مولانا شبلی کے خاکہ کے مطابق قائم تھا، اس میں عربی، صرف و نحو کی دفتوں کو کم کر کے عربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور قرآن پاک کو تعلیم کا محور قرار دیا گیا تھا اور دوسرے علوم کو قرآن پاک کا خادم بنا کر سکھایا جاتا تھا، اسی لئے فلسفہ اور منطق کی دو راز کار کتابیں نصاب سے نکال دی گئی تھیں، اس مدرسہ کے ناظم اول مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولانا فراہی کی رحلت پر ان کی یادگار اور ان کی تصنیفات قرآنی کی اشاعت کے لئے مدرسۃ الاصلاح کے علماء نے ایک دائرہ لے کیے مفری ہیں وہ لوگ جنہوں نے بزمِ محبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سید صاحب گئے تو تھے ملنے کے لئے لیکن مولانا تھانوی نے بذورِ تصرف ان کو مسخر کر لیا اور از خود ان کو مرید بنا لیا، اس بیان میں اگر مولانا تھانوی کی شکایت ہے تو سید الامرتیت کے ذمہ عالی کا کونسا پاس دلچاظ ہے۔ ملاحظہ ہو حکیم الامت ص ۳۳۸

حمیدیہ قائم کیا اور اصلاح نام کا ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کیا گیا۔

مدرسۃ الإصلاح کی روز افزوں ترقی آس پاس کے دوسرے مدارس کے لئے جو دیوبند کے طرز پر قائم تھے رشک و حسد کا باعث بنی اور انہوں نے اس مدرسہ کو ناکام بنانے کے لئے مسلمانوں میں غلط افواہیں پھیلانی شروع کیں اور جب اس میں کامیابی نہ ہو سکی تو آخری حربہ کافرگری کا استعمال کیا گیا۔ تھانہ بھون، سہارن پور، دہلی، بمبئی اور دیوبند کے چند علماء کو مولانا شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کی چند بے محل عبارتیں دکھلا کر دونوں کی تکفیر کا فتوے حاصل کیا گیا اور جلسے کر کے ان مرحومین کے خلاف وہ شور و غوغا مچایا گیا جو شائستگی کے لئے بھی قطعاً زیبانہ تھا، تقویٰ کا معیار تو بہت ہی اعلیٰ و اشرف ہے!

اس آخری حربہ کے مقابل دائرہ حمیدیہ کے ارکان کی طاقت ناکافی تھی مولانا امین احسن اصلاحی نے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے درخواست کی کہ اب وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں، خود حضرت دالار کے قلب پر بھی اپنے محبوب استاد اور اساذ رحمہ کے ممتاز بھائی (مولانا فراہیؒ) کے خلاف اس ناحق ہنگامہ آرائی سے جو کچھ گزر رہی ہوگی اس کو ہر سعادت مند شاگرد محسوس کر سکتا ہے، مگر داد دیجیے سید عالی مقام کے حلم اور عالی ظرفی کو کہ زبان و قلم کی ساری قوت کے باوجود امکانی کوشش یہی فرمائی کہ کہیں چھوٹوں کی نادانی سے بڑوں میں آویزش پیدا نہ ہو جائے، اس لئے پہلے مولانا عبد الباقی صاحب ندوی کو جو اس وقت بھی حضرت تھانویؒ کے حلقہٴ اداوت میں داخل تھے ایک خط تحریر فرمایا کہ :-

”آج کل اعظم گڑھ میں عجب طوفان بہا ہے، مدرسہ سرسے میر کی مخالفت

لہٰذا یہ تفصیل میں نے نہیں لکھی ہے بلکہ یہ خود حضرت دالار کے اس مفصل شدہ کا مختص ہے جو غوغائے تکفیر

ہی کے سلسلہ میں معارف بابائے ماہ اگست ۱۹۳۶ء میں چھپا ہے۔

میں ایک دیوبندی مولوی صاحب جو مولانا تھانوی کے مرید ہیں، دیوبند اور
تھانہ جہوں سے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کی تکفیر کا فتویٰ
لکھ کر لائے ہیں اور جلسے کر کے دیوبندی لوگوں کو بلوا کر اس فتوے کی خوب
تشریح کر رہے ہیں، ہم عقیدت مندوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ ان دو
متضاد قوتوں میں تطبیق دے سکیں، دیوبند کو خیر مگر مولانا (تھانوی) کے
خلاف بولنے پر مجبور ہونا بڑی بدبختی ہے، خدا اس سے بچائے، آپ سے
کچھ بڑے سے کہیجئے۔

والٹیم سید سلیمان۔ ۲۵ جون ۱۹۳۶ء

خط کشیدہ جملہ کا منظر لفظ شرافت، صلح جوئی اور پاک مشرب کا کتنا بلند معیار پیش کر رہا ہے
اور مخالفت کے جوہر میں جذبات سے گریز کی یہ کوئی معمولی مثال ہے؟
مولانا عبد الباقی صاحب نے یقیناً اس سلسلہ میں کوشش فرمائی ہوگی اور
”حکیم الامت“ (مؤلف مولانا دریا بادی) کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا دریا بادی نے
بھی اس کا خیر میں پورا حصہ لیا، مگر بات غالباً کچھ بن نہ سکی، بالآخر حضرت والادہ کو قسمل
اٹھانا پڑا، اور اس انداز سے حضرت والادہ نے اس فتنہ کا جواب تحریر فرمایا جیسے کوئی ثالث
پورے سکون خاطر کے ساتھ حق کو عیاں کر رہا ہو، کسی پر شخصی حملہ نہیں، طنز و ایراد نہیں
بات صاف اور دلائل محکم!!

یہ مضمون رسالہ ”اصلاح“ باب نمبر یکم جمادی الاول ۱۳۵۵ھ سے پورا کا پورا ذیل میں درج
کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

”مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم پر غوغائے تکفیر“

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ مدرسوں کی باہمی رقابت کے سلسلہ میں علماء ایک

دوسرے پر تکفیر و تفسیل کے فتوے جاری کر کے مسلمانوں میں نت نئے اختلافات پیدا کر رہے ہیں اور امت مسلمہ کو سرگرداں و حیراں بناتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو حق اور کس کو ناحق سمجھیں، وہ مسائل جن کی تحقیق یا تغلیط علماء کی خاص مجلسوں میں ہونی چاہیے ان کو عوام میں پھیلا کر طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں، حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنا کسی کافر کو مسلمان کہنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔

مولانا شبلیؒ کی تکفیر

مولانا شبلیؒ کی تکفیر جن مسائل کی بنا پر کی گئی ہے وہ ان کے نہیں بلکہ ملحدین کے خیالات ہیں جن کو انہوں نے رد کے لئے نقل کیا ہے۔ بہر حال ان کے مفصل جوابات تو بعد میں شائع ہوں گے اس وقت مختصر یہ کہنا ہے کہ آج سے بائیس برس پیشتر ندوۃ العلماء کے اختلافات کے سلسلہ میں ندوہ کے اجلاس دہلی کے موقع پر ۱۹۳۲ء میں ان ہی علماء میں سے چند نے انھیں عبارتوں کو نقل کر کے مولانا پر تکفیر کا فتویٰ مرتب کیا تھا، اس وقت مولانا نے اپنے دستِ خاص سے ایک مختصر تحریر لکھ کر شائع کی تھی جو میرے پاس ہے اس میں مخالفین کے ان الزامات کی پوری تردید کر دی تھی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آگاہی کے لئے اس کو مع سوال و جواب کے شائع کر دیا جائے۔

لے انا للہ، یہ خدا ترسی اور حق پسندی کا کون سا درجہ ہے! (غ۔م)

تہ یعنی وفات سے چھ مہینے پہلے!

مولانا شبلی کے عقائد

بھرت مولانا شبلی صاحب، السلام علیکم

(۱) مجھے آپ سے چند سوال پوچھنے ہیں، اجازت ہو تو عرض کروں،
میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنی تصنیف الکلام میں مادہ عالم کو غیر مخلوق لکھا
ہے، کیا یہ آپ کا اعتقاد صحیح ہے؟ اور آپ نے اپنی تصنیف میں یہ مسئلہ اپنے
مذہب کا لکھا ہے یا کیا؟

(۲) کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں؟ کیا آپ یہ مانتے
ہیں کہ ہر ایک آدمی اکتساب اور محنت سے نبی ہو سکتا ہے؟ یا اسکی اصلیت
کچھ اور ہے؟

(۳) اس کے علاوہ اور بھی کوئی خیال آپ نے ایسا ظاہر کیا ہے جس کی شہادت
قرآن مجید اور صحیح احادیث سے نہ مل سکے؟
آپ جو کچھ جواب دیں گے، اسے میں پیبلک میں شائع کر دوں گا۔

عاجز

سید عبدالسلام، مالک مطبع فاروقی، دہلی

۳۰ جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ

الجواب

جناب میر صاحب! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

(۱) جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے، وہ ملحد اور
زندقہ ہے، میں مادہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں نہ قدیم بالزمان،

البتہ یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں، الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے اقوال ہیں اور اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

(۲) نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ وہ آلتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے، میں نبوت کو عطیہ الہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں۔ اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں جانتا۔

(۳) باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں، میں عقیدہ اور فقہاء دونوں لحاظ سے اہل سنت و جماعت سے ہوں۔

شبلی نعمانی، دہلی

خود الکلام میں جس کی ناقص عبارتوں پر فتوائے تکفیر کی بنیاد پر توحید کے عنوان کے نیچے مذکور ہے۔

”نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گودہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے، لیکن سب مل کر ایک ہے یعنی اس کل کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو“ (صفحہ ۶۱)

صفحہ ۶۱ میں ہے: ”خدا عالم کی علت تامہ ہے“

نبی کی حقیقت جیسا اوپر بیان ہو چکا اجزائے ذیل سے مرکب ہے، اس کے علوم و معارف آلتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں؛

کیا اس کے بعد بھی کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے؟

مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر

مولانا حمید الدین صاحب پر جو نہ صرف علم و فضل میں یکساں زمانہ تھے، بلکہ اپنی صحت، اعتقاد اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے خواص اُمت میں تھے بعض الفاظ کی بنا پر کفر کا فتویٰ مرتب کرنا حد سے زیادہ جرات ہے۔

مولانا کی دو باتیں تکفیر کا باعث سمجھی گئی ہیں، حالانکہ ان دو میں سے ایک بھی تکفیر کی مستوجب نہیں۔

پہلی بات کا منشاء یہ ہے کہ قرآن میں کہیں کہیں قافیہ کی رعایت اور عبارت کی روانی اور فصاحت کا لحاظ کر کے مروجہ عامہ اصول نحو کی پیروی نہیں کی گئی ہے یا لفظ آگے پیچھے کئے گئے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ جہاں کہیں ایسا ہوا ہے، ترجمہ میں بھی قرآن پاک کی بعینہ پیروی کی جائے اور لفظ کو آگے پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ کہ ترجمہ قرآن کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔

دوسری بات کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ قرآن پاک کی ہر بات کو مسلسل و مربوط و متحد المقصد مضمون کی حیثیت سے غور کرنا چاہتے ہیں ان کو ایک غلطی یہ پیش آتی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر سورۃ کا جو نام ہے وہی اس سورۃ کا موضوع ہے، حالانکہ یہ نام محض سورتوں کے امتیاز کے لئے ہر سورۃ کے کسی خاص لفظ کا لحاظ کر کے رکھ دیئے گئے ہیں، ان ناموں کو سورتوں کے موضوع

لے غلط فہمی تو مٹ سکتی ہے مگر ادنیٰ تعصب بھی ہر حال تعصب ہی کی ایک قسم ہے۔ اس کا ٹھکانا کوئی آسان بات ہے؛ اب بھی شبلی کے نام نامی کے ساتھ زندیق و ملحد کے القاب بے جا استعمال کئے جاتے ہیں، نہ معلوم اس وقت مسئولیت کا تصور ہمارے بزرگوں کے ذہن سے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ (غ۔م)

و مطلب سے کوئی تعلق نہیں، یہی مذاق عرب تھا، اور اس کی پیروی سورتوں کے نام رکھنے میں کی گئی ہے، گلستان، بوستان خدائی نامہ خالق باری، قادر نامہ، فارسی میں کتابوں کے نام ہیں، مگر ان ناموں کو کتاب کے موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح قرآن پاک میں پاروں اور رکوعوں کی تقسیم سے بعض طالب علم جو یہ سمجھتے ہوں اس پارہ پر یا رکوع پر مضمون ختم ہو گیا ہے، دوسرے پارے یا رکوع سے دوسرا شروع ہوتا ہے، ان کا یہ سمجھنا درست نہیں کیونکہ قرآن کی تیس پاروں میں تقسیم معنی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تلاوت کے لئے ہے تاکہ تیس دن میں قرآن کو برابر حصوں میں تقسیم کر کے ختم کیا جاسکے، اسی طرح رکوع کی تقسیم جس کا صحیح نام عشرات ہے یعنی دس دن آیتوں کا ایک ایک حصہ، معنوی تقسیم نہیں بلکہ لفظی ہے تاکہ نمازیں عام لوگ آسانی کے ساتھ قرآن کے ایک مناسب حصہ کو پڑھ سکیں، اسی لئے ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں چھپے ہوئے قرآن پاک میں یا تو رکوع کے نشان ہی نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو ہندوستان سے مختلف کیوں کہ آیتوں کے شمار میں اختلافات ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ غامض علمی بحثیں ہیں جن کو علم اہل جانتے ہیں، مگر مخالفت کا بڑا ہونا جو صحیح بات کے سمجھنے سے انسان کو ہمیشہ باز رکھتی ہے۔ فتوے میں مولانا شبیر احمد صاحب نے درست لکھا ہے کہ سیاق و سباق عبارت پر غور کر کے کسی عبارت کا مطلب سمجھا جائے مفتی صاحب نے افسوس ہے کہ اسی نکتہ پر غور نہیں فرمایا اور یہ وہی شکایت ہے حضراتِ فتویٰ اور ان کے اکابر کو علماء بریلی و فرنگی محل سے ہمیشہ رہی ہے پھر ہم گنہگاروں

کے معاملہ میں ان حضرات نے اس ضروری نکتہ کو کیوں فراموش فرمادیا

تمت

اپنے مخالفوں کا جواب حق کو اپنی تائید میں رکھتے ہوئے اس متانت و سنجیدگی اور اس علم و وقار سے کتنے ارباب علم و فضل دے سکے ہیں، ذرا اختلافی سرٹ پچراٹھا کر دیکھ جائیے تو کلک سیلانی کی عظمت نظر آئے گی۔

حضرت مولانا تھانوی کا رجوع | بہر حال یہ مضمون جب اہل علم و دیانت حضرات کے سامنے آیا تو انصاف پسند طبیعتوں کو حق

و باطل، اصلیت اور شور و غوغا میں امتیاز کا موقع ملا

سب سے پہلے وقت کی سب سے برگزیدہ شخصیت نے بلاتامل اپنے فتوے سے رجوع فرمایا، یہ وہی ہستی تھی جس کے خلاف قلم اٹھانے میں حضرت والدہ آمادہ تھے نہ اپنی تحریر میں اس سے شخصی خطاب کی جھلک بھی پیدا ہونے دی یعنی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی!

حضرت تھانوی کے رجوع کی یہ پوری عبارت ”حکیم الامت“ کے صفحات ۴۸۷ و ۴۸۸ پر موجود ہے، یہاں بنظر اختصار صرف متعلقہ جملے نقل کئے جاتے ہیں۔

ضمیمہ ثانیہ رسالہ الایضاح لما فی الافصاح

رسالہ مذکور کے ضمیمہ اولیٰ کی تحریر سے تقریباً ایک ہفتہ بعد میرے پاس سرائے میر اعظم گٹھ سے ایک جدید و مطبوع مضمون معنون بہ عنوان فلاں فلاں حضرات پر غوغائے تکفیر قوم جمادی الاول جس میں زید (مراد مولانا شبلی) و عمر (مراد مولانا فراہی) کے تبرہ کے متعلق توجیہات تھیں پہنچا، چونکہ میں عمر کے متعلق خود رسالہ الاصلاح میں اپنے دستخط سے رجوع کر چکا ہوں، اس حصہ سے متعلق تو مزید کسی تبرہ کی ضرورت

نہیں، البتہ اس ضمیمہ میں زید کے متعلق بنا بر کسی تاویل یا تبریہ کے معلوم نہ ہونے کے رجوع سے معدوری ظاہر کی گئی۔ زید کے متعلق کبھی اپنے دستخط سے رجوع کرتا ہوں، مگر زید کی جماعت کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ امت محمدیہ پر رحم کر کے نہ زید کی ایسی تصنیفات کو شائع کریں نہ ان کی حمایت کریں!!

اب اسی تحریر کا آخری جزو ملاحظہ ہو جس میں خود حضرت تھانویؒ نے نندوں کی سیر لٹائف کی متانت اور پاسِ ادب کو سراہا ہے، لکھتے ہیں:-

”اور چونکہ میں اس رائے کو حق سمجھتا ہوں، اگر اس میں مجھ کو بدنام بھی کیا جائے، جس سے مجھ کو اب تک غایت تہذیب کے سبب بچایا گیا ہے جس کی مجھ کو خاص قدر ہے، جزا ہم اللہ تعالیٰ۔ تب بھی یہی عرض کر دوں گا کہ گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان مافیٰ خواہیم ننگِ دنام را والسلام خیر الختام ولیکن هذا آخر الکلام فی هذا المرام وافوض امری الی اللہ فی کل قال ومقام۔ آخر الاسبوع الاول من جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ

ہمارے حضرت والدہ کو اس رجوع کے بعد کسی اور کی فکر نہ رہی اور ماہنامہ معارف بابہ ستمبر ۱۹۳۶ء کے شذرات میں بڑے ہی انبساط اور جذبہ قدر دانی سے اس کا اعلان فرمایا، وہ شذرہ یہ ہے:-

”مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر کے فتوے چرن لوگوں نے دستخط کئے تھے، ان میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی تھی، مولوی عبد الماجد دیوبادی اور دوسرے دوستوں کے خطوط اور اخبار صدق اکھنؤ سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ

حضرت مولانا نے فتوے کے بعض جوابی مضامین پڑھنے کے بعد اپنے
مسک تو سح کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کی تکفیر کے فتوے سے رجوع
فرمایا۔ اس زمانہ میں جب کہ اعتراف حق کبریت احر ہے، حضرت
مولانا تھانوی کی یہ حق پسندی بے حد قابلِ قدر ہے!“

پھر گلہ بید یعنی نومبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں اس سلسلہ کا دوسرا شذرہ تحریر فرمایا
جو یہ ہے:

”مولانا شبلیؒ و مولانا حمید الدینؒ کے فتوائے تکفیر پر دستخط کرنے والوں
میں دوسری اہم شخصیت جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تھی
موصوف نے حقیقت حال سننے اور مولانا شبلی کی آخری تحریر دیکھنے کے
بعد اپنے فتوے سے رجوع فرمایا، مولانا حمید الدین صاحب کے دونوں
فردوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کو زیادہ سے زیادہ نقص تعبیر یا
سماحت بیان کہہ سکتے ہیں، ان سے کفر لازم نہیں آتا، ان کی پوری
تحریر اخبار صدق لکھنؤ میں چھپی ہے۔ مولوی محمد طیب صاحب دیوبند
نے بھی رجوع کیا، انہوں نے اپنا خط مدینہ منورہ میں چھپوا دیا ہے،
اسی طرح مولوی لطف اللہ صاحب شاہچہا پوری مدرس ذکر یا مسجد بنوی
نے بھی رجوع فرمایا، ان کا خط الاصلاح سرائے میر میں چھپا ہے، فالجیؒ

ایک اور ناخوشگوار واقعہ | خدا خدا کر کے ایک غلط فہمی مٹی تھی اور فتنہ تکفیر

ابھی دبا ہی تھا کہ تین مہینے کے اندر ہی اندیا ایک
اور ناخوشگوار صورت حال پیش آئی، جس میں حضرت مولانا تھانویؒ کی شخصیت کو
پھر سیر بنانے کی کوشش کی گئی۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں مولانا شوکت علی مرحوم اور فقیہ الامت مولانا کفایت اللہ

دہلویؒ کے اصرار پر حضرت والاؒ نے آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت قبول فرمائی۔ یہ اوج سلیمانی بعض نظروں میں بُری طرح کھٹکا، ایک دہلوی اہل قلم نے ۵۰ صفحہ کا رسالہ علامہ سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں کے زیر عنوان لکھ کر عین اس کانفرنس میں عام کیا، اس رسالہ میں حضرت والا کی تھانیف سے گیارہ غلطیاں فراہم کر کے یہ الزم لگایا تھا کہ ان کی تحریروں سے اتحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، اس رسالہ کے آغاز پر ایک تائیدی رائے حضرت تھانویؒ کی بھی تھی جو محض مؤلف پر اعتماد کر کے تحریر فرمائی گئی تھی، حضرت تھانویؒ کے سامنے مولانا سلیمان ندوی کی اصل تحریرات قطعاً نہ تھیں۔ البتہ اسی پر ایک تقریظ مفتی کفایت اللہ صاحب کی بھی ہے جس میں مفتی صاحب فرحوم نے اپنے قلم کو اس اظہار کے ساتھ بچایا ہے کہ چونکہ میں مصنف (سید سلیمان ندوی) سے ذاتی طور پر واقف ہوں اس لئے جو باتیں ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں ان کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

دسمبر ۱۹۳۳ء کے معارف میں حضرت والاؒ نے ان اعتراضات کا مدلل جواب تحریر فرمایا اور اس کا شبہ اظہار بھی فرمایا کہ یہ رسالہ کئی اور کے اشادہ پر لکھا بلکہ غالباً لکھوایا گیا ہے، مؤلف رسالہ حضرت والاؒ کے جواب کا جواب دینے سے عاجز تھے، لاچار انہوں نے علمی محاذ چھوڑ کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت والاؒ کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر کے ہر جانب سے کامطالبہ پیش کیا، جس سے دیکھنے والوں نے سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت والاؒ نے اس میں جو خطبہ پڑھا وہ دنیائے اسلام میں مقبول ہوا مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ ان کا شکریہ ادا کیا (سلمان نمبر معارف ص ۳)

یہ رسالہ میں نے آج سے کوئی بارہ چودہ برس پہلے حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا۔

یہ اشارہ حضرت تھانویؒ کی طرف نہ سمجھا جائے بلکہ کوئی اور شخصیت مراد تھی !!

کے سامنے ان کی حسن نیت اور قرآن دانی کھل کر آگئی۔ حضرت والا کو ایک عدالتی سمن کے ذریعہ دہلی کی عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کی گئی لیکن دہلی کے مشہور وکیل جناب عبدالرحمن صاحب کی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا اور سید صاحب کو عدالت میں حاضر ہونے کی نوبت نہ آئی۔

الحاصل اس ساری ناخوشگوار تفصیل کو بادلِ نخواستہ دہرانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ قارئین باتمکین یہ دیکھ سکیں کہ بیٹھے بٹھائے کیسی صورتیں پیدا ہوتی ہیں، تیلخیاں حضرت والا کے طبی میلان اور عقلِ رحمان کے باوجود ان کے خانقاہ امدادیہ اور ذاتِ اشرف سے ارادت میں رکاوٹ بنی رہی، اور یہ عین مقتضائے بشریت تھا کہ ایسے موقع پر عقیدت کا ہاتھ بجائے آگے بڑھنے سے کھینچا رہتا۔ یہ تو حضرت سلیمانؑ کی کا حوصلہ تھا اور کمالِ بے نفسی کہ جب کس اور جگہ اپنی باطنی تشفی کا سامان نظر نہ آیا تو گزشتہ اختلافات کو یکسر بھلا کر حضرت حکیم الامت کے کمالاتِ احسانی کے آگے خود کو بھکا دیا اور اس کی کوئی پرواہ نہ کی اس جبر سے علمی دنیا میں کیا تہلکہ مچے گا! کوئی ایشاد بے نفسی کی نظیر تو پیش کر دکھائے!

اس دور کا ایک رُوحانی کرشمہ

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں نادر خان شاہ افغانستان کی دعوت پر حضرت والا افغانستان تشریف لے گئے، یہ بڑی سفر تھا۔ واپسی میں مختصر سا قیام شہر ملتان میں بھی ہوا اور یہاں کی اس سفر کی تفصیلات خود حضرت والا نے تحریر فرمائی ہیں جو سفر نامہ افغانستان کے زیر عنوان پہلے معارف میں چھپی تھیں اور پھر نقیب ایڈیٹیو جید آباد دکن (منقول شدہ کراچی) نے انکو کتابی شکل میں سفر نامہ افغانستان کے نام سے شائع کیا۔ یہ سفر نامہ تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے نہایت اہم اور دلچسپ ہے!

لہ سلیمان نمبر معارف (صفحہ ۳۰ و ۳۱)

مشہور خانقاہ بہاء الحق اور مرقد شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی ملتانی کی زیارت بھی حضرت والا نے فرمائی، مرقد شیخ پہنچ کر حضرت والا کے قلب مصطفیٰ نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کو خود صاحب مشاہدہ کی زبان میں سنیتے فرماتے ہیں۔

"میں سیدھے حضرت کے مزار پر گیا، دعا مانگوں پڑھی، مقبرہ کے اندر خاصی تاریکی تھی تاہم آنکھیں بند کرتے ہی ایک نور سا چمک گیا، سہروردی خاندان کا سرتاج یہاں محو استراحت ہے، میں سبب نہیں جانتا تاہم دل نے ایک اثر محسوس کیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹھٹھک گئے۔"

(سیر افغانستان ص ۱۹۱-۱۹۲)

روحانی مناسبت کی یہ چمک اور اثرات ایک مجلی قلب اور مرکز نفس ہی دیکھ و محسوس کر سکتا ہے اور حضرت والا جیسے عاشق سنت کی روح کو یہاں مناسبت حاصل نہ ہوتی تو اور کہاں ہوتی کیونکہ ایک طرف تو خود سلسلہ سہروردیہ کا طفرائے امتیاز ہی سنت نبویؐ کا کمال اتباع ہے اور اس کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کے متعلق تو حضرت مجدد الف ثانیؑ کی کشفی شہادت بھی موجود ہے کہ:-

"اور ادرجہ شریعت غرق یافتہ"

پھر خود شیخ زکریا ملتانیؒ کے متعلق بھی حضرت والا نے تحریر فرمائی ہے کہ:-

"کتبتہ میں کہ اسکی یعنی خانقاہ بہاء الحق تعمیر حضرت بہاء الدین زکریا نے خود کرائی تھی اور یہاں بیٹھ کر چالیس برس تک حدیث کا درس دیا تھا۔" (سیر افغانستان ص ۱۹۱)

غرض اس واقعہ سے حضرت والا کے قلب کی جلا اور نفس کا تزکیہ نمایاں ہے، البتہ میں سبب نہیں جانتا، والا جملہ بھی بڑا معنی خیز ہے، یعنی اسرار و رموز باطنی کا ادراک الہی تک حاصل نہیں ہوا تھا، اسی دریافت کیلئے کسی دیدہ و درک رفاقت مضطرب کئے ہوئے تھی مگر ذوق اس قدر بلند اور سنت کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا کہ اس کے نفس کے سامان کہیں نظر نہ آتے تھے، کامل دس سال اس تلاش و جستجو کی نذر ہو گئے!!



حیاتِ نو مجھے اُن کی نگاہِ ناز نے بخشی
بھرا ہے آبِ حیاں کا سُنہرلا بل میں
(سید سلیمان)

باب چہارم

حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت و خلافت

اور حضرت تھانویؒ کی رحلت

۱۹۴۳ء

تا

۱۹۳۸ء

حکیم الامتؒ سے رجوع اور بعیت

شیخ کی تلاش برابر جاری تھی اور اب تو اس جستجو میں دس سال گزر چکے تھے چونکہ قلبِ سیمائی کو اصل کشش حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی ذاتِ اقدس سے تھی، اس لئے اس ساری مدت میں ہر پھر کر نظر خانقاہِ امدادیہ (تھانہ بھون ہی پر پڑتی تھی ادیبی اشارے بھی اسی سمت کو متعین کر رہے تھے، چنانچہ گزشتہ باب میں جو مراسلت (حضرت والارہ اور حضرت تھانویؒ کے درمیان) درج ہو چکی، اس میں بھی دو خواب صاف طور پر اسی کے مؤید تھے، یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔

حضرت حاجی صاحب کی زیارت | اب یہ ہوا کہ ایک رات عالم رویا میں
 شیخ العرب والجم حضرت حاجی امداد اللہ
 صاحب مہاجر مکی کی زیارت نصیب ہوئی حضرت سیدی نے اپنی انگشتِ شہادت سے
 اپنے سینہ کی طرف اور پھر حضرت حاجی صاحب کے سینہ فیض گنجینہ کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے عرض کی :-

”اس کو ایسا کر دیجئے“

شیخ الشیوخ قدس سرہ مسکرائے اور ارشاد فرمایا :-

”اب تو میں ایسا نہیں کرتا“

حضرت والارہ فرماتے تھے کہ جب آنکھ کھلی تو اس خواب کی تعبیر یہ ذہن میں آئی کہ حضرت
 حاجی صاحب چونکہ عالمِ ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہیں اس لئے ان کو عذر ہے
 اور اب ان کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہیئے۔

انتخابِ شیخ | ہندوستان میں اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ ارشد

تہا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ہی تھے اور انہی کی ذات بابرکات سے خاتماہ امدادیہ تھانہ بھون کو وہ مرجعیت حاصل ہو گئی تھی جو گیارہویں صدی کے آغاز پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ذات اقدس سے سرمد کو حاصل تھی، لازمی طور پر حضرت کے قلب و نظر نے پھر ذات اشرف ہی کی طرف جاذبیت محسوس کی اور ایسی جاذبیت جس نے رجوع پر مجبور کر دیا۔

باطنی اسباب تو یہ ہوتے رہے، اس کے کچھ ظاہری اسباب بھی پہلے ہی سے موجود تھے، یعنی حضرت والدہ کے دو مخلص احباب مولانا دریا بادی اور مولانا عبدالباری ندوی پہلے ہی سے تھانوی چشمہ فیض پر پہنچے ہوئے تھے اور ازراہ محبت و اخلاص حضرت والا کو بھی اپنا ہم شرب بنانا چاہتے تھے خصوصاً مولانا عبدالباری تو اس معاملہ میں مضطرب تھے چنانچہ لکھتے ہیں:-

”آخر اپنے اس مرض ”خیر خواہی“ سے مضطرب ہو کر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کر دیا، ابتداء غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، وہیں یہ تعاضا قلب میں تیز ہوتا جاتا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم و قلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے استفادات کا سونا یہاں کی ایک آرنج میں انشاء اللہ کندن ہو جائے گا، الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔“

عرض ظاہری موثرات اور باطنی تقاضوں سے مجبور ہو کر حضرت والدہ کی نظر انتخاب مرشد تھانویؒ کو قبول ہی کرنے والی تھی کہ اسی دوران میں ایک صاف و صریح اور سچا خوب لہ اس لفظ پر مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ کا فٹ نوٹ یہ درج ہے: ”ظاہر و باطن کے اس سراپا ربین میں اس مرض کی تشخیص بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تھی۔“

لہ میرۃ السید کے کچھ انمول سبق۔ سلیمان نمبر معارف ص ۹

یہ دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا تھانویؒ تشریف فرما ہیں اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ خود حضرت والا بیٹھے ہوئے ہیں، یکا یک مولانا مدنی اپنی جگہ سے اٹھے اور حضرت والا کا ہاتھ پکڑ کر مرشد تھانوی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

”ان کو میری طرف سے قبول فرمائیں“

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس رویائے صادقہ کے بعد حضرت والا کو یکسوئی حاصل ہوئی اور مرشد تھانوی قدس سرہ کی حلقہ بگوشی کا عزم فرمایا۔

جولائی و اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا عبدالباری ندوی مظلہ تھانہ **عزم تھانہ بھون** بھون میں مقیم تھے، اس مرتبہ کھل کر اور اصرار سے حضرت والا کو لکھا کہ ”بس اب میری اس حاضری کے زمانہ میں بہت فرما کر آہی جائیں“ اس اصرار کی وجہ بھی خود مولانا ہی کی زبانی سنئے :-

”اصرار کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلہٴ علامت طول پکڑتا جا رہا تھا اور ڈرتھا کہ کہیں یہ آفتاب ارشاد و تربیت لبِ بام نہ ہو۔“

ادھر حضرت والا خود آمادہ ہی تھے، مولانا کو جواب تحریر فرمایا کہ :-

”لفافہ ملا، میں آپ کے حرف سے متفق ہوں، کل صبح انشاء اللہ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوتا ہوں، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵ اگست تک وہاں (تھانہ بھون میں) رہیں گے، انشاء اللہ شاہد رہ لائن ریلوے سے ۱۱ اگست کی شام کو پہنچتا ہوں، دو روز ٹھہروں گا اور پھر ظرف فائدہ اٹھاؤں گا۔“

۱۔ سلیمان نمبر معارف ص ۶۸۶

۲۔ سلیمان نمبر معارف ص ۶۹۱

چنانچہ پروگرام کے مطابق حضرت والا عازم سفر ہو گئے اور چپ چاپ بیٹھنا بھونپہنچ گئے، مگر حکیم الامت سے یہاں ملاقات مقدر نہ تھی، حضرت حکیم الامت اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

لکھنؤ میں مرشد تھانوی سے رجوع | تھانہ بھون میں مرشد تھانوی کو نہ پا کر حضرت والا لکھنؤ پہنچے، حکیم الامت کا قیام یہاں مولوی محمد حسن صاحب کا کوہ دی کے مکان پر تھا، بیماری کے سبب سے عام ملاقات کا سلسلہ تو بند تھا، البتہ مخصوص حضرات جیسے خواجہ عزیز الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے لئے حاضری پر امتناع نہ تھا، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے بغرض رجوع آمد کی اطلاع جب حکیم الامت کی خدمت میں پہنچی تو فوراً بلا لیا گیا اور ان کی ہی درخواست پر تربیت کی خدمت بلاتامل قبول فرمائی گئی! اس طرح دس سالہ تلاش شیخ وسط اگست ۱۹۳۸ء میں بار آور ہوئی۔

جستجو آج وہاں پر مجھے لے آئی ہے خود جہاں حسن محبت کا تاشائی ہے

ایک مجذوب کا افتائے راز | حضرت والا کے اس رجوع کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا اظہار دلچسپی اور بصیرت سے خالی نہ ہو گا، حضرت تھانوی قدس سرہ جب لکھنؤ تشریف لے گئے تو تھانہ بھون میں ایک مجذوب نے آپ کے کسی مرید سے پوچھا کہ تمہارے پیر کہاں گئے ہیں؟ _____ انہوں نے فرمایا کہ اپنے علاج کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں، اس پر مجذوب نے ایک تہقہہ لگایا اور کہا۔

”علاج و لاج تو ایک بہانہ ہے، وہ تو ایک شہباز کے شکار کو گئے ہیں۔

اور شکار کر لائیں گے!“

لے تھانہ بھون اور پھر یہاں سے لکھنؤ تک کا سفر حضرت والا نے تھانے دار المصنفین بلکہ اہل غایۃ کے معنی رکھا تھا اور اس کی کچھ وجوہیں

چنانچہ جب شہباز علم و دانش کے رجوع کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی تصدیق کرنی پڑی کہ **قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید**

اور اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے تمام عارفین اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیشہ پیاسا ہی پانی کی طرف نہیں جاتا، بلکہ خود پانی کو بھی کبھی پیاسے کی تلاش ہوتی ہے۔

تشنگان گر آب جو سندر از جہاں

آب ہم جوید بعالم تشنگان (رومی)

خود حضرت والا کی تصدیق | مولانا عبد الباقی صاحب ندوی کے قلم سے اسی حقیقت کی تائید میں خود حضرت والا کا ایک

مکتوب نقل ہوا ہے اور اس تہیدی عبارت کے ساتھ کہ:-

”کچھ غیبی کشش پہلے سے بھی تھی جس کا ایک والا نامہ میں اس طرح اظہار فرمایا کہ:-

”مولانا گیلانی نے مجھے لکھا ہے کہ سنا آپ نے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، میں نکھنے والا تھا کہ ہاتھ گواہ بھی دیا ہو نہ دیا ہو، مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا، پھر مجھے فہم یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا تھا نوئی کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھا نوئی نے بار بار اپنی طرف کھینچا۔ (بعالم رویا)“

مناسبت کا فوری اثر | بہر حال اس ملاقات اور تعلق ارادت کے ساتھ ہی پیر و مرید کی مناسبت نے جذب و اثر کا حیرت انگیز

لہ یہ روایت مجھ کو ڈنٹھ اور معتبر راویوں یعنی حضرت حاجی عثمان خاں صاحب مرحوم اور مخدومی ڈاکٹر صاحب مدظلہ سے ملی اور شبہ کے احتمال سے پاک ہے۔

سے سلیمان نمبر معارف ص ۹۵۔

کرشمہ دکھایا، روحانی یگانگت نے پچاس پچپن سالہ یگانگی کو یکسر جھٹلادیا، غیریت کا کوئی حجاب اب باقی نہ تھا، چار دن کے محقق قیام لکھنؤ کے بعد حضرت والا نے اپنے جس تاثر کا اظہار فرمایا ہے وہ قابلِ دید ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

”لکھنؤ میں چارہی روز صحبت رہی مگر مولانا (تھانویؒ) کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی اور آخراں کی ہدایت کے بموجب اور آپ (مولانا عبدالباقی) کا مشورہ تو پہلے ہی تھا، باب مکاتبت دا ہے اور اب تو وہی وہ ہیں۔ طے آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معائنہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمے تک نوبت آتی ہے۔۔۔

تم میسرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
بہر حال اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے
وہ پہنچائے گا، دعا کیجئے!

مولانا کے مواعظ و رسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے مطابق پائے اور احوال و کیفیات میں اُن سے نئی نئی گریں کھلتی ہیں
افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل و محروم رہا؟

”اتنے دنوں کیوں غافل رہا“ کے خیال نے سالک کی طلب بے انتہا تیز کر دی تھی، ایک لے اللہ اللہ پہلا ہی قدم فتاویٰ الشیخ کے زینہ پر! جس کے اوج کی یہ ابتدا ہو اس کے لئے منازل کی رفتار کو برقِ نظر بھی کیا پاسکے؟ اور اس کے مقامِ منتہا کو کیا دیکھ سکے؟ سلوکِ سلیمانی کو سمجھنے سمجھانے کا خیال ایک خیالِ غام اور جسارت بے جا نہیں تو اور کیا ہے؟ اس حوصلہ کو دیکھئے اور خود کو دیکھئے۔

نہ نگاہِ حقیقت پر کسی جی ہوئی ہے اور دل رحمتِ باری سے کس قدر لرز رہے۔

کے علمی مذاق کے اس اکثری توافق پر حضرت والا ہمیشہ مسرور نظر آئے۔

کچھ یہ مواعظ اثرِ فنیہ کی زندہ کلامت ہے کہ ان کے مطالعہ سے سالکین کی ہر الجھن دور ہو جاتی ہے۔

جگہ شیخ سے فرماتے ہیں ۷

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں
ہو عطلے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے
اب حضرت والا کی طبیعت دفعۃً بدل گئی، وہ عارفِ رومی کے اس
تبذیلی احوال | شعر کا مصداق بن گئے کہ ۷

صد کتاب و صد ورق در ناز کن
سینہ را از نور حق گلزار کن
چنانچہ مولانا عبد الباقی ندوی مدظلہ ہی کے موسومہ مکتوبات کے دو اقتباسات سے
اس کی کھلی تصدیق ملتی ہے۔

”(۱) دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور پر سمجھ میں نہ آتی تھی وہ عملاً سمجھ
میں آگئی اور اب تلافیِ مافات میں مصروف ہوں لعل اللہ یرزقنی
صلاحاً، ۷

(۲) اب نہ دار المصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے نہ علمی مقالات
و تصنیفات سے، چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے اور گھر میں اُمانت
بھی نہیں، اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں، خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترک
تعلق کر سکوں“ ۷

۷ اس مصرع کو بہت غلط سمجھا گیا اور صوفیاء پر ناحق اور ناروا تنقید کی گئی، یہاں ”صد کتاب و صد ورق“ کنایہ ہے دو
قباحتوں کی طرف ”اولاً“ ”دعائے علم“ اور جہاں یہ نہ ہو تو پھر لذتِ علم جس کے کھوٹے بغیر غافل نہیں ملتا کیونکہ ہر لذت
غیر طالبِ حق کیلئے ایک حجاب ہے۔ عارفِ کامل حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ساجد کی یہ قول شہو یہ کہ طالبِ مذت
طالبِ حق نہیں اسی لئے صوفیائے کرام کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ادعائے علمی کہ جسکو ہر علم فطرتِ انسان بوجہ جہل و درمذت علمی
کو بھی جس کی بُرائی فوراً سمجھ میں نہیں آتی، دور کر دینی چاہیے۔

۷ علامہ صاحب کا تخریج، ناغتبہ و ادبِ اولیٰ لا بصائر ۷۷ میلان نمبر معارف ۷۷۔

دوسرے اقتباس کا لفظ لفظ اس حال کا آئینہ ہے جو ایک سالک کو معلوم کو مشہود پانے کی سعی میں طاری ہوتا ہے لیکن کسی حال کو بھی قیام نہیں چنانچہ برس ڈیڑھ برس بعد پھر حضرت والاؒ کے اس حال میں تغیر آگیا، وہی تغیر جس نے امام غزالیؒ کو ترک تصنیف و تالیف کے بعد احوال العلوم کی ترتیب و تدوین پر مجبور کر دیا تھا (اس کی تفصیل آگے آئے گی)۔ مگر آج تک بعض لوگ نادانستہ طور پر اور بعض ”دروغ مصلحت آمیز“ کے اصول کے ماتحت اسی کیفیت اور اسی حال کو حضرت والاؒ کی دارالمصنفین سے مفارقت کا سبب بتاتے ہیں جو واقعہ کے یکسر خلاف ہے۔

بہر حال اب دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی، فکر و نظر کی قدیں بدلیں، اپنی اس حالت کا نقشہ مولانا مسعود عالم مرحوم کے ایک خط میں بھی حضرت والاؒ نے ہی ایجاز کے ساتھ کھینچا ہے معنویت کے ساتھ اعجاز بیان بھی ملاحظہ ہو۔

”واہ واہ کا مزہ بہت اٹھا چکا، ادب اب یہ رنگ دل سے اتر چکا اب تو آہ آہ کا دور ہے اور اپنی پچھلی تباہی کا ماتم اور آئندہ کی فکر دیش ہے۔ یہ آہ آہ (یعنی کثرت استغفار و ذکر) اس درجہ بڑھی کہ دارالمصنفین کے ایک رفیق نے مجھ سے فرمایا کہ ”دارالمصنفین کے در و دیوار پر اس کا اثر چھا گیا تھا“۔ اسی کی شہادت اور رفقائے دارالمصنفین کے بیان سے بھی ملتی ہے، چنانچہ سید صالح الدین عبد الرحمن صاحب کا بیان ہے:-

”اس تعلق کے ساتھ سید صاحب کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اگرچہ ان کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گزری تھی، لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری میں تقویٰ و تودرغ کا ادا

۱۔ اسکی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مولانا عبدالباری ندوی کا مضمون شائع شدہ ماہنامہ ”فانِ کراچی“ بابۃ ماہ دسمبر

۱۹۵۵ء۔ مکاتیب سلیمان مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم مکتوب، ۱۱۹۔

بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہو گیا، عبادت و ریاضت بڑھ گئی، ذکر خنی کے ساتھ ذکر حلی بھی کرنے لگے۔ تقریر و خطابت نے وعظ و پسند کی شکل اختیار کر لی، زیادہ وقت علمی مذاکروں کے بجائے رشد و ہدایت میں صرف ہونے لگا۔

اور مدیر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد دوی نے لکھا ہے کہ:-

”وہ صبغة اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے، ومن احسن من اللہ صبغة اور ان میں بڑا روحانی انقلاب ہو گیا تھا، ان کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہو گیا اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا۔“

حضرت والدہ کے داماد محترمی جناب سید حسین صاحب نے جو خود بھی حضرت تھا تو ہی کے دست گرفتہ ہیں حضرت والا کے تبدیلی احوال کا بڑا جامع نقشہ کھینچا ہے لکھتے ہیں:-

”پہلے دارالمصنفین کے کاموں سے خالی اوقات کا کافی بڑا حصہ اہل و عیال کے ساتھ دینی مذاکرہ میں صرف فرماتے یا چھوٹے بچوں سے بذلہ سنی میں، اب اوقات کا بڑا حصہ غفلت میں گزرتا، خواہ مسجد میں ہو یا اپنے مسکنہ نکرے میں۔ پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دارالمصنفین کے ساتھ نوش فرماتے اور مغرب تک ان سے مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے یہ مجلس بھی ختم ہو گئی۔ کبھی اعزہ اہلیہ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے، عرصہ ہوا ان کی صحبت میسر نہیں آئی تو وہ جا کر غفلت سے آتیں اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل و عیال اور احباب

کی درخواست آپ کم مستر فرماتے تھے، اس لئے ان کی دلجوئی و استقامت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر و عافیت و بیافیت فرماتے اور جلد ہی کہیں اٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا تو تھوڑی دیر کے لئے ٹک بھی جاتے لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا کہ —

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا

اب میں تمہارے کام کا ہسم نفس نہیں ہا (محبذوب)

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک کر دیا اور حضرت قبلہ کا اہل و خیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا، باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے۔ ایم۔ اے وغیرہ کے امتحانات کی متعنی وغیرہ سب چھوڑ دی، اور دارالمصنفین کے کام کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے۔

خورد و نوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہو گئی پہلے کے لباسِ فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے، ناؤد شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کپڑوں ہی نے چاٹ لیا اکثر اہلیہ محترمہ یاد کر کے ہر دم سرے دن کپڑے نکال دیتیں اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انھیں خیال نہ رہتا تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جنہیں مزاج مالی میں درخور تھا، کبھی یہ عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ ہے، تو مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں، یاد نہیں رہتا، آپ یاد دلادیا کریں —

ای۔ ایم میں دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آئے، آپ بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے کبھی بعد نماز مغرب دارالمصنفین

کی مسجد کی شمالی چار دیواری پر ایک کونہ میں ذکرِ حق میں مشغول ہوتے، کبھی مکانِ مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے، کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے۔ کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں، فرما دیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا جاتا یا قالین کی جانماز بچھا دی جاتی سردی کا موسم ہے، ٹھنڈک نہ لگ جائے فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے

یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور میں نفاستِ مزاج میں مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کی مثال اور ظاہری و باطنی حسنِ اخلاق کا مجسمہ تھا جس کا رہن بہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا۔

ایک اور خاص کیفیت جو ارادت کے تعلق کے بعد ظاہر ہوئی وہ جذباتِ شوق کا وفور تھا جو جب سینے سے اٹھ کر زبان پر آتے شعرِ عربی نہ نکلتے تھے، چنانچہ خود صاحبِ کلام کو حیرت ہے، فرماتے ہیں۔

نغمۃ اللہ سے طبعِ حزیں موزوں ہوئی
جو کبھی گاتی نہ تھی وہ وجد میں گانے لگی

اور پھر فرماتے ہیں۔

فیض ہے یہ کس دلی وقت کا اب مرا جو شعر ہے الہام ہے
یہ بھی حضرت والاؒ کی زبانِ صدق سے سنا ہے کہ
میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والاؒ تھانوی قدس سرہ کے تعلق

سے ہوا اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہو گیا، بعد میں مشکل سے دو چار غریب ہوئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت کی موجودگی میں جذبات کا دفر رہتا تھا، جو پھر باقی نہ رہا۔

اسی حقیقت کی ترجمانی ان اشعار میں بھی فرمائی ہے

جو شعر بھی سپرد قلم کر رہا ہوں میں سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں
دیوانہ گانِ عشق کو دیکر صلائے عام آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں
اس لئے یہ انتباہ بھی کر دیا ہے کہ

سمجھیں میرے کلام کو جو ہوشمند ہیں مستی مری یہ یادۂ انگور کی نہیں

غرض لکھنؤ کی مذکورہ حاضری کے بعد حضرت والاکلیطیت
درخواستِ نصیحت | اب پوری قوت کے ساتھ اپنے شیخِ عالی مرتبت سے اخذ

فیض کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ذوق و شوق نے بار بار تھا نہ بھون کی حاضری پر مجبور کر دیا اور
شیخ کے مخصوص الطاف سے برسوں کے مراحل منٹوں میں طے ہونے لگے۔

ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ ”ایک مرتبہ حضرت سید صاحب خانقاہ تھا نہ بھون
تشریف لائے، محفلِ خاص آراستہ تھی، سید صاحب حضرت مولانا تھانوی سے متصل
بیٹھے ہوئے تھے، چپکے سے سید صاحب نے کوئی بات حضرت شیخ کے گوش گزار فرمائی اور
کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حضرت شیخ قدس سرہ نے سید صاحب کے کان میں کچھ ارشاد فرمایا،
ہم لوگ یہ عرض و ارشاد کوسن نہ سکے، مگر دیکھا یہ کہ دفعۃً سید صاحب پر گریہ طاری ہو گیا
یہاں تک کہ سسکیاں بندھ گئیں، پھر سید صاحب رخصت ہو گئے، ساری محفلِ محو حیرت
تھی کہ یہ کیا ماجرا تھا لیکن بارگاہِ انرفیہ میں استفسار کی کس کو مجال ہو سکتی تھی، ایک
عرصہ بعد حضرت خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجددِ دہ) نے حیرت کر کے
وہ بات پوچھی تو حضرت حکیم الامت نے اظہار فرمایا اور خواجہ صاحب نے اس واقعہ

کو بلا اظہار نام کے اشرف السوانح میں بھی درج فرما دیا۔ ”وہ یہ ہے
 ”ایک مشہور فاضل ندوی اتفاقاً چند گھنٹوں کے لئے حضرت والا کی خدمت
 میں حاضر ہوئے اور چلتے وقت عرض کیا کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمائیے
 حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں مزدور ہوں کہ ایسے فاضل شخص کو میں کیا
 نصیحت کروں، پھر اللہ تعالیٰ نے فوراً میرے دل میں ایک مضمون ڈالا جو
 بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے بالکل مناسب حال تھا۔ میں نے کہا کہ حضرت
 آپ جیسے فاضل کو میں نصیحت تو کیا کر سکتا ہوں لیکن ہاں میں نے جو
 اپنی اس تمام عمر میں سارے طریق کا حاصل سمجھا ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں
 وہ حاصل جو میں سمجھا ہوں وہ فنا و عبدیت ہے۔ بس جہاں تک ممکن ہو
 اپنے آپ کو مٹایا جائے، بس اسی کے لئے سارے ریاضات و مجاہدات
 کئے جاتے ہیں اور بس اپنی ساری عمر فنا و عبدیت کی تحصیل میں گزار دینی
 چاہیے، اس تقریر کا ان پر اس درجہ اثر ہوا کہ وہ آبدیدہ ہو گئے۔“

شیخ عالی مقام کی اس نصیحت کا با اخلاص مرید کے قلب نے ایسا اثر قبول کیا کہ پھر
 صاحب نظر حضرات اس بات پر متفق ہو گئے کہ ”حضرت سید صاحب نے فنایت میں جو
 کماں حاصل کیا اس کو کوئی نتہ پال سکا۔“

درخواست بیعت | اس مناسبت تاثر کے بعد جو بہت جلد شیخ و مرید میں پیدا

ہو یہ پیش شیخ الشیوخ کے الفاظ لفظ لفظ عبدیت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا اور دس عبدیت کا مظہر بنا ہوا۔

لے اس پر ایہ بیان میں طالب کی حیثیت و عظمت کا کس درجہ پاس دلچاظ ہے۔

لے اشرف السوانح جلد دوم ص ۲۱۵ مطبوعہ برقی پریس کھنڈ۔

کہ یہ تصدیق میں نے حضرت مفتی صاحب حاجی محمد عثمان خان صاحب مرحوم، ڈاکٹر صاحب مولانا شیخ اللہ

جلال آبادی مدظلہ اور متعدد خلفائے حکیم الامت کی زبانی سنی ہے!

ہو گئی تھی، حضرت دالار نے فرمایا کہ ”میں نے بیعت کی درخواست پیش کر دی۔“ مسگر
حکیم الامت قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ

”پچاس خط لکھ چکیں تو پھر انشاء اللہ!“

پھر فرمایا:۔ ”خواہ روزانہ یا صبح و شام خطوط لکھ کر یہ عدد پورا کر دیجئے۔“

حضرت مولانا تھانویؒ پر انتظامی شان غالب تھی، اس لئے بیعت سے قبل
ایک معتبر ماسلت کی شرط ضرور عائد فرماتے تھے، یہاں بھی عام ضابطہ کے مطابق ایک
قید تو عائد فرمادی مگر دیکھئے کہ کس حکیمانہ و کریمانہ انداز سے ضابطہ و محبت کے تقاضوں
کو ہم آہنگ کر دیا کہ نہ یہ ٹوٹے نہ وہ چھوٹے!

حضرت دالار نے یہ شرط قبول فرمائی کہ ظ

ہرچہ از دوست میر سنکیوست

لیکن اس انقیاد نے ان کو یہ شرف بخشا کہ ابھی چند ہی خطوط آئے گئے تھے کہ تھانہ
بھون کی ایک حاضری میں مرشد تھانویؒ نے از خود بیعت سے سرفراز فرمادیا، گویا
ایک عطا کو بے طلب اور بے گمان بنا کر اور بھی لذیذ بنا دیا!!

حضرت دالار فرماتے تھے کہ میرے نوکل خطوط جو حضرت تھانویؒ کی رحلت تک

لکھے گئے ۲۵-۳۰ سے زائد نہیں ہیں۔

یہ بھی حضرت دالہی سے سنی ہوئی بات ہے کہ حضرت
بیعت پر شیخ کا اظہار تشکر

مولانا تھانویؒ جب حضرت سیدی کو دست بردست

بیعت فرما چکے تو اظہار تشکر کے طور پر زبان اشرف سے یہ جملہ نکلا کہ:۔

”الحمد للہ میرے حصہ میں سارے عقلا ہی آئے ہیں“

حضرت دالار سے بارہا سنا ہے کہ بیعت سے قبل حضرت
بیعت کا اثر مرید پر

مولانا تھانویؒ کی عقیدت اور عظمت ان پر غالب رہی

لیکن بیعت کے ساتھ ہی محبت و عقیدت پر غالب آگئی اور بے تکلفی نے عظمت کی جگہ لے لی، اس تغیر احوال کی اطلاع جب شیخ کی خدمت میں کی گئی تو حضرت شیخ نے اس حال کی تصدیق فرمائی اور یقین دلایا کہ :-

”یہی مطلوب ہے، عقیدت کا شیشہ تو ادنیٰ ٹھیس سے چور چور ہو جاتا ہے مگر محبت ایک پائیدار چیز ہے!“

خصوصی تربیت | حکیم الامت کے مرتبہ شناس جانتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے مجدد اور ایک محقق کامل مرشد تھے، ان کے دامن تربیت

میں ہر رنگ اور ہر مزاج کے انسان کو پناہ اسی لئے ملتی اور اطمینان کامل اسی لئے میسر آ جاتا کہ ان کے طریقہ اصلاح میں مزاج کا لحاظ بطور خاص رکھا جاتا تھا، اس گلیہ کو جاننے پہچاننے کے باوجود بارگاہ اشرفیہ کے ارباب خاص کا کہنا ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے ہمارے حضرت کی تربیت روحانی ایک خاص نہج پر کی تھی۔

حکیم اشفاق الحسین صاحب مرحوم جو حضرت تھانویؒ کے مجاز صحبت تھے راقم سے اذراہ مہر و کرم فرماتے تھے کہ :-

”حضرت مولانا (تھانوی) کے سب خلفاء جانتے ہیں کہ حضرت سید صاحب کی تربیت بالکل خاص نہج سے کی تھی“

اس کی تائید ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی زبانی بارہا سننے میں آئی کہ

”حضرت سید صاحب کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، دیکھنے والوں کو تو

صرف یہ نظر آتا تھا کہ سید صاحب تھانویؒ نہ بھون نشریف لائے ہیں محفل

حکیم اشفاق الحسین صاحب بریلوی تقسیم ہند کے بعد کراچی تشریف لائے، ناظم آبادیں انکا مطلب خاصا مشہور تھا اور خود ان کی زاہدہ میرت لوگوں پر کافی اثر انداز تھی۔ غالباً ۱۹۵۵ء میں رحلت فرما گئے رحمت اللہ علیہ، مرحوم حضرت والا کے کمالات علمی و ایمانی کے بڑے معرفت تھے اور (۴۰) برس سے معارف کے خریدار تھے۔

محبت کا طالب ہوں اور اس کی محبت کا بھی جو آپ کا محبت ہو اور اس عمل کی محبت کا بھی جو آپ کی محبت سے قریب تر کر دے!	وحب من یحب وحب عمل یقرب الی حبک

غور کیجئے کہ یہاں ”محبت ربانی“ کی محبت کو ”تقرب نواز“ عمل پر مقدم رکھا گیا ہے جس کی حکمت کو نفسیات بشری کا ہر واقعہ کلاںچھ سکتا ہے!

پس وہ ہستی جس کو واصل باللہ جان کر اپنا رہنما و مہربن بنایا گیا، اس کی محبت جس قدر جلد اور جتنی زیادہ حاصل ہو جائے خود اپنے وصول الی اللہ کی ضامن کیوں نہ ہوگی؟ اسی حقیقت کو عارف باللہ دباغ قدس سرہ نے اپنے انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ ”مرید ہی کی محبت جاذب اسرار ہوتی ہے، اگر مرید کی ذات میں صفاتی طہارت اور خیر کے قبول کرنے کی قابلیت اور محبت جاذبہ نہ ہو تو شیخ

لہ مقصود اصلی یہ کہ حصول مقصود کے ذرائع و ثانوی درجہ میں مقصود

یہ حضرت سید عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ مادر زاد ولی اللہ اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے اسی محض تھے، لیکن کشف تکوینی کے علاوہ کشف تشربی بھی ایسا زبور دست حاصل تھا کہ قرآن و احادیث کے مشکلات علمائے وقت نے آپ سے حل کرائے ہیں اور آپ نے عربی الفاظ کے سریانی و عبرانی ماخذ تک کی تشریح فرمادی ہے۔ شہر فاس میں سلالہ کے لگ بھگ آپ کی پیدائش معلوم ہوتی ہے، آپ کے ایک مہتر شہر فاس علامہ حافظ احمد بن المبارک السجلماسی نے آپ کے کچھ ملفوظات جمع فرمائے ہیں جو اب تبریز کے نام سے مشہور ہیں ابریز تصوف کے مہات مسائل پر ایک نادر اور مستند کتاب ہے۔ اس کا نہایت سلیس ترجمہ مولانا عاشق آبادی میٹھن نے اردو میں کیا تھا جو دو جلدوں میں حیدر پور میں دہلی میں طبع ہوا تھا، اب نایاب ہے، میرے سامنے یہی نسخہ موجود ہے حیرت ہے کہ ترجمہ تو اس قدر سہل فرمایا گیا ہے لیکن خود کتاب کے نام (ابریز) کا ترجمہ (تبریز) کیا گیا ہے جو اصل سے کچھ کم غیر مانوس نہیں۔ یوں بھی ناموں کا ترجمہ نامنا سب ہی معلوم ہوتا ہے۔

کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔

پھر آگے فرماتے ہیں کہ یہ محبت اپنے کچھ آثار بھی رکھتی ہے مثلاً۔

”اس محبت صادقہ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ شیخ کو وزن کرنے کی ترازو مرید کے ہاتھ سے گر جائے۔“

اس محبت صادقہ کا ایک اور اثر یہ ہے کہ مرید، مسلوب الارادہ ہو جائے۔

ومن لم یکن سلب الارادة وصفه

فلا یطمعن فی شمس انحاء الفقر

(جس مرید کو سلب ارادہ حاصل نہ ہوا، اس کو فقر کی خوشبو سونگھنے کی ہوس نہ کرنی چاہیے)

حضرت علامہ ندویؒ نے شیخ کے انتخاب میں جتنی بھی دیر اور کرید کی

انقیاد کا میل

ہو مگر جب حکیم الامت کو اپنا شیخ بنالیا تو پھر شیخ کو وزن کرنے کی

ترازو اپنے ہاتھ سے پھینک دی اپنی ساری عالمانہ عظمت سے دست بردار ہو گئے

اپنے ارادہ کو مسلوب کیا، شیخ کی مرضی پر دل کو حاضر کر لیا، ڈاکٹر صاحب مدظلہؒ نے

فرمایا کہ ایک مرتبہ شیخ کی خانقاہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے بڑے موثر لہجہ میں فرمایا کہ

”جو کچھ کھا پڑھا تھا سب ان بڑے میاں (حضرت تھانویؒ) کے قدموں

پر لا ڈالا۔“

اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں اپنی اس تفویض کا ذکر

مولانا عبد الباقی ندویؒ کے ایک مکتوب میں فرمایا ہے کہ

”حضرت تھانویؒ میرے ہر معاملہ حتیٰ کہ ذاتی معاملہ سے بھی باخبر ہیں، یہ

میرا جوش محبت ہے کہ اپنے والد شفیق کی طرح ان کو ہر معاملہ لکھے بغیر چھین

ہی نہیں ملتا۔“

لے ملاحظہ ہو مقعیدہ انوار السرائر و سرائر الانوار۔ از حضرت ابوالعباس احمد بن محمد قرشی المصری۔

اور یہ محبت محض جذباتی محبت نہیں تھی بلکہ حبِ ایمانی کا ایک مقتضاتھا، چنانچہ آگے اس کی دلیل لائے ہیں۔

”میرا مذاق تو یہ ہے کہ شیخ وقت قائم مقام نبی ہے اُن امور میں جو مختص بالنبوة نہیں، غرض یہ کہ جس طرح نبی کی شان یہ ہے کہ لایومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ ونفسہ (او کا قال) اس کا عکس شیخ (کے ساتھ تعلق) میں بھی ہونا چاہیے۔“

سیرت نبویؐ کے مسلم محقق و ماہر اور ادا شناس سے بڑھ کر کس کا ذوق پاکیزہ اور کس کی بات مستند ہو سکتی ہے!!

نہجی معاملات میں تعلق شیخ کے
پاس و لحاظ کی مثال! | غرض اب حضرت والا نے اپنے شیخ عالی مقام کی ایک ایک ادا پر اپنے طور و طریق کو نشانہ کر دیا، تحریر کا طرزِ بلا، تقریر کا انداز

وہ نہ رہا، بلکہ دیکھنے والوں کا تو یہ بیان یہاں تک ہے کہ شیخ کا جمالِ ظاہری بھی یہاں تک جذب کیا کہ چہرہ بشرہ سے آثار جھلکنے لگے۔ شیخ کا تعلق اس درجہ غالب آیا کہ نہجی معاملات میں بھی اس کا پاس و لحاظ اولیت حاصل کر گیا، چنانچہ منجھلی صاحبزادی کی نسبت کا معاملہ ردِ پیش آیا تو اس کے لئے بھی نگاہ ایسے جوانِ صالح کی متلاشی ہوئی جو شرفِ نسبت سے مشرف ہو، جو زندہ یا بندہ، آخر نگاہ نے اپنا مطلوب پالیا تو فرطِ مسرت سے اپنے دوست مولانا عبدالباری ندوی کو تحریر فرماتے ہیں (۱۳۵۸ھ/۱۹۷۸ء) جو ایک متبحر عالم اور امامِ طریقت حضرت شیخ شہاب الدین سرہرودی کے ممتاز خلیفہ تھے قدس اللہ سرہما، شیخ کی کتاب ”خواص المعارف“ میں آدابِ یریدین پر جو کچھ لکھا ہے اس کو اس قصیدہ کی موت میں منظم فرمایا گیا ہے، اس قصیدہ کو مدتوں تزکیہ نفس کی تربیت گاہوں میں نصائی حیثیت اور بینائی اہمیت حاصل رہی ہے۔

”آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں اپنی منجلی موڑ کی نسبت ایک ایسے

نوجوان صالح سے کر رہا ہوں جو حضرت مولانا تھانویؒ کے تلامذین میں ہیں۔“

ذکر اس نوجوان کے عہدے یا اس کی تنخواہ کا نہیں، اس کی ثروت یا ظاہری دجاہت

کا نہیں بلکہ صرف اس کا ہونا ہے کہ وہ صالح اور بارگاہِ اشرافیہ کا متصل ہے! —

یہ اظہار اور اظہارِ مسرت محبت شیخ کی کس کیفیت کا ترجمان ہے؟

عجیب بات ہے کہ جن دنوں حضرت والاؒ ملنے مٹانے

پر ملے ہوئے تھے۔ قدرت نے ایک اور ظاہری اعزاز

سے نوازا چاہا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یہ طے کیا کہ علامہ

ندوی کے کمالات علمی و ادبی کے اظہاراً اعتراف کے لئے ان کی خدمت میں ڈی،

لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کرے، حضرت والا کو اس کی اطلاع ملی تو حضرت نے

اپنے شیخ کی خدمت میں اس اعزاز کے عطا کئے جانے کی حقیقت و صورت کی ساری

تفصیل لکھ بھیجی اور اس بارے میں شیخ کا فیصلہ طلب کیا، یہ بھی ظاہر فرمادیا کہ اپنے

دل میں اس کی کوئی طلب موجود نہیں مگر رشدد تھا نوٹی قدس سرہ کا جواب آیا

کہ ضرور قبول کیجئے۔ ”الفضل ما شہدت بہ الاعداء۔“

اس فیصلہ کے بعد حضرت والا نے وہ اعزاز قبول فرمایا اور نومبر ۱۹۷۷ء میں مسلم

یونیورسٹی نے حضرت علامہ ندویؒ کی خدمت میں ڈی، لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کرنے

کا فقر حاصل کیا۔

حصولِ اعزاز کے بعد پھر حضرت والاؒ نے اس کی اطلاع خدمتِ شیخ میں کی،

اور عرضِ حال کے طور پر یہ بھی لکھ دیا کہ ”جس وقت مجھ کو کوئون (عبا) پہنایا جا رہا تھا تو دل

میں کوئی ایسی لہر بھی نہیں اٹھی جو نیا کپڑا پہنتے وقت محسوس ہوتی ہے اور سارے اعزاز

و مراسم میں بھدا اللہ ذرہ برابر فخر و مباہات کا گمان بھی نہیں گذرا۔“

اس کے جواب میں شیخ عالی مرتبت نے لکھا کہ

”الحمد لله یہی توقع تھی!“

یہ تھا تفویض کا عالم اور اس کا نتیجہ ذرا سوچیے تو یہی کہ ایک عالم نہیں بلکہ علامہ عطر اور مقتدا بنے اہل علم و کمال کا محبت کی راہ میں اس درجہ اپنے آپ کو مٹانا اور اللہ کی خاطر ایک اللہ والے کا طوق ارادت اپنے گلے میں ڈال لینا، ایثار و تواضع کی کوئی معمولی مثال ہے؟ پھر کیا تعجب ہے کہ ”مت تواضع للہ رفعلہ اللہ“ کے حکم اصول کے تحت وہ سلوک و احسان کی راہ میں بھی اتنے اونچے کر دیئے گئے ہوں کہ اچھوں اچھوں کی نظر وہاں تک نہ پہنچ سکے!

سب جانتے ہیں کہ حضرت والا کو حکیم الامت **تھانہ بھون کی بار بار حاضری** | قدس سرہ کی صحبت بہتوں کے مقابلے میں

بہت کم میسر آئی مگر ایک طرف ذاتی فضائل اور دوسری طرف فردیت کے کمال نے اس کمی کی اہمیت بالکل گھٹا دی، لیکن خود حضرت والا کو اس کا بڑا احساس تھا، فرماتے تھے اور ایک شعر میں اس کا اظہار کیا ہے۔

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں

ہو عطاے خاص مجھ کو جو عطاے عام ہے

یہ اندرونی خلش حضرت والا کو مضطرب بنائے ہوئے تھی، وہ اپنی ساری مصروفیات کے باوجود بار بار خدمتِ شیخ میں حاضر ہوتے تھے، کبھی چار آٹھ روز کے لئے آرہتے، کبھی دو تین دن کا قیام ہوتا اور کبھی محض چند گھنٹوں کی حاضری ہوتی تھی مگر سلیمان ذی جاہ کے وقت کا بظاہر یہ مختصر ایشا را اپنی حقیقت کے اعتبار سے

لہ یہ ساری تفصیل حضرت میری قدس سرہ نے اس بے استحقاق کو سنائی تھی، یہ ان کا کم خاص تھا کہ اپنے بعض احوال سنائے ورنہ ایک رونا تو اس کا کیا حوصلہ کہ وہ مملکتِ سلیمانی کے روز تک رسائی کی طمع بھی کرے!

ادروں کے کئی کئی چلوں پر فائق تھا اور سب نے دیکھا کہ اس کے نتائج طویل طویل چلکشی سے فائق تر نکلتے۔

خود اپنی طرف سے جواب شیخ کی تعیین | حضرت والارہ کو اللہ تعالیٰ نے اور کمالات کے ساتھ ذہانت و فراست

سے بھی خوب نوازا تھا۔ دوسرے کے مزاج، مذاق اور انداز فکر کو بھانپنے میں ان کو کچھ دیر نہ لگتی تھی، اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ واقعہ ہے جو حضرت تھانویؒ سے ربط کے بعد پیش آیا۔ حضرت والارہ فرماتے تھے کہ کچھ عرصہ کے تعلق کے بعد حضرت (مولانا تھانویؒ) کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد میں حضرت کے مذاق سے واقف ہو چکا تھا، بعض مرتبہ یہ کیا کہ جب کوئی اشکال پیش آیا تو اس کا جواب خود حضرت ہی کی تعیین سے نکال کر حضرت کی خدمت میں عرض کر دیا کہ یہ اشکال ہے اور اس کا جواب حضرت والا کی طرف سے غالباً یہ ہوگا، بغرض تصدیق پیش ہے۔ حضرت نے میرے ہر جواب کی تصدیق فرمائی کہ آپ بالکل صحیح سمجھے اور اہل محفل کو خطاب کر کے فرمایا کہ: "یہ مولوی سلیمان صاحب بھی خوب ہیں کہ ہماری ہی تحریروں سے اپنے

ہر اشکال کا جواب خود ہی نکال لیتے ہیں۔"

ذرا غور تو کیجئے کہ یہ جواب کا نکال لینا کس کمال پر دلالت کر رہا ہے جب تک شیخ کی بھانیت سے مناسبت تامر حاصل نہ ہو اور اس کے الفاظ اس کی باطنی کیفیات کے موصل نہ بن جائیں اور جب تک میرا اپنے علوم باطنی کو فنا کر کے شیخ کے علوم اپنے اوپر طاری نہ کر سکے جو فنا فی شیخ کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے اس وقت تک اس طرح کے جوابات "قطعاً نہیں نکالے جاسکتے۔ اس سلسلہ میں راقم حقیر کو ایک رویائے صادقہ کے ذریعہ پوری تشفی کرا دی گئی اور خود حضرت حکیم الامت کی زبان فیض ترجمان کے ذریعہ، کہ حضرت والاؒ کے علوم باطنی بالکل اپنے شیخ کے ہر رنگ تھے،

شیخ کا کمال مہر و کرم | ادھر ارادت کا یہ رنگ تھا اُدھر شیخ بھی اپنے وقت کاسب سے بڑا جوہر شناس اور محبت نواز محب و محبوب کی جہاں نشاری اور دلنوازی میں مسابقت کی ادا چھلکے لگی اور بعض معاملات میں تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ محب کون ہے اور محبوب کون؟

غایتِ کرم | حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے بار بار فرمایا کہ "حضرت سید صاحب خانقاہ تشریف لاتے تو ہمارے حضرت (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا جوان ہو گئے ہیں، گھنٹہ بھر کی محفل کو دو دو گھنٹہ طول دیتے تھے حالتِ مرض میں بھی معلوم ہوتا تھا کہ گویا مرض چلا گیا اور فرماتے تھے کہ سید صاحب بہت صاف دل انسان ہیں۔"

اسی طرح ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ "آخر زمانہ میں تو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بس نہیں فرماتے تھے کہ جب رات کے دو بجے آنکھ کھلتی ہے توجی چاہتا ہے کہ سید صاحب کو بلا کر باتیں کرتا رہوں لیکن پھر ان کی رحمت کے خیال سے چپ ہو رہتا ہوں!"

فرطِ محبت | خود حضرت دالانے اپنے محبوبِ مرشد کے الطاف و عنایات کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی سنایا تھا کہ ایک مرتبہ وہ خانقاہ میں تشریف لے جا رہے تھے شیخ کی محفلِ آراستہ تھی، حکیم الامت کی نظر جو سید والا مرتبت پر پڑی تو بے ساختہ کھڑے ہو گئے، مرید صادق نے بڑھ کر عرض کی:

"حضرت تشریف رکھیں"

تو ارشاد فرمایا:-

"واللہ میں تعظیماً کسی کے لئے نہیں اُٹھتا میں تو فرطِ محبت سے کھڑا ہو گیا"

اظہارِ محبت اور دلنوازی کی یہ اداسنت کے سانچے میں کیسی ڈھلی ہوئی ہے!!

عطا ئے عصا اور کمالِ دنوازی

ایک مرتبہ حکیم الامتؒ نے ایک چھڑی تحفہ محبت کے طور پر بھیجی اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی جس میں خطاب اس بلخ جملہ سے فرمایا تھا۔

”راحت جان راحت جسم کا سامان بھیج رہا ہوں“

حضرت سیدی نے اس عطا ئے شیخ کو دل و جان سے قبول فرما کر جواباً عرض کیا کہ۔

”اس عطا ئے خاص سے میں نے استقامت فی العمل کی تعبیری!“

حضرت شیخ قدس سرہؒ نے جب یہ عارفانہ جواب پڑھا تو انبساط سے معمور ہو گئے اور اس کا ایک طویل جواب عطا فرمایا جو تمام تر دعاؤں سے بربز تھا اور دعائیں بھی ایسی پر شفقت اور دالہانہ انداز کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جن و انس کے شر سے محفوظ رکھے وغیرہ۔

حضرت والا فرماتے تھے۔ ان دعاؤں میں قرآن پاک کی ان آیات کی طرف اشارات تھے

لے شیخ الشیوخ کا یہ ہر حضرت سیدیؒ کے غایت کرم سے چھ جفر کے حقدیں آیا، حضرت والاؒ نے اس عطا کے ساتھ جو سند عطا تحریر فرمائی وہ یہ ہے۔

عزیزی السعید ادام اللہ توفیقکم
(اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ)

حضرت والا کا عطا فرمودہ عصائے مبارک جو میرے پاس ہے میرے پاس موجود ہے، حالات کے تقاضا اور عمر کی ناپائیداری سے میں اس کی حفاظت کا حق ادا نہیں کر سکتا میں اسکو آپ کے سپرد کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اسکی برکت سے آپکو مستفید فرمائے۔ والسلام۔ الفقیر الی اللہ سید سلیمان۔ ۱۵ ذی حجہ ۱۳۱۳ھ

مے حضرت والاؒ نے بھرائی ہوئی آواز میں یہ جملہ ہرایا اور فرمایا کہ شاید ہی حضرت نے کسی کو اس انداز سے خطاب فرمایا ہو گا۔

مے سلیمان علیہ السلام کے سلسلے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فصلحنا الیہم یحییٰ بن علیؑ یا سراج منار حیث اصابت
والشیطین کل بناء وعوامت و آخرین

پس ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے جہاں وہ جانا چاہتا نرمی سے چلتی اور جنات کو بھی انکا تابع

جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں آتی ہیں!! گویا مناسبت اسی کی رعایت بھی فرمادی اور حضرت والاؒ کے قابل رشک مرتبہ کا اظہار بھی فرمادیا۔

خوب یاد آگیا، اس عطاءے عصا کی تقریب میں حضرت والاؒ نے ایک فی البدیہہ قطعہ بھی موزوں فرمایا تھا جو ان کے تاثرات قلبی، بلند ہمتی اور ذات حق پر انفرادی و انحصار کا ترجمان ہے وہ قطعہ یہاں اسی عنوان اور انہی حاشیوں کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جیسے حضرت والاؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔

”بہ تقریب عطاءے شیخ عطاءے اقدس بہ ایں فقیر“

۲۸۔ شوال ۱۳۸۸ھ

سلیمان بودم در دست مناسبت نمی دادند
مرا از لطف حق در دست خواجه داد مناسبت
وگرچہ لطف حق خواہد را نقش و نگین بخشد
ہماں نقش و نگین کو ملک معنی را بود خاتم

مقرریت فی الاصفاد (ہیں) | کر دیا تعمیر نہانے والوں کو بھی اور غوطہ زنوں کو بھی اور
اسی ایت کی طرف اشارہ ہے اس دعا نے اشرف میں | دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔
لے کاش مکاتیب سلیمان و اشرف“ بلکہ تو اے اس مرض سلیمانی میں جان پر بھائی، سلوک و معرفت کے کیسے دکش
منافروں دیکھنے میں آتے اور منتہی سالکین کی کتنی گتھیاں ان سے بچھتیں! — مگر جو مقدر نہ تھا کیسے ہو جاتا —
میری عاجزانہ درخواست اور حضرت مفتی صاحب و ڈاکٹر صاحب دام فیوضہم کے اصرار پر حضرت والاؒ نے اجازت تو
عطا فرمادی تھی کہ میں اس خط و کتابت کو نقل کروں جو ان کے اور حضرت تھانویؒ کے درمیان رہی، مگر
مرض الموت کی وجہ سے حضرت خود اس قابل نہ تھے کہ اپنے دست مبارک سے یہ خزینہ نکال کر اس بے
بضاعت کے حوالہ فرماتے، حکم البتہ فرمادیا تھا کہ یہ مکاتیب دیدیئے جائیں مگر بھی تھیل نہ ہو سکی تھی کہ آقاؐ نے
سفر آخرت اختیار فرمایا اور اپنے خادم کو بے بس چھوڑ گئے — حضرت والاؒ سے اسکی اجازت حاصل
کرنے میں دیر اسوجہ سے ہوئی کہ حضرت پر حیا اور تواضع کا بے حد غلبہ تھا، فرماتے تھے کہ حضرت تھانویؒ نے مجھ کو

مگر یہ قطعہ حضرت تھانویؒ کے علم میں نہ آسکا، کیونکہ حضرت والار نے از خود تو کبھی ان باتوں کے اظہار کا قصد نہیں فرمایا، بلکہ کبھی دوست احباب ہی نے بلایا، اس قسم کے اشعار قدمت اشرف تک پہنچا دیئے تھے۔

عطائے سبحی | اس کے بعدہ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو شیخ الشیوخ قدس سرہ نے ایک اور عطیہ سے اپنے مسترشد کو مشرف فرمایا، اس واقعہ کو خود حضرت سیدی نور الدین مرقدہ کے الفاظ ہی میں منیے لکھا ہے۔

”ایک دفعہ حضرت (مولانا تھانویؒ) نے خاکسار کو ایک تسبیح عنایت فرمائی تو خاکسار نے ایک بیت کہی۔

خواجہ بخشید را سبج صد دانہ بلطف دانہ انداخت و در حلقہ مراد امیر
وصل بلگرامی (مرحوم) نے موقع سے حضرت کو یہ سنا دیا تو فرمایا: ”تو بھی مجھے بھی اس کا جواب لکھنا پڑے گا“ مگر کچھ فرمایا نہیں۔

راقم الخروف نے اور حضرات سے اسی سلسلہ میں یہ بھی سنا کہ اہل محفل سے حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ۔

”ہم تو مولوی سلیمان کو خوشگ سمجھتے تھے مگر وہ بھی ترسکے۔“

ملک سلیمان اور زہدِ عیسٰی | ایک اور واقعہ مرشد تھانویؒ کے اندازِ کرم کا یاد آیا، خود حضرت والار کی زبانی کئی محفلوں میں

(سلسلہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اپنی شفقت و محبت کی بناء پر ایسے ایسے اعزاز سے خطاب فرمایا ہے کہ ان مکتوبات کی اشاعت محض خوفِ خدائی مستحکم ہوتی ہے جس سے بہت خرم آتی ہے۔“

مے حصّے سلیمان

مجھے کما حقان الروی، ظہ خاتم ملک سلیمان است علم۔

لے ملاحظہ ہو ”سیکیم الامت کے آثار علیہ“۔ معارفِ باہرہ فروری ۱۹۳۵ء

سنا ہوا۔

حضرت کی منجھلی صابراوری سہما کی نسبت جناب سید حسین صاحب
دام مجدہ سے قربانی، اس نسبت کے قیام میں ہاتھ حضرت مولانا سید
محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، بلکہ دولہا کی طرف سے وہی سب کچھ تھے۔ مہر
کی مقدار کا مسئلہ آیا، ہمارے حضرت والاؒ زیادہ مہر باندھنا چاہتے تھے اور
”مہر شل“ کو لڑکی کا شرعی حق بتا رہے تھے، ادھر مولانا عیسیٰؒ اسم بامسمیٰ
ردائے زہدا ڈھچھوئے مقدار مہر کی کمی پر اصرار فرما رہے تھے حضرت والا
شیخ عالی مقام کے بعد سب سے زیادہ مولانا عیسیٰؒ قدس سرہ کی عظمت
کے معترف تھے، ان کی بات مان بھی لیتے، مگر یہ بذل نفس کا موقع نہیں
تھا بلکہ لڑکی کے تحفظ حق کا۔ اس لئے طے یہ پایا کہ اس اختلاف کا فیصلہ
حکیم الامت پر چھوڑا جائے، ایک عریضہ لکھ کر حضرت والاؒ نے صورت حال
کی تفصیل شیخ کی خدمت میں پیش کر دی اور فیصلہ طلب فرمایا حضرت
حکیم الامت نے صرف یہ جملہ تحریر فرمایا کہ :-

”حضرت مولانا عیسیٰ صاحب (ف) مارچ ۱۹۴۴ء کے متعلق حضرت والاؒ نے کھلے کہ ”خیال تھا کہ مرشد رحمۃ اللہ
علیہ کے بعد اگلی ذات مرجع انام بنے گی مگر
اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو آپ جانتا ہے، انکا وطن ہی الدین پونہ فتح آباد تھا، نسبتاً سادات کرام میں تھے
سلوک و طریقت، مسلک و مشرب، صورت و میرت حتیٰ کہ نشست و برخاست اور خط و کتابت اور گفتگو میں
اپنے مرشد کا کلی سے اسد پر مشابہت حاصل کر لیا تھی کہ ان کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا تھا کہ تا کس نگویہ بعد ازین
من دیگرم تو دو گمیری! وہ نہایت ہی عابد و زاہر متبع سنت اور رشد کے اصولوں کے سختی سے پابند تھے،
اطراف میں حلقہ ارشاد بھی قائم تھا۔ صاحب مقامات، مستجاب الدعوات اور داندات صحیحہ سے سرفراز
تھے!“ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”یاد و فتگان“).

”ملک سلیمان رہہ بیٹے سے بڑھ گیا“

مراد یہ تھی کہ اس معاملہ میں مولانا سلیمان ندوی کا پلہ شریعت کی میزانِ عدل میں بھاری ہے مگر ذرا لطفِ خطاب دیکھئے کہ ایک فقہی خشک جواب کو بھی پیرانہ محبت بنا کر بھیجا!! یہ ادائے دین و از کس تعلقِ خاص کی غمازی کر رہی ہے؟

حضرت والا فرماتے تھے کہ بات چونکہ مسئلہ کی تھی اسلئے میں نے حضرت (مولانا نقانوی) کی خدمت میں ایک ریضہ لکھا کہ ”جواب کا مفہوم میں پوری طرح سمجھ نہ سکا، اسلئے وضاحت کا طالب ہوں اس پر حضرت والا نے پھر صاف الفاظ میں میری تائید فرمادی!“

سلیمان کا پھیرا | ایک اور لطیفہ بھی جو طرفین کی غایت محبت ہی کا آئینہ ہے مثنیٰ لیجئے اور خود حضرت والا ہی کی زبانی سنئے، ”حکیم الامت کے آثارِ علمیہ“ والے مضمون میں لکھا ہے کہ ”ایک دفعہ میں نے اپنے برادرِ گرامی قدرد مولوی مسعود علی صاحب (ندوی) کو جو تھانہ بھون میں مقیم تھے، اپنے حاضر ہونے کے قصد سے مطلع کیا اور ریاض مرحوم کا یہ مصرعہ لکھ دیا، ”زندگی ہے توفیقوں کا بھی پھیرا ہوگا“ برادر موصوف نے یہ اطلاع مولانا کو دی اور یہ مصرعہ بھی سنا دیا، تو فوراً فقیروں کو بدل کر یوں فرمایا:-

”زندگی ہے تو سلیمان کا بھی پھیرا ہوگا“

انتباہ | یہ تھے چند واقعات جن سے شیخ و مرید کے خصوصی ربط پر پوری طرح روشنی پڑ جاتی ہے۔ یہ ہمارے معلومات کی حد ہے، اس کے سوا بھی کچھ

”میانِ عاشق و معشوق رمزِ نیست“

والے کتنے اسرار ہوں گے جن تک کسی کی رسائی نہیں۔ جو واقعات جمع کر دیئے گئے ہیں ان میں تاریخی ربط نہیں ہے، ممکن ہے ان میں بعض عطاے خلافت سے پہلے کے ہوں اور بعض بعد کے، اسکی وضاحت اسلئے ضروری تھی کہ اب خلافت کا واقعہ لکھا جا رہا ہے۔

خلافت سے سرفرازی

اگست ۱۹۳۵ء کو حضرت سید سلیمان نے راہ سلوک میں قدم رکھا اور اب اکتوبر ۱۹۳۶ء آ پہنچا تھا، مسافر نے عشق و معرفت کی اتنی منزلیں طے کر لی تھیں کہ اب وہ مجدد وقت حضرت تھانویؒ کی نگاہ میں راستہ کے سارے نشیب و فراز اور چڑخ و خم سے پوری طرح باخبر اور ناداقوں کی بہری کے لئے ہر طرح لائق اعتبار تھا۔

استخارہ واستنشارہ | حکیم الامت نے اپنے قلبی داعیہ کی مزید تفسی کی خاطر استخارہ فرمایا، استخارہ سے تائید و تقویت پائی پھر حضرت والا کے نام ایک مکتوب لکھا جس کا عنوان تھا۔ ”استنشارہ بعد از استخارہ“۔ امیں لکھا تھا کہ ”میراجی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دوں میں نے اس سلسلہ میں استخارہ بھی کر لیا ہے، اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟“

جواب | حضرت والا فرماتے تھے کہ چونکہ دو تین ہی روز میں تھانہ بھون کی حاضری کا قصد تھا اس لئے میں نے اس گرامی نامہ کا جواب نہیں دیا بلکہ اب تھانہ بھون حاضر خدمت بھی ہوا تو خاموش ہی رہا۔۔۔ آخر ایک دن حضرت والا (حکیم الامتؒ) کی طرف سے ایک پرچہ ملا کہ:-

”آپ نے میرے استنشارہ کا جواب نہیں دیا“

اس اصرار پر میں نے جواباً یہ عرض کر دیا کہ

”حضرت والا کا مکتوب گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی،

کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری؟“

عطائے خلافت | حکیم الامت علیہ الرحمۃ اپنے مریدوں کو ہر مرحلہ پر آزماتے اور

پر کھتے رہتے تھے، اور اکثر ایسے لطیف پیرائے میں کہ خود آزمائے جانے والے کو اپنی آزمائش کا احساس تک ہونے نہیں پاتا تھا، یہاں اس "استثارہ" میں بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید اسالکین کے "تاثر" اور "حال" کی آزمائش بھی مقصود تھی اور خود اپنے اذعان کا مشاہدہ بھی!! — چنانچہ جب سید اسالکین کا وہ جواب جواب بھی نقل ہو چکا پہنچا، تو حضرت شیخ بے حد مسرور ہوئے اور حاضرین سے فرمایا کہ:-
 "الحمد للہ وہی جواب آیا، جس کی توقع تھی"

بس اس کے بعد سید والا مرتبت کو سلاسل اربعہ میں خلافت باطنی عطا فرما دی اور سند ارشاد پر ان کو ممکن فرمادیا، پھر خود اپنی حیات میں بعض اپنے زیر تربیت افراد کو بھی اپنے خلیفہ مجاز کے سپرد فرمادیا، یہ واقعہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کا ہے!
شیخ الشیوخ کا تاثر | اس بات کے راوی حافظ عثمان صاحب دہلوی ہیں، (جو خود بھی حکیم الامت کے فدائی اور خلیفہ مجاز تھے) کہ:-
 "حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت والا (حکیم الامت) اس درجہ مسرور و مطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمد للہ مجھے اب کچھ فکر نہیں،

میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں۔"

مرشد اور وہ بھی مرشد تھا نوی جیسے شیخ حقیق کی نگاہ تحقیق میں یہ اعتبار کوئی معمول امتیاز ہے؟
خلیفہ مجاز کا حال | بہر حال شیخ کا تاثر تو وہ تھا، خود خلیفہ مجاز کی کیفیت بھی قابل دید ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس عطائے خلافت کے ساتھ ہی حضرت والا پر نیستی اور فنایت بدرجہ اتم چھا گئی وہ غرقِ عبدیت ہو گئے اس اثر میں ڈوب کر حضرت نے جو غزل کہی ہے وہ ان کے نزول پر شاہد ہے۔ یہ غزل جس طرح حضرت والا کی قلمی بیاض میں درج ہے۔ اسی طرح یہاں نقل کی جاتی ہے البتہ حاشیہ اس عاجز کی طرف سے ہوگا۔

براہ الہ آباد بتقریب خلافت ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء

ابھی تو مشتق فغان کُنج میں ہزار گئے
جو آج لذت درد نہاں کا جویا ہے
وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے
وہ نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے
ادب سے دیکھ لیں شقائقِ دور سے ان کو
سنا تو دیے انھیں افسانہ غمِ جہاں
وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو
تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے
تری نظر میں ہے تاثیرِ مستی صہبؔ

تری نگاہ میں دونوں خواص یکھے ہیں

وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

۱۔ تحلیل ذکر کہ نہاں خاندانِ دل سے ذاتِ سالک سے حصولِ تمکین سے منصب و مقامِ ولایت جو وہی ہے
یونیس، من پشآء، البتہ راہ ولایت کھلی ہوئی ہے جو چاہے پیچھے کی کوشش کرے کہ یعنی حق تعالیٰ کا وصال
حقیقی تو ایک محالِ عقلی ہے، البتہ وصالِ مجازی یعنی بندہ کے حسبِ استعداد و وجاہات کا ارتفاع ممکن بھی
ہے اور مقصود بھی! یہ یعنی دعا بذاتِ خود عاشق کا مطلوب ہے بقول عارفِ رومی

از دعا بنود مسرود عاشقان جز بمن گفتن باں شیریں دہان

۲۔ اشارہ ہے "ادعونی استجب لکم" کے وعدہ ربانی کی طرف سے مراد آدابِ دعا جن کی تفصیل
احادیث میں موجود ہے، مثلاً اخلاص، عجز، ادب، یقین وغیرہ یعنی وہ اللہ دہم ہرا ہے، رحمت، رحیم اور
ودود ہے! یہ مراد توفیقِ الہی جس پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ قل ان الہدے ہدے اللہ (قرآن)
یعنی وصول الی اللہ کے دونوں ہی طریق ہیں: (۱) اجتہاد یا جذب (۲) انابت یا سلوک۔ طالبِ
مولیٰ ہر حال کا میاب ہے! تری نگاہ جسے چاہے "دالے مصر" سے طالبِ مولا کا دل چھوٹے کو تھکا کر اس

سلسلہ سند | اب حضرت والا کا سلسلہ سند جس کو عرف تصوف میں شجرہ کہا جاتا ہے پیش کر کے اس عنوان کو ختم کرنا ہے۔ وہ طوائف زنجیر جس کی چالیسویں کڑی ہے حضرت ممدوح کی ذات ہے، بمدارج ذات پاک رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح مربوط ہے۔

اسم گرامی	سند وفات	مدفن
حضرت اقدس سید سلیمان ندویؒ	ھ (۱۳۷۳)	کراچی
حضرت اقدس اشرف علی تھانویؒ	ھ (۱۳۶۲)	تھانہ بھون
حضرت اقدس امجد الدین فاروقی تھانویؒ ثم مہاجرگی	ھ (۱۳۱۷)	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس میاں بی نور محمد علوی جھنجیانیؒ	ھ (۱۲۵۹)	جھنجیانہ
حضرت اقدس حاجی سید عبدالرحیم افغانیؒ	ھ (۱۲۳۶)	پنجتار (سرہند)
حضرت اقدس عبدالباری صدیقی امرہویؒ	ھ (۱۲۲۶)	امرہہ
حضرت اقدس سید عبدالہادی امرہویؒ	ھ (۱۱۹۰)	امرہہ
حضرت اقدس سید محمد الدین امرہویؒ	ھ (۱۱۷۳)	امرہہ
حضرت اقدس شاہ محمد مکی جعفریؒ	ھ (۹)	
حضرت اقدس سید محمدی اکبر آبادیؒ	ھ (۱۱۰۷)	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس محب اللہ فاروقیؒ الد آبادی	ھ (۱۰۵۸)	الد آباد
حضرت اقدس ابو سعید نعمانیؒ گنگوہیؒ	ھ (۱۰۳۰)	گنگوہ
حضرت اقدس نظام الدین فاروقیؒ تھانیسری (۱۰۳۵) یا (۱۰۳۶) ھ		تھانیسری
حضرت اقدس جلال الدین فاروقیؒ تھانیسری	ھ (۹۹۰)	تھانیسری

تقریر حقیقت کبریٰ کو! اللہ یجتنبی! لیما من یشاء ویحدہ ے (لیما من یشیب) نظر کے سامنے کر کے ڈھارس بندھا دی کہ یہاں تو مایوسی کا گدہ بھی نہیں!!

اسم گرامی	سنه وفات	مدفن
حضرت اقدس عبدالقدوس نعمانی گنگوہی	(۹۴۲ یا ۹۴۵) هـ	گنگوہ
حضرت اقدس شیخ محمد فاروقی ردوولی	(۸۹۸) هـ	ردولی
حضرت اقدس شیخ عارف فاروقی ردوولی	(۸۸۲) هـ	ردولی
حضرت اقدس شیخ احمد عبدالحق ابدال فاروقی ردوولی	(۸۳۷) هـ	ردولی
حضرت اقدس جلال الدین بکیر الاولیاء عثمانی پانی پتی	(۷۷۵) هـ	پانی پت
حضرت اقدس شمس الدین ترک علوی پانی پتی	(۷۱۷) هـ	پانی پت
حضرت اقدس سید علاء الدین علی بن احمد صاحب کلیری	(۶۸۹ یا ۶۹۰) هـ	کلیر
حضرت اقدس شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر فاروقی	(۶۶۳) هـ	اجودھن پاکپن
حضرت اقدس سید قطب الدین بختیار کاکی اٹوٹی ثم دہلی	(۶۳۳) هـ	دہلی
حضرت اقدس سید معین الدین سحرانی ثم اجیری	(۶۲۷) هـ	اجیر
حضرت اقدس خواجہ عثمان ہروی ثم مکی	(۶۰۳) هـ	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس حاجی شریف زبیدی منیر الدین	(۵۸۴) هـ	زبندہ
حضرت اقدس سید قطب الدین مودود چشتی	(۵۲۷) هـ	چشت شانگلان
حضرت اقدس ناصر الدین ابویوسف بن سمان چشتی	(۴۵۹) هـ	چشت شانگلان
حضرت اقدس سید ابومحمد چشتی	(۴۱۱) هـ	چشت شانگلان
حضرت اقدس سید ابوالحسن بن سلطان فرسافہ چشتی	(۳۵۵) هـ	چشت شانگلان
حضرت اقدس ابواسحاق شامی چشتی	(۳۲۹) هـ	عکہ (شام)
حضرت اقدس مشاد علوی دہلوی	(۲۹۹) هـ	عکہ (شام)
حضرت اقدس بہیرۃ البصری	(۲۸۷) هـ	بصرہ
حضرت اقدس حذیفہ مرعشی	(۲۵۲) هـ	بصرہ

اسم گامی	سنہ وفات	مدفن
حضرت اقدس ابراہیم بن ادہمؒ	۱۹۳۲ھ	جبل شام
حضرت اقدس فضیل بن عیاضؒ خراسانی (یا بخاری) ثم مکیؒ	۱۸۸۷ھ	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس عبدالواحد بن زید بصریؒ	۱۷۷ھ	بصرہ
حضرت اقدس حسن بصریؒ	۱۱۰ھ	بصرہ
خلیفہ رابع حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ	۴۰ھ	کوفہ
خاتم الانبیاء احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	۱۱ھ	مدینہ منورہ

نوٹ: یہ شجرہ تعلیم الدین "مولفہ حضرت مولانا تھانویؒ سے ماخوذ ہے۔

سید العلماء کا اعلان رجوع اور حکیم الامت کی تبریک و تحسین

راہ سلوک میں اگر ایک مخلص سالک کی نظر اپنے نفس و اعمال پر محاسبانہ انداز سے پڑنے لگتی ہے، وہ اپنے حال ہی کا نہیں بلکہ ماضی کا بھی جائزہ لے ڈالتا ہے تاکہ جہاں کہیں کوئی کورس نظر آئے اس کی تلافی کر سکے اور ماضی کے دامن پر اگر کہیں کوئی داغ دھبہ پڑ گیا ہو تو اسے دھو ڈالے، اس دور کے سید سالکین کو بھی اس مرحلہ سے گزرنا پڑا اور تلافی مافات کی فکر ان پر بھی غالب آرہی۔ ادھر شیخ سے والہانہ محبت نے مسلک شیخ کو اس درجہ محبوب بنادیا کہ اس کی خاطر ہر ایثار و قربانی کی انگ انگ خود بخود دل میں پیدا ہونے لگی، چنانچہ حکیم الامت کے کسی اشارے کنایہ کے بغیر، او خود اپنے احساس سے مجبور ہو کر، حضرت والہ نے رجوع و اعتراف کے نام سے جنوری ۱۹۳۳ء کے معارف میں ایک تحریر شائع فرمائی جو ان کے اسی حال کی ترجمان ہے جس میں مبتلا ہو کر خسرو بے ریا کہہ اٹھا تھا:۔

خلق میگوید کہ خسرو عشق بازی می کند
آرے آرے میکنم با خلق عالم کار نیست

وہ تحریر دہنڈیر ہے، ذرا دل و دماغ کی یکجائی اور یک سوئی کے ساتھ ملاحظہ ہوتا کہ اس حال مالی کا فیضان آپ پر بھی ہو سکے۔

رجوع و اعتراف

”میری پیدائش صفر ۱۲۸۷ء میں ہوئی اور اب یہ محرم ۱۳۳۷ء شروع ہو گیا یعنی میری عمر نے زندگی کے ساٹھ مرطلے طے کر لئے، میری تحریر کا آغاز ۱۲۹۷ء سے ہوا ہے اور اب ۱۳۳۷ء جس کے معنی یہ ہیں کہ میری تحریری عمر نے چالیس سال پورے کر لئے، جب اس پر نظر جاتی ہے کہ اس ساٹھ سال کی زندگی میں کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں اور کیسی کیسی لغزشیں پیش آئی ہوں گی تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے :

اے اکر دہ ناصواب یا رب توبہ

تحریری زندگی کے چالیس سال پورے ہو گئے، یاد نہیں کہ ان چالیس برسوں میں قلم نے کیا کیا لکھا اور کہاں کہاں غلطی کی۔ اتباع حق کے بجائے اتباع ہوئی کے موقعے کہاں کہاں پیش آئے اور اب بھی اپنی موجودہ حالت پر بزبان حال یہ صدائے غیب آتی ہے۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت

مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

کتا بوں اور مضمونوں کے ہزار ہا صفحات اتنے دنوں میں سیاہ کئے گئے، کہا نہیں جاسکتا کہ کہاں کہاں حق کا ساتھ چھوٹا ہے اور کس باطل کی تائید میں قلم نے لغزش کی ہے جس سے اتباع حق کے بجائے اتباع ہوا کا ارتکاب ہوا ہو، بندہ ہر حالت میں قصور وار ہے، خطا و نسیان اس

کا خیر ہے اور اس کا علم و عمل کی لغزش گاہوں سے ٹھیک ٹھیک بچ
 نکلنا بہت مشکل ہے اس لئے یہ خاکسار پھر اس علی الاعلان اپنی ان تمام
 غلطیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ حق کی خلاف ہوئی ہوں صدقِ دل سے
 توبہ کرتا ہے اور اپنے قصور کا اعتراف اور اپنی ہر اس رائے سے جس کی
 سند کتاب و سنت میں نہ ہو، اعلانِ برائت کرتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ
 مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلف
 صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی
 ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہو سکی بلکہ اپنی بساطِ بھر دلائل کی تنقید کے بعد
 فقہائے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی جس کی
 تائیدِ آئمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں
 حافظ ابن تیمیہ حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ صاحبِ حمت اللہ علیہم کی تحقیقات پر
 اکثر اعتماد کیا ہے!

ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا ہے کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے
 آتی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوتی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں اسکے مطابق
 تبدیلی کر دی ہے مثلاً معراج بجا است بیداری و بہ جسم ہونے پر قرآنِ پاک
 سے صحیح استدلال مجھے پہلے نہ مل سکا اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے توفیق سے
 صحیح دلیل سجھادی تو دوسرے ایڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر
 دی۔ اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی
 پیروی میں کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہوری رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے
 دلائل کی تشریح کر دی اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہوری کے

لے فقہیات میں حضرت دالاکا ہی مسلک ابتداء سے آخر تک قائم رہا ہے یہ باتیں تو دلیل ہیں اس امر کی
 کہ حضرت والا مرتبہ نفس کے مرحلہ سے ہمیشہ ہرگز وبالہ رہے۔

مسئلہ کا حق ہونا سمجھ میں آگیا و ما توفیقی الا باللہ

مسئلہ تصاویر کے متعلق میں نے ۱۹۱۹ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں (۱) ذی روح کے فوٹو لینے یعنی عکس تصویر کشی اور خصوصاً (۲) نصف حصہ جسم کے فوٹو کا جزا نظر کیا تھا، اس سلسلہ میں بعد کو ہندوستان اور مصر کے بعض علمائے بھی مضامین لکھے جن میں سے بعض میرے موافق ہیں اور بعض میرے مخالف، لیکن بہر حال اس بحث کے سارے پہلو سامنے آگئے ہیں، اس لئے سب کو سامنے رکھ کر اب اس سے اتفاق ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ابراہیل دسی تصویر کی طرح ناجائز ہے اور امثالہ کی کھینچنا ناجائز اور کھینچنا با مضطر اور جائز اور دھڑکا بغیر سر اور چہرے کے دونوں جائز! پوری تفصیل آئندہ لکھی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ

زیوروں میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف رہا ہے، روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عدم وجوب کی قائل تھیں۔ سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں ان کے اس مسلک کی تشریح میرے قلم سے کچھ اس انداز سے نکلی ہے، جس سے اس مسئلہ میں ان کی اس رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے چنانچہ ایک صاحب علم نے بڑی خوبی سے اس کا جواب بھی ایک رسالہ میں لکھا ہے

لے یہ ہے محققانہ رنگ جو ہر دور کے صفِ علما کی چند ہی ہستیوں میں دیکھا جاتا رہا ہے اور ہر عالم کا ایک حلقہ نظر ہوتا ہے جس کے باہر بھاگنے کو وہ جرم سمجھتا ہے مثلاً موجودہ ہندوستان و پاکستان میں دیوبند بریلی اور خیر آباد کے تین حلقے قائم ہیں اور بالعموم علما ان ہی چند نبیوں میں محصور رہ کر کام کرتے ہیں۔

مے معلوم نہیں کہ تفصیل بھی جاسکی یا نہیں لیکن جو کچھ تحریر فرمایا گیا اس میں تصویر کے مسئلہ میں ہر پہلو سے حاوی فتویٰ مل گیا۔

جو شائع ہو چکا ہے اس لئے اس غلط فہمی کو دور کر دینا ہے اور کہہ دینا ہے کہ میں زیوروں میں جمہور کے فیصلہ کے مطابق زکوٰۃ کے وجوب کا قائل اور اسی پر محمد اللہ عامل ہوں اور کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ اس کی تصحیح بھی ہو جائے گی۔

یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بارالہا مجھے صراطِ مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ سے غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہِ صواب دکھا، ربنا اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین -
ربنا لا تأخذنا ان نسینا او اخطانا..... وعف عنا و اغفر لنا وارحمنا انت مولانا!!

اگر مسلمانوں میں کوئی ایسا ہو جس نے میری وجہ سے ان مسئلوں میں میری رائے اختیار کی ہو تو اس کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ اس میرے رجوع اور تصحیح کے بعد اپنی غلطی سے رجوع کر لے اور صحیح امر اختیار کرے۔ علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور ترجیح اور قولِ ثانی کا عام رواج رہا ہے

لے اپنے ناقد کا ذکر اس خندہ پیشانی اور قدر شناسی کے ساتھ سلیمان پاک نہاد ہی کے قلم سے پڑھنے میں آئے گا ورنہ اور حضرات کی کتابوں میں اس مرحلہ پر طالب علمانہ شان اور عالمانہ زبان کی تقصیر صاف نظر آئے گی۔

لے یہ ہے حقیقت حال جو طاری تھی۔

لے یہ ہے رنگِ عیدیت جو بخت سے بخت تر ہوتا چلا گیا تھا۔

یہ انہی کا اتباع حق ہے۔ والحق احق ان یتبع والسلام علی
من اتبع الہدے!"

سبحان اللہ! تبارع حق کا کیسا حق ادا فرمایا، آخرت میں اس اظہار حق پر جو کچھ
انعام و کرام ملے گا وہ تو ملے ہی گا، مگر دنیا میں بھی اہل نظر کی نگاہ میں حضرت والا کا رتبہ
کس قدر عالی ہو گیا، وہ خلف میں سلف کی تصویر میں کر نمایاں ہو گئے۔

شیخ کی تبریک و تحسین | اس اعلان رجوع و اعتراف کے ساتھ معارف کا ایک
رسالہ حضرت والا نے اپنے شیخ معرفت آگاہ کی خدمت

میں بھی بھیجا، حضرت شیخ کے قلب مبارک پر اس تحریر کا بڑا اثر ہوا، اپنی عادت و مزاج
کے خلاف پہلی اور آخری مرتبہ اپنے خلیفہ ارشد کی مدرج میں چند اشعار لکھ کر بھیجے، ان
میں قلب سلیمان کی تنویر اور معرفت آگاہی کی تصدیق فرمائی اور خوب خوب تحسین
و آفرین کی ہے، ساتھ ہی اپنی کتابوں کی نظر ثانی کا بھی مشورہ دیا ہے کہ یہی خود شیخ کا بھی
طریق عمل تھا۔

اس نظم کا آغاز آیات قرآنی کے جن جواہر پاروں سے کیا گیا ہے اس کے بعد کا
ایک شعر مثنوی معنوی سے ماخوذ ہے اور اس میں "تصرف سیر" کے بعد ذات سلیمانی پر چپاں
کیا گیا ہے، بقیہ اشعار اور نظم کے کل عنوانات حکیم الامت ہی کے قائم کئے ہوئے ہیں، اس
ضروری تعارف کے بعد وہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اعتراف (یعنی اعلان) | اعتراف (یعنی رجوع سلیمان)

لشکل هذا فليعمل العاقلون | وفي ذلك فليتنافس المتنافسون

یعنی عمل کرنے والوں کو چاہیے کہ حضرت سلیمان کے اس عمل (رجوع) کو اپنے لئے شمع ہدایت بنائیں اور
ایسے اعمال حق و صداقت کی حرم پیدا کریں۔

اقتباس ترغیب دلیزیر، از مشنوی رومی بتصرف سیر

از سیلماں گیر اخلاص عل داں توندوی رامنزہ از دغل
لے دلت معور از اسرار حق لے دلت مخور از آثار حق

بشارت

لے دلت پرنور از انوار حق لے دلت مسرور از اخبار حق

دعا

صد مبارک باد ایں اظہار حق صد مبارک باد ایں اقرار حق

مشورہ

یک باشد ایں طریق نفع خاص کہ بہ اہل علم دار و اختصاص

سعی نفع عام اینجا واجب است آنکہ نافع بہر ہر طالب است

تفسیر نفع عام

در کلام خود نظر سر خود کردنی یا کہ تقاوے بدست آوردنی

ہیچناں کردم بہ تالیفات خویش صرف ہم کردم پے اول نقد خویش

معذرت

گرچہ ناظم نیستم ابیات را نشر کردم ایک ایں جذبات را

مقصود من خیر خواہی ہست و بس بگو کہ بار غبت فتنہ در گوش کس

اشرف علی ۲۷ محرم ۱۳۶۱ھ

لے اصل شعریہ ہے۔ از علی ہوز اخلاص عل بہ شیر حق را داں منزہ از دغل۔ (دفتر اول مشنوی معنوی)

لے حضرت والا فرماتے تھے کہ اس نصیحت کے مطابق سیرۃ النبی کی نظر ثانی کی گئی مگر بجز ان دو مسائل کے جنکا ذکر خود اعلان رجوع میں آپ کا کوئی بات قابل ترمیم و تصحیح نظر نہیں آئی۔ رسالہ اہلسنت والجماعت کی بھی نظر ثانی فرمائی تھی، اور کچھ تنسیخ و ترمیم کے بعد اس کو دوبارہ کراچی کے دوران قیام میں مکتبہ الشرق میں چھپوایا تھا

ان اشعار کو ایک بار نہیں بار بار پڑھئے اور محسوس کیجئے کہ شیخ کے آمنہ خاطر میں
باطن سلیمانی کا کیسا نقش اتر آیا ہے کہ اسی کے کیف نظاہ سے ہشتاد سالہ شیخ کے
جذبات متحرک ہو گئے اور زبان نرئم دیز ہو گئی ہے!

جہاں تک اپنی نگاہ کی پہنچ ہے نظر نہیں آتا کہ حسام الدین چلیں رحمۃ اللہ علیہ کے
بعد یہ سعادت حضرت دالاج کے سوا کسی اور کو نصیب ہوئی ہو کہ شیخ وقت نے اپنے مترشد
کی مدح میں بے ساختہ اشعار کہے ہوں، اللہ کی دین ہے کہ سید ذی جاہ کا اعتبار علم و
معرفت کی اقلیموں میں یکساں قائم رہا، ادھر علامہ شبلیؒ اور ادھر عارف تھانویؒ سے تحسین و
آفرین پائی!

وَلَيْسَ عَلَى اللَّهِ بِمُسْتَنْصِرٍ
أَنْ يَجْمَعَ الْعَالَمُ فِي وَاحِدٍ

۱۔ مثنوی کے دفتر ششم کا آغاز ہی مولانا روم نے اس تمہید سے فرمایا ہے۔

میل می جو شد بقسم سارے	اے حیاتِ دل حسام الدین بیسے
در جہاں گرداں حسامی نامہ	گشت از جذب چو تو عسلام
در تمام مثنوی قسم ششم	پیش کش بہر نہایت می کشم

شور و غوغا اور حضرت والاؒ کی استقامت

حضرت والاؒ نے حکیم الامتؒ سے تعلق تو کہنا چاہیے "بصیغہ راز" ہی جوڑا تھا مگر یہ راز وہ راز نہیں تھا جو زیادہ دیر چھپا رہتا، زبان اس کو افشاء کرتی مگر حال کا اخفا کس کے بس کی بات ہے، بقول خسرو ثانی خواجہ عزیز الحسن مجذوب ہے

زباں چُپ رہی مگر چہ مجبور ہو کر رہا بال بال اپنا منصور ہو کر
شور تسبیح و استغفار سے پہلے دار المصنفین گونجا اور انقلابِ باطن کی خبر ملی،
پھر خلافت کی منادی ہو گئی اور اب جو رجوع اور اعتراف کی تحریر چھاپ دی تو ساری علمی
دنیا میں اس کا ڈنکا پٹ گیا، لوگ حیران تھے کہ مسند نشین شبلیؒ آستانہ اشرفیہ پر؟
علم کا دھنی فیکری دہلیز پر؟ ملت کا رہبر خانقاہ کے حجرہ میں؟

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو

تو کجا بہر تماشا میروی

جبرت نے مخالفت کی کروٹ بدلی، ایک ہنگامہ بپا ہوا حضرت علامہ کے
لئے بڑا صبر آزمائے! اندر کے کچوکے، باہر کے دار، اپنوں کی ناراضی، بیگانوں
کی شتمات، ع

کھاؤں کہاں کی چوٹ بچاؤں کہاں کی چوٹ

بہت تنگ کئے گئے خطوط کی بھر مار ہوتی کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟ آپ کو
اس کی کیا ضرورت پڑی تھی مگر جس کو ستایا جا رہا تھا وہ کوہِ وقار تھا، اس کا دل یقین
سے معمور تھا کہ جو راہ اختیار کی گئی ہے وہ حق ہے، صداقت ہے اور حق و صداقت ہی

کی دونوں جہان میں کامرانی ہے۔

ان سارے استفسارات و اعتراضات کے جواب میں حضرت والا
عمومی جواب اکثر یہی فرماتے رہے کہ:-

”وہ لوگ مجھ کو زبان سے توفاضل اور محقق کہتے ہیں مگر درحقیقت مجھ کو
یہ عقل جانتے ہیں، آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے کہ ان کے
خیال کے مطابق اگر میں واقعی علامہ اور محقق ہوں تو کیا بلا وجہ میں نے
مولانا تھانوی کا دامن تھاما ہے؟ میں نے اپنے اندر کوئی کمی تو پائی
جس کی تکمیل کے لئے میں وہاں گیا۔“

ایک اور محکم جواب | اس کے باوجود جب بعضوں نے گلہ کیا کہ ہم نے تو آپ کو
اپنا قبلہ بنایا تھا، آپ کو کسی کے آگے جھکنے کی کیا ضرورت
تھی تو صاف یہ جواب باصواب لکھ دیا کہ:-

”جن کمالات کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا، ان ہی کمالات
نے مجھ کو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا میں نے اپنے انجام کی فکر کر لی
اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لیں۔!“
یہ پامردی اور استقامت کی کوئی معمولی مثال ہے؟ عزت و جاہ کی کوئی معمولی
قربانی ہے؟

عم محترم کو بصیرت افروز جواب | اس شور و غوغا سے بہت پہلے معلوم
ہوتا ہے کہ حضرت سیدی کے محبوب

چچا حضرت سید عبدالحکیم صاحب دینوی مدظلہ نے بھی حضرت کی ارادت سے متعلق
شاید لکھا تھا کہ ظاہر و باطن کے سارے کمالات کے باوجود اب اس کی کیا ضرورت
تھی، ظاہر ہے کہ چچا کی اپنے بھتیجے سے یہ ہمدردی، غایت مہر و محبت ہی کا کرشمہ تھی۔

حضرت والدہ نے ان کی تسکین خاطر کے لئے جو جواب تحریر فرمایا، اس کا ایک ایک جملہ چشم بھیرت کے لئے سرمہ سلیمان کا اثر رکھتا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت پر حقیقت کیسی کھل گئی تھی اور اب وہ ماسوی اللہ سے کس قدر مستغنی ہو کر طریق اخلاص پر گامزن تھے۔ مکتوب پوری توجہ سے ملاحظہ ہو:-

"آپ اپنی محبت سے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں، لیکن من آنم کہ من دانم علماء پر فرائض کا بارعام مسلمانوں سے زیادہ ہے اس لئے اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے۔ معاملہ دماغ کا نہیں قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے۔ نفس کا نہیں روح کا ہے۔

میری اتنی زندگی بندوں میں گزری، اب کچھ اس زندگی کے لئے کرنا چاہیے جو باقی ہے۔ ابھی منزل مقصود بہت دور ہے..... صرف تسبیح و مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو۔ ہم تو بندوں کی رضامندی اور ناراضی میں گرفتار ہیں مالک کی رضامندی اور ناراضامندی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجئے کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ صحیح راستہ پر چلائے۔" (۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کا استعجاب | مولانا ابوالکلام مرحوم حضرت والاک کے قدیم رفیق اور ان کے حالات کے معترف تھے

یہ ہے ساختہ عارف شیراز کے شعریار آگئے۔

از قیل وقال مدرسہ حالے دلم گرفت
ایں جان عاریت کہ بد حافظ سپرد دست
ایک چند نیز خدمت معشوق می کنم
روزے رخش بہ بینم و تسلیم دی کنم

تسبیح و مراقبہ تو محض ذرائع ہیں مقصود نہیں مقصود حصول نسبت مع اللہ ہے!! سلیمان نمبر معارف۔

یہ ملاحظہ ہوں مکاتیب ابوالکلام بنام علامہ سید سلیمان، شائع شدہ معارف ۱۹۵۳ء ۱۹۵۵ء۔

مدت تک مل جل کر کام کرتے رہے لیکن ادھر عرصہ سے دونوں کی راہ الگ الگ ہو گئی تھی اور ملنے ملائے تک کا موقع برسوں سے نہیں آیا تھا مگر مولانا تک حضرت کے انقلاب روحانی کی خبر بہر حال پہنچ چکی تھی اور وہ بھی حیرت زدہ تھے کہ یہ کیا ہو گیا؟ خود حضرت والا نے سنایا کہ برسوں بعد جب مولانا ابوالکلام بھارت کے وزیر تعلیم بن چکے تھے دہلی میں کسی دعوت میں ان سے ملاقات ہو گئی تو انہوں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

”مولانا میں نے سنا ہے کہ آپ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مسرید ہو چکے ہیں اور ان کے خلیفہؒ مجاز بھی ہیں؟“

حضرت والا نے دونوں باتوں کا اعتراف فرمایا تو پھر مولانا نے سوال کیا۔
 ”آخر تصوف میں ہوتا کیا ہے؟“
 حضرت والا نے جواب دیا کہ۔

”یہ بات تو کسی تفصیلی صحبت میں پوچھنے کی ہے اس مختصر وقت میں کیا بتاؤں؟“
 (بات ختم ہو گئی اور پھر کسی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ سوال تشوُّبِ جواب ہی رہ گیا مگر اب سائل و مسئول دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں بغیر سوال کے ہر حقیقت خود بخود شاہد ہے!)۔

غرض اس واقعہ کو سنا کر حضرت والا نے فرمایا کہ یہ وہی مولانا ابوالکلامؒ ہیں جن کے والد ماجد کلکتہ کے مشہور پیر تھے اور ان کے وصال پر لوگوں نے ان کو ان کا گدی نشین بھی کیا تھا، اگر وہاں کچھ پایا ہوتا تو آج یہ سوال کیوں کرتے، رسم و رواج نے حقیقت گم کر دی اور اس رسمی پیری مریدی کو دیکھ کر لوگ حقیقت تصوف کے، جس کا صحیح عنوان تقویٰ و احسان ہے منکر ہو گئے!!

اب تک اعتراض عجیب بات یہ ہے کہ حضرت والارح سے متعلق یہ ہنگامہ کوئی ہنگامی نہ تھا بلکہ آج تک سیرت سلیمان کا یہ باب

ایک اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے اور کہنے والے اب بھی یہی کہہ جاتے ہیں کہ سید صاحب نے ”ندوی“ نسبت کو ٹھیس پہنچائی، اس رجوع سے ان کو کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو مگر سید صاحب کی ارادت کے طفیل مولانا تھانوی کا نام تاریخ میں محفوظ ہو گیا جو ذرا نرم ہیں وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ خیر اس تعلق میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا مگر صلیب کے ذکر و شغل میں انہماک کی وجہ سے ان کی علمی تحقیقات رک گئیں غرض جتنے مذاہنی باتیں، یا یوں کہیے کہ جتنے ہمدرد اتنی ہمدردیاں، ان سب کا ایک جواب تو وہی ہے جو خود حضرت والا کے جگر گوشے سید سلیمان صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے ایک محفل جہاں اسی قسم کا تذکرہ چھڑ گیا تھا دیا تھا کہ :-

”جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور وہ واقعہ تاریخ کا ایک جزو بن چکا اب اس

پر بحث کون سی غفلت مندی ہے! انہوں نے جو ٹھیک سمجھا وہ کیا اب

آپ لوگوں کی جو سمجھ میں آتا ہے وہ کیجیے“

فرزندِ سعید کا یہ جواب بالکل اپنے والدِ بزرگوار (قدس سرہ) کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور ان کی زبان سے ادا ہو کر اس کا لطف دو بالا ہو گیا۔ رزقہ اللہ تعالیٰ معرفتِ کاملہ۔

میں سب اہل علم معترضین سے بکمال ادب پوچھتا ہوں کہ اگر جواب خاتم ”آبروے ندوہ“ اپنی عظیم الشان رسمی و تعلیمی، قومی و ملی خدمات

کے بعد اور اپنے ہیج پر کام کرنے والوں کی ایک جماعت تیار کر کے بالآخر ہمہ تن متوجہ بحق نظر آ رہا تھا، تسبیح و استغفار میں مہمک تھا تو کیا وہ اپنے عمل سے

محبوب دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی سنتِ مطہرہ کو زندہ نہیں کر رہا تھا، جو اسوہ محمدیؐ کا آخری باب ہے ۹۔ حیرت ہے محمد رسول اللہؐ تو منصب تبلیغ پر

مامور اور ساری انسانیت کے دائی شرح صدر سے مشرف اور بیکہ معصومیت ہونے کے باوجود فساہیم بہ حمد ربک واستغفرک کا حکم پائیں اور سب کاموں سے ہاتھ کھینچ کر تسبیح واستغفار میں مشغول ہو جائیں لیکن اگر ان کے کسی خوش نصیب امتی کو یہی سعادت زندگی کے ایسے ہی مرحلے میں حاصل ہو جائے تو وہ قابل گرفت ٹھہرے؟ یا العجب۔

مقام ڈرنے اور توبہ کرنے کا ہے! دعا تو سب خادمان علم اور خدمت گزاران ملت کی یہی ہونی چاہیے کہ آخر کار ان کو بھی ایسی ہی سعادت مل جائے جیسی سید الملت علیہ الرحمۃ کو مل گئی تھی۔

لمثل هذا فليعمل العاملون

وفي ذلك نلینا نفس المتنافسون

معتقدین کے لئے سامانِ تشفی | ایک بات جہاں معترضین کی خدمت میں عرض کر دی گئی، دو جملے حضرت دلائل

کے معتقدین کی تشفی کے لئے بھی ضروری ہیں۔ یہ ہنگامہ جو ہمارے سید ذی شانؑ کے ساتھ پیش آیا، عرفاء اور اتقیا کی تاریخ میں انوکھا نہیں — دیکھئے عارفِ رومیؒ نے جب شمس تبریز کا دامن تھاما تھا تو کیا خود مولانا روم ہی کے شاگردوں نے شمسِ تاباں پر دھول جھونکنے کی کوشش نہیں کی؟ اور کیا بالآخر انہی ناقدروں کے ہاتھوں عارفِ رومیؒ کو مدّتوں بادیہ پیمالی نہیں کرنی پڑی؟ — اسی طرح امام غزالیؒ کو بھی اس مرحلہ پر پہنچ کر کیا کچھ نصیحتیں سننی نہ پڑیں، خود امام عالی مقام ہی کی زبانی اس کی کچھ روداد سنئے۔

”علماء اور ارکانِ سلطنت کو جب یہ خبر ہوئی تو سب نے نہایت

الخارج کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بد نصیبی ہے

ایسی نفع رسائی (یعنی درس و تدریس) سے آپ کا دست بردار ہو جانا
 شرمنا کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ تمام علماء و فضلاء یہی کہتے تھے، لیکن
 میں اصل حقیقت کو سمجھتا تھا، اس لئے سب کو چھوڑ چھاڑ دفتہ
 کھڑا ہوا اور شام کی راہ لی۔

حضرت شیخ کی خدمت میں آخری حاضری اور

رحلت شیخ

ہوتا رہا جو کچھ ہوتا رہا، مگر حضرت والا اپنی متعینہ راہ پر پورے عزم و یقین سے گامزن تھے، اور گرد و پیش سے بالکل بے نیاز

ع خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے

اپنی مشغول و مصروف زندگی کے باوجود وقت نکال نکال کر بار بار شیخ عالی مقام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیض صحبت اٹھاتے رہے، یہاں تک کہ وہ حاضری بھی جس پر اس عالم ناسوت کی ملاقات ختم تھی، اس کی تفصیل خود حضرت والا ہی کی زبان فیض اثر سے سنئے۔

”میری آخری حاضری“

”خاکسار جون (۱۹۶۳ء) کے آخر میں اپنے مستقر (اعظم گڑھ) سے تھانہ بھون اور پھر بھوپال کے ارادہ سے روانہ ہوا، لیکن لکھنؤ پہنچ کر دارالعلوم ندوۃ کے معاملات نے الجھا لیا۔ لکھنؤ میں ہر روز حضرت کی شدت علامت کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ حضرت کے ہزاروں

معتقدوں کی طرح خاکسار بھی زیارت کے لئے بے چین تھا۔ حضرت کی طرف سے سخت قدغن تھی کہ باہر لوگوں کو اس شدتِ علائق اور کیفیتِ مزاج کی کوئی اطلاع نہ دی جائے تاکہ مخلصین میں اضطراب پیدا نہ ہو اور وہ سفر کی زحمت نہ اٹھائیں، جو پہنچ جاتے تھے عام طور پر بطور تنبیہ ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اس پر بھی خاکسار خلاف دستور بے اطلاع ۶ جولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہو گیا اور ۷ کی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہنچا، دریافت حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے جس سے تسکین ہوئی میرا اس طرح خلاف دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لئے تعجب کا موجب ہوا، میری آمد کی خبر مینے والے سے پوچھا "تم مولوی سلیمان کو پہچانتے بھی ہو یا یوں ہی کہہ رہے ہو"۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوا، "ان کی عادت ہے اطلاع آنے کی تو یہ تھی" حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض کی، علائق کی خبر سن کر چلے آئے ہوں گے نمازِ ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی ضعف سے بستر پر لیٹے تھے، مصافحہ فرمایا، خاکسار نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا، شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی۔ قیام کے دن پوچھے خاکسار

۱۔ ذرا اس جملہ کی روح تک رسائی ہو اکیا شانِ تواضع ہے کہ اپنی محبت کو کبھی بے امتیاز کر کے رکھ دیا ہے اور نہ حبِ شیخ جس نقطہ کمال تک پہنچی ہوئی تھی اس کا اندازہ ابھی چند بلبوں کے بعد ہو جائیگا (غ م)

۲۔ حضرت والا فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے ہمیشہ ناز و نعم ہی میں رکھا، یہاں تک کہ شیخ کی خدمت میں بھی جب تکسی خادم کے حاضری ہوئی تو حضرت شیخ نے تاکید فرمائی کہ آپ کو سفر میں ایک خادم ہمیشہ اپنے ساتھ ضرور رکھنا چاہیے۔

نے بھوپال کے سفر کی ضرورت ظاہر کی کہ سرکار بھوپال نے اپنی ریاست میں مسلمان عورتوں کے طلاق و تفریق کے مسائل طے کرنے کے لئے علما اور اہل قانون کی ایک مجلس مقرر کی ہے، اس کی شرکت کے لئے مع مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب یہاں سے جانا چاہتا ہوں، اس لئے مجلس کی تاریخ کی اطلاع تک یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ والیہ بھوپال پر رحمت فرمائے کہ انھوں نے مسلمان عورتوں کے حال پر رحم کھایا، خاکسار نے عرض کی کہ حضرت وہاں اب والیہ نہیں والی ہیں، فرمایا ٹھیک ہے، غرض اس حالت میں بھی کہ ضعف پوری شدت پر تھا، سکھ میں تکلف تھا، پھر بھی حاضرین مجلس پر شفقت فرما کر ملفوظات سے ذرا تھم تھم کر بہرہ ور فرما رہے تھے، اور لوگوں کے آئے ہوئے خطوط سن رہے تھے اور بدستور جواب لکھوا رہے تھے بلکہ بعض بعض خطوط پر خود دست مبارک سے بھی لکھ دیتے تھے کہیں جو قوت پاتے اور اس وقت کام کرنے لگتے تو تھوڑی دیر کو حاضرین کو یہ خیال ہونے لگا کہ حضرت بیمار ہی نہیں، مگر ادھر جوش بیان کم ہوا اور ادھر تکیہ پر سر رکھ دیا، ہمیشہ کی عادت یہ تھی کہ بڑا تکیہ پیٹ سے لگا کر سر کو بے سہارا اونچا رکھتے تھے، یہی حال اس وقت بھی تھا، دیکھنے والوں کو تکلیف معلوم ہوتی تھی اور اس مشورہ کو جی چاہتا تھا کہ دوسرا تکیہ اور رکھ کر اس پر حضرت سر مبارک کو رکھ لیں، چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں عرض کیا تو ارشاد ہوا، ”نہیں اس کی حاجت نہیں“، بعد کو خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری ریٹائرڈ انسپکٹر آف

لے یہ ہے عارفانہ نقطہ نظر اور عارف کا میل کی دعا کا محرک۔

اسکولس یونی، جو حضرت کے خلیفہ خاص، محرم خاص بلکہ خادم خاص ہیں نے فرمایا کہ حضرت کی ہمیشہ کی عادت یہی ہے، اس ضعف و اضحال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار، نظم و ضبط اور اصول و قواعد کی پابندی بدستور جاری تھی اور اخیر لمحہ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا۔

عصر کے وقت مجلس برخواست ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ کھانے کے الگ انتظام کی ضرورت نہیں، چند روز کے مہمانوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں، بڑے گھر سے کھانا آجائے گا، اور ایک خادم خاص کو اس کی ہدایت فرمائی۔

اس نامنوا دار کے لئے تو یہ خیر و برکت کا سامان تھا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب چاہو اور جس وقت چاہو آ سکتے ہو، کوئی قید نہیں۔ یہاں

لے ایک مسلم ادیب اور صاحبِ فکر و نظر کے قلم سے خلیفہ محترم اور خادم کے الفاظ، یہ نہ سمجھے کہ یونہی نکل گئے ہیں، نہیں، اس ترتیب میں معنوی ترقی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ محبت و اخلاص کی نگاہ میں خلافت بلکہ حریمیت سے بڑھ چڑھ کر خادمیت ہی کا رتبہ ہے کہ یہاں خادم اپنے آقا و محبوب کا محض عاشق ہی نہیں، بلکہ عاشقِ فانی ہوتا ہے وہ وفاداری کے منتہا پر پہنچ کر وفا کے معنی کو بھول جاتا ہے اور اپنی حالت پر شرمسار ہوتا ہے۔

جان تم پر نشانہ کرتا ہوں میں نہیں جانتا وفا کیلئے

اس خادمیت کی مثال صدیوں پہلے امیر خسرو دہلوی نے قائم کی تھی، یا پھر اس دور میں خواجہ غریب الدین مجدوب نے، ورنہ خلفاء جو حضرت سلطان اولیا قدس سرہ کے بھی سیکڑوں تھے اور حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بھی بیسوں!

تھے ہمارے حضرت والاؒ کو یہ امتیاز بھی ہمیشہ حاصل رہا کہ حکیم الامتؒ نے ہمیشہ اپنا ہی ہمسان بنائے رکھا، حتیٰ کہ اس مرض الموت کی حاضری میں بھی اس شفقت خاص کو برابر مہذول رکھا۔

سے اٹھ کر جب خانقاہ پہنچا تو بعد نماز حضرت والار کی طرف سے ،
 حضرت کی اخیر تصنیف ”بوادر النوار“ کا ایک نسخہ مولانا جمیل احمد صاحب
 نے ہدیہ لاکر عنایت فرمایا اور یہ ارشاد سامی پہنچایا کہ میرے مضامین
 سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو، اس حکم کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا نسخہ
 سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت
 نے اپنی زبان مبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت
 کی زحمتِ تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد
 صاحب کے ذریعہ پہنچ چکا، مگر وہاں سے اٹھنے کے بعد مولانا جمیل احمد
 صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود کیا ہے ؟ یعنی
 اس کتاب بوادر سے اقتباس یا عام کتابوں سے ؟ انہوں نے فرمایا
 اس کو میں خود بھی نہیں سمجھا، بعد کی حاضری میں موقع پا کر میں نے تفصیل
 چاہی تو ارشاد ہوا، انہیں، عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں،
 اُن کو یکجا کر لیا کرو۔

میری حاضری، جولائی سے ۱۱ جولائی ۱۹۴۳ء کی دو پہر تک رہی
 حاضری کے دوسرے یا تیسرے دن استفسار ہوا کہ کھانا تو مزاج کے
 موافق ہوتا ہے ؟ عرض کی کہ بالکل مطابق ہے، کس تواضع اور کس
 شفقت اور کس بلاغت سے ارشاد ہوا کہ ”میں (یعنی حضرت تھانوی)
 معافی کا خواستگار نہیں مستحق ہوں“۔ اس نکتہ پر اہل ذوق نے
 تحسین کی سعادت پائی کہ ضعف و نقاہت کے اس عالم میں بھی دل
 و دماغ ناقصوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور اکرامِ غنیف کا نمونہ
 پیش کیا جا رہا ہے۔

فاسکار کو بھوپال کی مجلس کی تاریخ ۹ جولائی کو تار سے معلوم ہو چکی، تھی، ۱۰ کو رفیق سفر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا بھی حکومت تلہ آگیا۔ ۱۱ کی صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی بالانہمہ ضعیف قوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لئے بڑھائے، حقیر نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دست مبارک کو بوسہ دیا، اور آنکھوں کو ملا، آہ! کس بلا کا رخصتانا تھا، فرمایا۔ ”جاؤ، خدا کے سپرد کیا“ یہ لفظ کانوں نے پہلے نہیں سنے تھے، آنکھیں ڈبڈبائیں اور دیر تک چہرہ مبارک پر چہرے رہیں کہ یہ جمال جہاں آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے، سو ایسا ہی ہوا۔“

رحلتِ شیخ | غرض حضرت دالہ آخر کی زیارت سے مشرف ہو کر ۱۱ جولائی کو تھانہ بھون سے بھوپال روانہ ہو گئے، اس کے آٹھ دن بعد یعنی ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۳۲ء کی درمیانی شب کو شیخ وقت حضرت حکیم الامت نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل رابدل رہیست۔ اسی رات کو حضرت والادہ نے ایک خواب دیکھا، جس کی تفصیل خود حضرت ہی کی زبانی سنئے:-

”فاسکار اب تک بھوپال میں تھا، عنایتِ الہی دیکھئے کہ عین شب وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا شبیر علی صاحب (برادر زادہ حکیم الامت) مجھ سے فرما رہے ہیں کہ حضرت مولانا کو پوری صحت ہو گئی، صبح اٹھ کر

لے کیا عجیب بات ہے کہ یہ ٹھیک ہی جمد ہے جو شیخ العرب والہم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان چھوڑتے ہوئے اپنے خلیفہ رشید مولانا رشید احمد گنگوہی سے دعا کی ملاقات پر فرمایا تھا اور رخصت ہو گئے تھے!! (ملاحظہ ہو امداد المشتاق مولف مولانا تھا نوٹی)۔

میں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے یہ خواب بیان کیا، دونوں چپ رہے، مفتی صاحب ۲۱ جولائی اور خاکسار ۲۲ جولائی کو بھوپال سے روانہ ہوئے، میں ۲۳ کی دوپہر کو کھنوسہ پہنچا اور مدوہ آیا۔ حادثہ سے بالکل بے خبر تھا۔ مدرسہ پہنچنے کے ساتھ میرے بچے سلمان سلمہ نے سب سے پہلے خبر دی۔

دما کان قیسؑ ہلکے ہلاک واحد ولا کنہ بنیان قوم تھکد ملہؑ

حضرت والا کا گہرا تاثر | مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہ کی رحلت کا حضرت والا کے قلب مبارک پر جس قدر گہرا اثر ہوا، اسکا اندازہ ہم کیا کر سکتے ہیں، باقی اتنی بات تو آنکھوں دیکھی ہے کہ اس سانحہ کے کوئی ۹-۱۰ مہینے بعد یعنی مارچ و اپریل ۱۹۴۲ء میں جب وہ حیدر آباد دکن تشریف لائے تھے تو چہرہ بشرہ مرقع غم اور لب و لہجہ اس قدر داغیز تھا کہ اہل محفل کے قلوب گداختہ ہو جاتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علامہ کا قلب ابھی خون ہوا ہے، ”فراق یار“ کا یہ اثر برسوں باقی رہا، بلکہ سکون پانے پر بھی آخر حیات تک یہی دیکھا کہ جب حضرت تھانویؒ سے اپنے تعلق کا ذکر فرماتے تو آواز بھرا جاتی اور آنکھیں ڈبڈباتیں، بس ایک آدھ جملہ فرما کر خاموش ہو جاتے تھے۔

تاثر کے قلمی اثرات | غرض اس سانحہ کے فوراً بعد حضرت والا نے چند اشعار درود کرب سے مجبور ہو کر کہے، مگر چونکہ خود عارف تھے اور سند ارشاد پر فائز اسلئے جذبات کا سیلاب حصارِ شرع کو چھو بھی نہ سکا اور آہ و بکا

لے یاد رنگان صلاۃ

یہ حضرت حاجی حافظ محمد عثمان صاحب دہلوی فرمایا کرتے تھے کہ جن حضرات کو یکیم الامت قدس سرہ کے جنادہ میں شرکت کا موقع حاصل رہا، ان کو سکون پھر بھی جلد نصیب ہوا مگر جو اس شرکت سے محروم رہے انکے غم و حزن کی آگ بہت دیر میں بجھ سکی، چنانچہ خود اپنی دردناک سبیا کرتے تھے کہ میں بھی انھیں

میں بھی تلقین و صبر کی شان پیدا ہو گئی۔ ملاحظہ ہو، اشعار اسی انداز میں لکھے جا رہے ہیں جیسے حضرت والاؒ نے اپنے قلم سے اپنی بیاض میں لکھے ہیں۔

رحلتِ شیخ

داغِ فراق یا رُمٹایا نہ جائے گا اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا
حرفِ دم و داغِ خدا کے پیرِ دہو تا آخر حیات جھلایا نہ جائے گا

خیالِ سربالین

دل بھر کے دیکھ لو یہ جانِ ہاں فروز پھر یہ جمالِ نور دکھایا نہ جائیگا
گوشِ جہاں بغور سنے اس کلام کو پھر یہ کلامِ شوق سنایا نہ جائے گا
اے میکشویہ دردِ تہِ جام بھی پیو تو سو گئے پھر یہ جامِ پلایا نہ جائیگا

میں سے تھا جو توفیقِ شیخ کے وقت موجود نہ تھے، مجھ پر ایک عرصہ دما ز تک اس درجہ شدید گریہ طاری رہا کہ بصارتِ رخصت ہونے کا قوی امکان پیدا ہو گیا تھا، ایسے میں حضرت عظیم الامت کو ایک رات خواب میں دیکھا کہ تشریف لائے اپنے سیدِ مبارک سے مجھ کو لگایا اور میرے شانوں پر بوسہ دیا، اس رویا کے بعد سیلابِ اشک تھم گیا اور دل کو ایک گونہ قرار آ گیا۔ یہ عشق و محبت کے احوال ہیں نمری عقل سے نہیں بلکہ حائرِ قلب کی بیداری سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

لہٰذا اس عنوان اور ان تین اشعار سے متعلق خود حضرت والاؒ نے لکھا ہے کہ جب وہ مولانا تھانویؒ کی خدمت میں آخری بار حاضر ہوئے تو حضرت نے اذراہِ محبتِ سربالین ایک کرسی پر بیٹھنے کا امر فرمایا حضرت تھانویؒ پر غور و نگاہِ استغراق کا عالم بار بار طاری ہو جاتا تھا اور آنکھیں بند فرما لیتے تھے، صاحبِ نظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے ردِ مال سے عکس رانی فرماتے ہیں، اسی عالم میں یہ خیالات انکے دل و دماغ پر گزرتے رہے !!

لے دل غمخس صبر و رضا کا مقام ہے نقشِ دوامِ فیضِ مٹایا نہ جائے گا
 پیرِ مغان نہیں ہے مگر میکہ تو ہے جام و سبو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا
 یونہی بچھا رہے گا یہاںِ خوانِ فیضِ عام جب تک ہیں مہمان بڑھایا نہ جائے گا
 چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چہ سراغ
 یونہی جلا کرے گا بھجایا نہ جائے گا!

اس کے علاوہ معارفِ مسیحیہ صوبۃ العالمِ موتِ العالم کے زیرِ عنوان
 وفاتِ شیخ پر اپنے انداز کا ایک مضمون بڑے سوز و گداز سے لکھا جس کے ابتدائی جملے
 یہ ہیں:-

”محفلِ دو شین کا وہ چراغِ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے چھونکوں
 سے کچھ کچھ کر سنبھل جاتا تھا، بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ ۲۰ روز قبل کر جب
 ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا،
 داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سودہ بھی غمخس ہو
 یعنی حکیم الامت، مجددِ طریقت، شیخِ اکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
 رحمۃ اللہ علیہ نے مرضِ ضعف و اسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹، ۲۰ جولائی
 ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نمازِ عشاء کے وقت اس دارِ فانی
 کو الوداع کہا اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں و مستفیدوں کو
 غمگین و مجبور چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب اُس دور کا بالکل
 خاتمہ ہو گیا جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور مولانا یعقوب
 صاحب نانوتوی اور مولانا قاسم صاحب نانوتوی مولانا شیخ محمد صاحب
 تھانوی کی یادگار تھا، اور جس کی ذات میں حضراتِ چشت اور حضرت

مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد بریلویؒ کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سبب چشتی ذوق و شوق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا،

پھر اس کے کچھ عرصہ بعد فروری ۱۹۴۳ء (صفر ۱۳۶۳ھ) کے معارف میں ”حکیم الامت کے آثارِ علمیمہ“ کے عنوان سے اپنے شیخِ رگنہ کی تصنیفات پر ایک مضمون سپرد قلم فرمایا جو انہی کا حق بھی تھا، اور حصہ بھی! اس مقالہ میں حسنِ ادب کے ساتھ کل تصنیفات اشرفیہ کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا گیا ہے اور بقول ہمارے محترم مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ کے

”جامع المجددین حضرت تھانویؒ کی تصنیفی و اصلاحی، علمی و عملی جامعیت پر حضرت سید القلم ایجاز رقم کا اعجاز مجسم ہے“۔
اور سچ یہ ہے کہ اپنے موضوع پر حرف آخر ہے، اس کے دو تین اقتباسات نمونہ پیش ہیں۔

(۱) تمام تصانیف کا ایک اجمالی تعارف پہلے کرایا گیا ہے جس کے درمیان چند فقرے یہ ہیں:-

”ان تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں، آٹھ سو کے قریب ہے، ۳۵۴ھ میں ان کے (مولانا تھانویؒ کے) ایک خادم مولوی عبدالحق صاحب فقہپوری نے

لے ملاحظہ ہو یاد رفتگان ص ۲۸۳۔

لے ملاحظہ ہو میری تالیف ”حیاتِ اشرف“ کا پیش لفظ رقم فرمودہ مولانا عبدالباری ندویؒ۔

ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے
(۸۶) صفحوں کو محیط ہے۔ اس کے بعد ۹ برسوں میں جو رسائل یا تصانیف
ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں،

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جن کی تصانیف
کے اوراق اگر ان کی زندگی پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد
زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے، امام ابن جریر طبری، حافظ خطیب
بغدادی، امام رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام
اس سلسلہ میں لئے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں مولانا ابوالحسنات
عبدالحی فرنگی محلی اور نواب صدیق حسن خان مرحوم کے نام بھی اس
سلسلہ میں داخل ہیں، اس سلسلہ کا اخیر نام مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ
کا ہے؛“

(۲) اس کے بعد تصانیف کے انواع، اُن کی زبان اور موضوعات کا ذکر
کر کے ہر فن کی کتابوں پر الگ الگ تبصرہ فرمایا گیا ہے، بیان القرآن پر تبصرہ
ملاحظہ ہو:-

”تفسیر بیان القرآن:- یہ بالہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر
ہے، جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے اس
تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں: سلیس و بامحاورہ، حتی الوسع
تحت اللفظ ترجمہ، نیچے ”ف“ کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر،
تفسیری روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے
فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے، لغات اور نحوی ترکیبوں
کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے،

صرفیانہ اور ذوق معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات و حقائق و معارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتبار فرمایا گیا ہے.....! عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیر صرف عوام اردو خوانوں کے لئے علماء لکھتے ہیں، یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا، لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب (کشمیری) نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے خود میرا خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے، ساتھ ہی ربط آیات و سورت کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں، اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق و وجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے، اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے۔

(۳) اب ایک اور اقتباس ”کلید شنوی“ سے متعلق پیش ہے تاکہ فن احسان کا تذکرہ بھی آجائے جو مرتبہ سلیمانی کی روح ہے۔

"طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کی بجائے ضلالت کا ذریعہ بن جائیں۔ اس لئے مولانا روٹی کی "نئے جو مثنوی معنوی کے نام سے سرودنوار حقیقت ہے اور اسی لئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خانقاہی درس میں رہی ہے، حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے خاص ذوق تھا، اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اس کا درس دیتے تھے، چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایماء سے مولانا احمد حسن صاحب کا پیوری نے اس کا حاشیہ لکھا اور منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے مطبع نے اس کو چھاپا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا بحر العلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حضرت حکیم الامت نے اس مثنوی کی خدمت محض فن کی حیثیت سے فرمائی سلوک کے مسائل، طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ "کلید مثنوی" کی تطبیق فرمائی، کہ اس فن کا مبتدی بھی چاہے تو اس کلید کے ذریعہ مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے۔

یہ چند نمونے تھے جو بڑی شکل سے اصل مقالہ سے منتخب کئے جاسکے، ورنہ جو مضمون خود "ایجاز بیانی"، "کاجاز مجسم ہو، اس میں سے اقتباس کا نکالنا کوئی آسان کام ہے؟ حاصل یہ ہے کہ اس مقالہ کی وجہ سے حکیم الامت قدس سرہ کے افادات کا ایک مستند تعارف عالمگیر علمی حلقوں میں ہو گیا۔ یہ ایک بڑی خدمت تھی جو حضرت دالہ کے ہاتھوں انجام پائی گئی۔



باب پنجم

دارالمصنفین سے بے تعلقی اور قیام بھوپال

۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۹ء

تواصی بالحق کا عزم نو

جبرستی برسوں مسندِ شہل کے حقوق ادا کرتی رہی اُس کو اب مسندِ اشرف کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تھا یا یوں کہیے کہ فروغِ دانش ہو کر اب اسے ضیائے قلوب بننا تھا۔

گھر کا جائزہ | اس کے لئے دینی اور فطری ترتیب کے لحاظ سے اپنے نفیس کے بعد اپنے اہل و عیال ہی افادۂ خاص کے حقدار تھے چنانچہ پہلے گھر ہی کا جائزہ لیا بھی گیا۔ یہ نہیں کہ دینی اقدار گھر پر تربیت میں پہلے ہی سے پیش نظر نہ تھے مگر تحریکِ خلافت کے سیاسی جوش و خروش اور نئے ولولوں کے ساتھ قائم شدہ ”جامعہ ملیہ“ کے قیام کی وجہ سے حضرت والار نے اپنے بڑے صاحبزادے سید سہیل صاحب کو جامعہ میں داخل کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی دینی تعلیم نہ ہو سکی تھی، اب چھوٹے صاحبزادے سید سلمان سلمہ اللہ تعالیٰ کا نمبر تھا، حضرت والار نے دل و جان سے یہ کوشش کی کہ تلافیِ مافات ہو جائے، پہلے ندوہ میں پھر گھر پر متداول دینی درس کی تقریریں ساری کتابیں ختم کروائیں، صاحبزادے کی وضع قطع بالکل عالمانہ رکھی، بھوپال کے دورانِ قیام میں میں نے خود دیکھا کہ فرزندِ رشید کے لباس میں اپنے والد ماجد کی پوشاک کا رنگ قائم تھا، یعنی جسم پر شیر وانی، سر پر صافہ اور شرعی پاجامہ، شریعت کی اس ظاہرہ پابندی کے ساتھ حضرت والار کی کڑی نظر تربیت اخلاق پر رہتی تھی، اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے میں صاحبزادے کی ایک ایک حرکت نگاہ تربیت سے فیض یاب تھی،

اس ساری توجہ کے بعد دلخواہ نتائج کو نہ دیکھ کر حضرت والار کچھ غمگین تھے

رہے، بارہا ارشاد فرمایا کہ میں نے ان کو (صاحبزادہ سلمہ کو) ہر فکر سے بے نیاز رکھ کر عالم خانہ کی کوشش کی مگر ان کو شوق نہیں، ان کا بچان انگریزی تعلیم ہی کی طرف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، کراچی کے قیام میں حضرت والدہ نے جب میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت مرحمت فرمائی تو ہم لوگ حیران تھے کہ صاحبزادے سلمہ نے مہینوں کی محنت میں یہ امتحان پاس کر لیا، پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہی۔ لے کے امتحان امتیاز سے پاس کیا، اور اب جون ۱۹۵۸ء میں ایم۔ اے ابتدائی کے امتحان سے فارغ ہو چکے ہیں۔ مگر یہ حضرت والدہ کی تربیت کا اثر اور ان کے اصولی تربیت کی کامیابی ہے کہ صاحبزادہ کا اخلاق ایسا ہی بلند ہے جیسا ہونا چاہیے تھا، کباترے، جنب، فراغت کے پابند، دین کی کد صحیح سے آراستہ، اس پر سنجیدگی، تکنت اور تواضع کے بردوشی اور با ف مستزاد!! پھر مستقبل کی مزید دینی رفعتوں کی ضمانت یہ ہے کہ اپنے والد صاحب سے جس قدر ملے، ملے کے بعد سے حضرت مفتی صاحب دہلی فیرنسہ، جیسے صاحب ارشاد سے نیا مسئلہ تعلق پابرقائم ہے!

حضرت والدہ کی اہلیہ محترمہ (مدظلہ) تونہ اے فضل و کرم سے موجودہ مسلم معاشرہ کی ان مثالی خواتین میں سے ہیں جو فہم و فراست، قناعت و ہمت و ہمدردی، خاص سلیقہ خاندانی اور تقویٰ و طہارت کے اوصاف عالیہ سے آراستہ پیرائندہ، فرائض و واجبات سے گزر کر نفلی عبادتوں خصوصاً روزہ جیسی شاق عبادت کی کثرت موصوفہ محترمہ کا امتیاز ہے، پھر یہ بھی حضرت مرشدی (رحمۃ اللہ علیہ) ہی سے سنی ہوئی بات ہے کہ دعا میں قبولیت کی تاثیر سے بھی سرفراز ہیں۔

کثر اللہ تعالیٰ امثالہا۔

لے اور آج تو ماشاء اللہ ڈاکٹر سید سلمان ندوی صدیقہ اسلامیات ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی (افریقہ) میں اور نائبہ ادارت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی مدظلہ (خلیفہ حضرت تھانوی) سے رکھ کر اپنے والد ماجد کے

حسب منشاء بن چکے ہیں،

رفقائے دارالمصنفین کی طرف توجہ | یہ مروت و کرم کا عین تقاضا تھا کہ باطنی دولت کی تقسیم

میں نگاہِ سلیمانی گھر کے بعد سب سے پہلے ان ہی لوگوں پر پڑتی جن کو علم و قلم کا سلیقہ بخش کر برسوں سے اپنی رفاقتِ علمی کے لئے پسند فرمالیا تھا، حضرت والارز نے چاہا اور پوری کوشش فرمائی کہ جو اپنے ہو چکے تھے وہ کسی مرحلہ پر اور کسی حیثیت سے بھی بیگانے نظر نہ آنے پائیں، چنانچہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے موسومہ ایک مکتوب میں یہ صراحت تحریر فرماتے ہیں:-

”میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ رفقاء (دارالمصنفین) میں وہ فضا پیدا ہو جس کی تمنا آپ کو ہے، مگر ظاہر ہے کہ مجھ ہی میں کیا ہے جو دوسروں پر اثر ہو، حضرت (تھانویؒ) کی باتیں ان کو سنانا ہوں اور ان کی تصانیف کی طرف متوجہ کرنا ہوں!

برادرم، دعا کیجئے کہ دارالمصنفین کی یہ چھوٹی برادری صراطِ مستقیم کو پا کر اس پر قائم رہے اور ہم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لئے وبالِ آخرت بننے کے بجائے، باعثِ برکات و خیرات ہو!“

کیسی خشیت، فکرِ آخرت اور اپنوں کی خیراندیشی ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے۔ مگر بہ تمام ادب یہ کہنا پڑتا ہے کہ رفقائے دارالمصنفین نے حضرت والارز کی ان توجہات کی قدر نہ جانی، ان کو حضرت والارز کی صفتِ علم و تحقیق سے تو بے پناہ شغف تھا، مگر انہوں نے شاہدہ کو محدود رکھا۔ اگر وہ نظر کو وسعت دیتے تو دیکھتے کہ حضرت والارز کی شخصیت جامع کمالات تھی اور ایسی جامعیت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی تھی کہ آج اس کی جیتی جاگتی نظیر پیش کرنا دشوار ہے۔

مگر نہیں، رفقاء دارالمصنفین کو کمالاتِ باطنی سے استفادہ کی اہمیت ہی سمجھ میں نہ آئی اور سید الطائفہ کی دعوتِ صلاح و تقویٰ کو انہوں نے باتوں میں ٹال دیا، ذرا دارالمصنفین کے رفیق خاص مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ہی کی قیل و قال سنیں اور خود انہی کی زبانی سنئے "تاکہ بات کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہ رہ جائے تحریر فرماتے ہیں :-

"اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا، راہِ سلوک میں آنے کے بعد اکثر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو بھی اس کی (یعنی حصولِ تقویٰ و احسان کی) تلقین فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو سارے کام ختم کرنے اور جو حاصل کرنا اور دینا تھا، اس کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے بعد یہ راہ اختیار فرمائی ہے۔ اگر ہم خدام ابھی سے اس راہ پر لگ گئے تو ہمارا کیا انجام ہوگا۔ میرا اشارہ سمجھ کر فرمایا میں یہ نہیں کہتا کہ علمی کام بے کار ہیں یا ان کی ضرورت نہیں رہی یا ان کو چھوڑ دیا جائے بلکہ تالیف و تصنیف کا مقصد اور نقطہ نظر بدل جانا چاہیئے، اور اس کے لئے خود اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے! میں نے عرض کیا، اور ان خالص علمی کاموں کے متعلق کیا ارشاد ہے جس کے لئے تبدیلی کی ضرورت نہیں اس کے جواب میں حسبِ عادت معنی خیز مسکراہٹ سے فرمایا کہ شوق سے کیجئے، اس سے کون روکتا ہے، یہ بھی ایک کام ہے اور اس دلائل و مسکراہٹ پر بات ختم ہوئی، ۱۰

لے گیا حضرت والا نے کوئی پروگرام بنا رکھا تھا کہ جب پچاس پچپن کی عمر کو پہنچیں گے تب تقویٰ اور احسان کی منزل میں قدم رکھیں گے، اس سے پہلے نہیں، حالانکہ آپ پڑھ چکے کہ حضرت کو اس کا بڑا قلق تھا

یقیناً دلادیز مسکراہٹ حضرت والار کے ہونٹوں پر کھیل گئی مگر یہ تو سوچیے کہ ان کے دل پر کیا کچھ گزری ہوگی۔۔۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، ماضی پر افسوس اور مستقبل کا انتظار جو ایسے حق کے لئے دونوں ہی حجاب ہیں۔

ماضی و مستقبل پر مدہ خداست (رومی)

حضرت والار کی دعوت اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ ذات حق سے قرب پیدا کرنے کے لئے تھی، ان کا یہ منشا اب بھی پورا کیا جاسکتا ہے اور جب بھی اس کی تکمیل

کراتی دیر بعد اس طرف کیوں توجہ ہوئی، اور اس ماقام سے کئی بار فرمایا کہ آپ اس پر بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے کہ جو ان میں ہی (دھر) راہ سلوک کا خیال آیا، درنہ اکثر اس کا خیال آتا بھی ہے تو اس وقت جب عمر بچہ بن حصہ گزر جاتا ہے۔

لے اس ارشاد سے (دبائیں غرض ہوتی ہیں (۱) یہ کہ اپنی عمر کا اندازہ متیقن ہے (۲) یہ کہ سارا خوف قلم ہاتھ سے چھوٹ جاتے، سب معاش کے معرض خطر میں آجانے اور تعلقات واجب کے ترک ہو جانے کا لاحق سوچنا تھا، حاکم نے اپنی اس تحریر میں اس سے پہلے ہی کے پیرگراف میں حضرت والار سے اس الزام کو محسن و خوبی اٹھایا ہے کہ وہ سنوک میں آنے سے حضرت کے علمی و تحقیقاتی کام نامے بند نہیں ہو گئے۔ کیا یہ محض برائے جواب تو نہیں تھا؟

لے اس جامع و مانع اور صاف و سترح جواب میں کسی اشکال کی گنجائش تھی؟ مگر دیکھیے پھر بھی ایک سوال پیدا کیا گیا ہے!

مولانا کی زبان سے علم برائے علم کے تمام تر مغربی اور سراسر غلط نظریہ کی یہ ترجمانی کس قدر حیرتناگیز ہے! مولانا ص ۴۱ "بھی کیا بلا تعین مقصد اور بغیر کسی نقطہ نظر کے انجام دیا جاتا ہے؟

یہ میں متعجب نہ ہوں تھا، کیونکہ جب ایک تبلیغ جواب پر پورے غور و فکر کے بغیر ایک اشکال

دار کردیا (بس کا جواب اسی میں اچکا) تو اب معنی خیز مسکراہٹ ہی کافی تھی!!

ہوگی۔ سیدالطائف کی روح کو اس سے بڑا سرور و نشاط حاصل ہوگا۔۔۔ یہ باتیں میری زبان و قلم سے گستاخانہ محسوس ہوں گی مگر سید والا مرتبت سے جو ادنیٰ نسبت اختیار کو حاصل ہے وہ امید ہے کہ ظاہر کلام سے صرف نظر کرنے اور منشاء سخن ہم رسانی کا ذریعہ بن جائے گی۔

نظر کردن بدر ویشاں بزدگی را منافی نیست
سیلمان با همه حشمت نظر با بود با مورش

ان فقائے دارالمصنفین نے حضرت والدہ کی توجہات کا مرکز عام شاگردوں کا خیال تھے مگر عام شاگردوں پر بھی ان کی نگاہ مہر برابری ہوئی تھی اور وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ جو جتنے قریب میں قرب الہی کی راہ پر اُتے ہیں جلد آجائیں

شاگردوں کے زمرہ میں حضرت والدہ کی نگاہ میں مولانا مسعود عالم ندوی کو خاص جگہ حاصل تھی حضرت والا ان کے مسلک اجتماعی کو پسند نہ فرماتے تھے، اس کے باوجود، ان کی وفا شاعری اور حسنِ ادب کے ہمیشہ مداح رہے اور پوری شفقت و دل سوزی سے اپنے اس شاگرد عزیز کو احسان و تقویٰ اور تزکیہ و اخلاص کی طرف کھینچنا چاہا مگر وہ بہت کچھ مان کر بھی اس مسلک سے کھچے ہی رہے، البتہ حضرت والا کی رحلت پر جو مکاتیب مرتب کر کے وہ وقف عام کر گئے، اس کا تبلیغی پہلو آج بھی اہل نظر اور... جو یائے حق کے لئے عبرت و بصیرت کا ایک باب ہے اور امید ہے کہ یہ مولانا مسعود عالم مرحوم کے لئے صدقہ جاریہ کا موجب ہوگا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

دارالمصنفین میں خلفائے اشرفیہ کا تاریخی اجتماع
علیم الامت کی رحلت سے ان کے

لے مکاتیب سلیمان، مرتبہ مسعود عالم ندوی مرحوم شائع کردہ مکتبہ چراغ راہ لاہور۔

خلیفہ ارشد خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کے اندر بقول حضرت والار کے! ”و جذبے قوی پیدا ہوئے تھے، ایک یہ کہ شیخ کے علم اور تعلیم کو جس طرح بھی ممکن ہو پھیلایا جائے اور دعوت الی اللہ دی جائے۔ دوسرا یہ کہ حضرت شیخ کے اکابر خدام سے مل کر طلب کی پیاس کو بجھایا جائے۔ چنانچہ اس ایک سال کے اندر انہوں نے اپنے وطن کے اندر بہت کم قیام کیا محض کانپور، روٹی، جونیپور، اعظم گڑھ، بہارچ وغیرہ شہروں میں پھر پھر کر اخوان طریقی دوستوں سے ملا کے رہے۔

ابو صاحب محبت و محبوبیت کا پیکر، جو بھر جاتے تنہا تھوڑے ہی جاتے تھے، اہل نیت، ایک قلعہ ان کے جلو میں چلتا تھا، چنانچہ جب لکھنؤ آئے تو ان کے اطراف حضرت تھوڑی دیر کے کسی خلفاء اور مریدین خاص جمع تھے اور جب یہاں سے غالباً مارتھ ۱۹۳۵ء کو حضرت سلیمان ندوی کے مستقر اعظم گڑھ کا قصد فرمایا تو دارالمصنفین میں ایک ایسا یاں گارا اجتماع ہو گیا، جو اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر نہ ہو سکا ”ملک سلیمانی“ کا لے یعنی عبید اللہ کی مفارقت کا ایک سال جو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دار فانی میں گذار سکے۔

حضرت مجذوبؒ کی جو حالت اپنے پیر و مرشد کی رحلت سے ہو گئی تھی، اس کا اندازہ اس ہر تار مسرور حسرت غزل سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے فراق شیخ میں کہی تھی، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کوئی مزہ مزہ نہیں کوئی ہنسی ہنسی نہیں	تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہیں
پیر مذکور کہاں اس کی وہ بزم کہاں	بادہ نہیں تو ہم کہاں زلیبت یہ زلیبت ہی نہیں
بحرک شب عجب ہے شب حال یہ ہے کہ تعجب	تارے ہیں روشنی نہیں چاند ہے چاندنی نہیں
لے میرے باغ آرزو! کیسا ہے باغ ہائے تو؟	کلیاں تو گو میں چادر کوئی کلی کھلی نہیں

دل میں لگا کے ان کی لو کر دے جہاں میں نشر و فو

شمعیں تو جل رہی ہیں تنو بزم میں روشنی نہیں

تفوق اس حیثیت سے بھی ثابت ہی رہا محترم ڈاکٹر عبدالحی صاحب جو اس مقدس انجمن کے ایک رکن تھے، فرماتے ہیں کہ سترہ خلفائے اشرافیہ یہاں جمع ہو گئے تھے، اور دارالمصنفین اہل دل کے انوار سے معمور ہو گیا تھا، اس مبارک انجمن کی شمع خواجہ صاحب کی دلاویز شخصیت تھی، شرکائے محفل میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا عبدالغنی صاحب پھوپوری مولانا محمد حسن صاحب کاکوروی، مولانا عبدالحق صاحب (ہردوی) ڈاکٹر عبدالحی صاحب ڈیڑی سید علی ہجا صاحب۔

ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے بتایا کہ صبح سے دوپہر تک اور سہ پہر سے شام تک نشستیں ہوتی رہیں اور خواجہ صاحب مجذوب اپنے عارفانہ کلام اور بابرکت انقاس سے اہل محفل کے قلوب کو گرماتے اور حب الہی کو ان کے سینوں میں بھڑکاتے رہے جو دمیزبان عالی مقام کی ربانی بھی اس کی تصدیق سنئے :

”ابھی چند ماہ ہوئے کہ خواجہ صاحب ہمارے دارالمصنفین میں آئے تھے، کئی دن رہے، اہل شہر اور اطراف شہر کا ہجوم ان کی زیارت اور ان کے کلام کو سننے کے لئے جمع ہو رہا تھا، جو کچھ بھی کہا تھا اور جو کچھ بھی کہتے تھے سب نوکِ زباں تھا، جب وہ اپنے شعر پڑھتے تھے تو خود بخود ہوجاتے تھے اور دوسروں کو بخود بنا دیتے تھے، ایک جوش تھا جو ان کے سینہ سے باہر آتا تھا“۔

جہاں تک خود دارالمصنفین کے رفقاء کا رُکاوہ تعلق ہے، وثوق سے سنا ہے کہ بعضوں نے اہل در و درو محبت کے اس اجتماع کا اثر قبول کیا اور ایمان کی حلاوت محسوس کی، بعض غیر متاثر رہے اور ایک دو نے اس کی آڑ لے کر سید عالم مقام کے خلاف اپنے بغض و حسد کے اظہار کا موقع پایا کہ مرکز علم و فن میں یہ شور و سیح اور شورش اذکار !!

دارالمصنفین سے ہجرت یا صبر کا تلخ ترین گھونٹ

حضرت سید العلماء والصلحاء کو اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ میں جو عزت و سربلندی عطا فرمائی تھی اس کو دیکھ کر یہی رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ حیاتِ سلیمانی عطا و شکر کا وہ جامِ شیریں ہے جس میں ابتلا و صبر کی تلخی کا شائبہ تک نہیں۔ اور تو ادر اکثر وہ بھی جو قریب سے دیکھ سکے انھوں نے بھی یہی جانا اور پہچانا مگر یہ غلط فہمی حضرت والا کے کمال صبر و ضبط کا نتیجہ تھی، خود راقم حقیر بھی اس غلط فہمی کا شکار رہا اگر کبھی کوئی کھٹک بھی محسوس ہوئی اور اس کا اظہار میں نے حضرت کی خدمت میں کیا بھی تو اس کو وہ تحمل نے اس کا ازالہ اس بشاشت سے فرمایا کہ پھر مزید تجسس کو جی بھی نہ چاہا۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ جب بعد وفات معارف کے سلیمان نمبر کے لئے مضمون لکھنے بیٹھا تو صبر کا علو و عنوان قائم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی اور یہ جملہ قلم سے نکل گیا کہ :

”حیاتِ سلیمانی کا بڑا حصہ ”شکر“ ہی کا آئینہ دار ہے، علم و فضل، عزت و عظمت، دولت و ثروت ہر اعتبار سے ہمیشہ سرفراز رہے، مگر آخر عمر کے دس برس میں انہوں کی ناقدری و ناسپاسی اپنے محبوب ادارہ دارالمصنفین سے جدائی، تقسیم ہندوستان کے بعد کراچی کا قیام اور یہاں کی مالی و ذہنی پریشانیاں یہ سب ایک مستقل مجاہدہ افراطیہ تھا۔“۔۔

۱۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ جب حضرت علامہ کو تحریر خطاب فرماتے تو یہ کلمات ان کے القاب کا لازمی جزو ہوتے تھے، لہٰذا سلیمان نمبر معارف۔

۲۔ چنانچہ مولانا گیلانی کا قول تو آگے آہی رہا ہے، یہاں پر و فیسرد شید احمد صدیقی (علی گڑھ) کا بیان بھی سنئے جنہوں نے حضرت کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی سعادت پائی ہے لکھتے ہیں۔۔

”میر صاحب کا تعلق دارالمصنفین سے تقریباً ۳۲-۳۰ سال تک رہا، ان کی قیادت

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اور حضرت مولانا گیلانیؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب کراچی ۲۰۰۵ء فروری ۱۹۵۷ء میں یہی رائے کی تصدیق ان الفاظ میں فرمائی :-

”ہمارے سیدالملت قدس سرہ العزیز کی صباریت کے جن حالات کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے ان کا تعلق سچ پوچھیے تو اس جہان سے زیادہ نہ تھا ان کی زندگی کا بڑا حصہ ”شکوریّت“ کے زیر اثر گذرا تھا، ”صباریت“ کی منزلیں رہی جاتی تھیں، زندگی کے آخری دور میں ان منزلوں سے وہ گذر گئے اور خوب گزے صرف علامہ ڈاکٹر اور اعظم المصنفین ہی ہونا ان کے لئے مقدر نہ تھا۔ سیدالعارفین بن کر رفیق اعلیٰ میں قدرت نے ان کو بلانا چاہا، اسی کا نظم کیا گیا :-“

یہ غلط فہمی رہی مولانا گیلانیؒ تک کو جو حضرت والارہ کے قریبی رفقاء میں سے تھے یسین جب نیری اور مولانا گیلانیؒ کی یہ رائے مولانا عبدالباقی ندوی مدظلہ کے زیر نظر آئی تو موصوف نے اظہار واقعہ کے لئے ازراہ کرم ایک مکتوب سے سرفراز فرمایا جس کا متعلقہ تقباس درج ذیل ہے اور لفظ بہ لفظ توجیہ کا محتاج :-

(بقیہ حاشیہ صفحہ) میں اس ادارہ کا یہ زمانہ کامرانی اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا مجھے یقین نہیں کہ مستقبل قریب میں دارالمصنفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکے گا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دارالمصنفین سے علیحدہ ہو کر بھوپال میں ملازمت کر لی!! (معارف سلیمان نمبر ۱۳۱)۔

۱۔ مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ میرے مضمون شائع شدہ سلیمان نمبر ۱۳۱ء (کراچی) کی طرف ہے جس میں محض قیام پاکستان کے چند صبر آزما مراحل کا ذکر تھا جو ان مراحل صبر کا یا سنگ بھی نہیں جو بعد کو میرے علم میں آئے اور خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مخفی تھے ۔

میراث

بارڈنگس روڈ، لکھنؤ

۲۰ - ۶ - ۵۵ء

محبِ کرم سلمہ السلام علیکم معارف کے "سیلمان نمبر ۱" سے استفادہ کی نوبت پر میں آنحضرت سید العارفین "اعلیٰ اللہ مقامہ سے اپنی گوناگوں نیاز مندوں کی خدمت و ہدایت کی بنا پر کچھ نہ کچھ ان کے "عرفانی پہلو" کی معرفت کا دعویٰ بھی زیادہ ہی تھا، مگر آپ کی ترقی و تازہ عقیدت و ارادت کے تاثرات و معلومات اس پہلو کے پڑھ کر یہ دعویٰ نرا و دعویٰ ہی نکلا، ماشاء اللہ و جزاک اللہ۔

کسی "حال" سے تو یہ میرا بدمحال خود ہی محروم ہے تو حضرت مرحوم کے "احوالِ عالیہ" کو کیا پہچانتا، البتہ ان کے "مقاماتِ عالیہ" میں جس مقام کی معرفت سے ٹھوڑا بہت تعلق رکھنے والا بھی غیر متعلق نہیں رہ سکتا تھا اور جس کا میرے اوپر ہمیشہ بہت زیادہ اثر رہا وہ ان کا "مقامِ صبر" تھا چالیس سال کے بے شمار مواقع و تجربات میں کبھی شاذ ہی خفیف لغزش کا مشاہدہ ہوا ہوگا وہ بھی بس لب و لہجہ کے خفیف تغیر کی حد تک!

مولانا کیلانی مدظلہ زار دور کی اور آپ صرف آخر دور کی واقفیت کی بنا پر خیال فرماتے ہیں کہ "سید العارفین" کی زندگی کا بیشتر حصہ "شکوہ و پریشانی" کی راہ تھا اور صباریت کی منزل سے صرف آخر زمانہ میں گزرا دیا گیا۔ کیا کہوں سنی سنائی نہیں، آنکھوں کی بھی سننا ہوں کہ ان کے امتحانِ صباریت کی بڑی کڑی کڑی منزلیں خود دار المصنفین کے دورانِ قیام میں آئیں اور اس کا خاتمہ جیسی طیر چڑی (المیہ) پر ہوا کہ جس ادارہ کو انہوں نے تیس بیس بیس برس خونِ جگر پلا کر پالا تھا اس سے دودھ کی

مکھی کی طرح ملحدی، بس سید عالی مقام ہی کا ظرف تھا جو غن کے اس گھونٹ کو بھی صبر و سکون ہی کے ساتھ پی گئے!

ان کی عظیم اُشان زندگی کے اس سب سے المناک المیہ کی طرف خود انہی کے مکاتیب سے بعض ملکہ اُشانے اپنے مضمون میں کر دیے تھے۔ مگر یاران ”مصلحت اندیش“ نے ان کو بھی بلا اجازت ہی نہیں عدم اجازت پر بھی سرے سے حذف ہی فرما دیا جس سے نہ صرف ان کے ایک بڑے کمال ”سیرت و سلوک“ کی سب سے بڑی شہادت کا جرم اخفا ہوا، بلکہ سوڈینے والوں کو ”سید السوانح“ کے سب سے بڑے تاریخی سانحہ و حادثہ سے تاریخی میں چھوڑ دیا گیا کہ آخر جو ادارہ ان کی ٹرکھ کی علمی و تعلیمی کمائی کا سب سے گراں قدر خزانہ تھا اور جس کی خاطر وہ ہمیشہ ہر طرح کی جاہی و مافیہ نسیوں اور تحریصوں کو ٹھکرتے رہے کیا اس کو محض بھوپال کی تغواہ اور نوکری کے لئے چھوڑ بھاگے؟“

میں کہتا ہوں کہ نہیں، حاشا وکلا نہیں! دلیل مطلوب ہو تو کلیجہ تھا! کہ حضرت والاؑ کے ایک مکتوب موسومہ شاہ معین الدین احمد ندوی کا یہ اقتباس پڑھئے؛ ۳ جولائی ۱۹۳۶ء کو بھوپال پہنچ کر تحریر فرما رہے ہیں:-

یہاں سرکاری مہمان خانہ میں ہوں، بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آئند مستقبل ہے، مگر خدا جانتا ہے کہ ان سب سے بہتر شبل منزل میری نگاہ میں ہے، لے کاش کہ مجھے وہاں سکون میسر آتا اور خلاف مزاج

لے شائع شدہ سلیمان نمبر معارف

لے ملاحظہ ہو! مہمانہ فاران (کراچی) بابتہ دسمبر ۱۹۵۵ء جس میں یہ حذف کردہ مضمون میرے ایک نوٹ کے ماتھے چسپا ہے!

حالات سے میں بچا رہتا، وہیں کا فقر یہاں کی شاہی سے بہتر ہے۔
 حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر خار وطن از سنبل وریحان خوشتر
 یوسف کہ بمصر بادشاہی میگرد می گفت گدا بودن کنعان خوشتر
 ایک ہزار تنخواہ، سوانی کا لائسنس اور پانچ سو (۵۰۰) ماہوار سلسلہ دار تصنیف کے لئے اور تمام
 دفاتر و محاکمہ شرعیہ اور تعلیمات شرقی کی امارت، اس جاہ و اعزاز سے نڈل میں فرحت
 اور نہ قلب میں انشراح، استاد مرحوم نے اخیر زندگی میں مولانا حمید الدین صاحب کے نام
 ایک خط میں لکھا تھا:-

مرا گر تو بگذاری لے نفس طامع بے بادشاہی کم در گداں
 بحمد اللہ تعالیٰ و بفضلہ طمع نفس سے خالی ہوں مگر دل بعض کاموں کو چاہتا
 ہے جن میں سے ایک والا تکمیل کا خیال ہے جو مجھے یہاں لایا ہے!
 اور یہ مفارقت کسی وقتی اختلاف اور فوری فیصلہ کا نتیجہ بھی نہیں تھی، کامل سترہ
 سال تک قلب و جگر کا خون کرنے کے بعد جب "دل میں طاقت" اور جگر میں حال باقی نہ
 رہا تو مجبور و لاچار ہو کر گوارہ فرمائی گئی تھی، پڑھئے مولانا عبدالباری صاحب کو کس بے کسی سے
 لکھ رہے ہیں:-

"برادر من! میں جس طرح بہر کر رہا ہوں، میرا دعویٰ ہے کہ بہت سے
 احباب اس طرح چند سال بھی بہر نہیں کر سکتے تاہم میں نے سترہ سال بہر
 کئے اور چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے کو مجھ سے ٹھیس نہ لگے اور جس طرح یہاں
 میں جسمانی اور روحانی آلام میں رہتا ہوں ان سے نجات کی ہر وقت
 آرزو ہے!

برادر من! میری حالت ہمدردی کے لائق ہے، ملامت و عتاب
 کے لائق نہیں، میں اپنے رونے کا بھی آپ مالک نہیں۔

ع :- یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد

یہ اذیت کس کے ہاتھوں پہنچی اور پہنچتی رہی؟ مولانا مسعود علی (رحم) کے ذریعہ کبھی نہ لڑا
کے بڑے مخلص دوست تھے اور دارالمصنفین کی عمارات اور مطبع و منشی کے انتظامی امور
کے کامیاب نگران مگر بقول حضرت مولانا عبدالباقی ندویؒ اب ان میں یہ پیدا ہوا ہے
تھا کہ دارالمصنفین ان کی ذات سے عبارت ہے!!

حضرت والار نے اپنی طبعی شرافت و عالی حوصلگی کے تحت مظلوم بزرگ کو
عذر خواہانہ پہلو سے کام لیا کہ فتنہ فردہ بجائے چنانچہ ثبوت میں مولانا عبدالباقی صاحب
کے موصومہ ایک اور مکتوب کا اقتباس ملاحظہ ہو :-

”جس تاریخ برادر موصوف تھا نہ بھون گئے ہیں اسی دن ان کے طرز عمل
سے یقین تھا کہ میری ہزار بلیوں کے باوجود میری طرف سے انھیں کوئی
شکایت نہیں ہے اور نہ بھی تو وہ معافی مانگ چکے اور میں بھی مسجد میں معافی
مانگ چکا، اب اس کے بعد کوئی حرکت ہوئی تو میں ہر طرح طلب غفور
کے لئے تیار ہوں چنانچہ باوجود برادر موصوف کی خاموشی کے میں نے
ان کو تھانہ بھون خط لکھا، انہوں نے ویسا ہی جواب دیا، جیسا وہ دے
سکتے تھے، اور اس کے باوجود آج ان کو خط لکھ رہا ہوں اور مشورہ مانگ رہا
ہوں، جیسا جواب آئے۔“

مگر اس بدل خلق و ایثار منزلت سے مخالفت کی آگ نہ بجھ سکتی تھی، میری کیا
حقیقت مگر امام تشریٰ کی بات کا اعتبار تو ضروری ہے، اپنے مشہور اور مستند ”الرسالہ“ کے باب
”مسد“ میں امام نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے :-

”مَنْ أَسَانَا أَعْدَرْنَا عَلَىٰ أَسَاطِيهِ إِلَّا الْحَاسِدَ فَإِنَّهُ لَا يَرْضِيهِ“

یعنی طعن آمیز و دل آزار۔

الازدال النعمۃ“

یعنی میں ہر انسان کو راضی و موافق کر سکتا ہوں بجز حاسد کے کہ وہ تولینے
محسود کے شرف (علمی، عرفانی، جاہی، مالی، جو کچھ بھی ہو) کے مٹے بغیر
راضی ہی نہیں ہو سکتا۔

بہر کیف اس سترہ سالہ کرب و اذیت کی تفصیل اور حضرت والا کی یہ مش
صباریت کی تشریح پیش کرنا ادب دار المصنفین کے ذمہ ہے اور اس سے گریز بانی ادارہ
کے احسانات کی طرح ناپاسی ہے، امید ہے کہ دار المصنفین سے جو حیات سلیمانی مرتب
ہوگی تو اس علمی و اخلاقی المیہ کا بیان ورد اس میں ضرور کھل کر آئے گا، اس نیت سے
نہیں کہ دوسرے کی رسوائی ہو بلکہ اس جذبہ کے ماتحت کہ حضرت سلیمانؑ سے متعلق
خلوق میں کوئی بدگمانی نہ رہ جائے اور آئندہ مومنین اپنی قیاس آرائیوں سے حقیقت
کو افسانہ نہ بنادیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مدت دراز کے بعد حیات سلیمانی ۱۹۷۳ء میں دار المصنفین سے جس
معیار کی بھی شائع تو ہو گئی اور اس کے شائع ہونے تک مولانا مسعود علی صاحب مرحوم
ہو چکے تھے شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے اپنی اس تالیف میں اس تلخ حقیقت
کا ذکر اجمالی طور پر کر دیا ہے گویا بات کو موقع سے ہٹا کر یعنی ان واقعات کو دار المصنفین
سے علیحدگی کے اسباب کے تحت بیان کرنے کے بجائے ترک قیام بھوپال کے بعد
دار المصنفین دوبارہ نہ تشریف لاسکنے کے وجہ کے تحت ذکر کیا ہے ہر حال بات مبہم
نہیں بالکل صاف اور واضح آگئی ہے، ملاحظہ ہو:

”حقیقت یہ ہے کہ بھوپال سے علیحدگی کے بعد سید صاحب کی اصلی جگہ
دار المصنفین ہی تھی، مگر یہاں ان کو امن و سکون حاصل نہ تھا، انکے
ادریس مولوی مسعود علی صاحب کے اختلافات اس درجہ کو پہنچ گئے تھے کہ ان

کی اصلاح کی کوئی شکل باقی نہیں رہی تھی، ایک زمانہ میں ان دونوں کا اتحاد حزب المثل تھا اور دونوں نے مل کر دارالمصنفین کو پرڈن چڑھایا تھا، لیکن پھر اختلاف بھی اسی درجہ کا ہو گیا، اس کا سبب دونوں کا اختلاف مزاج تھا، سید صاحب نرم خو، حلیم الطبع اور تمیل مزاج تھے، اختلاف اور جنگ و مقابلہ سے گھبراتے تھے، ان کی ایک سطح تھی جس سے کسی حال میں نیچے اتر نہ سکتے تھے، مولانا مسعود علی صاحب کا مزاج اس کے بالکل برعکس تھا، اب اس کی تفصیل کیا کھی جائے..... وہ کسی معاملہ میں ادنیٰ اختلاف رائے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے دارالمصنفین کے معاملات میں بھی استبداد اور مطلق العنانی سے کام لیتے تھے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان کو کسی بات میں تامل نہ تھا اس لئے دونوں میں اختلاف بڑھ گیا جس کا اثر دونوں کے گھروں سے لے کر دارالمصنفین کے معاملات تک پہنچ گیا، سید صاحب گواہی طبعی بردباری اور دارالمصنفین کے مصالح کی خاطر برداشت کرتے رہے لیکن آخر میں ان کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ان کا دارالمصنفین میں سکون کے ساتھ رہنا مشکل ہو گیا۔ اس کی تفصیل بڑی طویل اور ناخوشگوار ہے اور اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں ایسے قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے۔ (ص ۵۶۸ و ۵۶۹)۔

ایک شدید مرض اور اعلیٰ ترین کرامت | آپے درپے جو چڑھیں قلب سلیمان کو پہنچیں ان کا طبی اثر و نتیجہ

یعنی دارالمصنفین کا عمارتی قالب مولانا مسعود علی مرحوم کے ہاتھوں اور اس کی روح اور علمی و تحقیقاتی منزلت حضرت علامہ نور اللہ مدظلہ کے طفیل قائم تھی۔

سمجھئے یا نہیں نکتوں کا تقاضا، بہر حال قیامِ اعظم گٹھ کے اسی دورِ آخر میں حضرت والاؒ کو سخت ترین مرض لاحق ہو گیا جس کا اثر تادمِ آخر باقی رہا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ استقلالِ قلبی (Dilation of Heart) کا شکار ہو گئے تنفس کی شکایت پہلے ہی تھی، اب دل کے پھیل جانے سے سانس لینا اور مشکل ہو گیا، اسی گھٹن کی وجہ سے نہ لیٹ سکتے تھے نہ بیٹھ سکتے تھے، خود ارشاد فرماتے تھے کہ آٹھ دن ایسے گزرے کہ لیٹنا تو درکنار بیٹھنا بھی محال تھا بس دیوار کا سہارا لے کر آٹھ دن اور آٹھ راتیں کھڑے کھڑے گزارنی پڑیں، پاؤں دم کرائے۔۔۔۔۔ اس دردِ انجیز واقعہ کو سنا کر مسکراتے ہوئے فرماتے تھے:-

”بھئی مجھ سے اختیاری مجاہدات تو کچھ بھی نہ ہو سکے تھے، اللہ تعالیٰ نے

اضطراری مجاہدات میرے لئے مقدر فرمائے، یہ بھی اس کا کرم ہے!!

یہ سہ ایک عارفِ بومن کی یافت اور اس کا ایقان کوئی غیر عارف اس عقلاً فیہ کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ اور اس کی کیا قدر کر سکتا ہے؟ اس کو تو سمجھنا ہو تو کس عارفِ کامل سے ہی پوچھنا چاہیے، دیکھئے حضرت عارفِ تھانویؒ اس کی یوں تشریح فرماتے ہیں:-

”اہل اللہ کو مصائب میں الم تو ہوتا ہے گھٹن نہیں ہوتی، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم پر نشتر لگائے، اس وقت تم کو الم تو ہوگا مگر رنج و غم نہ ہوگا گو ظاہر میں تم ہلے ہلے بھی کرو گے مگر دل اندر سے خوش ہوگا، کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت کے موافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع خیال کرتے ہو، یہ حال اہل اللہ کا ہے، زمانہ کے حوادث کے ساتھ کہ وہ ان کو عین حکمت اور مرتابا معلومت سمجھتے ہیں، اس لئے ہر حال میں خوش ہیں۔“

لے ملاحظہ ہو ذخیرِ الحیات و خیر الحیات۔ وعظِ حضرت مولانا تھانویؒ

غرض یہ حضرت والدہ ہی جیسے اہل اللہ کا کمال تھا کہ کامل آٹھ دن پیکر رضا و تسلیم بن کر کھڑے رہے اور اپنے رب کے اس معاملہ پر مطمئن بھی!! ع ہرچہ آن خسرو کند شیریں کند! مگر اہل و عیال تو حضرت کی اس تکلیف و بے چارگی کو دیکھ کر رو پڑتے تھے حضرت والدہ کمال صبر ان کی دلجوئی فرماتے اور ان کی نظر کو حقیقت تک پہنچانے کی کوشش فرماتے تھے، ارشاد فرماتے تھے کہ پریشانی کی کیا بات ہے صحت کے لئے دعا کرو اور راضی برضا رہو حق تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ گویا چاہتے تھے کہ حق تعالیٰ کے حاکم و حکیم ہونے کا استحضار ہر فرد خاندان میں پیدا ہو جائے جو راحت و سکون کی ایمانی کلید ہے۔

غرض یہ صبر و استقامت خود ایک کرامت تھی، مگر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ایک اور کرامت کا ظہور ان آٹھ دنوں کے ہر دن میں پانچ مرتبہ برابر ہوتا رہا اور قریب کے لوگ محو حیرت بن کر اس کا بار بار مشاہدہ کرتے رہے۔ وہ کرامت یہ تھی کہ جب نماز کا وقت آجاتا تو حضرت والدہ کی پھوٹی صاحبزادی سلمہا وضو کر دیتیں، ہاتھ منہ تو حضرت خود دھو لیتے، پاؤں دھالنے کی سعادت صاحبزادی کو حاصل دیتی، پھر حضرت والدہ کو بدقت تمام مصلے پکڑا کر دیا جاتا اور لوگ ہٹ جاتے۔

اب اللہ کا بندہ اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہے۔ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لئے گئے، اب نہ جانے قرب کے کن منازل میں وہ گم ہے کہ اپنے مرض کا خیال ہے نہ بے طاقتی کا، کیا نیاز مندی میں حائل ہے چشم حیرت دیکھ رہی ہے کہ وہ عبدیت کا پیکر اب رکوع میں جھکا پھر کھڑا ہو گیا، پھر بے تکلف سجدے پہ سجدے کیا جا رہا ہے۔ نہ کوئی آہ ہے نہ کراہ ہے! فرض نماز اسی طرح پوری ادا ہو گئی البتہ دوسرا سلام پھیرتے ہی ایک دل گناز چنچ سنائی دیتی تھی اور حضرت والدہ گر پڑتے تھے، اعزاء فوراً اٹھا کر دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتے۔ اس طرح آٹھ دن میں چالیس بار دیکھنے والوں نے اس اعلیٰ ترین کرامت

کا مشاہدہ کیا اور خود اپنے ایمان و یقین میں تقویت پائی ہوگی۔
 "قرب فرائض" کے سرفرازوں کی کرامات بھی فرائض ہی میں دیکھی جاسکتی ہے اور
 صاحب نظر ہی ان کے مقام ارفع کا اندازہ لگا سکتا ہے ورنہ عام لوگ تو "قرب نوافل"
 والوں ہی کو صاحب کرامات جانتے ہیں !!

دارالمصنفین سے جدائی کا فیصلہ | سترہ سالہ روحانی اذیت نے اب ضبط و
 تحمل کی طاقت بھی نہ چھوڑی، دلوں ہی
 صورت میں حضرت والاؒ کے لئے اب ممکن تھیں، یا تو اس ہاتھ کو قطع کیا جاتا جو مسلسل بغلی
 گھونٹے لگائے جا رہا تھا، مگر یہ ان کے لئے بہت مشکل تھا طبع مروت
 و شرافت کی وجہ سے بھی اور ادارہ کی بدنامی کے خوف سے بھی! — یا پھر خود ہی
 چپ چاپ وہاں سے نکل جاتے، حضرت والاؒ کے علم و اشارے نے دوسری ہی شق کو پسند
 کیا، تاکہ ادارہ بدنامی سے محفوظ رہے، چنانچہ مولانا عبدالباری صاحب نے لکھا ہے کہ:
 "سید صاحب اپنی علمی و دینی خدمت و محنت کے ایک بڑے سرائے
 کو جس طرح برباد ہوتے دیکھ رہے تھے، اس کا قلق خود ان کو جتنا ہوگا
 دوسرا اندازہ بھی کیسے کر سکتا ہے اور اس میں ان کو اشخاص کے ذاتی
 تعلقات سے بھی کہیں زیادہ ادارہ کے اصلاح کی فکر تھی۔"
 چنانچہ حضرت کو بڑی فکر یہ دامن گیر ہوئی کہ علیحدگی کی کیا شکل اختیار کی جائے
 کہ شرعاً سادہ اور شہادت ہمسایہ سے حفاظت رہے، ڈاکٹر صاحب مدظلہ جو اس دوران
 میں حضرت والاؒ سے اعظم گڑھ میں ملے تھے ان کا ارشاد ہے کہ:-

"ایک روز مجھ کو درپیش آپنے ساتھ لے کر ٹہلتے رہے، سارا ماجرا لے ورد
 سنایا اور فرمایا کہ تین مقامات ہیں جہاں بہ آسانی قیام کر سکتا ہوں،
 اپنا وطن دیسند، لکھنؤ اور لاہور، مگر وطن میں وہ علمی ماحول نہیں لاہور

کے احباب گودھاں کے قیام پر مصر میں مگر دارالمصنفین سے دوری ہو جائیگی
البتہ کھنوکھ قیام نسبتاً مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر اب تک اس بابے
میں یکسوئی نہیں! "لے

غرض اب تو یہ طے تھا کہ شبلی منزل کی جُدا کی گوارا کر لی جائے، اور خندہ پیشانی
سے مفارقت کا یہ ذمہ آلود جا پی لیا جائے، البتہ یہ تمنا اب بھی ضرور تھی کہ الگ ہو کر کبھی
ادارہ سے زیادہ فصل نہ رہے۔

لے ہمارے حضرت مولانا گیلانی بھی اپنے وطن پرچ کر اس علمی فقدان کی وجہ سے مایہی بے آب بن گئے تھے!
مگر یہ صرف انہی کی سمجھ میں آنے والی بات ہے جو بحر علم کے ساکن ہوں!

قیام بھوپال

(جون ۱۹۴۶ء تا اکتوبر ۱۹۴۹ء)

علامہ سید سلیمان ندوی جیسی فریدانہ شخصیت کے لئے یوں تو ہر علمی و تعلیمی ادارہ، ملک و بیرون ملک کا، اپنی آنکھیں فرشِ راہ کئے ہوئے تھا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مدت سے ان کے لئے اپنا دامن بچھائے ہوئے تھی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے بارہا ان کو خوش آمدید کہنے میں فخر محسوس کیا، بلکہ آخر زمانہ میں تو اسٹینبول یونیورسٹی سے تک یہ اصرار دعوت پہنچی تھی، مگر حضرت علامہ دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو چھوڑ کر کسی تعلیمی یا علمی ادارہ سے تعلق جوڑتے ہوئے اس لئے تامل فرما رہے تھے کہ اس کی وجہ سے پھر لوگوں میں شک و شبہ پیدا ہونے کا قوی امکان تھا، کہ اگر علمی ہی خدمات انجام دینی تھیں تو اپنے ادارہ کو چھوڑ کر پرانے ادارہ سے تعلق کیسا؟ اللہ اللہ کتنا خیال تھا دارالمصنفین کی نیک نامی اور استحکام کا!

غرض حضرت علامہ ابھی کوئی تصفیہ نہ کر پائے تھے کہ ریاست
حیدرآباد نے صدر الصدور کا عہدہ جلیل (جو مولانا
عبد الرحمن خان شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے خالی

تھا) خدمتِ عالی میں پیش کیا بلکہ خببِ اوخر ۱۹۴۷ء میں وہ حیدرآباد تشریف لائے تو وزیر تعلیمات اور وزیر امور دستوری حضرت کی قیام گاہ پر تشریف لا کر اس پیش کش کو قبول کرنے پر اصرار کرتے رہے مگر ادھر سے انکار ہی رہا۔ یہ وزرا ابھی گئے ہی تھے کہ راقمِ آثم خدمتِ عالی میں حاضر ہوا تو حضرت نے واقعہ سن کر ارشاد فرمایا کہ جو لوگ عہدہ و منصب کے پیچھے پھرتے ہیں وہ ان کو ملنا نہیں، اور جن کو اس کی خواہش نہیں

ان پر اصرار کیا جاتا ہے کہ یہ اعزاز ہوگا، اتنی تنخواہ ہوگی — بس دنیا کا یہ حال ہے!“
یہ ارشاد راقم آئیم کی موعظت کے لئے تھا،

نواب بھوپال کا کامیاب اصرار | اسی زمانہ میں خدا کا چاہا یہ ہوا کہ نواب
حمید اللہ خاں والی ریاست بھوپال نے
اپنی دیرینہ دعوت پھر ایک مرتبہ پوری قوت سے خدمت سیدانی میں پیش کی، اب کی مرتبہ ذہین
نواب نے اصرار کا ایسا پیرایہ اختیار فرمایا کہ وہ سوئپر ہو کر رہا، نواب صاحب نے جو کچھ لکھا، اس کا
حاصل یہ تھا کہ میں نے اپنی ریاست کے دارالقضاء اور یہاں کے مدارس عربیہ کی اصلاح کا
عزم کیا اور اس کام کے لئے میری نظر میں علامہ سید سلیمان ندوی سے موزوں شخصیت کوئی نہیں
تھی لیکن میری دعوت کو آپ قبول نہیں فرماتے ہیں، اب میں ہری التزم ہوں، اگر اللہ تعالیٰ
قیامت میں مجھ سے اس بارے میں پوچھے گا تو صاف عرض کر دوں گا کہ بارِ الہام میں نے
اس کام کے لئے جس ہستی کو موزوں سمجھا، بہ اصرار اس کو بلاتا رہا مگر میرا اصرار کارگر نہ ہوا۔

یہ روایت میں نے خود حضرت والاؒ سے سنی ہے، فرماتے تھے کہ نواب صاحب کے
اس (خط کشیدہ) جملہ نے مجھ کو مجبور کر دیا، اور میں نے ان کی دعوت قبول کر لی!
اس طرح جون ۱۹۳۶ء کو ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ احمدیہ بھوپال
کے صدر کے دو گانہ عہدوں پر فائز ہو کر حضرت والاؒ بھوپال کے مقیم بن گئے۔

نواب صاحب کی قدردانی | یہاں حضرت والاؒ کو وسیع اختیارات، ایک ہزار
ماہوار کا مشاہرہ سرکاری رہائش اور ہر طرح کا
اعزاز و اکرام حاصل رہا، حضرت والاؒ نے بار بار فرمایا کہ قیام بھوپال کے تین سال میری زندگی کا
بہت ہی پرسکون زمانہ گذرا — نواب صاحب کی قدردانی میں ملاپ ہی میں نہیں
بلکہ سرکاری کا مدد و ایوں میں بھی بہت ہی نمایاں رہی، ان کی قدر شناسی کا تذکرہ کرتے ہوئے
حضرت والاؒ نے ایک سرکاری مثل (فائل) احقر کو دکھائی تھی، جس میں حضرت نے کسی بات کی

منظوری کی سفارش فرمائی تھی اور منظور کرنا نواب صاحب کا اختیار تھا، نواب صاحب نے بجائے صرف ایک لفظ منظور کے یہ جملہ لکھ کر دستخط ثبت فرمائے تھے: ”حسب سفارش حضرت قاضی صاحب منظور۔“

فاطر داری اور پاسِ مرتبت کی ایک اور مثال دیکھئے کہ ملکہ بھوپال نے ہماری پیرانی صاحبہ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا، حضرت والدہ نے معذرت کی کہ ہم لوگ پردہ کے زیادہ پابند ہیں اور محل شاہی میں مرد ملازمین اور خدام بھی ہوتے ہیں، حضرت کے اس اعتذار پر ملکہ مددوح نے پردہ کے پورے اہتمام کا وعدہ فرمایا چنانچہ سنا ہے کہ جب پیرانی صاحبہ تشریف لے گئیں تو مارے مرد ملازمین کو نہ صرف زنا نہ حصہ سے بلکہ محل کے کمپوٹر سے باہر کر دیا گیا تھا۔

اس واقعہ میں اہل ریاست و امارت کے لئے تو یہ درس ہے کہ وہ اپنی آئی و نانی شوکت کی وجہ سے دین اور بزرگانِ دین کی عظمت کو فراموش نہ کر بیٹھیں اور علمائے کرام کیلئے بھی یہ درس بصیرت ہے کہ وہ استغناء کو اپنا شعار بنائیں اور دینی معاملات میں مداخلت نہ کریں، اور اللہ کے اس اٹل فیصلہ کو یاد رکھیں کہ

عزت اللہ، اسکے رسول اور
وَلِلّٰهِ الْحُكْمُ وَلَیْسَ لِمَنْ شَاءَ
مومنین ہی کا حصہ ہے!

عوام کی گرویدگی | پہلی مرتبہ جب راقمِ حق حضرت شیخ کی خدمت میں بھوپال حاضر ہوا تو حضرت کو بھوپال آتے ابھی شکل سے ڈیڑھ ماہ ہوا تھا، اخبارات میں بڑی بڑی سرخیاں نظر آئیں کہ ”ریاست میں غیر ملکیوں کی درآمد شروع ہو گئی“

”ملکی افراد کی حق تلفی“ وغیرہ۔۔۔ لیکن جب دوسرے سال پھر حاضری کا شرف پایا تو حالت بالکل برعکس دیکھی، پڑھے لکھے اور عوام سب حضرت علامہ کی مرتبت کے قائل اور ان کے تقدس کے معترف تھے، میں نے بعض لوگوں سے پچھلے سال کے اخبارات کا ذکر کیا

تو ہر شخص کو نام پایا، اور کھلے بندوں اس امر کا معترف کہ حضرت علامہ جیسی شخصیت کا قیام بھوپال کے لئے باعث افتخار ہے! — ایک مرتبہ ایک تانگہ والے سے یہی ذکر چھیڑا تو اس کا کھرا جواب بے حد پسند آیا، اس نے کہا کہ شور تو بہت اٹھا تھا اور ہم بھی اسی کو ٹھیک سمجھتے تھے مگر جب قاضی صاحب کے چہرہ کو دیکھا اور ان کی تقریریں سنیں تو سارا ہنگامہ ختم ہو گیا وہ تو بڑی بزرگ سستی ہیں!!

خانقاہ سے ربط | بھوپال میں حضرت شاہ ابوالحسن محمد مدنی (جو اپنے وقت کے قطب الارشاد تھے) کی خانقاہ قبولیت عام حاصل کئے ہوئے ہے، امراء اور عوام سب ہی اس کو نگاہ عقیدت سے دیکھتے ہیں اس خانقاہ کی رونق اب حضرت شاہ قدس سرہ کے چھوٹے صاحبزادے شاہ محمد یعقوب صاحب سے ہے جو پیر ننھے میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ ہمارے حضرت والار کے بڑے بھائی شاہ ابوجیب صاحب چونکہ اس خانقاہ کے بانی سے خلافت رکھتے تھے، اس لئے حضرت والا اور پیر صاحب میں دلی ربط اور ادب و احترام کا تعلق قائم تھا، اور دونوں حضرات کو دیکھا کہ ایک دوسرے کی تکریم میں مسابقت کی سعی فرماتے تھے حضرت والا نے ایک مرتبہ شاہ یعقوب صاحب سے فرمایا کہ سلمان میاں پر نظر شفقت رکھیں، اس ارشاد کا پیر صاحب نے اس درجہ خیال رکھا کہ وقتاً فوقتاً حضرت والا کی قیام گاہ پر تشریف لاکر صاحبزادہ کو نصیحت و ارشاد سے فیض یاب فرماتے رہے۔

پاکبازوں اور اللہ والوں کی ملاقاتیں بھی عجیب دیکھیں کہ ان کو دیکھ کر اہل جنت کی ملاقاتوں کا ایک تصور نگاہ میں آجاتا اور ناتمام ہونے کے باوجود دل کو شوق و تمنا سے معمور کر جاتا ہے۔

ارشاد و ہدایت کی مساعی | دامالقصا اور جامعہ احمدیہ کی اصلاح سے متعلق جو اقدامات حضرت والا نے کئے وہ ان کے فرائض

منصبی سے متعلق تھے اور ہمارے موضوع سے راست ان کا کوئی تعلق نہیں، البتہ اس کے علاوہ جو انھیں بابرکات عام ارشاد ہدایت میں صرف ہوتے رہے ان کا اظہار ضروری ہے۔

حضرت دالارہ کے افادہ ممولات جو بھوپال کی حاضری میں احقر نے دیکھے وہ یہ تھے کہ نماز اشراق کے فوراً بعد ناشتہ کر کے دفتر دارالقضاہ کے برآمدہ میں تشریف لے آتے یہاں بیس پچیس فیض قرآنی کے طالب جمع رہتے تھے، حضرت دالارہ کے جلوہ فرما ہوتے ہی سب لوگ قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاتے اور پھر حضرت علامہ کوئی پون گھنٹہ تک درس قرآن پاک سے مستفید فرماتے تھے، بالعموم بیضاوی شریف حضرت کے سامنے ہوتی تھی، مخاطب چونکہ اہل علم ہوتے تھے اس لئے صرفی و نحوی نکات، بلاغت و اعجاز، کے کمالات اور ربط آیات و معانی کی دقیق بحثیں پیش کی جاتی تھیں، کبھی کبھی ذوق نکات زیادہ تر اپنے شیخ قدس سرہ کے بیان فرمودہ اور کچھ اپنی طرف سے بھی بیان فرماتے تھے:

ان مجلسوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حضرت دالارہ کو علوم قرآنی پر کس درجہ تبحر حاصل تھا۔

تفسیر ختم کر کے اپنے صاحبزادے کو عربی ادب اور بیضاوی شریف بقا سبغاً پڑھاتے تھے یہاں حضرت دالارہ کا معلمانہ امتیاز اور نفسیات تعلیمی سے بانیگری کا اندازہ ہوتا تھا۔

اس کے بعد دفتر مصروفیات شروع ہوئیں، جو قبل عصر تک جاری رہتیں عصر اور مغرب کا درمیانی وقت ”احسانی مجلس“ کے لئے وقف تھا اس وقت حضرت دالارہ کے مترشدين اور بعض پیر بھائی جن میں مولانا اشفاق الرحمن کا نہ ہلوی مرحوم اور ماسٹر لے حضرت دالارہ کے قرآنی افادات ان کے شاگرد رشید مولانا اویس نعمانی (شیخ التفسیر والعلوم

شفیق احمد صاحب ایم۔ اے (علیگ) خاص تھے، روزانہ شریک محفل رہتے تھے۔ اس محفل میں گفتگو کا موضوع تو کوئی خاص نہ ہوتا تھا، بلکہ ضرورت کے مطابق شیخ قدس سرہ اپنے ملفوظات سے مستفید فرماتے تھے اور وہ بھی کوئی مستقل تقریر کی صورت میں نہیں بلکہ مجلس گفتگو کے انداز میں تاکہ دوسروں کو بھی عرض و معروض کا موقع مل سکے۔

خوب یاد آیا، ایک صاحب حکیم الامتؒ کے دست گرفتہ، جوان عمر اور غامری اعتبار سے نختہ حال بڑے ذوق و شوق سے حاضر ہوتے اور ہیکہ عجربن کرا اس محفل میں بیٹھتے تھے مگر نہ جانے کمالات باطنی کا کیا خزانہ چھپائے ہوئے تھے کہ حضرت والا ان کا بڑا خیال فرماتے تھے، ایک دفعہ تو ان کی طرف محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرا کر فرمایا ”مولوی صاحب آپ کا تو ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے!“

شام کی یہ محفل بڑی دلچسپ اور اثر آفریں ہوتی تھی، اس محفل کے صاحبِ جدو حال رکن ماسٹر شفیق احمد صاحب تھے، حضرت والا قدس سرہ کے ایک ایک جملہ پر چل جاتے اور کبھی کبھی چیخ تک نکل جاتی تھی حالانکہ حضرت کی گفتگو میں ظاہرہ و جوش و خروش کبھی نہ ہوتا تھا البتہ سادگی میں بھی سوز و درد کچھ ایسا ہوتا تھا کہ اہل محفل بے قابو ہو جاتے تھے، _____ ایک واقعہ ہے اس کا اندازہ ہو گا جواب بھی چشمِ تصویر میں ایسا حاضر ہے کہ گویا اس کو ماضی سے کوئی تعلق ہی نہیں، ایک روز مولانا اشفاق الرحمن رحمہ اللہ نے تذکرہ فرمایا:-

”ہمارے حضرت (یعنی مرشد تھا نوی قدس سرہ) کبھی آنکھ میں آنکھ ڈال کر نہیں

نہ دیکھتا تھا۔ جمع فرما رہے تھے جب یہ ذخیرہ اہل نظر کے سامنے آئیگا تو دنیا حضرت والا کی قرآنی بصیرت کا اعانہ لگا سکے گی لیہ دونوں حضرات حضرت تھانوی قدس سرہ کے مجازین صحبت میں سے تھے مولانا اشفاق الرحمن صاحب کو حضرت والا نے مدرسہ امینیہ (دہلی) سے جامعہ احمدیہ (بھوپال) میں معلمِ حدیث کی حیثیت سے یا تھا اور ماسٹر صاحب غالباً کسی انگریزی ہائی اسکول کے اسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تھے۔

دیکھتے تھے بلکہ ہمیشہ کن انکھیوں سے نظر فرمایتے تھے۔

اس پر صدر نشین محفل (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ وجد آفرین اضافہ اپنے دلاویز مہتمم کے ساتھ فرمایا کہ۔

”مگر اس سے کسی کو محروم نہ فرماتے تھے، چنانچہ میں نے اسی کیفیت کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

اس کی دُزدیدہ نگاہی کے نشار“

بس ابھی مصرعہ اولیٰ ہی ادا ہوا تھا کہ ماسٹر شفیق احمد صاحب نے ایک چیخ لگائی اور زار و قطار رونے لگے، ساری محفل اس کے زیر اثر آ گئی، حضرت دالار کی آنکھ سے بھی ایک درِ شہوار ڈھلک کر ضبطِ محبت کے راز کو فاش کر گیا، اور وہ گردن جھکائے بیٹھ گئے، جب ماسٹر صاحب کے وجد کو ذرا سکون ہوا تو مولانا اشفاق الرحمن نے عرض کی کہ حضرت دوسرا مصرعہ تو رہ ہی گیا۔ حضرت دالار نے فرمایا کہ

”اب تو میں خود ہی بھول گیا، پھر کسی وقت سن لیجئے۔“

حالانکہ اصل مصرعہ تو دوسرا ہی ہے اگر ادا ہو گیا ہوتا نہ معلوم اہلِ جوش کے ہوش کہاں گم ہو جاتے، ————— پورا شعر یہ ہے۔

اس کی دُزدیدہ نگاہی کے نشار آج ہی آغاز کا انجام ہے

بہر حال یہ تو ایک دن کی محفل کا ایک واقعہ ہے، ورنہ کوئی مجلس بھی ذوق و محبت کے اثر و تاثیر سے خالی نہ ہوتی تھی۔

یہ افادی معمولات ہفتہ کے چھ دن یعنی ہفتہ سے جمعرات تک کے تھے، جمعہ کا پروگرام ذرا مختلف تھا، کیونکہ یہ چٹائی کا دن بھی تھا اور عید المومنین بھی! ————— آج درنِ تفسیر بند رہتا تھا، البتہ کچھ تاخیر سے مغلیہ دور کی یادگار جامع موتی مسجد میں رشید و ہدایت کا ایک اجتماع عام ہوتا تھا، میں نے یہاں کے شریک ہونے والوں کی تعداد چالیس پچاس کے

لگ بھگ دیکھی، ممکن ہے بعد میں اور بڑھ گئی ہو، اس میں اعلیٰ عہدہ دار اور عوام یکساں ذوق و عقیدت سے شریک ہوتے تھے۔ حضرت والا ٹھیک نو بجے مسجد پہنچ جاتے اور صحن مسجد کے مشرقی شاندار دروازے کے متصل قبلہ رخ تشریف فرما ہوتے تھے، سب لوگ سامنے باادب بیٹھ جاتے تھے۔۔۔۔۔۔ اس محفل میں حضرت شیخ کسی ایک موضوع پر گفتگو فرماتے اور سب لوگ ہمہ تن گوش گھنٹہ بھر تک ارشادات عالیہ سے فیض یاب ہوتے۔

حد یار ہے گرم سخن محفل سراپا گوش ہے

مضامین سب تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب ہی سے متعلق ہوتے تھے مگر ان میں عام قصص و روایات نہیں بلکہ قرآن و حدیث اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا تذکرہ اور اسی سے استناد ہوتا تھا، درمیان درمیان میں عصری فتنوں اور ان کے پیرا کردہ شکوک و شبہات کا بڑی قوت سے رد فرماتے تھے، ساتھ ہی اکابرین صوفیاء۔۔۔۔۔۔ جیسے امام غزالیؒ، شیخ اکبرؒ اور مجدد الف ثانیؒ وغیرہ کے دقیق فلسفیانہ مضامین کو مصطلحات سے الگ کر کے اس قدر سلیس اور یقین پرور پیرایہ میں بیان فرماتے تھے کہ بات بالکل کف سننے والوں کے دل میں اتر جاتی تھی، دوران بیان میں کہیں کہیں اپنے شیخ عالی مقامؒ کے کمال تحقیق اور فن احسان میں ان کی تجدیدی شان کا ذکر بھی آ جاتا تھا، مگر اس ادب کے ساتھ کہ کسی بزرگ سے تقابل یا کسی کی تنقید کا ادنیٰ شائبہ بھی طرز بیان میں آنے نہ پاتا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ کمال احتیاط وہیں دیکھا جاسکتا ہے جہاں مزاج کا اعتدال اور علم و نظر و سمعت موجود ہو، اور کون انکار کرے گا کہ یہ عطاۂ ربانی عام نہیں !!

اس ہفتہ وار مجلس احسانی کا نفع، اللہ کے فضل و کرم سے گہرا اور عارِ دہا، بیسیوں غافل چونک گئے بے راہوں نے راستہ پایا، کمزوروں میں چلنے کی سکت پیدا ہو گئی، اور وہ چل پڑے۔ راقم حقیقتاً تو جن عہدہ داروں تک کو اپنی پہلی حاضری میں حدود شریعت

سے آزاد دیکھا تھا۔ انہی مجالس کی برکت سے ایک سال بعد ان میں عظیم تغیر پایا کہ ان کے باطن کا انقلاب ان کے چہرے بشرے اور وضع قطع پر پوری طرح اثر انداز تھا، بس یہ فرق ہے صوفیانہ اور مولویانہ طریق اصلاح میں، مولوی ظاہر سے باطن کی طرف جاتا ہے وہ جبر و تکرار سے عادت اور عادت سے طبیعت صالح پیدا کرنا چاہتا ہے اور صوفی دفعۃً باطن میں اتر آتا، فطرت صالحہ پر جو گرد و غبار پڑ گیا ہے اس کو جھاڑ دیتا ہے، انسان کی فطرت اصلی اب خود بخود مطالبات شریعت (جو کہ عین فطرت بشری کا مقتضاء ہیں) کے لئے تڑپ اٹھتی ہے اور ان کی تکمیل ہی میں اس کو چین و سکون ملتا ہے !! اب خود بخود فرمایا جیسے کہ اصلاح کی کون سی راہ اقرب اور اس کی کون سی صورت پائدار ہے؟

یہ تو ایک ضروری جملہ معترضہ درمیان میں آگیا، بات یہ ہو رہی تھی کہ ان ہفتہ وار مجالس سے اہل بھوپال کو بڑا نفع پہنچا، راقم آثم کا خیال یہ تھا کہ غالباً سلیمانی ارادت رکھنے والوں کی اکثریت بھوپال ہی میں ہوگی، مگر دو چار بار حضرت والارہ کی زبان مبارک سے یہ جملہ سُن کر اپنا خیال بدلنا پڑا کہ میرے حصہ میں تو حیدر آبادی ہی زیادہ ہیں۔

فیض سلیمانی کا کرشمہ یاد دار العلوم تاج المساجد | مرحوم شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال نے اپنی حیات

میں ایک عالیشان جامع مسجد، جو جامع مسجد دہلی سے بھی وسیع و شاندار ہوتی، بنائی شروع کی تھی مگر عرفانہ کمر سکی اور بعد والوں نے اس کی تکمیل پر توجہ نہ دی حضرت والارہ کی نگاہ میں یہ مسجد تھی اور اس کی معوضی کا خیال ذہن مبارک میں تھا، قاری عبدالرؤف صاحب بھوپالی ثم می نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب حکمہ تعلیم کی طرف سے ایک کمیٹی بلائی گئی اور اس میں یہ مطالبہ اہل مدارس سے کیا گیا تھا کہ وہ اپنی تعلیمی ضروریات اور ان سے متعلق قومی تجاویز پیش کریں تو حضرت والارہ نے اس کمیٹی میں شرکت کی عرض سے ایک پرزہ پر چند سطریں لکھ کر قاری صاحب

لے اس موضوع کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ الباقیہ۔ از شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ۔

موصوف کو جو حضرت کے منشی تھے، دیں کہ ان کی تمییز کر دیں۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ تاج المساجد ہمارے سپرد کر دی جائے اور پچیس ہزار روپیہ، گو اس مسجد کی ضروریات کیلئے بہت کم ہے، فی الوقت ہم کو دیا جائے تو ہم اس میں ایک دارالعلوم قائم کر سکیں گے۔ یہ حضرت کی معرفت لنگاہی کی گویا کرامت تھی۔۔۔۔۔ تجویز کیٹی میں پیش ہوتی مگر نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اور بظاہر بات آئی گئی ہو گئی مگر نہیں۔۔۔۔۔ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید، یہ تجویز تقدیر بن چکی تھی، بھوپال کی ریاست جب ختم ہوئی اور مدارس دینیہ کی امداد بند ہو گئی۔۔۔۔۔ تو مسلمانوں کو اپنا بار آپ اٹھانا تھا، مدرسوں کو انتشار سے بچانے کے لئے حضرت والا نے حفظ تجوید و قرأت کے تمام مدارس کا مرکز موقی مسجد کو قرار دیا، قاری عبدالرؤف صاحب کو اس تنظیم کا نگران قرار دیا گیا اور موقی مسجد کے وسیع دالانوں میں دوڑ شور سے کام شروع ہو گیا۔ اعلیٰ مدرسہ کے قیام کے لئے پھر حضرت نے اسی تجویز کو دوبارہ پیش کیا کہ تاج المساجد کو قبضہ میں لے کر یہاں ایک دارالعلوم قائم کر دیا جائے، چنانچہ جامع مسجد میں ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا اور حضرت نے اپنے فاضل اور منظم شاگرد مولانا عمران خان صاحب ندوی بھوپالی کے ساتھ اس میں شرکت فرمائی، پہلے حضرت نے اس تجویز کی اہمیت کو واضح فرمایا، پھر مولانا عمران خان صاحب نے اس پر مزید تقریر فرمائی اور ہزاروں روپے فوراً جمع ہو گئے، مولانا عمران خان صاحب کے حسن تدبیر سے قانونی طور پر تاج المساجد پر قبضہ حاصل ہو گیا اور حضرت والا کے ہاتھوں دارالعلوم کی بنیاد پڑ گئی۔۔۔۔۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد حضرت والا نے تو بھوپال کا قیام ترک فرما دیا مگر حضرت مولانا عمران خان صاحب کی مستعدی اور اعلیٰ تنظیمی و علمی صلاحیتوں کی برکت سے بہت جلد ایک دارالعلوم بن گیا جو آج تک علمی سیرابی کر رہا ہے، یہ خیمہ فیض سلیمانی کی کرامت ہے،۔۔۔۔۔ محترم قاری عبدالرؤف صاحب راقم عاجز سے فرماتے تھے کہ جب حضرت سید صاحب قدس سرہ کو اس دارالعلوم کے فروغ کی تفصیل لکھی تو حضرت نے جواب میں یہ سرور افرا جملہ

تخیر فرمایا تھا کہ جب دیامت پر خزاں آئی تو شاہ جہاں بیگم کی تاج المساجد میں بہاد آگئی ہے!“

تبلیغی جماعت کی سرپرستی | حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کا ایک بڑا مرکز بھوپال بھی تھا، اور تبلیغی حضرات کی وجہ سے حضرت والا رحمہ سے خاص تعلق رکھتے تھے، اس لئے جب تک حضرت بھوپال میں مقیم رہے، تبلیغی کاموں کی گویا سرپرستی فرماتے رہے، اور غالباً حضرت ہی کے ایماء سے مولانا اشفاق الرحمن کاندھلوی بڑی گرم جوشی سے تبلیغی دُور میں حصہ لیتے رہے اور اپنے مواعظ حسدہ کے ذریعہ ریاست کے چہ چہ تک اسلام غالب کی دعوت پہنچاتی،

ادعائے ملحد کی شکست | حضرت والا رحمہ کی سرپرستی میں یہ بات تو شروع ہی سے نمایاں اور متاثر دہی ہے کہ ان کا قلم مبراغنی اسلام کے خلاف شمشیر بران کا کام کرتا رہا ہے، دین کے جس پہلو پر بھی دنیا کے کسی گوشے سے کسی نے وار کرنے کی جرأت کی اور شیلوی فوج کے اس سپہ سالار نے بڑھ کر ادعائے باطل کا سر قلم کر دیا۔ اسی جلالت ایمانی کا ایک فائز نامہ مظاہرہ بھوپال کے دوران قیام میں بھی دیکھا گیا۔

شعرائے بھوپال نے ایک محفل شعر و سخن بڑے پیمانہ پر منعقد کی اور اس میں ملحد شاعر جوش ملیح آبادی کو بھی مدعو کیا، بھوپال کی عام دینی فضا میں معلوم یوں ہوتا ہے کہ جوش کی بغاوت منہبہ کو پہنچ گئی اس نے نظم کی سحرکاری میں تاریخی معاطلوں سے مدلل کر کے وجود باری تعالیٰ کے عقیدہ کا مذاق اڑایا، اس کی یہ نظم دوسرے روز (۳۱ جنوری ۱۹۴۹ء) کو مقامی اخبارِ ندیم میں چھپی، حضرت والا رحمہ کی نظر حبِ ملحد کے اس مغالطہ آمیز ادبی پر پڑی تو پھل گئے، پیکرِ جمال پر شانِ جلال غالب آگئی، خود فرماتے تھے کہ دن تو ضروری مصروفیتوں میں جوں توں گزر گیا، رات آئی اور فرصت ملی تو اس نظم کا کلمہ بہ کلمہ فی البدیہہ جواب لکھ کر ہی بسترِ پرہیز کے صبح یہ جزابی نظم اخباروں کے حوالہ کر دی گئی اور دوسرے دن سادے اردو اخبارات نے اس کو پورے آب و تاب سے چھاپا، پھر ہندوستان کے اور جابجا در سائل نے

بھی اس کو شائع کیا۔

یہ جوابی نظم حسانی شان اور اثر لئے ہوئے ہے، اس میں جوش کے ہر دعوے کا ایک ایک کر کے دندان شکن جواب دیا گیا ہے، اور آخر میں ایک شعر عزائم لکھ کر اس کی جہالت پر ضرب کاری لگائی گئی ہے، ایسی ضرب کہ وہ پھر سرنہ اٹھا سکا۔ پہلے ادمائے الحاد کو دل پر چیر کر کے سُن لیجئے تاکہ پھر نعرہ حق کی صداقت و قوت کا اندازہ ہو سکے کیا کیا جائے مجبوری ہے کہ اس عالم کون و فساد میں اضداد ہی کو پیش نظر لا کر ان کے فرق و امتیاز کو سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ نقل کفر کس اہل ایمان کو گوارا ہو سکتا ہے؟

ہفت اب جوش

جبکہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرم خردش	باپ کی صرف ایک ہوں نے کر دیا بکھوڑش
ہوں بزرگ خاندان کی آہنی دیوار ہے	ہر فساد و غلطی کو ایک ہوں درکار ہے
سننے میں انسان کا ہے باپ رب کائنات	اس لئے دوست تجھے پوچھتا ہوں میں بات
جب ہلاک کرنے پہائی تھیں ہو کی ندیاں	کوئی ہوں اسوقت کیا گونجی تھی زیر آسمان؟
تحفہ آئے تھے جب مقتول انسانوں کے سر	پھٹ پڑی تھی کیا کوئی ہوں نیمہ چنگیز پر؟
شعلہ ہائے حکم نیر و جب کہ تھے بھڑکے ہوئے	ڈانٹ کی کوئی صدا آئی تھی با عرش سے؟
لے اڑا تھا جبکہ رادن ایک دیوتا کا گہر	کوئی ہوں گرجی تھی کیا اسوقت ادج چرخ پر؟
جب بہا تھا کہ تباہی خاک پر دریائے خون	دہر پر نازل ہوئی تھی کوئی رعیت ناک ہوں؟
کر رہا تھا دہر جب سقراط کے دل پر اثر	عرش سے اتری تھی ہوں کوئی بساط فرش پر؟
یسے مریم کو جب کھینچا گیا تھا دار پر	ہوئی تھی کیا کسی ہوں سے زمین زیر و زبر؟

لے میرا اشارہ بارگاہ نبوت کے شاعر اعظم حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی طرف ہے جن کے استعداد کو لفظ نبوی نے مجاہدوں کے تیروں سے زیادہ موثر قرار دیا تھا۔

آٹم نے رکھ دیا تھا بھون کر جب ایک شہر
 قلم تعبیر میں آئی تھی کیا اس وقت لہر؟
 ہستیاں غلطیدہ تجیس جب موت کے گرد ہیں
 کوئی ہوں؟ کوئی تھی کیا بنگالہ و پنجاب میں؟
 جب ہوئے تھے آخری اوتار گاندھی جی ہلاک
 آئی تھی کوئی نلئے خستہ کین و قمہر ناک

آئی چپ سادھے ہوئے ہے کس لئے عرش بریں
 کیوں ہمارا آسمانی باپ ہوں؟ کرتا نہیں؟

نعوذ باللہ واستغفر اللہ اس نقل کفر پر۔ اب سنیے بیتان توحید کے
 نیک لکارد۔

جوابِ عارفِ ندویؒ

باپ کی ہوس سے سنبھل جاتے ہیں فرزندِ معید
 ناخلف جو ہیں نہیں سنتے میں تہدید و وعید
 اس جہاں میں جو مصیبت پیش آئی ہے کہیں
 وہ بجز تئیبہ رب العالمین کچھ بھی نہیں
 تازیانہ غافلوں کو قفسِ چنگیز تھا
 راہوارِ نظمِ ملت کے لئے مہینہ تھا
 نسل سے چنگیز کی سلطانِ دین پیدا ہوا
 ظلمِ نیر و سے کھلیں آنکھیں عوامِ روم کی
 راونِ بدکیش ظلم و جور کا فرماں روا
 اس سے جو ہر کھل گیا ستیا کے پاک اخلاق کا
 کر بلا کی خاک سے اُمڈا تھا جو سیلِ بلا
 جو پیلا زہر کا سقراط پی کر مر گیا
 عیسیٰ مریم کی مظلومی کا یہ اعجاب دیکھ
 آٹم ہم سے ہوا جو شہر کل دیران دیکھ
 ناخلف جو ہیں نہیں سنتے میں تہدید و وعید
 وہ بجز تئیبہ رب العالمین کچھ بھی نہیں
 راہوارِ نظمِ ملت کے لئے مہینہ تھا
 ظلمتِ تاناہ سے نورِ مبس پیدا ہوا
 ہل گئی بنیاد اُس کی عظمتِ مومہوم کی
 ہند کے دیوتا کا جو گوہر اڑا کر لے گیا
 رام کی غمِ بلند و شہرہ آفاق کا
 ظلمِ پیشہ بادشاہوں کو بہا کر لے گیا
 عقل کے وہ تابہ جینے کا سامان کر گیا
 روم کے ظالم ہوئے یوں حق سے سرفراز دیکھ
 جیس کی آہوں کا شہرہ اندوں جاپان دیکھ

غرمن پنجاب و بنگالہ پر جو بکسی گری اس سے جل کر خاک ہے سامانِ فقر پروری
 کشتہ بیداد گاندھی کے بدن کا سرخون ہے زبانِ فطرتِ خاموش کی خاموش ہوں
 جاگ اٹھی اس ہوں کیسے ہم شور و غواہی روح رو پر پی چشمِ سنگرہنس پڑی غم دیدہ روح
 بے بھر کو کیا خبر ہوتا رہا ہے بار بار! "تیرگی" سے "نور"، "نثر" سے "خیر" یوں نہیں آشکارا

_____ ندیم بابت ۲، فروری ۱۹۴۹ء

بَن لَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ تَيَدًا مُّعَدَّةً قَدْ أَفْلَحَ الْهَيْهَنُ۔
 بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مار رہے ہیں اور حق باطل کو کچل دیتا ہے اور باطل ناگہاں
 مٹ جاتا ہے۔

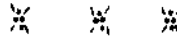
چنانچہ پھر حق اور حقانیت کا غلطہ تو ہر طرف بلند ہوا مگر جوشِ باطل کچھ ایسا
 ٹھنڈا پڑ گیا کہ اس کا ہونا مشتبہ ہو کر رہ گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ریاست بھوپال ہندوستان
 میں ضم ہو گئی، اب یہاں کا نظام کار بدلا،
بھوپال سے دل برداشتگی

افرادِ کارنے آگئے۔ جن اعلیٰ کریسوں پر مسلمان فائز تھے یہندوؤں نے اب ان پر قبضہ
 جما لیا۔ افراد کی تبدیلی فکر و نظر اور اقدار حیات کی تبدیلی تھی حضرت والا جیسی غیور
 ہستی کے لئے ان حالات میں تعاون ناممکن ہو گیا اور وہ دل برداشتہ ہو گئے۔
 بدلے ہوئے نظام کی مجبوریات کے تحت دو مہینے طوعاً نہیں بلکہ کرہاً گزار کر اکتوبر
 ۱۹۴۷ء میں حضرت والا نے استعفا پیش کر دیا اور بھوپال کے عہدہ اور قیام کو ترک
 کر کے عازمِ حج ہو گئے۔

حضرت والا نے ترکِ قیام سے اہل بھوپال نے بڑی بے سہارگی محسوس کی اور

بہت سوں نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ خرد پیر صاحب (شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ) بھی ہجرت کی سوچنے لگے تھے، مگر جب حضرت والاد کے سامنے یہ خیال ظاہر فرمایا تو حضرت کی رائے اس کے خلاف رہی، حضرت نے فرمایا کہ آپ کا وجود مسلمانانِ بھوپال کے لئے ایک سہارا ہے۔۔۔۔۔ ایک مخلص بزرگ کے اس مشورے اور بعض اور حالات کے ماتحت پھر پیر صاحب مدظلہ نے ہجرت کا خیال ترک فرمادیا اور آج تک وہیں مقیم ہیں۔





باب ششم

سفر حج، ہجرت پاکستان اور رحلت

۱۹۴۹ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء

آخری سفر حج

۱۳۶۸ھ ۲ ۱۹۴۹ء

یوں تو حضرت والارہ کو دومرتبہ زیارت حرمین کا شرف مل چکا تھا، مگر یہ دراصل ملکی خدمات اور وفودِ خلافت کے سلسلہ کی حاضریاں تھیں خیال مدت سے یہ پرورش پا رہا تھا کہ اللہ کے گھر اور اس کے نبی خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خواہ گاہ پر حاضری ہر مقصد و مدعا سے الگ ہو کر محض انھیں کو مطلوب و مقصود بنا کر کم از کم ایک بار تو ضرور ہی ہونی چاہیے کہ یہ اس ارض پاک کی عظمت و تقدس کا حق بھی ہے اور خود اپنے جذبہ عشق و فدویت کی تسکین بھی اسی میں ہے۔ اچنانچہ اسی باطنی تقاضے کے تحت ۱۹۴۵ء میں سفر حج کے سارے انتظامات فرمائے، حضرت کی اس آمادگی کو دیکھ کر ان کے داماد سید حسین صاحب نے بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس مقدس سفر کا تہیہ کر لیا، مگر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ واپسی کے عین قریب سید حسین صاحب کے فرزند کو شدید علامت لاحق ہو گئی اس کی وجہ سے نہ وہ جلسے اور حضرت والارہ کیونکہ حضرت کے ساتھ پیرانی صاحبہ بھی تشریف لے جا رہی تھیں اور ان کو فریضہ حج کی ادائیگی کی زیادہ فکر تھی کہ اب تک ان کو اس کا موقع نہیں ملا تھا، اس التوائے سفر کا حضرت والارہ کو بے حد صدمہ رہا۔ فرماتے تھے کہ میں اس قابل کہاں کہ اس بارگاہ میں بلایا جاسکوں۔

ایک موسم حج گزر گیا، دوسرا آیا، حضرت والا تو کب کے منتظر اور پابرجا ابھی تھے اکتوبر ۱۹۴۹ء ۱۳۶۸ھ کو اپنی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادہ سلمان سلمہ کو ساتھ لے کر بمبئی پہنچ گئے اور یہاں سے خسر و نامی جہان پر بیت اللہ کی زیارت کو روانہ ہو گئے، عاشقانِ الہی

اڑھنے کو جی چاہتا تھا، طبیعت کی ساری نفاست اور مزاج کی ساری نزاکت معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کی رخصت ہو چکی ہے، سر پر دوپٹی ٹوپی، کبھی کرتہ پا جامہ، کبھی تہمداد کرتہ، بر سبز یا حرم پاک میں نکل آتے اور اس دار فنگی کے ساتھ طواف کرتے، یا صحن حرم میں نماز پڑھتے یا پھر خانہ کعبہ پر ٹھکلی جمائے بیٹھے نظر آتے، وہ گرد و اطراف سے بے خبر، خیال غیر سے پاک کبھی ساکت و صامت اور کبھی گریاں و بریاں دکھائی دیتے تھے، محویت کا ایک عالم تھا اور فنایت کی ایک شان!

پروفیسر عبدالمنان بیدل (سابق صدر شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی) کی عینی شہادت سنئے:
 ”کئی بار صحن حرم میں مشغول نماز یا محو دیدار کعبہ نظر آئے، دو ایک بار سنی کرتے کوہ صفا پر دعائ مانگتے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آنکھ والوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ

”ایمان و احتساب کی جلوہ ریزیاں، ان کی ہر نقل و حرکت سے

ظاہر ہیں۔“

اس دوران میں حضرت والاد کے لئے التفات غیر نہایت ہی شاق تھا، اگر کوئی ان کو اپنی طرف متوجہ کرنا بھی چاہتا تو وہ خود اس کی توجہ کو اپنے مرکز توجہ کی طرف پھیر دیتے تھے، چنانچہ اس وقت کے پاکستانی وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین صاحب نے (جو پاکستانی وفد کے اسی سال موسم حج میں وہاں حاضر تھے) حضرت سے مل کر حکومت پاکستان کی موت کی تجدید کرنی چاہی تو حضرت والاد نے اس کا جواب دیئے بغیر خود ان کے ذہن کو اس مقام کی برکات اور ان برکات کے حصول کی طرف پھیر دیا، اور خواجہ صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ اسی طرح معتقدین اور مترشدین کے خطوط بھی وہاں برابر پہنچتے رہے لیکن وہ کسی کا جواب نہ دے سکے، حالت کچھ ایسی تھی کہ قلم کا دھنی آج دو حرف لکھنے سے بھی خود کو عاجز پارہا تھا!!

لے سلیمان نمبر معارف ص ۲۳۵۔ لے معارف بابۃ ماہ مئی ۱۹۵۹ء

چنانچہ مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے محترم کو جن سے اپنا کوئی حال نہ چھپاتے تھے تحریر فرماتے ہیں:
 "اس دفعہ طبیعت کا رنگ یہ رہا کہ قلم چھوٹنے کو جی نہیں چاہا، کہیں خط
 نہیں لکھا، کوئی روزنامہ بھی نہیں لکھا، غرض ایک صفحہ کا بھی تحریری سامان
 اس سفر میں ہاتھ نہیں آیا۔" لے

یہ بھی ارشاد فرماتے تھے کہ "دعا تو سب کے لئے دل سے کی مگر ہاتھ میں قلم پکڑنے کو
 جی ہی نہیں چاہتا تھا" چنانچہ پھر ہندوستان پہنچ کر سب خطوط کے جوابات عطا فرمائے۔

یہ بات احقر نے خود حضرت مرشدی نور اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے سنی کہ ایک روز وہ صحن حرم میں بیٹھے ذکر

ایک نجدی عالم کا اقرار تصوف

میں مشغول تھے اور ہاتھ میں تسبیح بھی تھی کہ ایک نجدی عالم نے "اسلام علیکم" کہہ کر حضرت
 کو معویت حق سے نکالا اور اپنی طرف متوجہ کر لیا، وہ عالم حضرت والارہ کی علمی عظمت کے
 قائل تھے، انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ اے شیخ! میں نے سنا ہے کہ آج کل آپ تصوف
 کا شغف رکھتے ہیں؟ _____ حضرت والارہ نے اقرار فرمایا اور تعجب کی وجہ پوچھی،
 عرب عالم نے کہا یہ تو بدعت ہے! حضرت والارہ نے ان کو بٹھالیا اور آدھے گھنٹے تک
 حقیقت تصوف پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسی مدلل تقریر فرمائی کہ اس کو سن کر
 مخاطب عالم نے اعتراف فرمایا کہ اگر اسی کا نام تصوف ہے تو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

میں نے حضرت سے اس تقریر کی تفصیل پوچھی تو ارشاد فرمایا کہ مجھے خو حیرت ہے
 کہ بلا حلف وہ آیات و احادیث جن میں دذائل اخلاق کی مذمت اور ان پر وعید
 اور نضائل اخلاق کی تاکید اور ان پر انعام و الادب ہے مسلسل زبان پر آتی چلی گئیں اور
 میں نے مختصر تشریح کے ساتھ ان کو پیش کر دیا، اور پھر حصول تقویٰ و احسان کی ترغیب
 اور اس کے ثمرات جو قرآن پاک اور اقوال نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آئے ہیں

۔ مدونہ بابہ ماہی ۱۳۵۷ھ

وہ سنا دیئے۔ یہ محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ اس نے سینہ کھول دیا اور زبان رواں کر دی!

غزلِ عارفانہ | غرض اب کسی کو کیا معلوم کہ عبدا در معبود میں کیا علاقہ رہا۔ کتنے حجابات اٹھے، تجلیاتِ جلال کے کیسے کیسے مشاہدے ہوئے، مگر ہاں اتنی بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مانگنے والے کو بہت کچھ نوازا گیا اور دونے والے کو ہنسا کر بارگاہِ عطیہ سے رخصت کیا گیا، اس کا ثبوت حضرت والار کے وہ اشعار ہیں جو اس ارضِ مقدس پر شوق و ذوق کی فراوانی میں زبان سے نکل گئے تھے، یہ غزل حضرت کی بیاض میں جس عنوان و انداز سے لکھی ہے ذیل میں درج ہے :

بوقتِ حاضری مکہ مکرمہ

ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ - مناسکِ حج

دیدہ دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں
انکے کرم کے ہم نثار، انکی عطا کا کیا شمار دیدیا عاصیوں کو بار، اپنے حیرم ناز میں
صبر و تندرہ و ہند و شام، سرخ رخ و سیاہ فام عشقِ نواز ہر مقام، آئے ہیں سب حجاز میں
عش کے بامِ کعبہ ان وسعتِ دستِ ان میں شانِ کرم ہوئی عیاں، ہو کے نہاں مجاز میں
سنگِ سیاہ و زجوقھا، دستِ مصافحہ بشناق اب رہا وہ راز میں، وہ جو چھپا تھا ناز میں
روزہ و نیامقام صبح کہیں کہیں ہے شام عشق کی منزلیں تمام، راہِ خم و درواز میں
دل کو نصیب ہو گمراہ جہاں کو عطا ہو موز و باز ہے یہ دعا بصد نیا ز، درگاہِ بے نیاز میں

دل جو ملا سیاہ کا رانکھ عطا ہوا شکبار

دھوئے جودل کو بار بار، غلوتِ خاص راز میں

لے الحجر بیت اللہ یصافح بها المؤمنین۔ (الحديث)

علمائے حجاز سے ایک استفتاء | سب جانتے ہیں کہ برسوں سے مکہ معظمہ میں آلہ مکبر الصوت پر نماز ہوتی ہے، ہمارے

حضرت والدہ نے علم و بصیرت کی روشنی میں آلہ مکبر الصوت پر نماز کے حجاز کا فتوے اس وقت دیا تھا جب کہ ہندوستان کا کوئی مشہور عالم اس کا قائل نہ تھا، مگر حضرت والدہ جانتے تھے کہ علماء حجاز جو اس کے حجاز کے قائل ہیں وہ کچھ زیادہ مستحکم دینی بنیاد پر نہیں بلکہ اس میں عصری تغصن اور دباؤ کی آمیزش ہے، مرکز اسلام میں فقہی امور میں سیطیت حضرت والدہ کے لئے تکلیف دہ تھی چنانچہ اس صورت حال پر متنبہ اور اس کی اصلاح کا حکمانہ طرز یہ اختیار فرمایا گیا کہ خود حضرت والدہ نے آلہ مکبر الصوت پر نماز کی ادائی سے متعلق ایک استفتاء مرتب فرما کر علماء حجاز سے اس پر فتوے طلب فرمایا۔ فتوے حجاز کے آئے۔ مگر دلائل حضرت کے گمان کے مطابق نہایت ناقص تھے، فرماتے تھے کہ بعضوں نے اس کے استعمال کو نماز میں بینک کے استعمال پر معمول کر کے ابھی دلائل سے حجاز کا فتویٰ دیا۔

غرض اب حضرت والدہ چونکہ خود مستفتی تھے، اس لئے ان کا فتویٰ لکھنا تو سبب نہ تھا اس لئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ سے فرمایا کہ وہ جواب تحریر فرمائیں مولانا نے حجاز کا فتوے اس کے فقہی دلائل کے ساتھ لکھا، حضرت والدہ نے اس کو علمائے حجاز کی خدمت میں پیش کر کے ان سے ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات مرکز اسلام میں رہتے ہیں، عالم اسلام کی نظریں آپ کے عمل پر لگی رہتی ہیں، اس لئے فقہی مسائل میں آپ حضرات کو زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ جب حج سے واپس تشریف لائے اور میں بعض احباب کے

لے مولانا مظاہر پاکستانی وفد کے رکن رکنین کی حیثیت سے خواجہ شہاب الدین صاحب کے ساتھ اس حج میں شریک تھے۔

ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے یہ واقعہ الی الفاظ کے ساتھ سنایا کہ حضرت سید صاحب نے تو علمائے حجاز میں تہلکہ مچا دیا۔

مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت والا رحمہ اللہ پر جو فائیت اور عبدیت طاری تھی اس کا ہلکا سا نقشہ پیش کیا جا چکا ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف بالکل یکسو

دو تقریریں

ہو کر لوگوں سے میل ملاپ اور تحریر و تقریر سے گریزان تھے، مگر اس حال کا صحیح اندازہ دوسروں کو کہاں ہو سکتا تھا اور جس عظمت و شہرت کے مالک حضرت والا رحمہ اللہ تھے، اس کے ہوتے ہوئے لوگ ان کو کیسے چھوڑ سکتے تھے، خواہی نحو ہی دو بار اہل عرب اور عام مسلمانان عالم کو مخاطب کرنا پڑا۔ موقف اس قدر نازک تھا کہ نومی اعتبار سے حضرت ہندوستانی تھے اور ہمدردیاں فطرۃ پاکستان کے ساتھ تھیں، ادھر پاکستان کی دعوت سال بھر سے ان کے زیر غور تھی اور ہندوستان اس سے بے خبر نہ تھا پھر جن اجتماعات کو مخی طیب کرنا پڑا۔ ان میں دونوں ملکوں کے دفور کے ارکان موجود تھے اور تقریروں کا موضوع واعظانہ نہیں، بلکہ مسلمانان عالم کی فلاح و بہبود سے متعلق تھا مگر حضرت والا کے لئے یہ کوئی پہلا مرحلہ نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ سیاسی مراحل پر وہ پوری جرأت و صداقت اور جزا و احتیاط کے ساتھ کامیاب گزر چکے تھے، ان کا کمال یہ تھا کہ بات نہایت مختصر و مفید میں مگر بہت گہری کہہ جاتے تھے، اور پیرایہ بیان اس قدر محتاط اور محفوظ ہوتا تھا کہ الفاظ گت لگا کر بھی گرفت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی دینی و صفائیوں پر دو تقریریں فرمائیں اور بلاد اسلامیہ کے اتحاد کی ضرورت و اہمیت اور اس کی صورتوں کو دینی نیت سے واضح فرمایا اور نو زائدہ مملکت پاکستان کے خصوصی ہمدردی بھی نہ فرمادیں، مگر طرز خطاب کچھ ایسا رہا کہ پاکستانی اور ہندوستانی سرکاری خبر رسالوں پر جو طرے نے اپنی اپنی حکومتوں کو جو رپورٹیں بھیجیں وہ سنا ہے کہ دونوں جانب نہایت شغلی بخش تھیں۔ یہ تقریریں اتنی موثر اور نکل افراتھیں

کہ علماء اور اہل سیاست سب ہی نے سید الملت علیہ الرحمۃ کی پختہ فکری اور فراست ایمانی کی داد دی۔ خود عزت مآب خواجہ شہاب الدین جو پہلے ہی سے حضرت والا کو علامہ اور متقی کے علاوہ مفکر اسلام بھی مانتے تھے، ان تقریروں کو سن کر فکر سلیمانی کے اور زیادہ متروک ہو گئے۔

مدینہ منورہ کی حاضری اور تغیر حال | بہر حال بارگاہ جلال کے فیضان سے سینہ کو شفاف فائوس اور دل کو تابندہ چراغ بنائے حضرت والا اب تجلیات جمال کے مرکز یعنی رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وطن ہجرت اور مدفن اقدس میں آپہنچے، فضا کی تبدیلی سے دفعۃً حالت بھی بدل گئی، دل کا چراغ وہی، محبت کی تو وہی، مگر ماحول کی خشکی نے اس کے کرنوں کی لذت جذب کر لی، وارفتگی جاتی رہی، پاس ادب غالب آیا۔ _____ موقعہ کی نزاکت بھی خود اسی مبارک انقلاب کو چاہتی تھی۔

عہد با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

حضرت والا خود فرماتے تھے مدینہ طیبہ پہنچتے ہی طبیعت ایک گونہ سکون پر لگتی خوراک و پوشاک کے ذوق کی بے رغبتی اب باقی نہ رہی، حسب معمول صاف ہاندرھے اور شیر وانی پہنے بغیر گھر سے نکلنے کو اب جی نہ چاہتا تھا، آغاز سفر کے بعد معمول کے مطابق لباس گویا مدینہ الرسول پہنچ کر ہی پہنا گیا، اور کھانا رغبت سے کھایا گیا۔

لے عمری جناب احمد عبداللہ المددوی (لکچر قانون اردو کالج کراچی و مصنف "مذہب عالم کا معاشری و سیاسی جائزہ") جو خاص سیاسی ذہن و فکر کے مالک ہیں، جب حضرت کا ذکر آتا ہے تو فرماتے ہیں کہ بھتی میں توسید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے اور فضائل و کمالات کے علاوہ ایک گہرا سیاسی مانتا ہوں، وہ ایک ایک جملہ میں ایسی گہری بات فرما جاتے تھے کہ عام ذہن اس کے عمق کو پہنچ بھی نہیں سکتا تھا۔

حصول تمکین

اسکینیت کا جو اثر اب تک مرتب ہوا وہ تو مدینہ طیبہ کے عمومی انوار و برکات کا اثر تھا، قلب سلیمانی میں جو انتہائی کیفیت مدت سے پیدا تھی اور بیت اللہ کی حاضری میں جس کی تپش احتراقی نقطہ کو پہنچ چکی تھی، وہ اب بھی موجود تھی، سید عالی مقام کو جب بارگاہ نبوی میں حاضری کا شرف ملا تو انھوں نے اپنے جذبات محبت کا ہر یہ ان اشعار کی صورت میں بکمال ادب پیش کیا۔

آدم کے لئے فخریہ عالی نسب ہے مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے
پاکیزہ تراز عرش و سما جنت و فردوس آرا مگر پاک رسول عربی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے
لے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ سے محبوب نبی کی محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے
اس کے بعد آخری شعر میں اپنے دل کا درد اور اس کی درمانی کی درخواست پیش کر کے زبان عشق و ادب کو خاموش کیا گیا ہے۔

بکھجائے ترے چھینٹوں سے لے ابر کرم آج

جو آگ مرے سینے میں مدت سے دلی ہے، مدینہ منورہ محرم ۱۲۹۹ھ

لے ”عرش کو محل استقرار حق کی وجہ سے فضیلت نہیں ہے کہ بقعہ شریف سے وہ افضل ہوتا بلکہ اس کو صرف اس وجہ سے اور اماکن پر فضیلت ہے کہ وہ ایک تجلی گاہ ہے درنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون تجلی گاہ ہوگا پس اس حیثیت کے اثر سے بھی بقعہ شریف خوں نہ رہا، اس لئے ہر طرح وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں سب سے زیادہ اشرف ہوتی کیونکہ تجلیات حق بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ تمام اماکن سے زیادہ فائز ہوتے ہیں، بہر حال اس مسئلے میں تمام علماء کا اتفاق ہے۔“

(المجول انوار الصدور۔ از حضرت تھانویؒ)

عاشق صادق و جانِ شاہ جس نے اپنی ساری صلاحیتیں سیرتِ نبویؐ کی خدمت اس کے احیاء اور اظہار میں صرف فرمادیں اور محبوبؐ ایسا کریم کہ جس کے نطقِ مبارک سے کلامِ انبیاء کا کلمہ کسی کان نے کبھی سنا ہی نہیں، آج جب زبانِ درد و محبت سے ایک التجا نکلی، تو اس کی ناکامی کا تصور بھی آخر کس بنیاد پر کیا جاسکتا ہے؟ مداحِ نبویؐ کی

اور استدعاء نے قبولیت کا شرف پایا، ————— رات آئی تو حضرت والاؒ کے لئے مطلعِ انوار اور مشرقِ سعادت بن کر ادا سونے تھے کہ خواب میں سسر دارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، و نور شوق میں اپنے آپ کو قدمِ رسالت پر ڈال دیا، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شہداء کو شفقت سے اٹھایا، پھر ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم کر دی۔ یہ گویا نفعِ سکینت تھا، طریقِ نبوتؐ کے سالک کی تمکین کا سامان کیا گیا اور یوں عاشقِ صادقؐ کو منہ مانگی مراد عطا کی گئی۔

حضرت والاؒ کی آنکھ جب کھلی تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ دعا ذہن میں تازہ اور محفوظ تھے۔ حضرت نے اپنی اہمیتِ محترمہ کو بلا کر وہی دعا ان پر دم کر دی اس کے بعد وہ دعا ذہن سے محو ہو گئی، مقصود غائب نہیں تھا کہ جو برکت ذاتِ رسالتؐ سے راست حضرت والاؒ کو میر آئی تھی۔ حضرتؒ واطہ سے ان کی رفیقہ حیات بھی اُس سے بہرہ یاب ہو جائیں، یہ کمالِ دلہنِ اذن کا جزاء تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی کے ساتھ ظہور میں آیا۔

اس واقعہ کے بعد ہی حضرت والاؒ کو تمکینِ کامل و درجیتِ مطلقہ نصیب ہو گئی۔ اب ان کو ایسا نزولِ نامِ حاصل ہو گیا کہ اس کی وجہ سے ان کی باطنی عظمت اور نسبتِ مع اللہ کی قوت کو پہچاننا ناممکن ہو گیا۔ ان کے لئے نہیں بلکہ اچھے اچھے سالکین کے لئے بھی دشوار ہو گیا ہمارے مخرم ذکرِ صاحبِ الکرامۃؒ یا کرتے ہیں کہ میں نے حضرت سید صاحب کو جو پور میں بہت قریب سے دیکھنے کا شرف پایا۔ بڑی پرسوز گفتگو

حضرت کا اعتراف | یہ تو ایک ضروری جملہ معترضہ درمیان میں آگیا، ورنہ بات یہ کہی جا رہی تھی کہ سید اسالکین کو دربار نبویؐ سے

بامراد کر کے لوٹایا گیا، اس کی طرف اشارہ خود حضرت والا رحمہ اللہ کے ایک ملفوظ عرفانی سے بھی ملتا ہے جس کو پروفیسر عبدالمنان بیدل نے نقل کیا ہے۔ بیدل نے مدینہ منورہ میں حضرت سے اپنے متعلق عرض کی کہ ابھی تو صورت ہی صرف بدلی ہے، یعنی باطن میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا، اس پر وہ لکھتے ہیں:-

”مسکرا کر فرمانے لگے، انشاء اللہ اس دربار سے جاتے جاتے سیرت بھی بدل جائے گی۔ اس جملہ کے ساتھ ہی ساتھ ان کی آنکھوں سے چند قطرے بھی نکل پڑے — کہنے لگے بیدل صاحب کیا عرض کروں، جلال و جبروت والے کے دربار میں بھی بہت کچھ ملتا ہے، مگر رافت و رحمت والے کے دربار میں سب سے بڑی چیز یعنی محبت ملتی ہے، آنا شرط ہے آئے نہیں کہ ہر بڑے محبت ملا نہیں، ہاں ایک بات ادر عرض کروں، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہاں آئے بغیر بھی بہت کچھ دے دیا جاتا ہے، اللہ رے ان کی قسمت ہے“

اس بلیغ ملفوظ کے علاوہ خود وہ نعت جس پر حضرت کے عارفانہ تغزل کا خاتمہ ہے اور جو زیارتِ حرمین سے واپسی میں کہی گئی، اس کا مطلع حضرت کی بامراد مراجعت کا پتہ دیتا ہے، فرماتے ہیں:-

عشقِ نبویؐ دردِ معاصی کی دوا ہے
ظلمتِ کدہ دہر میں وہ شمع ہدا ہے

پہلا مصرعہ صاف طور پر اپنے حال کی ترجمانی کر رہا ہے !!

لے سلیمان نمبر معارف ص ۳۴، مضمون سفر حجاز۔

واپسی | زیارتِ حرمین سے فیض یاب و سرشار ہو کر حضرت والادِ جدہ سے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اسی جہازِ خسر و پرہیزگی کے قصد سے سوار ہو گئے، اس سفر میں حضرت نے بہ اصرار اپنے آپ کو قافلہ سالاری سے الگ رکھا، اور ان کے حسبِ ارشاد پروفیسر مہدیکو سالار مقرر کیا۔

حضرت والادورانِ سفر ہی شدید بخار میں مبتلا ہو گئے اور بڑی پہنچ کر بالکل صاحبِ فرش ہو گئے یہاں اعظم گڑھ کے سیٹھ عبدالعزیز انصاری نے حضرت کی تیمارداری اور مہمانی کی سعادت حاصل کی، جب شفایاب ہوئے تو جنوری ۱۹۴۰ء کے وسط میں پھر بھوپال تشریف لے گئے، کیونکہ گومرکاری تعلق اب وہاں باقی نہ تھا، مگر سامان و اسباب اب تک وہیں پڑا ہوا تھا یہاں اپریل تک قیام فرمایا، اور پھر اہل و عیال اور اسباب کو لے کر اپنے داماد سید حسین صاحب کے ہاں کانپور منتقل ہو گئے۔



قیامِ پاکستان کے تین سال پانچ ماہ

(جون ۱۹۵۵ء تا نومبر ۱۹۵۳ء)

آنے کی تمہید ۳۳ برس سے ایک بات ہے، مسلم لیگ ترقی کے آخری مراحل طے کر رہی ہے، مگر حصولِ مقصد میں کھٹکا اب بھی لگا ہوا ہے کیونکہ عام مسلمانوں کا دماغ تو ان

کے ساتھ ہے مگر دل اب بھی دینی اعتبار سے علماء کی عظمت کا قائل اور علماء کی اکثریت ان کے مخالف محاذ پر مورچہ جمائے ہوئے ہے، کبھی مقابلہ پڑ جائے تو لیگی فوج کا ”میمنہ اور میسرہ“ جتنا بھی قوی ہی ہو مگر ”قلب“ نہایت کمزور ہے۔ لیگی ہائی کمان نے اس ضرورت سے جب غیر جانب دار علمائے کرام کی صف کا جائزہ لیا تو لائحہ عمل ان کی نظر سے کہ خلافت کے کامیاب جرنیل علامہ سید سلیمان ندویؒ کی جامع شخصیت پر مرکوز ہو گئی۔ مگر ۱۹۲۶ء کے بعد سے وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے چنانچہ لیگ کے سہی خواہ ان کو دوبارہ اس میدان میں نہ لاسکے۔ یہاں تک کہ خالص اہل سیاست کی ناکامی کے بعد مولانا غفر احمد شامانی نے بھی جب مجبور کرنا چاہا تو علامہ نے ان کو اس جواب سے لاجواب کر دیا کہ:

”آپ ہی کے بزرگ (یعنی حضرت مولانا تھانویؒ) مجھ کو جلوت سے خلوت میں

لے آئے اور اب آپ چاہتے ہیں کہ مجھے اس خلوت سے نکال کر پھر جلوت

میں لے آئیں؟“

غرض یہاں سے مایوس ہو کر پھر اربابِ فکر کی نظریں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ پر پڑیں اور کچھ تامل کے بعد وہ ان کو لیگ کی باقاعدہ شمولیت اور ”جمعیتہ علمائے اسلام“ کی تشکیل پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مولانا کی آمد سے ”جمعیتہ علمائے ہند“ کے مد مقابل ایک دینی جماعت لیگ میں ابھر آئی، اور اب لیگی فوج کو کسی صورت سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا، چنانچہ

میدان اس کے ہاتھ آکر رہا،

پاکستان جب بن چکا تو مولانا عثمانی مصوبہ بنگال کی طرف سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مولانا اور ان کے رفقاء کے کارکی کوشش سے مارچ ۱۹۴۹ء میں وہ ”قرارداد مقاصد“ پاس ہوئی جس کی رو سے دستور پاکستان کا کتاب و سنت کے چوکھٹے میں لانا ضروری ہو گیا، لیکن یہ کام نہ تنہا اسمبلی کے افراد سے ہو سکتا تھا، نہ محض علمائے کرام ہی اس کو انجام دے سکتے تھے، اب تو ان ماہرین قانون کی ضرورت تھی جو جدید دستور و قانون سے بھی باخبر ہوں اور کتاب و سنت کے بھی پختہ عالم۔۔۔۔۔ اس ضرورت کے تحت طے یہ پایا کہ پانچ علماء پر مشتمل ایک بورڈ قائم کیا جائے جو اسمبلی کے پاس شدہ دستوری سفارشات کو اصول شرع پر پرکھ کر ان کو کتاب و سنت کے مطابق کر سکے، اس بورڈ کی رہنمائی کے لئے ارباب حکومت میں سے وزیراعظم لیاقت علی خان مرحوم اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی نظریں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو مرکز نگاہ بنائے ہوئے تھیں اور جب اس معاملہ میں انہوں نے مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے مشاورت کی تو مولانا نے کہا کہ میں نے اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ طبقہ علماء میں صرف مولانا ندویؒ ہی کی شخصیت موزوں ترین ہو سکتی ہے کیونکہ وہ جدید و قدیم کا سنگم ہیں، اس طرح اہل حکومت اور مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے اتفاق رائے سے حضرت علامہ ندویؒ کا اسم گرامی اس مجوزہ بورڈ کی صدارت کے لئے طے ہو گیا، یہ جو کچھ ہوا علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے بلا ایما اور محض بامید منظور ہوا تھا، اس بورڈ کے اور ارکان ڈاکٹر محمد حمید اللہ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی پروفیسر عبدالخالق مرحوم اور محبت جعفر حسن (نمائندہ اہل تشیع) منتخب ہوئے ڈاکٹر صاحب بیرس سے آگئے۔ باقی حضرات تو پاکستان ہی میں تھے۔ اگست ۱۹۴۹ء سے بورڈ نے صدر مجوزہ کی آمد کی توقع پر کام شروع کر دیا۔

حضرت علامہ قدس سرہ کے نام حکومت پاکستان کی طرف سے دعوت نامہ جاری

ہوا، اس وقت حضرت والا قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے، اور ہجرت پاکستان کا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہ تھا، کیوں؟ اس لئے کہ دارالمصنفین وہاں تھا، محبوب استاذ کی دائمی خوابگاہ بھی وہیں تھی، ارض پاک بلحاظ کے بعد جو زمین اپنی خوابگاہ کے لئے محبوب تھی وہ بھی تو اسی کے قریب محسن مسجد کے سامنے درخت کے نیچے والی تھی۔ اس قلبی انجذاب کے علاوہ عقلی طور پر بھی ترکِ قیام کچھ مناسب نہ تھا، پریشان و لاچار بھارتی مسلمانوں کی ڈھارس جن دو چار عظیم شخصیتوں سے بندھی ہوئی تھی، ان میں سے ایک حضرت علامہ کی ذاتِ اقدس بھی تھی اور وہ پورے عزم و استقامت سے اپنی ہمت، اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں صرف بھی فرما رہے تھے، قلبی جہاد کی شہادت تو معارف کے شد زات دیں گے، باطنی ہمت جو کچھ صرف فرماتے رہے اس کو جاننے والے ہی جانتے ہیں!! اس سب کے علاوہ خود حکومتِ ہند بھی ان کے وزن اور اہمیت سے باخبر تھی اور کسی قیمت پر اس گرانمایہ شخصیت کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ تھی اسی طرح حضرت والا کے نخلص احباب بھی ان کے قیامِ ہندوستان پر مہر تھے۔

غرض ان حالات میں جب حکومتِ پاکستان کا دعوت نامہ پہنچا اور علمائے کرام کے خطوط سے اصرار پر اصرار کیا جانے لگا تو حضرت والا ایک کشمکش میں مبتلا ہو گئے چنانچہ راقمِ حقیر کے ایک عزیز کے جواب میں یہ تحریر فرمایا تھا:

”حالت یہ ہے کہ ہر دو جگہ میرے وجود کے لئے احبابِ مصر ہیں، اپنی حالت یہ ہے کہ عدمِ صحت اور ضعفِ قوی سے بھی اور طبیعت کے اقتضاء سے بھی اختلاف و منازعت سے گھر آتا ہوں۔“ (۱۸ جنوری ۱۹۵۰ء)

لے خط کشیدہ جملہ میں بڑی گہرائی ہے اور اس کے منشاء کی کچھ وضاحت یہاں ضروری ہے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ بہ کمال فراست اس بات کے قائل تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اب یہاں کے مسلمانوں میں کوئی طبقاتی یا جماعتی نزاع باقی نہ رہنا چاہیے وہ اس شعور کی پرورش اور فرائس کو ہر اصلاح (باتی نہ نہ خیر)

کی، حق تعالیٰ نے جو فرماست ایمانی حضرت سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمائی تھی اس کے پیش نظر انہوں نے حتیٰ وعدہ تو نہیں فرمایا، البتہ عارضی طور پر آنے کا یقین دلایا ہوا لانا واپس آگئے اور حضرت علامہ کی آمد کا مژدہ سنایا۔

آمد غرض خارجی دباؤ تو بڑھ رہا تھا مگر اس کے علاوہ خود اندرونی تقاضا بھی حضرت علامہ کو کچھ دن کے لئے پاکستان آنے پر ابھار رہا تھا، حضرت کے بڑے داماد سید ابو عاصم صاحب ایڈووکیٹ سیکشن ۱۹۷۷ء ہی میں کراچی آچکے تھے، حضرت کو اپنی جیسی صاحبزادی، جوان دنوں میل بھی تھیں، اور نواسوں سے ملے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا اور محبت پوری جوش و زن تھی، چنانچہ راقم حقیر کو اپنے اس اشتیاق و اضطراب سے مطلع فرماتے ہوئے لکھا تھا:

”ان کے لئے دل بے چین رہتا ہے، کیونکہ ان کے پاس پہنچوں؟“

غرض اس جذبہ سے مجبور ہو کر وراہل پاکستان کا خیال فرما کر جون سنہ ۱۹۷۷ء میں چند روزہ قیام کی نیت سے صرف چند جوڑے کپڑے اور ایک بستر کے ساتھ حضرت والاؒ ہندوستان سے چل نکلے، ساتھ صاحبزادہ سلمان سلمہ بھی تھے جن کو یوں بھی ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے، حضرت والاؒ دہلی سے براہ لاہور ۱۲ جون سنہ ۱۹۷۷ء کی صبح کراچی وارد ہوئے اسٹیشن پر بلا کسی اہتمام کے خاصا اثر دہام ”اھلا وسہلا مرحبا“ کہنے والوں کا ہو گیا تھا، اس میں عوام سے زیادہ علماء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہی تھے اور ان میں سے بعض تو عزم لئے ہوئے تھے اب سید العلماء کو واپس جانے نہیں دیں گے اور بہت سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت والاؒ ہجرت ہی کر کے آئے ہیں۔ یہ عقیدہ اس وجہ سے بھی لائیکل رہا کہ پریس والوں کے استفسارات کے جواب سے حضرت نے انکار فرمایا چنانچہ جب موٹر کار پر گھر تشریف لے جا رہے تھے تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی ہم نشین تھے، ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ پہلے اسمبلی تشریف لے چلیں اور بورڈ کی صدارت کو تحریراً قبول فرما کر پھر

شدائدِ ہجرت اور توکل و استغناء

ایک انسان سوچ سمجھ کر، خاکہ بنا کر ہجرت اختیار کرے تب بھی وہ مصائبِ شدائد سے بچ نہیں سکتا، چہ جائیکہ وہ چوندر روز کے لئے کہیں چلا جائے اور وہاں پہنچ کر اس کو بے وہم و گمان ترک وطن کی نیت کرنی پڑے اور اس بے سرو سامانی کے عالم میں قصد و ارادے سے اپنے سامان کو ٹھکرانا پڑ جائے، ایسے ہاجر کے شدائد کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے خصوصاً جب کہ وہ ہاجر، مہاجر الی اللہ اور عارف کامل ہو جس کی نظر ہر تکوینی تصرف و تغیر میں دست ازل کے ہر اشارہ کو صاف دیکھ رہی ہو اور اس کو عین لطفِ کرم جاتی ہو، وہ تو ہر افتاد پر ضربُ الْحَبِيبِ ذَبِيْنُہُ کی لذت سے کچھ ایسا سرشار ہو گا کہ نہ تو اس کو کسی کی ہمدردی کی پروا ہوگی اور نہ کوئی اس کے استغنا کو دیکھ کر صیح انداز بھی لگا سکے گا کہ وہ کن صبر آزمایا مراحِل سے گزر رہا ہے

حضرت سیدی وسید الملت قدس سرہ نے پاکستان کی سہ سالہ مدتِ شانِ توکل و استغناء سے گزار دی، جو کچھ چھوڑ آئے اسے اپنے ارتقائے روحانی کا محض مفخر خراج جانا اور اس پر کبھی رنج و ملال ظاہر نہیں فرمایا اور نہ اس کے معاوضہ کے متمنی ہے بلکہ اگر کوئی موقع ایسا آیا بھی تو اس سے بے رغبتی برتی۔ اسلئے میں نہرِ دیانت پیکٹ کے تحت بہار کے ہاجرین کو بہت سہولتیں دی گئیں تھیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے لوگ حضرت واللہ کو اصرار کرتے رہے لیکن غایتِ استغناء سے جواب انکار ہی کا عطا فرمایا چنانچہ اپنے عزیز سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”ہندوستان چھوٹے پر جانداروں مکان کی محبت دل سے نکل گئی۔

بلبل نے آشیانہ چین سے اٹھالیا اس کی بلا سے بوم بے یا ہمارے
اس کے بعد کا جملہ حضرت والاؒ کی عرفانی بصیرت کو جو توکل و استغناء کی علت تھی کستہر نمایاں
کر رہا ہے

”سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسوں میں طے ہو سکتی ہے
اس مہاجرت میں دم کے دم میں طے ہو گئی“

چھوٹے پر صبر کرنے والے پھر بھی ملیں گے، ٹھکر اکر مسکرانے اور شکر ادا کرنے والوں کی
مثال ملنا آسان نہیں۔ یہ حضرت والا جیسے عارف ربانی ہی کا حوصلہ تھا۔
یہ توسیلمانی استغنا کا پہلا منظر تھا، اب آگے قیام پاکستان کے بعد کے شدائد کا سہری
شمار اور ہر مرحلہ پر توکل و استغناء کا اعلیٰ مظاہرہ دیکھتے چلتے۔

معاشی پہلو سے | قیام پاکستان کے ارادہ کے بعد مسئلہ فکر معاش کا یقیناً پیدا ہوا،
بعض درسی اور تصنیفی اداروں نے پانچ سو اور ہزار روپیہ ماہوار
تک کی پیشکش کی مگر حضرت والا نے ہر ایسی صورت سے احتراز فرمایا کہ خانگی ملازمت
تمام عمر کبھی کی نہ تھی اور جانتے تھے کہ اس میں نباہ کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ اسی
طرح بعض تجارتی خدمت دین و ملت کی ایکسپس لے کر آئے اور حضرت والا کے ساتھ
ایسا ہی سودا کرنا چاہا جیسے پاکستان میں عام طور پر اور علماء کے ساتھ وہ کرتے ہی رہتے
لے اور مکان بھی کیا عالی شان ڈیڑھ جس کی تعمیر کے لئے لکڑی اور موزری اسباب اور مزدور اعظم لکڑھ
سے گئے تھے، اور حضرت نے اپنے حسن مذاق کی اس میں پوری رعایت رکھی تھی اور یہ سب اہتمام
اس نیت سے کیا تھا کہ آخری عمر میں خلوت گزری کو بی چاہے گا تو یہاں راحت حاصل رہے گی۔ مگر
قضا و قدر کی نگاہ میں یہ حویلی سلیمان ذی جاہ کے التفات کے لائق نہ تھی۔ اس لئے اس میں قیام کی
مہلت ہی نہ ملی۔

ہیں لیکن ایک ہی دو ملاقات میں ان کو یہاں مایوسی ہو گئی حضرت والا نے صاف فرما دیا کہ۔

بروایں دام بر سر رخِ دگر کہ عنقا را بلند است آشیانہ

پھر تادمِ آخران اربابِ خیر کی صورت دکھائی نہ دی۔

یہ صورتیں، اس لئے پیش آتی ہیں کہ حضرت علامہ نے بورڈ کی صدارت قبول نہیں فرمائی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ جو بات مراسلت کے ذریعہ تشنہ رہ گئی تھی وہ وزیر اعظم سے بالمشافہ بھی طے نہ پاسکی، یعنی شرائطِ تقرر اور تفصیلات کار کا تحریری تیقن!! البتہ زبانی وعدے بہت کئے جا رہے تھے اور اسی بنا پر اصرار پر اصرار تھا کہ جلد بورڈ میں شرکت فرمائی جائے مگر حضرت علامہ خوب جانتے تھے کہ جمہوری نظامِ حکومت میں شخصی اور زبانی تیقن کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ اس لئے اپنی بات پر جے رہے اور پورے سواد و برس بورڈ کی شرکت سے الگ رہے اور اس دوران میں ذرائعِ معاش کے فقدان کے باوجود توکل واستغناء اور وقار و کمند کی وہ مثال پیش فرمائی کہ اہل ثروت و اربابِ حکومت حیران رہ گئے دو وزرا نے تو اپنے سارے ذرائعِ تحسّس صرف کر کے اس شان بے نیازی کے سبب کی تلاش کی اور شرافتِ نفس اور غیرتِ دینی کے نادر محرکات کو پا کر عظمتِ سلیمانی کے اور زیادہ معترف ہو گئے۔۔۔ کردار کی یہی عظمت تھی جس کا لوہا خاص و عام اور دوست دشمن سب ہی مانے ہوئے تھے۔۔۔ ورنہ پاکستان آکر بہت سے نامی گرامی علماء و شیوخ نے حرص جاہ و مال کے جو کہ بہ مناظر پیش کئے ہیں اور اعلیٰ و اشرف علمی و روحانی عظمتوں کو جس قدر مخدوم کر دیا ہے، اس پر ان تک خون بہا کر بھی دل ہلکا نہیں کیا جاسکتا۔

لے مثلاً کس قدر افسوسناک بات ہے کہ اہل اقتدار نے "کتاب الحیل" کھولی بھی ہے جسمول دولت کی مکروہ شکلیں جن کو دینِ تودینِ لادینی معاشیات تک گھناؤنا سمجھتی۔ ان کو ادنیٰ جیلوں سے جبرجواز میں لایا جا رہا ہے۔ چوکائی کا لین دین، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکنگ۔ ہر غریب ایک جیل کے بعد

بہر حال اس سوا دو سال کی مدت میں حضرت والارہ کو سخت مالی دشواریاں پیش آئیں یہاں تک کہ مقروض ہو گئے، اور کیسے نہ ہوتے؟ وہ کوئی دردیش کنج نشین نہیں تھے، ربط ضبط عوام، اہل حکومت اور عمائد ملک سب سے قائم تھا، پھر ملنے ملانے اور رکھ رکھاؤ کا جو معیار تھا، وہ بھی قائم تھا، اہل و عیال کی ذمہ داریاں الگ تھیں — ایک مرتبہ راقم حقیر سے، شفقت خاص کی بنا پر فرمایا:

”مجھ کو تنگ دستی کا خیال نہیں آتا۔

ع چناں نمائد جنیں نیز ہم نخواہد ماند

مگر گھر میں چونکہ آج تک ہاتھ خالی نہیں رہیں

اس لئے ان کو پریشانی رہتی ہے!“

اس دوران میں احقر کی موجودگی میں ایک لیڈر مولانا ”حضرت کی خدمت میں آئے اور انہوں نے دو ہزار روپے کے نوٹ پیش کئے کہ فلاں صاحب نے مجھ کو بھی اتنی ہی رقم ہدیہ بھیجی ہے اور حضرت کو بھی! حضرت والارہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا ”اچھا“ اور وہ رقم لے کر فوراً زمانہ دروازہ میں کھڑے ہوئے، اپنی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادیوں میں ایک ایک سے دریافت فرمایا:

”بھئی یہ دو ہزار مولانا بدیہ لائے ہیں، تم کو ضرورت ہے؟“

ہر ایک نے بغیر ادنیٰ تاامل کے انکار کر دیا، اس سوال و جواب کو راقم بھی سُن رہا تھا، اور وہ مولانا بھی، اس کے بعد حضرت نے وہ رقم ان کو واپس فرمادی کہ

ابقہ حاشیہ صفحہ گزشتہ، بے عیب ہے اور یہ مسلک شکر متفق علیہ ہے۔

دوسری طرف جاہ پسندی کا نظارہ کرنا ہو تو شیخ الاسلام مولانا عثمانیؒ کی رحلت کے بعد کی تاریخ

ہی کے اوراق میں دیکھ لیجئے کہ جمیعت علمائے اسلام کی نظامت و صدارت اور اس سے بڑھ کر

”شیخ الاسلامیت“ (گویا یہ بھی ایک عہدہ تھا!!) اور ارباب حکومت کی نگاہ میں مقام پانے کے لئے

کیسی ریس بڑے بڑوں نے کھیل اور علم دین کے وقار کو کس بے دردی سے روند ڈالا؟ انا للہ ثم انا للہ۔

”مجھ کو تو حاجت نہ تھی اور آپ نے دیکھ لیا کہ گھر میں بھی کوئی لینے کو آمادہ نہیں اس لئے اس کو واپس فرما دیجئے“

استغنا کی یہ اعلیٰ مثال حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے بعد اور کس کس جگہ نظر آئے گی۔ ہر یہ دینے والے سے بے تکلفی نہیں، اس کی نیت کا حال معلوم نہیں جس ذریعہ سے بھیجایا اس کا اعتبار نہیں، آخر شریعت مقدسہ کے کس اصول کے ماتحت اس کو ”داؤد خداست“ سمجھ لیا جاتا پھر داد دیجئے اس تربیت کی جس کی وجہ سے گھر کے بچے بچنے لے لینا اس کو غیرت و محبت کے مغائر سمجھا،

ہاں ایک اور بات رہی جاتی ہے۔ حضرت والاؒ کا کچھ روپیہ ہندوستان میں جمع تھا جس کو اب یہاں منتقل کر دانا چاہتے تھے اور اس کے لئے حضرت کے پاس کئی محفوظ ذرائع موجود تھے مگر ایک ”لیڈر مولانا“ نے اس خدمت کا ثواب حاصل کرنا چاہا، اور اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حضرت والاؒ نے فرمایا ”یہ کام ان کے سپرد فرمادیا۔“ یاد ہو گا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بھارتی سکہ کی قدر پاکستانی سکے سے کافی بڑھی ہوئی تھی، اور تبادلاً زمیں بھارتی سکے کے عوض پاکستانی روپیہ زیادہ مل رہا تھا ”مولانا نے موصوف“ نے اول تو حضرت والاؒ کی رقم کا تبادلاً پرابو شرح پر طے فرمایا (اور یہ بھی انہی کا بیان ہے) پھر جب رقم منتقل ہو چکی تو کئی بار کے مطالبہ پر تھوڑا تھوڑا کر کے ادا فرمایا اور آخری قسط دو ڈھائی ہزار کم پر ختم فرمادی اور حساب تک نہیں دیا، گویا معاملہ حسن خدمت خود ہی وضع کر لیا۔ عاصم صاحب آخری ڈوکیٹ میں چاہتے تو یہ آسانی معاملہ صاف ہو جاتا مگر حضرت والاؒ نے سختی سے منع فرمادیا کہ اس میں ان کی اور ان کی وجہ سے طبقہ نکلا، کی امانت ہے، میں نے عرض کیا کہ کم از کم مجھے اتنی اجازت ملے کہ جن صاحب کے ذریعہ یہ رقم منتقل ہوئی ہے ان سے مل کر صحیح بات معلوم کر لوں کیونکہ ان سے میری

ملاقات ہے اور وہ واقعہ ایک ریندار اہل ثروت پر مگر خیرت والا نے اس پر بھی ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

”جب مجھ کو اس نقصان کی پروا نہیں تو آپ لوگ کیوں خواہ مخواہ اس کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اس قصہ کو بس یہیں ختم کر دیجئے ورنہ مجھ کو سخت تکلیف ہوگی!“

اللہ اللہ، یہ عالی طرفی اور یہ شان استغنا! کون دھونڈ کے تو دیکھے کہ زہد و اتقاء کی مسند بچانے والوں میں بھی کتنوں کو حاصل ہے؟

خیر، کہنا یہ ہے کہ باوقار معاشی صورتوں کے فقدان کی وجہ سے اور اہل و عیال کی آئندہ کفالت کا خیال کر کے حضرت والا کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ ایک علمی دینی مکتبہ قائم کیا جائے (اس خیال نے تقویت یوں بھی پائی کہ دارالمصنفین کی طرح ایک ادارہ کے قیام کی تجویز جو ذہن میں تھی جس کی تفصیل آگے آئے گی) اس کے لئے بھی ایک مکتبہ کی ضرورت تھی اسی مکتبہ سے وہ ضرورت بھی آسانی پوری ہو سکتی تھی اور گو یہ کام کثیر رقم کا طالب تھا لیکن اس میں سہولت کا پہلو نظر آیا کہ حضرت والا کی کافی رقم دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذمہ واجب الادا تھی، اس رقم کی منتقلی کی آسان اور مفید صورت یہی تھی کہ اس لاگت کی کتابیں خرید لی جائیں، چنانچہ یہی کیا گیا، مسجد باب الاسلام آرام باغ کے تحت جو دوکانیں بن رہی تھیں ان میں سے ایک کے لئے حضرت والا کے ایمار سے سلمان میاں نے درخواست دی اور دکان ملنے پر کتابیں منگوالی گئیں۔ اس طرح سے وہ مکتبہ قائم ہوا جس کا نام حضرت والا نے ”مکتبۃ الشرق“ تجویز فرمایا تھا۔

اس مقام پر بھی حضرت والا کے کردار کی عظمت کا یہ پہلو قابل دید ہے کہ وہ چاہتے تو ان کے ہلکے سے اشارے پر اچھی سی دکان نہیں ”عمارت“ الٹ ہو جاتی، لیکن وہ اپنے اشارے کنایہ کی قیمت سے آگاہ تھے، ان کی عزت نفس پر یہ بات بہت گراں تھی کہ شخصی

مفاد کے لئے کسی سے پوچھا جاتے وہ بالکل شیخ سعدی کے اس مسلک پر کاربند تھے کہ
 ہم رقعہ دو قسبہ والا نام کنج صبر کر مہر جامہ رقعہ برخواجہ گاہ نوشت
 آج "گلستان" پڑھانے والے تو پھر بھی مل جائیں گے مگر جن کو دیکھ کر خود گھستاں
 نظروں میں اتر آتے، ایسوں کا ملنا آسان نہیں اور یہ عقلا، عرفاء، کا متفقہ مسئلہ ہے کہ انسان
 "آکھٹے سے بنتا ہے نہ کہ کانٹے سے" !

فرق ماحول کے اعتبار سے | مادی نگار لیف سے کہیں زیادہ تلخ و تیسرے
 نفسیاتی آزاد ہوتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی جسم پر
 نہیں بلکہ دل و دماغ پر پڑتی ہے، حضرت دالہ رحمۃ اللہ علیہ کو ہجرت کے بعد یہ تلخ
 گھونٹ بھی پینے پڑے۔ وہ سستی جس کے عمر بھر کا مشغلہ ہر علم کی غواہی اور جوہر تحقیق
 کی برآمد تھا، جس کے علمی شغف پر آج بھی دارالمصنفین کے عظیم الشان کتب خانہ کی
 ایک ایک کتاب گواہ ہے جس کے ذوق جستجو نے مشرق اور مغرب کے سفر میں کتب خانوں
 کی چھان بین کو اولین اہمیت دے رکھی تھی، کراچی کے نوزائیدہ تجارتی شہر میں آکر اس کی
 حالت مایہ بے آب کی سی ہو گئی !! بار بار ارشاد فرماتے تھے کہ :

"کراچی نے مجھے جاہل بنا دیا، یہاں نہ کوئی اچھی لائبریری ہے نہ لکھنے پڑھنے
 کی کوئی جگہ، میرے لئے تو کوئی عمدہ کتب خانہ ہوا دریں اس میں بیٹھ کر
 کام کر سکوں !"

اس اضطراب اور ذہنی کوفت کو صرف وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کو نشان
 علم کے سوا کسی اور جگہ کی آب و ہوا اس نہ آئی ہو

لے بین محض اقوال زریں کسی کی تعمیر سیرت کا کام نہیں کر سکتے، میرت میں انقلاب جب ہی پیدا ہوتا ہے کہ
 کوئی صاحب کردار آنکھوں کے سامنے آجائے اور اس کی ایک ایک ادا دعوت صلاح پیش کرے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ہیں کیا یہی نفسیاتی امر موجود نہیں۔
 (حاشیہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

علمی ذخائر کی قلت کے علاوہ دوسری صبر آزمائچیزات رجالِ کار کا چھوٹ جانا تھا جن کی رفاقت میں عمر گذاری تھی اور اب خواہی نخواہی ان افراد کا ساتھ دینا تھا جن سے طبیعت و مذاق کو کچھ مناسبت نہ تھی۔ یہ کوئی حسنِ عقیدت کی تعبیر نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت علامہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو جن ہستیوں کے ساتھ مل کر علمی و دینی ملی و قومی اور اجتماعی اور اصلاحی کاموں کے مواقع حاصل رہے وہ علم و تحقیق، فکر و نظر اور تجربہ و کردار ہر لحاظ سے اس دور میں ہندوستان کی صفِ اول کی شخصیتیں تھیں، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا مدنیؒ، مفتی کفایت اللہؒ، مولانا محمد سورتیؒ، ڈاکٹر محمد اقبال، اس مسعود، مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزاد، گاندھی جی، موتی لال و جواہر لال نہرو، وغیرہ وغیرہ، انہی سے تو علم و حکمت اور سیاست کی پہلی صفیں قائم تھیں، اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بے پایاں عطا کا کرشمہ تھا کہ ہر جگہ میداں ملت کو امتیازی مقام حاصل تھا، دارالمصنفین میں نہ صرف علماء و فضلاء کا مرجع تھا، بلکہ رئیس دارالمصنفین کی جامع کمالات شخصیت نے اس کو مصالحن قوم و ملت اور عمائدین سیاست کی توجہات کا بھی مرکز بنا رکھا تھا، اپنے تو اپنے ہی پس، گاندھی جی، نہرو، مالویہ اور راجندر پرشاد تک وقت مقرر کر کے حضرت علامہ ندوی سے ملنے آیا کرتے تھے لے

غرض کہاں یہ ماحول تھا اور کہاں پاکستان آکر ہر شعبہ عمل کے ان افراد سے

(حاشیہ صفحہ سابق) لے جیسے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کہ وہ بھی کراچی آکر اس پے پینی کا سکار ہوئے تھے یا مثلاً مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کہ جب آئرم میں ڈاکٹروں نے کھنکھنے پڑھنے کی ممانعت کر دی تو مولانا نے اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ ان کیلئے اس سے زیادہ سخت کوئی پرہیز نہ تھا، اس لئے وہ اس پر قابو بھی نہ پاسکے۔ لے اس کی تفصیل تو مکمل سوانح سلیمانی کا موضوع ہے، البتہ تفصیلی اشارات اس وقت بھی حضرت والا کی تصانیف یا دفتر نگار، برید فرنگ اور سہرافغانستان سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور مزید مواد مکتب اقبال، مکتب ابوالکلام وغیرہ میں بھی موجود ہے!

واسطہ پڑا جو مذکورہ صدر شخصیتوں کے آگے شانوی حیثیت بھی شکل ہی سے رکھتے ہیں پھر ستم بالائے ستم یہ کہ انہیں میں وہ لوگ بھی تھے جو انقلابِ زمانہ سے فائدہ اٹھا کر چہرہ دروازوں سے چھپ چھپا کر، علم کی، تقویٰ و تقدس کی، قیادت و سیادت کی مسندوں پر آ بیٹھے تھے اور اب اس خود ساختہ بُرائی کے قیام و بقا کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو وقف کر رکھا تھا، ایسے ماحول میں آ کر حضرت والارہ کی شخصیت ”شاہدے درمیان کوراں“ کا مصداق بن گئی تھی ان لوگوں کی دانستہ و نادانستہ حرکات سے حضرت والارہ کو مسلسل اذیتیں پہنچتی رہیں، ہر بڑا، چاہتا تھا کہ حضرت علامہ اس کا ساتھ دے کر اس کے وزن کو بڑھائیں اور دوسرے کی طرف ان کی نظر التفات کبھی نہ پھرے! یہ بات ایک عالمگیر شخصیت، ایک بے غرض محبتِ ملت کے لئے کس قدر درد فرماتی!! حضرت کا مسلک ہمیشہ سے ملت کی ہی خواہی اور اس کی خاطر ہر کارِ خیر میں شرکت رہا، وہ تعاون علی البیڑہ کے لئے کبھی کسی ادارہ یا گروپ کے پابند نہ تھے، یہاں کی حلقہ بندی اور تحزب سے ان کو سخت صدمہ پہنچا، ایک مرتبہ ایسی ہی صورت سے دیگر ہر کو احقر سے فرمایا، اور یہ ان کی شفقتِ خاص کا ایک انداز تھا — کہ

”آپ نے مجھے ان لوگوں میں کہاں لاپھانسا“ لے

اور واقعی حرمِ دہرا اور نام و نمود کے ماحول میں کسی اہلِ اخلاص کا پھنس جانا بڑا ہی تکلیف دہ موقف ہے۔ صرف دو مثالوں سے جو منظرِ عام پر آچکی ہیں اسکا اندازہ لگائیے۔

لے اس میں میری ذاتِ حقیر کی اہلیت کا اشارہ نہیں بلکہ ایک نادانی پر تنبیہ ہے۔ میں نے کسی کی باتوں میں آ کر اور اپنے اصرار پر ایک عریفہ پورے آٹھ صفحات کا خدمتِ سلما نی میں کھا تھا اس میں پاکستان کے حالات کا نقشہ کھینچ کر یہاں حضرت کی تشریف آوری کی ضرورت کو شدت سے ثابت کیا تھا اور ماحول کی موافقت اور کام کرنے والوں کے اخلاص و طلبِ صادق کا بھی پورا پورا یقین دلایا تھا۔ یہ عریفہ حضرت والارہ اپنے ساتھ لائے تھے، کبھی کبھی ازراہِ لطف فرمایا کرتے تھے کہ کہاں ہیں آپ کے تیقنات؟

دو شرمناک مثالیں | غائبانہ ہی تھا، مگر عالمِ اسلامی کا سالانہ اجلاس پوئے

ترک و احتشام سے کراچی میں منعقد ہو رہا تھا، اس کے کرتادھرتا ایک "الازہر لٹی" تھے، اس اجلاس میں شرکت کے دعوت نامے اندرونِ ملک بھی تقسیم ہوئے اور بیرونِ ملک بھی دور دور تک بھیجے گئے۔

مگر علامہ سید سلیمان ندوی کو نظر انداز کر دیا گیا کہ آفتاب کا طلوع جنگنوی چمک کیلئے پیامِ فنا تھا، ————— خیر وقت پر عالمِ اسلام کی بعض ممتاز ہستیاں بھی آگئیں، ان میں ایک مفتی اعظمِ فلسطین سید امین الحسینی بھی تھے اجلاس شروع ہوا، مفتی اعظم کی نظریں متلاشی پاکر کسی نے وجہ دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ ہم کو تو یہ معلوم ہوا تھا کہ علامہ سلیمان ندوی آج کل کراچی میں ہیں مگر وہ یہاں نظر نہیں آرہے ہیں، بات ٹانے کو جواب یہ دیا گیا کہ رقعہ تو ان کی خدمت میں بھی گیا تھا نہ معلوم کیوں تشریف نہیں لائے۔ اب اس کو مفتی اعظم کی فراست کہنے یا کشف کہ انہوں نے جواب پر یقین نہیں فرمایا اور فوراً اٹھ گئے کہ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے، ان کو ہم لے آئیں گے۔ یہ کہتے ہوئے مفتی صاحب وہاں سے اٹھ گئے، کار لے کر حضرت والاؒ کی قیام گاہ پر پہنچے، مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی،

لے اونچے اونچے نامی اداروں کی نسبتیں جس بے باکی سے یہاں استعمال اور بے دردی سے پامال کی جا رہی ہیں اس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ یہاں کئی ہیں جو اپنے نام کے ساتھ (عثمانیہ) لکھتے ہیں حالانکہ جامعہ عثمانیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں بلکہ بعض تو میٹرک پاس بھی نہیں۔ بہت سے ہیں جو ندوی کہلاتے ہیں حالانکہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ندوہ میں دو ایک برس گزارے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے خود کو "دیوبند" کا فارغ التحصیل مشہور کر رکھا ہے، حالانکہ وہ صرف نائرسین دیوبند میں سے ہیں۔ یہ جمادات جب قریب کے اداروں کے ساتھ جانے پہچانے ماحول میں ہیں تو نصر، بغداد کے اداروں سے نسبت جوڑنا کیا شکل ہے۔ جن دفتریہ کے اس ماحول میں کسی کو کیا پڑی ہے کہ دوسروں کی حقیقت کھول کر خود کی عریانی کا سامان کرے یہاں تو انگریزی کی مثل صادق آتی ہے کہ "ایک حمام میں سب ننکے"۔ الحذر والعباد۔

گرم جوشی و اخلاص میں طرفین نے مسابقت کی کوشش کی، مفتی اعظم نے اجلاس میں شرکت نہ فرمانے کا سبب پوچھا؟ حضرت والا نے جو حقیقت تھی بتادی، مفتی صاحب نے فرمایا، جو کچھ ہوا، ہوا مگر آپ کے بغیر تو یہ اجلاس نہ ہوں گے، اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئے، خود صدر جلسہ تھے اپنے برابر بٹھایا۔ پھر دوسرے اجلاس کے لئے کرسی صدارت سپرد فرمادی، نتیجہ وہی ہوا، جس سے بانیانِ موقوفہ خائف تھے کہ سید الملت کے آنے سے ان کا نمود بے بود ہو کر رہ گیا، یا تو وہ نظر انداز کر دیئے گئے تھے یا اب وہ ہی وہ تھے مجدد شرف کامرکز اور فضل و کمال کا قطب تارہ!! ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء۔!

اس سے بھی زیادہ شرمناک اور ملک و ملت کے لئے المناک ایک اور سانحہ پیش آیا۔

حضرت والا کی بڑی تمنا تھی کہ دار المصنفین کی طرح ایک ادارہ کراچی میں بھی قائم ہو جائے اور قرآنی علوم کی ایک اعلیٰ درگاہ یہاں کھولی جائے اور اس کا ایک خاکہ ”انوار المصنفین“ اور مدرسہ دار القرآن کے نام سے حضرت والا نے تیار بھی فرمایا تھا (تفصیل آگے آئے گی) البتہ اس کی عملی تشکیل کے لئے جگہ اور مقام کا تعین ذہن میں موجود نہ تھا، اس کا سامان غیب سے یہ ہوتا نظر آیا کہ دفاتر معتمدی کے ملازمین کی ایک مرکزی کالونی کلیٹن کو ارد گرد کے وسط میں ایک خاصہ وسیع خطہ اراضی تھا، جس کے ایک گوشہ میں خس پوش مسجد تھی اور یہاں ایک وسیع مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بھی تھا، مسجد کمیٹی کے صدر ایک دیندار اعلیٰ عہدیدار جناب راحت علی رضوی (ڈپٹی ڈائریکٹر سول ایریشن) کو خوب سوچھی کہ حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچ کر مسجد کی سرپرستی کی درخواست پیش کی اور اس کو ”جامعہ مسجد سلیمانہ“ کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت چاہی۔ پہلی بات تو حضرت والا نے بلا تامل منظور فرمائی، دوسری تجویز سے محبوب ہو گئے، نظریں جھکائے جوئے بڑے تاثر سے فرمایا کہ اگر مسجد کا کوئی نام رکھنا ہی ہے تو ہمارے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ

کے نام پر ”جامع مسجد اشرفیہ“ رکھ لیجئے مگر راحت صاحب نے بڑی ذہانت اور حسن عقیدت سے عرض کی کہ حضرت تھانویؒ کی عظمت مسلم مگر ہم نے تو آپ کو دیکھتا ہے اور آپ کے عقیدت کش ہیں اور ہم کو آپ سے ایسی ہی عقیدت ہو جیسی خود آپ پر سنت مولانا تھانویؒ سے ہے ہم کو تو آپ ہی کے اسم گرامی سے منسوب کرنے کی اجازت عطا ہو۔ حضرت والا! اس اصرار پر خاموش ہو گئے اور خاموشی بمنزلہ رضا کچھ کر مسجد کا نام ”جامع مسجد میلانیا“ طے پائیا۔ اب مسجد کمیٹی نے باضابطہ دستور تیار کر کے اس کو رجسٹرڈ کرو لیا۔ جس پوش مسجد کو عارضی طور پر (۸۰x۱۰۰) گز کے چوتھے کی صورت میں وسیع کر کے اسپسٹانس کی چارروں سے اس کو مستقف کر دیا گیا، کیونکہ لوگوں کا رجوع روز افزوں تھا، حضرت والا نے مسجد سے ملحق ایک تصنیفی ادارہ کی عمارت کی ضرورت مسجد کمیٹی پر واضح فرمائی، کمیٹی نے حضرت والا کے مشورہ سے مسجد اور ادارہ کی دو منزلہ شاندار اور خوبصورت نمازوں کا نقشہ تیار کروایا اب صرف اس کی منظوری کا مرحلہ باقی تھا۔ ایسے میں کمیٹی کے دستور کے موافق سالانہ انتخاب کی تاریخ آگئی، خیال یہی تھا کہ حضرت والا کی سرپرستی اور افراد کمیٹی پر اعتماد کے ہوتے ہوئے یہ انتخابات محض ایک تکمیل باضابطہ کی صورت میں انجام پا جائیں گے۔ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ چیز مسجد کمیٹی اور حضرت علامہ کے عوام کے لئے طوفانِ حوادث ثابت ہوگی۔ مگر افسوس کہ ہوا ایسا ہی۔

ادبِ باب کمیٹی کا موقف قانونی اعتبار سے بالکل مستحکم تھا، انہوں نے قانونی چارہ جوئی اختیار کرنی چاہی مگر حضرت والا نے اس کو وقار اور لہجہ کے کیر خلافت سمجھا اور صبر کی تلقین فرمائی۔۔۔۔۔ ارشاد ہوا:

”سب کا جواب خاموشی ہے، آخر صبر کی تعلیم کس دن کے لئے ہے!“

مولانا محمود الغنی صاحب (خلیفہ حضرت مولانا تھانویؒ) جن کی نظروں کے سامنے یہ طوفانِ حوادث گذرا اور حضرت والا کے تحمل و ایثار کو جنہوں نے مشاہدہ فرمایا تھا۔

احقر سے فرماتے تھے کہ

”حضرت سید صاحب نے تو ٹھیک وہی کیا جو ان کے پیر و مرشد نے کیا تھا،
حکیم الامتؒ پر بھی مدرسہ کے سلسلہ میں (غالباً) تھانہ بھون ہی میں (ایک محلہ
ایسا ہی آیا تھا، تو حضرت بھی بلا تامل مدرسہ سے دست کش ہو گئے تھے اور
معرضین اور معاندین کے لئے جگہ خالی کر دی تھی“۔

مگر قوم کے علمی و تعلیمی نقصان کے اعتبار سے سوچئے کہ یہ واقعہ کتنا بڑا سانحہ ہے!!

تصویر کا دوسرا رخ ————— یعنی اعزاز و اکرام

شدائد ہجرت اور ماحول کی تلخیوں کے تذکرہ کے بعد انصاف کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی جو قدر و منزلت رہی اور خواص و عوام نے زہرہ شناسی کا جو ثبوت دیا اس کو کبھی بیان کر دیا جائے۔

حضرت والا کی آمد کا شدید انتظار
جمعیتہ علمائے اسلام کی طرف سے استقبال

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ذاتِ سلیمانی ہی سب کی نگاہوں کا مرکزِ جاذبہ بنی ہوئی تھی چنانچہ جب وہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جمعیت ہی کی طرف سے حضرت والا کے اعزاز میں ایک جلسہ استقبال منعقد کیا گیا، جس میں علمائے کرام اور عزیزین شہر کے علاوہ بلادِ اسلامیہ کے تمام سفراء شریک تھے۔ یہ اجتماع نگاہِ ہوٹل کے وسیع ہال میں منعقد ہوا تھا، مہانوں کی کثرت سے برآمدے تک بھرے ہوئے تھے۔ میر مجلس کے جلوہ فرما ہونے پر جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ظاہر قاسمی کی تلاوت قرآن کے بعد مولانا محمد عیسیٰ ندوی نے عربی زبان میں خطبہٴ استقبالیہ پیش کیا۔ پھر سفیرِ حجاز محترم خطیب عبدالحمید اور سفیرِ مصر محترم عزام بے نے تقریریں کیں، ان کے علاوہ بعض اور حضرات نے بھی اس میں حصہ لیا، ہاں ایک عالم نے عربی میں ایک قصیدہ بھی پیش فرمایا۔ اس کے بعد حضرت علامہ استادہ ہوئے اور عربی زبان ہی میں آدھ گھنٹہ تک فی البدیہہ ایک تقریر فرمائی جس میں بانیانِ جلسہ اور مفرارِ بلادِ اسلامیہ کا شکریہ بھی ادا فرمایا اور اتحادِ ملت کی ضرورت و اہمیت بھی واضح فرمائی۔

صدارتِ جمعیتہ کی پیشکش | عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے

بعد جمعیت کی صدارت پر نہ ہو سکی تھی، حضرت علامہ کی خدمت میں یہ اعزاز پیش کیا گیا، مگر حضرت نے اس سے اس اظہارِ حقیقت کے ساتھ انکار فرمایا،

”پولٹیکس بڑی گندی چیز ہے، میں نے کبھی اس خرقہ سے آلودہ کو از خود نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا، کبھی شوکت علی نے اور جب کبھی کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا۔“

حافظِ خود نہ پوشیدارینِ خرقہ سے آلود

لے شیخِ پاک دامن معذور دارِ مسارا“

بات واقعی یہی تھی کہ حضرت والاؒ اپنی افتادِ طبع، فطرتِ صالحہ اور مذاقِ اعلیٰ کے اعتبار سے خالص علمی و فکری رہبری کے لئے موزوں تھے آج کی مروجہ سیاست خواہ وہ ”جمعیت العلماء“ ہی کی کیوں نہ ہو، ان کی طبعِ لطیف پر نہایت گراں تھی، چنانچہ ایک مرتبہ ایک سیاست زدہ کو مخاطب کر کے فرمایا بھی تھا کہ:

”ڈپلومیسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو اس کو دیانت دار تسلیم کیا جائے اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو دیانتدار اور اچھا سمجھا جائے اور پھر اس کی اگر بددیانتی ثابت ہو تو اس سے قطعِ تعلق کر لیا جائے۔“

ایک طرف مسلک کی یہ پاکیزگی اور دوسری طرف ضعفِ قوی کی وجہ سے اب حضرت والاؒ پبلک پولٹیکس کے لئے واقعہً موزوں نہ رہے تھے، چنانچہ مزاحاً یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

”مجھے چیمبر پر کیٹس تو آتی ہے پبلک پر کیٹس نہیں آتی“

اس سب کے باوجود علمائے کرام صدارت قبول کرنے پر اصرار کرتے رہے جب

بعض قابل اعتماد حضرات نے بھی اس کو رنج انتشار کا واحد حل قرار دیا اور تعاونِ عمل کا وعدہ فرمایا تو حضرت والا نے اواخر ۱۹۵۲ء میں جمعیت کی صدارت منظور فرمائی اور تا آخر حیات اس کے صدر رہے۔

علماء کی انفرادی قدر شناسی | اس اجتماعی عزت و منزلت کے علاوہ پاکستان کے ہر مکتب خیال کے علماء نے عموماً اور

علمائے دیوبند نے خصوصاً حضرت والا کی عزت و مرتبت کا پورا الحاظ رکھا، جس غفل میں وہ مدعو ہوئے، مسندِ صدارت ان کے لئے خاص کر دی جاتی، پاکستان کی کوئی اہم دینی درس گاہ ایسی نہ تھی، جس نے اپنے دستار بندی و تقسیم اسناد کے جلسوں میں حضرت والا کو خاص طور پر مدعو نہیں کیا۔ مشرقی پاکستان سے مولانا اطہر علی صاحب وغیرہ نے ہمیشہ ہاضمہ بلایا، مگر دوریِ مسافت اور خرابیِ صحت کی وجہ سے حضرت والا عذر فرماتے رہے۔ مغربی پاکستان کے مدارس میں البتہ ہر جگہ تشریف لے جاتے تھے۔ دارالعلوم کراچی، دارالعلوم ٹنڈوالیار، خیر المدارس ملتان، جامعہ اشرفیہ لاہور مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی وغیرہ کا کوئی سالانہ جلسہ ایسا نہیں ہوا جس میں حضرت والا نے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ شرکت نہیں فرمائی اور یوں تو گوہرِ مدرسہ کے بانی نے سید العلماء کے احترام کا شرف پایا مگر جامعہ اشرفیہ کے شیخ عالی مقام پر کوئی سبقت نہ لے جاسکا، حضرت مفتی صاحب مدظلہ اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ نجی صحبتوں میں بھی مسندِ خاص پر حضرت والا کو بٹھاتے نماز فجر کے بعد روزانہ حضرت والا سے درسِ تفسیر سارے علماء و طلباء کے ساتھ سنتے اور درس کے مطالب و حسنِ تعبیر پر بڑے ذوق و شوق سے دوسروں کو متوجہ فرماتے جاتے تھے۔

حضرت والا کی خاطر و متحر خوان اس قدر پُر تکلف چنا جاتا کہ جیسے کسی امیر کبیر کی طرف سے اہتمام ہوا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت والا نے فرمایا بھی کہ:

”میری غذا تو بہت مختصر ہے حضرت اس قدر اہتمام کیوں فرماتے ہیں۔“

تو حضرت مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ:

”کہ یہ تو محض حضرت کا اکرام ہے۔“

راقم، ہیچران نے شیوخ و علمائے پاکستان میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے زیادہ حضرت دارالار کا قدردان و مداح کسی اور کو نہیں دیکھا۔ حضرت مفتی صاحب نے کراچی کی پہلی ہی ملاقات میں یہ عہد حضرت دارالار سے لیا تھا کہ لاہور جب کبھی اور کسی سلسلہ میں بھی آنا ہو تو مہمانی کا شرف انھیں کو حاصل رہے، چونکہ لاہور میں حضرت کے قدیم احباب اور قدر شناسوں کی تعداد کافی تھی، اس لئے حضرت دارالار نے فرمایا کہ شاید ہمیشہ قیام ممکن نہ ہو سکے مگر پھر حضرت مفتی صاحب کے اصرار اور ان کے اخلاص، احترام اور تقدس کے پیش نظر حضرت دارالار نے وعدہ فرمایا

پیشین ”کو تار و زپیس“ نباہ لے گئے۔ اور اس وعدہ

۱۹۵۱ء میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس ہسٹاریکل سوسائٹی کی رکنیت کی طرح پاکستان میں بھی ایک آل پاکستان

ہسٹاریکل سوسائٹی قائم ہوئی حضرت علامہ اس کے مایہ ناز رکن بنائے گئے اور مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کے پہلے اجلاس منعقدہ کراچی کے شعبہ تاریخ اسلام کی صدارت فرمائی، اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں سوسائٹی کے جنرل سشن (عمومی اجلاس) منعقدہ ڈھاکہ کی صدارت کو زینت بخشی۔

لے عارف شیراز کا شعر ہے۔

آں نیست کہ حافظ را ہر شش رود از خاطر

آں وعدہ پیشینش تار و زپیس باشد

یہ اس اجلاس کے خطبہ صدارت میں بنگلہ زبان کے رسم الخط کی تبدیلی پر حضرت دارالار نے زور دیا تھا تاکہ پاکستان کے سب صوبے باہم قریب تر ہو سکیں۔ اس تجویز کی گہرائی کو پاکستان کے دشمن عناصر

یونیورسٹی سنیٹ کی رکنیت | اسی طرح ۱۹۵۲ء میں جب کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو حضرت علامہ کو اس کی سنیٹ کا ممبر بنادیا گیا اور مجوزہ شعبہ اسلامیات کی صدارت بھی پیش کی گئی، مگر علامہ نے صحت کی خرابی اور ضعف کی بنا پر اس کو قبول نہیں فرمایا۔

بیرون ملک اکرام | اندرون ملک کے علاوہ بیرون ملک سلیمان ڈی جاہ کے اعزاز و اکرام کا سلسلہ آخر دم تک قائم رہا۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں حکومت عراق نے حکیم یونعلی سینا کی الفی تذکار (ہزار سالہ ہستی) بٹسنے ترک و احتشام سے منائی، پاکستان سے حضرت علامہ کو بطور خاص شرکت کی دعوت آئی، حضرت والا جانانہ چاہتے تھے، اس لئے خوش اسلوبی سے ملتے رہے، مگر سفارت خانہ عراق کی طرف سے

(بقیہ حاشیہ پہنچ گئے، اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء نے ہندوچندیسروں کا آؤٹ کالین کر علامہ کے خلاف نہایت تہذیب شکن مظاہرہ کیا۔ آپ کی موٹر جس میں آپ تنہا تشریف لے چاہے تھے، ہیسکروٹوں طلبہ نے گھیر لی اور اپنی تجویز واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ بنگالی مسلمان طلباء کے ماتھے پر یہ کلنگ کا ٹیکہ ہے کہ انہوں نے ایسے محترم و محسن بزرگ کے ماتھے پر سلوکی کی، مگر اس شرے شیر ہی نمودار ہوا اور ہونا بھی چاہیے تھا کہ صاحب اخلاص ہستیوں کی ظاہری شکست سے بھی سو کا مراتب پیدا ہوجاتی ہیں چنانچہ اس ہنگامہ کا رد عمل یہ ہوا کہ مولانا اطہر علی صاحب اور دوسرے علماء و علمائے جگہ جگہ جلسے کر کے اس کی مذمت کی اور حضرت علامہ کی تحریک کی تائید اس زور و شور سے ہوئی کہ بعض گوشوں سے اس کے مطابق علی اقدام فوراً شروع ہو گیا اور جگہ زبان کے بعض جرائد عربی رسم الخط میں چھپنے لگے۔ سچ کہا ہے یاسن

مرحوم نے

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خون کھیریں جہاں ساغرِ نیک دیں چشمہ زمزم اُلتا ہے
لہذا تم حیرے فرمایا کہ میں نے بڑی سینا کے فلسفہ کا رد کیا ہے اور اب بھی اس کو غلط سمجھتا ہوں۔ اہل عراق اس کا ہزار سالہ جشن منا رہے ہیں جشن کا مقصد ہی شخصیت کی تعریف و توصیف ہوتا ہے ایسی صورت میں وہاں جا کر کیا حصہ لے سکوں گا بعد میں امراریا دہونے پاس شرط کے ساتھ شرکت کا وعدہ فرمایا کہ کوئی مقالہ نہ پڑھیں گے۔

یہ ہم اصرار پر پھر وعدہ فرمایا مگر انجام کار تشریف نہ لے جاسکے کیونکہ وزیر تعلیم حکومت پاکستان مصارف سفر پر سودا کرنا چاہتے تھے جس کو حضرت والاؒ کی حمایت کبھی بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

عالم اسلام کا اعلیٰ علمی اعزاز | مصر میں ایک لغوی اکاڈمی "مجمع نواد الاول" قائم ہے جو ممالک عرب بلکہ کل عالم اسلام کا سب سے عظیم الشان علمی ادارہ ہے ۱۹۵۲ء کے آغاز میں اس اکیڈمی نے حضرت علامہ کو اپنا "عضو" (رکن) منتخب کیا۔ یہ اعزاز برصغیر پاک و ہند میں بقول مولانا مسعود عالم حرم اس سے پہلے کسی اور کو نہیں ملا تھا۔

حضرت والاؒ کی بعض خدمات

۳۱ علماء کی کمیٹی | حکومت پاکستان نے دستور سازی کے سلسلہ میں بنیادی اصولوں کی ایک کمیٹی قائم کی تھی، اس نے اپنی رپورٹ ۱۹۵۷ء میں شائع کی جس میں بورڈ تعلیمات اسلامی کی سفارشات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا ضروری تھا کہ پاکستان کے ہر مکتب خیال کے علماء کو جمع کر کے اسلامی دستور و آئین کا ایک متفقہ خاکہ حکومت و عوام کے سامنے پیش کر کے علماء اپنی ذمہ داری سے عہدہ براہوں چنانچہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں حضرت والاؒ کی رہبری اور صدارت میں ۳۱ علماء کا ایک اجتماع کراچی میں منعقد ہوا جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ علماء نے شرکت کی اور تین دن کی کوشش میں ایک دستوری خاکہ تیار کر دیا، علماء کے اس متحدہ کارنامے پر اہل حکومت حیران تھے اور سب نے یہ اعتراف کیا کہ یہ کارنامہ

حضرت علامہ کی مرکزی شخصیت کا زمینِ امت ہے چنانچہ حضرت علامہ کے نام مبارک باد کے برقیوں اور خطوں کا اتنا بندھ گیا تھا ————— یہی وہ ایٹم بم تھا جس نے حکومت کی رپورٹ کو تباہ کر دیا۔

علمائے کرام پر حضرت والا نے جس طرح کنٹرول (قابو) رکھا اس کا لطیفہ بھی قابلِ شنید ہے۔ اجلاس کے ختم پر حضرت مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ کی قیام گاہ پر ایک نجی محفل میں اس کا ذکر آ گیا تھا، راتم حقیر بھی وہاں موجود تھا، حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ :

”آج حضرت سید صاحب نے علماء کو خوب تھنجوڑا، جب حکومت کی رپورٹ پر تنقید شروع ہوئی تو فرمایا کہ یہ عوام کا نہیں علماء کا اجتماع ہے اور حضرات علماء کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے جن حضرات نے اس رپورٹ کو پڑھا اور اس پر غور نہ کیا ہو ان کو اظہارِ خیال کا کوئی حق نہیں پہنچتا ————— چنانچہ اس کے بعد صرف ان ہی حضرات نے اس بحث میں لیا جو اس کے لئے تیار ہو کر آئے تھے، اس طرح کام بہت تیزی سے ہوا۔“

لاکیشن کا قیام | حضرت والا کا دوسرا کاننام لاکیشن کا قیام ہے حضرت والا کی نظر بڑی غامض تھی، وہ اربابِ فکر سے فرمایا کرتے تھے کہ تنہا دستور سے نہ تو مملکت اسلامی بن سکتی ہے نہ اس میں کوئی انقلابی شان نمایاں ہو سکتی ہے انقلاب تو جب پیدا ہوگا کہ وہ قانون جس سے رعایا شب و روز دوچام ہوتی ہے اسلامی بن جائے یہی نکتہ حضرت والا نے لیاقت علی خان مرحوم کو بھی سمجھایا اور حضرت کو خوشی ہوئی کہ وہ اس کی گہرائی کو پا گئے چنانچہ ۱۹۵۷ء کے اواخر میں وزیر اعظم مرحوم نے لاکیشن کا اعلان کیا، جس کے تین اراکان جسٹس رشید حبیبس مین اور علامہ سید سلیمان ندوی قرار پائے

اس کمیشن کا فریضہ یہ تھا کہ مروجہ قانون پر نظر ثانی کر کے اس کو محدود و شرع کے مطابق ڈھالا جائے۔

یہ حضرت علامہ کا ایک ٹھوس کارنامہ تھا اور اسی کے بعد علامہ نے بورڈ تعلیمات اسلامی میں بھی شرکت فرمائی کہ اب ایک مستقل کام کی صورت نکل آئی تھی۔ اس کمیشن کے قیام کے بعد حضرت والدہ نے اس خیال سے کہ قانون اسلامی کی تمام تر ذمہ داری تنہا انہی پر عائد نہ رہے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے لاکیشن میں لئے جانے کا تحریک فرمائی اور اس کو منوالیا، — یہ حضرت والدہ کے احساس ذمہ داری اور حزم و احتیاط اور خشیت و تقویٰ کی ایک کھلی نشانی ہے۔

مولانا مفتی صاحب ممدوح سے احقر نے کئی بار سنا کہ لاکیشن میں حضرت والا کی شخصیت اس قدر وقیع اور وزنی تھی کہ ان کے چند جملے تجوں کو ساکت اور مطمئن کر جاتے تھے، ساتھ ہی نفس جواب کی اصابت و ایجاز کے بھی مفتی صاحب بہت مداح ہیں۔

احتفال علماء حضرت والدہ مالک اسلامیہ کے ربط و اتحاد کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے، اور ایسے باہمی رابطہ کے جوہاں تھے جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ بنیاد پر موصوف بن جائے اس کے لئے وہ ان ممالک کے مشاہیر علماء اور مفکرین کا اتحاد از بس ضروری سمجھتے تھے اور اپنے اس خیال کا اظہار اجتماعی کارکنوں کے سامنے اکثر فرمایا کرتے تھے چنانچہ بعض حضرات اس کام کیلئے مستعد ہو گئے حضرت والدہ نے "احتفال علماء اسلام" کے نام سے بلا دار اسلامیہ کے مشاہیر علماء کے نام اپنے دستخطی دعوت نامے جاری فرمائے۔

اس احتفال کا پہلا اجلاس ۱۴ فروری ۱۹۵۲ء کو دار الخلافہ کراچی میں عالیشان عمارت پر منعقد ہوا، بلا دار اسلامیہ کے اکثر اکابر علماء شریک اجلاس رہے، عراق کے علم اُدھر حکومت کی طرف سے خلیفہ شجاع الدین کو کمیشن میں شامل کیا گیا۔

مقبول ترین عالم محمد امجد زہاوی اور دوسرے مجاہد عالم محمد محمود صواف، ایران کے مشہور شیعہ عالم کاشف الغطاء اور فلسطین کے مفتی اعظم محمد امین الحسینی، اس اجلاس سے قبل ہی کراچی پہنچ چکے تھے، اور سب نے یہی کہا کہ دعوت نامہ پر دستخط جس ہستی کے ثبت تھے اس کو دیکھ کر عذر کی گنجائش نہ تھی، ان کے علاوہ پاکستان کے اکثر اور ہندوستان کے بعض علماء اور بلاد اسلامیہ کے تمام سفراء شریک رہے، البتہ الجزائر کے نامی گرامی عالم و خطیب دادیب محمد البشیر الابراہیمی وقت پر تشریف نہ لاسکے بلکہ احتفال کے بعد کراچی پہنچے۔

احتفال کے اجلاس تین دن (۱۳-۱۵-۱۶ فروری کو) ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے، دوسرے کی مفتی اعظم فلسطین نے اور تیسرے کی جہان تک خیال پڑتا ہے ایرانی عالم کاشف الغطاء نے فرمائی۔ ان اجلاسوں کی کارروائی عربی زبان میں انجام پائی جو ملت اسلامیہ کی مشترک اور دینی زبان ہے۔

اس "احتفال علمائے اسلام" کی افادیت خود حضرت والارہ کی زبانی سنئے، ایک مکتوب میں اپنے شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو تحریر فرمایا ہے:

"میرے نزدیک تو علمائے اسلام کا یہ اجتماع بجائے خود ایک تاریخ تھا حضرت شیخ کو اکی نے سجل جمعیتہ المصطفیٰ میں جو خواب دیکھا تھا اس کی حقیقت یہاں عیاں تھی، اگرچہ اس بنا پر کہ یہ پہلا اجتماع تھا ناقص تھے، تاہم افادہ سے خالی نہ رہا، خصوصاً ایران و خجف کے علماء کی آمد سے مذاہب مختلفہ کے درمیان ایک خوشگوار حد تک ملواری و فرق کی راہ میں منزل طے ہوئی۔"

مگر اس کام کو انجام دینے کے لئے حضرت والارہ کو بے حد تعب اور ذہنی کلفت اٹھانی

پڑی، بعض مقامی علماء کی خود غرضیوں اور جاہ پسندیوں اور جذبہ مسابقت کی وجہ سے قدم قدم پر جو رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں اور ان کو دور کرنے میں حضرت والا رحمہ کو جن قوتوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کی بنا پر وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ

”یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے اجتماعی کام کی صلاحیت جاتی رہی ہے، خود غرضی، نام و نمود اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ کوئی اجتماعی کام مشکل ہے۔“

چنانچہ اس کے بعد پھر حضرت علامہ نے نہ کوئی اجتماعی مہم اٹھائی نہ لوگوں نے ان کی عالمگیر شخصیت اور خدا داد فراست و صلاحیت سے کچھ فائدہ اٹھایا، دیکھنے کی بات ہر واقعہ میں یہ ہے کہ سارا نقصان نفس کی کھوٹ سے ہے اور ہر نفع کا مدار نفس کی پاپا کی پر! — قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى!

مدرسۃ القرآن اور دائرۃ المصنفین | حضرت علامہ کی آرزو تھی کہ قدیم درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلباء

اور جدید کالجوں کے ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ طلباء جنہوں نے عربی یا اسلامیات میں ایم اے کیا ہو اور جن کو علوم دین سے شغف بھی ہو، ان دونوں قسم کے طلباء کو ملا کر ایک باضابطہ درس کا سلسلہ قائم کیا جائے جس میں صرف علوم قرآنی کی اعلیٰ تعلیم ہو اور کلام اللہ سے استفادہ کے طریقوں کی تفہیم کی جائے۔ دوسری آرزو یہ تھی کہ دار المصنفین (اعظم گڑھ) کی طرح کراچی میں بھی ایک اعلیٰ تصنیفی ادارہ قائم کیا جائے تاکہ صحیح اور مستند اسلامی لٹریچر سے قوم کو بہرہ مند کیا جاسکے، حضرت نے اس کا ایک خاکہ بھی بنایا تھا اور اس کے ارکان کی ایک فہرست بھی تیار کر لی تھی جس میں علماء اور جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کا ایک خوش آئند امتزاج تھا۔ مگر سب سے بڑی رکاوٹ

لہ اس فہرست کے یہ چند نام ہیں جو اس وقت ذہن میں ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا غفر احمد عثمانی

اس سلسلہ میں جگہ اور عمارت کی تھی مسجد سلیمانہ کے قیام، اس کی متعلقہ وسیع اراضی کے پیش نظر یہ دونوں تمنائیں پوری ہوتی نظر آرہی تھیں، اور حضرت والا پوری گرجبوشی سے اس جانب متوجہ تھے، مگر بُرا ہوا اہل ہوا وہوس کا کہ یہ کاخِ خیر بھی ان کے ہاتھوں مسدود ہو گئے۔۔۔۔۔ اب حضرت والا کی وہ عمر اور قوی میں وہ استقامت تو نہ تھا جس کے ساتھ ایسے کاموں کی بنیاد رکھی جاتی اور راستہ کے ہر سنگ گراں کو پاش پاش کیا جانتا ہے۔ یہ توانائی وہ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی تاسیس میں صرف فرما چکے تھے!!

نشر فیض

اب تک حضرت والا کی جو خدمات گنائی گئیں، ان کا تعلق مسلمانوں کی عمومی اصلاح سے ہے۔ گوان کا محرک محض امت اسلامیہ پر شفقت اور محبت کا جذبہ تھا جو ایک باطنی خلق ہے اور خلق بھی وہ جو "سلوکِ نبوت" کے رہروں کے لئے مخصوص ہے، مگر نگاہِ ظاہر میں چونکہ صرف مظاہر کو دیکھتی ہے اور انہی پر حکم لگاتی ہے اس لئے ایسی صاحبِ اخلاص ہستیوں کے کارناموں اور قائدینِ قوم کے کاموں میں وہ امتیاز نہیں کر سکتی، اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ حضرت والا کی مذکورہ خدمت اصطلاحی "ملی خدمات" میں شمار کی جائیں اور مصنف حقیر پر اعتراض ہو کہ ان کا ذکر اس کے موضوع سے خارج تھا خیر اب ہم خاص طور پر حضرت والا کے اس کارنامہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو انفرادی نفع نام یعنی تزکیہ اور باطنی تربیت کی صورت میں جاری رہا۔

بھوپال میں اور کراچی کے دورانِ قیام میں حضرت نے عصر و مغرب کا دینیاتی وقت خاص طور پر ان تشنہ کاموں کے لئے وقف فرما رکھا تھا جو اپنی باطنی پیاس بجھانا چاہتے ہوں اور محبت و معرفتِ الہی سے سرشار ہونا چاہتے ہوں، اس روزانہ کی

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) مولانا مفتی محمد شفیع مولوی محمد شفیع (اور نیٹل کالج لاہور) ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی وغیرہ۔

محل کا جو رنگ تھا اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا، یہاں یہ بتانا ہے کہ یہ وقت تو خاص اسی کام کے لئے تھا، مگر اس کے علاوہ سفر حضر میں بھی طالبین اور سالکین کا رجوع برابر قائم رہتا تھا اور کراچی کے بعد لاہور اس حیثیت سے خاص تھا، — ایک مثال سے حضرت کے فیض جاریہ کا اندازہ ہوگا۔

لاکیشن میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے جایا کرتے تھے، دفتر کے ایک چپراسی نے اپنی بعض خانگی پریشانیوں کا ذکر کر کے دعا اور تلقین دعا کی درخواست کی، حضرت والا نے اس کے لئے بھی دعا فرمائی اور خود اس کو بھی کوئی دعا قلا دی، دوسری با جب لاہور تشریف لے گئے تو اس چپراسی نے فرط مسرت اور عقیدت سے قدم پکڑ لئے اور بتلایا کہ ساری الجھنیں رفع ہو گئیں۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ حلقہ ارادہ میں داخل کر لیا جائے۔ حضرت والا نے خلاف معمول فوراً اس صاحبِ اخلاص کو بیعت فرمایا، اور اس پر اس درجہ مسرور تھے کہ جب کراچی تشریف لائے اور یہ ناکارہ خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو پہلی بات یہی ارشاد فرمائی اور اس انداز سے کہ سننے والے کو اس درویشِ دل چپراسی پر رشک آگیا،

اہل جہان کے نقطہ نظر سے اس "عامی" کے بعد ایک دوسری مثال اہل تخصیص کی بھی سنئے، راقم حضرت والا کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شہرِ مہر عالم اور صاحبِ اجازت بزرگ تشریف لائے، سلام و مصافحہ کے بعد کچھ دیر تو خاموشی رہی، پھر ان عالم نے فرمایا کہ "حضرت اضطراب نہیں ملتا، دل ہمیشہ چین رہتا ہے!" حضرت والا نے بچی نظر کئے تشریف فرما تھے، ان جملوں کو سن کر حضرت والا کی نظریں ان کے چہرے پر جا پڑیں اور زبانِ فیض سے کلام اللہ کی صرف یہ پانچ لفظی آیت پاک بڑے اثر و گداز سے نکلی۔

"الابد کر اللہ تَطْمِئِنَّتِ الْقُلُوبُ!"

زنگوں سے بھی بعض طالبین کے خطوط آیا کرتے تھے، یہ وسعت فیض روز افزوں رہی اور اسکی عظمت اور بڑھ جاتی ہے جب زندگی کی اس مختصر مہلت کو پیش نظر رکھا جائے جو خلافت باطنی کے بعد حضرت والاؒ کے حصہ میں آتی۔

حضرت اقدس کی وسعت فیض کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ غیر سلسلوں کے سالک بلکہ شیوخِ سنیہ کو بھوپال اور کراچی میں حضرت کی خدمت میں آتے اور مستفیض ہو کر لوٹتے خود اپنی آنکھوں نے دیکھا، حضرات نقشبندیہ کو خصوصیت سے حضرت والا کی طرف کشش تھی اور خود حضرت کو بھی اس سلسلہ عالیہ کے حضرات سے خاص انس تھا، بہر حال ”متمجد جانِ مردانِ خدا“

کے مناظر بھی حضرت والاؒ کی بابرکت صحبتوں میں دیکھے ورنہ آج کل تو افتراق سے صوفیا کی مجالس بھی خالی نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اسی وسعت فیض کے باوجود حضرت والاؒ نے اس عاجز و معجز کے سوا کوئی خلیفہ نہیں چھوڑا، حالانکہ بھوپال، حیدرآباد اور پاکستان کے بعض علاقوں میں ان کے دستِ گرفتہ ایسے ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آئے جو تقویٰ و طہارت اور ان میں سے بعض فنِ وانی کے اعتبار سے بھی شاید اور جگہ خلافت کے ہر طرح مستحق ٹھہریں۔

مے دہنِ مہلِ مقدر کے طور پر بھی اور دہنِ مہل کی نیت سے بھی یہ وضاحت یہاں ضروری ہے کہ اپنی بے بضاعتی اور اس سے بڑھ کر ”تنہا تو فی“ اب جس استثنیٰ کا اظہار ہوا ہے اس کو چھپائے رہی اور چھپائے ہی کتنی معجز حضرت مرشدی کے وصال کے آٹھ نو برس بعد بعض بزرگوں خصوصاً حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ جیسے انتہائی محتاط پیر طریقت کی طرف سے خلافت کی نوازش (جو نہ پہلے کسی پر ہوئی تھی نہ بعد میں) ہوئی تو یہ خاکِ پلے سلیمان عجب شکل میں پڑ گیا تو اب قبل خلافت سلیمانی کو چھپا کر یا چھوڑ کر کسی اور بزرگ کی نسبت سے خود کو اس منصب کا حامل بتلانا ممکن ہی نہ

رہا۔ سرپا شفقت شیخ اقدس کی ۱۹۵۲ء ہی سے تاکید ہی تھی کہ

”یہ چیز اپنی ہی حد تک کب تک رہے گی اس کو دوسروں تک پھیلا نا چاہئے۔“

پھر مرض الموت سے قبل یہ وصیت فرمائی کہ

”میرے بعد اپنے ساتھیوں کا خیال رکھنا۔“

اور میری اس عرض پر کہ میرے پلے تو کچھ بھی نہیں، یہ ارشاد کہ

”مجھ کو کچھ دینا تھا دے چکا۔“ (تفصیل زیر عنوان ”کلمہ آخر“ پہلے ہی سے موجود ہے)

اتنی تصریحات کے باوجود احتیاطاً اپنی شکل کو بے کم و کاست محدث جلیل حضرت مولانا عبدالرحمن کامپلوریؒ (جو حکیم الامت کے اجل خلفاء میں سے تھے) کی خدمت میں پیش کر کے قول فیصل کی التماس کی، جواب ملا کہ اپنے شیخ اقدس سے خلافت صریح ہے اور دوسرے بزرگوں کی خلافتیں تائیدی و تائیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ فالمننت للہ الکرام۔

اور ہاں جب انظہار ہی کی ٹھہری تو یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب احقر کے اس موقف سے خوب واقف تھے، چنانچہ حضرت واللہ کے صیہ حیات خود حضرت کے سامنے اور بعد وصال احقر کے غیاب میں، منج میں ہو یا کہ محفل میں جب احقر کا ذکر فرماتے تو نام کے بجائے ہمیشہ ہمیش حضرت سید صاحب کے خلیفہ ہی کے پُر شفقت اور بندہ نواز لفظوں سے یاد فرمایا کرتے تھے، حضرت کے سب مستبین اسی لئے اس حقیقت سے واقف ہیں۔

مانئے بمانگ چنگ نہ امر و می کشیم

بس دود شد کہ گنبد چرخ ایں صدا شنید

۱۱ ہندوستان کا پورا حال معلوم نہیں کہ حضرت واللہ کی رحلت کے بعد ان کے کفش برداروں میں کون کون خلافت پا گئے۔ ایک میرعلیم الدین صاحب حیدر آبادی اور دوسرے علی ملکا صاحب کرناٹکی کا معلوم ہے کہ جلد ہی حضرت مولانا ابراہام الحق صاحب (خلیفہ حکیم الامت) کے اجازت یافتہ بنے پاکستان میں مولانا عمر اشرف خاں صاحب پشاور کی کوادلا تبلیغی جماعت کے شہر بزرگ شاہ عبدالعزیز دما جو رحمۃ اللہ علیہ نے اوپر حضرت مولانا فقیر محمد صاحب مظفر (خلیفہ حکیم الامت) نے بھی اجازت بیعت دی تھی، امیر اللہ صاحب حیدر آبادی ثم کراچی نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حکیم الامت) سے خلافت پائی۔

رودادِ علالت

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی صحت مدت ہوئی کہ گرچہ تھی، کئی برس سے کام قوت جسمانی سے زیادہ ہمتِ باطنی ہی پر چل رہا تھا، خوراک برائے نام تھی جوانی میں میند کے کچے تھے۔ اس کی تلافی برسوں کی کم خوابی نے کردی۔ کام میں اس قدر مہلک رہتے تھے کہ کبھی اپنی صحت یا بے صحتی کے خیال کی مہلت ہی نہیں پائی تھی مگر اب ”مرکز کار“ سے دوری، تصنیف و تالیف سے مجبوری اور ہجومِ افکار نے بڑھاپے کا احساس پیدا کر دیا تھا،

حضرت والدہ کی علالت کا آغاز دراصل استسقاءِ قلبی کے عارضہ سے ہوا جو ۱۹۴۵ء میں اعظم گڑھ میں لاحق ہوا تھا، جس کی تفصیل اس مقام پر نذر چکی ہے کہ آٹھ دن تک لیٹنا تو دور کنار بیٹھنا بھی محال ہو گیا تھا، دیوار کے سہارے کھڑے ہی کھڑے آٹھ دن گزارنے پڑے تھے، پھر رفتہ رفتہ بیٹھنے اور بیٹے کے قابل ہوسکے، مگر اس مرض نے بعض مستقل اثرات چھوڑے، مثلاً تنفس کی شکایت ہمیشہ کے لئے رہ گئی کراچی میں قلب کے ماہر ڈاکٹروں نے بتایا کہ مدت سے صرف نصف قلب کام کر رہا ہے، بقیہ نصف معطل ہے، اسی طرح بے خوابی کی شکایت بھی تقریباً قائم ہو گئی تھی۔ ان عوارض کا لازمی نتیجہ ضعفِ اعصاب تھا،

لہٰذا یہ مولانا دبیادہ کی مدظلہ سے معلوم ہوا۔

ان مستقل اثرات کی تخفیف کے ساتھ بھوپال کے دوران قیام حضرت والا کی صحت عموماً ٹھیک ہی رہی البتہ دسمبر ۱۹۴۹ء میں سفر حج سے لوٹتے ہوئے جہاز ہی پر طبیعت بگڑی اور طبی پہنچ کر صاحب فراش ہو گئے تھے بخار اور تنفس قلبی نے شدت اختیار کر لی تھی مگر علاج معالجہ سے پھر طبیعت سنبھل گئی۔

اس کے بعد جون ۱۹۵۰ء میں کراچی تشریف آوری ہوئی، یہاں کا موسم یوں بھی تندرست کو بیمار بنا دیتا ہے، حضرت والا کو جو عوارض لاحق تھے اور جن افکار میں یہاں کا ابتدائی زمانہ گزرا اس سے صحت بہت جلد گر گئی، خون بے حد کم ہو گیا اعصاب کمزور تر ہو گئے، حالت یہ تھی کہ جاڑوں کے موسم میں موٹی موٹی لفافوں میں بھی سردی لگتی تھی اور باہر جانا ہوتا تو اس قدر اہتمام فرمانے کے بیان پر کرتا، اس پر اونی سوٹر، اس پر گرم شیر وانی اور پھر اس کے اوپر گرم لائنا کوٹ یا ادنیٰ نشال ڈھتے تھے۔ پاجامہ بھی گرم فلائین کا اور موزے بھی گرم پہنتے تھے، اس کے باوجود سردی کا اثر ہو کر رہتا، اور ہوا کے ہلکے جھونکے سے بھی تنفس تیز ہو جاتا تھا۔

انہی جاڑوں میں خس پوش جامع مسجد سلیمانیہ میں نماز فجر کے بعد درس قرآن کا سلسلہ جاری تھا جو محض ہمت و عزیمت کا کرشمہ تھا۔ راقم کی درخواست پر تفسیر کے ساتھ ساتھ ہفتہ میں دو دن (جمعرات و جمعہ) درس حدیث کا بھی آغاز منظور فرمایا تھا پہلی ہی درس تھاشکوۃ شریف کھول کر حدیث شریف ”انما الاعمال بالنیات“ کی تلاوت فرمائی اور اس کی تشریح فرمانے لگے، نومبر ۱۹۵۱ء کا آغاز کھلی مسجد اور سرد ہوا، یکایک ہم لوگوں نے دیکھا کہ آواز پست ہو گئی، اور غنودگی سی طاری ہونے لگی یہاں تک کہ الفاظ ناقابل فہم ہو گئے، مگر بیان جاری تھا، میں نے گھبرا کر مشکوۃ شریف حضرت کے دست مبارک سے کھینچ لی، محفل برفراست ہو گئی شوی صلب

لے راحت علی رضوی صدر مسجد کٹی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انہی کی قیمت میں یہ سعادت کبھی تھی کہ وفات نماز فجر کے لئے حضرت والا کو اپنی کار پر سجدے آتے اور بعد درس قیام گاہ پر چھوڑ جایا کرتے تھے!!

اور دوسرے حضرات نے بغل میں ہاتھ دے کر حضرت علامہ کو اٹھایا اور بہ دقت تمام پاؤں گھسیٹتے ہوئے حضرت والا موٹر تک تشریف لائے، آج اتفاقاً مسلمان میاں بھی موجود نہ تھے، موٹر کی کچلی سیٹ پر حضرت کو لٹا دیا گیا۔ شیخ کا فرق مبارک اس مرید بے استحقاق کے زانو پر تھا، عجیب پریشانی کا وقت تھا لیکن جو نہی موٹر کار ڈار منزل پر رُکی حضرت نے آنکھیں کھول دیں، مسکرا کر خادم کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ آپ نے توجہ کو بیمار سمجھ لیا حالانکہ نیند کا غلبہ ہو گیا تھا، بس یہ فرماتے ہوئے صافہ درست گمتے موٹر سے ایسے اترے کہ ہم لوگ سہارا بھی نہ دے سکے اور سیدھے اپنے کمرے میں جا بیٹھے۔ مگر دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ چہرہ مبارک پر لقوے کے کچھ آثار ہیں، گو بہت خفیف !!

سلمان میاں اور عاصم صاحب کو واقعہ کی تفصیل علیحدگی میں بتا دی گئی فوراً ڈاکٹر میجر حسن کو بلوایا گیا، انہوں نے یہی بتایا کہ لقوہ کا ہلکا سا حملہ ہوا تھا مگر زائل ہو گیا۔ مگر آئندہ کے تحفظ کے خیال سے انجکشن کا ایک کورس تجویز کیا گیا اور مکمل آرام کی ہدایت کی گئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر حضرت والا کی ہمت عالی کا اثر دیکھئے کہ خود ان پر پریشانی کی پرچھائیں بھی نہ آنے پائی، ڈاکٹر جب انجکشن دے رہا تھا تو ازراہ مزاح حضرت نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب انجکشن پٹھے کا ہے یا رگ کا؟ پھر فرمایا کہ ”رگ زدن“ ایک فارسی محاورہ ہے اور اس پر فارسی کا ایک شوخ شعر سنایا، جس کو میرا ذہن محفوظ نہ رکھ سکا، اس کے بعد جب ڈاکٹر نے بتایا کہ انجکشن رگ کا نہیں پٹھے کا ہے تو اس پر ایک اور مزاحیہ جملہ ارشاد فرمایا کہ

”ڈاکٹر صاحب یہ پٹھے کچھ ٹھیک بھی ہوں گے یا یوں ہی اُلو کے پٹھے دیں گے۔“

غرض ہفتہ عشرہ میں بات بالکل آئی گئی ہو گئی، چہرہ پُر جمال پر اثر تو مین ہی

لے حضرت کی قیام گاہ۔

چار روز بعد ایسے زائل ہوا جیسے دیکھنے والوں کی نظروں نے دھوکہ ہی کھایا تھا۔ میں نے چونکہ حالتِ اضطراب میں دعائے صحت کے لئے ایک عریفہ حضرت مفتی صاحب مظللہ کی خدمت میں بھی لکھ دیا تھا، جو اس وقت خود بھی صاحبِ فراش تھے اور شدید تعلق خاطر کی بنا پر اس عریفہ نے حضرت مددِ روح کو بے حد مضطرب بھی کر دیا تھا، اس لئے سب سے پہلے صحت کا شردہ بھی انہیں کی خدمت میں پہنچنا چاہیے تھا، چنانچہ احقر نے حضرت والارہ کی صحت یابی کی تشفی بخش تفصیل حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں لکھ بھیجی، اس سے حضرت مددِ روح کو جس درجہ راحت و مسرت پہنچی اس کا اندازہ ان کے اس خود نوشتہ جوابی والا نامہ سے لگا لیجئے، اور دیکھئے کہ اہل اللہ کے قلوب اخلاص و حب فی اللہ سے کس قدر پیوستہ ہوتے ہیں اور ان حضرات میں ایثار نفس اور تواضع کس درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

مکتوب پیش ہے :

خودنو و محترمی . السلام علیکم

آپ کے اس عنایت نامہ سے حضرت سید صاحب کی صحت معلوم کر کے دل بہت خوش ہوا، حق تعالیٰ عافیت کے ساتھ ہم خدام پران

لے حضرت مفتی صاحب مظللہ کے دانتیں پاؤں میں ایک ناسور کوئی بیس بائیس برس سے گھر کئے ہوئے تھا، اس طویل مجاہدہ اور ہر طرح کے علاج معالجہ سے مجبور ہو کر بالآخر نومبر ۱۹۵۱ء میں پاؤں گھٹنے کے اوپر سے قطع کر دیا گیا، اس سانحہ کو شاید چند ہی روز ہوئے تھے کہ میرا عریفہ حضرت کی خدمت میں ہسپتال میں پہنچا اور سنا دیا گیا، حضرت صاحبِ فراش تھے، جواب اٹھے بھتیجے مولوی عرفان صاحب نے تحریر فرمایا کہ آپ کا خط سن کر حضرت اسد درجہ مضطرب ہوئے کہ شدتِ اضطراب سے بار بار پہلو بدلتے جاتے تھے اور زبانِ مبارک سے بے تابانہ صرف یہ نکلتا تھا کہ "یا اللہ خیر، یا اللہ خیر" حضرت سید صاحب کی خیریت سے جلد مطلع کئے۔

کامایہ رکھے، مگر التماس ہے کہ دل بہت خوش ہوا، سب گھر میں خوش ہوئے احقر نظر بھر کر حضرت سید صاحب کی طرف نہیں دیکھتا کہ نظریہ کا اثر نہ ہو، حق تعالیٰ نے کمالاتِ معنوی باطنی کے ساتھ ظاہری صورت بھی ایسی عطا فرمائی ہے کہ شاید نظیر نہ ملے۔

حضرت کی خدمت میں ادب سے سلام و درخواست دعا اور یہ کہ احقر، ۱ نومبر سے گھر آ گیا ہے، دن بدن صحت میں ترقی معلوم ہوتی ہے، گوا بھی درد اور ضعف ہے۔ محمد حسن۔

بات ذرا دور بھل گئی، اس علالت کے بعد سب عقیدت مندوں کے اصرار پر درس حدیث و تفسیر کا سلسلہ چاروں تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

اس کے چند ماہ بعد یعنی ۱۹۵۲ء کی گرمیوں میں حکومت کی قائم کردہ بنیادی کمیٹی کا اجلاس تھیا گل میں منعقد ہوا، حضرت والا کو بھی اس میں شرکت کرنی پڑی، اٹھ ہزار فٹ کی بلندی ان کے قلب و اعصاب کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی، تنفس کا شدید دورہ پڑا، خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا (حالانکہ عام حالت میں وہ نارمل سے کم ہی رہتا تھا)، خان عبدالقیوم خان اور میاں ممتاز دولتانہ کی خصوصی توجہ سے حضرت کو فوراً راولپنڈی کے ہسپتال میں پہنچایا گیا، یہاں کرنل سرور کی تشخیص بھی دبی رہی، پھر حبیب کراچی تشریف آوری ہوئی تو یہاں کے ماہرین قلب نے بھی اس تشخیص کو صریح بتایا اور یہ بھی بتایا کہ صرف نصف قلب کام کر رہا ہے۔۔۔۔۔ میں تو حیران اس بہت عالی پر رہتا تھا کہ مرض اور اس کی نوعیت معلوم ہونے کے باوجود حضرت والا کبھی شوش نہ ہوتے تھے، پچنانچہ یہ بات خود حضرت ہی نے مسکراتے ہوئے مجھے سنائی تھی کہ:-

لے جو اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ لے جو حکومت پنجاب کے وزیر خزانہ تھے۔

”ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ ہمارا صرف آدھا قلب کام کر رہا ہے غنیمت ہے آدھا تو ابھی چل رہا ہے، کچھ دنوں میں پوری مشین گھس جائیگی۔ یہی تو ہوتا ہے۔“

یہ جملے اس طمانیت سے فرمائے گئے کہ گویا مشین کے گھس جانے کا کوئی رنج ہی نہیں، بلکہ وہ گھس جانے کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ کُل شَکْیَۃَ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھُہُ کی قولی تفسیریں تو بہت پڑھی اور سنی تھیں مگر اس کو حال کے آئینہ میں دیکھنا اور سمجھنا شیخ عالی مقام کی صحبت ہی میں میسر آیا!

بہر کیف مرض کی یہ نوعیت جان لیوا ہی ثابت ہوئی، گو علاج بہت ہوتے رہے، ڈاکٹر ہی تھے، یونانی بھی اور ہومیو پیتھک بھی!! ڈاکٹر ہی علاج خاص طور پر کر لیں مگر حرم نے کیا جو بھوپال سے حضرت والا کے واقف و شناسا تھے ہومیو پیتھک علاج محترم ڈاکٹر عبدالحی صاحب مظانہ کا ہوا اور کچھ خدمت کی سعادت قائم الحروف کے حصے میں بھی آئی، لیکن بعد کو سب سے بڑھ کر خدمت پوری فدویت و جانشاری کے جذبہ سے حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی (جمیری نے انجام دی، جو گو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے باضابطہ مرید نہیں، لیکن عقیدت و محبت میں مریدوں پر بھی سبقت رکھتے ہیں اور خود حضرت شیخ بھی ان پر غایت درجہ شفیق و مہربان تھے، حکیم نصیر الدین صاحب کی تجویز ڈاکٹروں سے مختلف نہ تھی، مگر

اتنی بات وہ پورے وثوق سے فرمایا کرتے ہیں کہ قضا و قدر سے بہت کم محض طبی نقطہ نظر سے اس نیم جان قلب میں اتنی قوت و سکت تھی کہ کم از کم دس برس تک اس کے افعال باقی رہتے، مگر جو جزا جتیں اپنوں کی احسان فراموشی، ناقدری اور ایذا سانیوں سے اس کو پہنچتی رہی تھیں اور وہ بلا آہ و کراہ سہتا چلا گیا تھا، اس سے وہ بہت جلد تھک کر رہ گیا۔ ————— ٹھیک ہے حکیم صاحب کا ارشاد، آخر

جمیۃ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا تو پورا بھر گیا
حب سید صاحب نے ہال کے زمین پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت
بھری نگاہ ڈالی اور درد بھری آواز میں یہ شعر پڑھا ہے
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہاں لے کے آیا ہوں
اس کے پڑھنے پر اُن کی طرح اور لوگوں کی بھی آنکھیں اشکبار ہو گئیں
جلسہ کی کارروائی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی، قاری نے
شروع میں یہ آیت پڑھی :

وَلَمَّا فَصَلَ الْغَبِيرُ حب قافلہ چلا تو ان کے باپ
قَالَ اَبُوهُمْ اِنِّي كَاَجِدُ (یعنی حضرت یعقوبؑ) نے فرمایا کہ
يَرْجِعُ يُوسُفَ كَسُوْلًا اَنْ میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں
تَقْنِدُوْنَ (سورہ یوسف) اگر تم مجھ کو بے وقوف نہ بناؤ۔

اس کو سن کر تمام حاضرین متاثر ہوئے۔ خود سید صاحب ضبط نہ فرما
سکے مے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تاتا بندھ گیا، ایک
طالب علم نے عربی میں سپاس نامہ پڑھا جس کے بعد سید صاحب
نے بڑے درد بھرے انداز میں اپنی تقریر شروع کی، پوری تقریر
سوز و درد کا مرقع تھی، اس میں پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان
فرمائے اور آخر میں اپنے عزیز طلبا کو یہ پیام دیا ہے

سبق پڑھ پھر صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلباء کے نا ان کا یہ آخری پیام تھا“ لہ

مرض الموت اور اسکے دوران میں! | اپریل ۱۹۵۲ء میں حضرت والاؒ

ہی دنوں بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا اور مہینوں اس کا اثر رہا، جب کچھ کم ہوتا نظر آتا تھا تو آگست میں نزولی تحریک کے ساتھ پھر اس کا اعادہ ہوا اور ساتھ ہی حرارت بھی آگئی۔ اب کی مرتبہ کرنل رحمن اور حضرت کے فعلی ڈاکٹر فاروقی مرحوم کے علاوہ ڈاکٹر کرنل شاہ بھی شریک علاج ہو گئے۔ از سر نو قلب کا اکسرے، کارڈیو گراف اور خون کا امتحان وغیرہ ہوا، تشخیص جو پہلے ہو چکی تھی وہی قائم رہی۔

اب حضرت والاؒ نے اپنا پنگ ڈرائنگ روم میں ہی بچھا رکھا تھا اور وہیں لیٹے رہتے تھے اور باوجود ساری تکلیف کے آنے والوں کو محروم زیارت نہ فرماتے تھے، بلکہ طاقت و توانائی نہ ہونے کے باوجود دقیق دقیق مسائل پر بھی کسی کی طلب دیکھ کر طول طویل گفتگو فرماتے تھے اور دوران گفتگو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اپنے مرض کو بھول گئے ہیں مثلاً دو تین واقعات درج ذیل ہیں:-

(۱) ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لیکچرر تشریف لائے۔ سلام و مزاج پرسی کے بعد انہوں نے وحدت الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا تھا حضرت نے معذرت فرمائی کہ میں اپنی صحت سے مجبور ہوں مگر تھوڑی دیر بعد خود ہی مسلسل ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے، لیکچرر صاحب اُلجھتے رہے اور انکی تسلی نہیں ہو پاتی تھی، چنانچہ انہوں نے پھر سوال کیا تو ارشاد فرمایا کہ بھائی بس اب دم نہیں رہا، ہاں اس سلسلہ میں سعدی کے دو شعر سن لیجئے۔

یہ کئے قطرہ اذا بر باران چکید نخل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریا ست من کیستم گراوست حقا کہ من نیستم
ان اشعار کو سن کر لیکچرر صاحب جھوم گئے، کہنے لگے کہ ہزاروں مرتبہ یہ اشعار

سنے تھے لیکن ان کے مطلب کو نہیں سمجھا تھا، اب وعدۃ الوجود کا مسئلہ سمجھ گیا۔
اب صرف ایک گزارش یہ ہے کہ خط و کتابت کی اجازت عطا ہو، ارشاد فرمایا،
بڑے شوق سے! لے

یہ ہوتی ہے ”صاحب نسبت“ ہستیوں کی ضرب کہ جب مخاطب کی فہم کو عاجز
پاتے ہیں تو زبان روکنے سے قبل ایک سادہ سی بات کے ذریعہ راست اس کے
قلب میں اس مفہوم کو اتار دیتے ہیں!

(۲) اسی طرح کچھ دنوں کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر آئے۔ غالباً فلسفہ یا تاریخ
اسلام ان کا خاص موضوع تھا، وہ اپنی استعداد کے متعلق حضرت کی تصدیقی تحریر کے
متقی تھے۔ فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے
ہونا دیانت کے خلاف ہے اس جواب سے پروفیسر صاحب افسردہ سے ہو گئے۔

حضرت والا رہے ان کا یہ تاثر بھی دیکھا نہ گیا آخر چند سوالات فرمائے جس کا وہ
جواب دیتے رہے، پھر ایک ذرا دقیق سوال کیا گیا جس کا تشفی بخش جواب نہ مل
سکا اس کے بعد دریافت فرمایا گیا کہ اس موضوع پر جو خاص کتابیں زیر مطالعہ
رہی ہوں ان کے نام بتائیں، انہوں نے اپنی حد تک بتا دیئے، اس کے بعد خود
حضرت والا نے اردو، عربی اور میں حیران تھا کہ بیسیوں انگریزی کتابوں کے نام
لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کتابیں کیا آپ نے نہیں دیکھیں؟ پروفیسر صاحب کا
چہرہ عرق آلود ہو گیا اور ان کو اپنے کوتاہی علم کا پورا احساس ہو گیا، اس کے بعد
حضرت والا نے مناسب تحریر عطا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اصل مسئلہ کی خود
وضاحت فرمادی۔

لے یہ واقعہ میں نے محترم مام صاحب کے مضمون مندرجہ سلیمان نمبر سے نقل کیا ہے، میں خود اس وقت
موجود نہ تھا۔

دراصل بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ اسلام میں غیر اسلامی عناصر کہاں کہاں سے اور کب داخل ہوئے؟ جب حضرت والارہ اس کی تشریح فرما رہے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس موضوع پر تیار ہو کر بیٹھے ہیں، گفتگو ٹھہر ٹھہر کر فرما رہے تھے مگر تسلسل کے ساتھ معلومات کا سیلاب تھا کہ امڈا چلا آتا تھا، فلسفہ یونان سے لے کر حالیہ دور کے فلسفہ کی تاریخ ارتقاء اور ساتھ ساتھ اس پر نقد و تبصرہ اور مختلف یونانی، کلاسی، اصطلاحات کی فن لسانیات (فیلوجی) کے اعتبار سے تحقیق بڑے ماہرانہ اور محققانہ انداز کی بیان فرمادی اور دراصل ماہرانہ طرز تعلیم کا ڈھنگ سکھادیا۔

(۳) ایک اور دلچسپ واقعہ جواب تک ذہن میں تازہ ہے سن لیجئے، رحلت سے صرف چار روز قبل (۱۹ نومبر ۱۹۵۳ء) مغرب کے فوراً بعد جب حضرت والا نماز سے فارغ ہو کر حسب معمول پلنگ پر لیٹے لیٹے ہم لوگوں سے مخاطب تھے کہ سفیر شام، ان کے مشیر ثقافت (کچلر ایچی) اور دو افراد کے ساتھ تشریف لائے، حضرت والارہ اٹھ بیٹھے مگر سفیر صاحب نے باصرہ لیٹے رہنے کی درخواست کی، اور خود سہراہنے کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے مزاج پُرسی کے بعد سفیر صاحب نے فرمایا کہ مجھ کو ایک علمی الجھن ہے جو کئی علماء سے حل نہ ہو سکی، وہ یہ ہے کہ یہودیوں کے متعلق قرآن پاک میں یہ تصریح موجود ہے کہ

صَبَرْتُمْ عَلَيْهِمُ الدَّلِيلَةَ
وَالْمُتَشَكِّكَةَ (بقرہ)

اور فقیری۔

اور احادیث نبوی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کبھی دنیا میں با آبرو حاکم قوم نہیں رہے گی پھر آج فلسطین میں ان کی حکومت کیسے قائم ہے؟

حضرت والارہ نے ایک لمحہ تامل کے بغیر فرمایا کہ اس کا جواب تو قرآن پاک ہی میں خود موجود ہے۔ راقم حقیر نے اشارہ پا کر عمائل شریف پیش کردی اور حضرت والا

نے نوراً سورۃ آل عمران کی یہ آیت پاک نکال کر سنادی کہ :-

صُرِفَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
أَيْنَ مَا تُثْقَلُونَ إِلَّا لِحَبْلِ
مِنَ اللَّهِ وَحَبْلِ بَيْنِ النَّاسِ
الانسان کی رتی۔ (آل عمران)

اور اس کی تشریح میں فرمایا کہ حبل اللہ تو دین اسلام ہے اور حبل الناس سے مراد ورلڈ پاور (مالی طاقت) ہے، یعنی وہ دین میں داخل ہو جائیں یا کسی مالی طاقت کا سہارا لے لیں تو البتہ ان کی ذلت دور ہو سکتی ہے، چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کی حکومت محض انگریز و امریکہ کے بل بوتہ پر قائم ہے! اس جواب سے سفیر شام اچھل پڑے اور فرمایا کہ واللہ آج تک کسی نے اس آیت پاک کی طرف دہری نہیں کی تھی، آج پوری تشنی ہو گئی۔

اس کے بعد سفیر مذکور نے جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے متعلق حضرت والا کی شخصیت دلائل دریافت فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ
”جماعت اسلامی دین کی سیاسی تعبیر پیش کرتی ہے اور تبلیغی جماعت دین خالص کی داعی ہے۔“

سفیر صاحب کی ذہانت اس جواب کی گہرائی کو پانگی اور انہوں نے اظہار مسرت و تحسین فرمایا، پھر عقیدت و محبت کے لہجہ میں ایک اور سوال کیا کہ مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی میں آپ کے نزدیک کون بڑا عالم ہے؟ جواب بغیر تعابلی طرز اختیار کئے ہوئے صرف یہ عطا ہوا کہ :-

”مولانا ابوالحسن علی ندوی تو ایک بڑے عالم ہیں۔“

اس پر سفیر صاحب نے کہا، خوب خوب !!

پھر تیسرا سوال یہ کیا گیا کہ سب سے بہترین تفسیر قرآن پاک کی کونسی ہے؟
حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ کسی ایک تفسیر کا نام لینا دشوار ہے، اس لئے کہ
ہر تفسیر اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے ماتحت لکھی گئی ہے اور لکھی جاتی رہے
گی۔ قرآن پاک کے مطالب و معنی کبھی ختم نہ ہوں گے اس لئے کوئی تفسیر بھی سب سے
بہترین تفسیر نہیں ہو سکتی۔

سفیر صاحب نے اس جواب سے بڑا حظ پایا اور حصول بصیرت کا اعتراف کیا۔
ادھر ان کے فاضل مشیر ثقافت ابوالخیر عرسوسی بھی حضرت والا کے جوابات پر بھوم
رہے تھے۔

اس کے بعد سفیر صاحب نے حضرت والا کی صحت کے لئے دعا کرتے ہوئے
اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے۔

حضرت والا کے آخری احوال شیخ الشیوخ حضرت تھانوی قدس سرہ
آخری احوال | کی طرح نظر آئے، بلکہ خود بھی دو ایک بار اس احقر سے حضرت
نے ارشاد فرمایا کہ:-

”ہمارے حضرت والا پر آخر زمانہ میں یہ حال طاری ہو گیا تھا کہ اپنی
تصنیفات کے اہم اہم مضامین کو یکجا فرمادیں، چنانچہ بواہر النوادر
کی تالیف اسی جذبے کے تحت ہوئی تھی۔ میرا بھی جی
بس اب یہی چاہتا ہے کہ میرے منتشر مضامین فن داری تقسیم کے ساتھ
یکجا ہو جائیں۔“ لے

لے الحمد للہ کہ اس آرزو پر مطلع ہو کر شاہ معین الدین صاحب (مدیر معارف) نے اس کام کو اپنے ہاتھ
میں لے لیا ہے اور اطلاع ملی ہے کہ پہلا مجموعہ مضامین ”علوم القرآن“ پر مشتمل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح
حدیث، فقہ، فلسفہ، کلام اور تاریخ وغیرہ کے مضامین کی جمع و ترتیب کر دے کہ نقوش سلطانی اسلامی
علوم و فنون کے ہر باب کو مزین کئے ہوئے ہیں۔

پھر سکراتے ہوئے ازراہ لطف فرمایا کہ

”اچھا یہ بتائیے کہ میرے کل مضامین کی تعداد کیا ہوگی؟“

نادم ہو کر عرض کیا کہ میری نظر میں کل مضامین تو نہیں ہیں، البتہ قیاس یہ ہے کہ دو ڈھائی سو تو ضرور ہوں گے، ارشاد فرمایا :

”نہیں، اس سے بھی (یا بہت) زائد ہیں میرے مضامین مولانا شبلی علیہ الرحمۃ سے کافی زائد ہوں گے۔“

یہ تو تصنیفات سے متعلق توافق حال تھا شیخ الشیوخ کے حال سے !! اب جہاں تک ام الاحوال یعنی تعلق مع اللہ اور تعلق مع الخلق کی بات ہے، آخر زمانہ میں قلب مبارک ہر غیر سے بالکل منقطع اور ذات رب کے ساتھ تمام تر وابستہ ہو گیا تھا۔ گویا ”إِذَا فَرَغْتَ فَانصَب“ کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے تھے، گھنٹوں تنہا لیٹے رہتے اور اسی تنہائی کو پسند کرتے تھے۔ میل ملاپ اور ہر شغل غیر سے دل بیزار تھا۔ بس دو تین ہی خوش نصیب ایسے تھے جن سے طبیعت کو انشراح کا مسل حاصل تھا ان سے البتہ مل کر خوش ہوتے تھے اور ملنے والے کو مسرور فرما دیتے تھے چنانچہ ایک واقعہ سنئے :

ایک روز ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ تشریف لائے، حضرت والا نے ارشاد فرمایا :

”ڈاکٹر صاحب ذرا میرے دل کی حالت تو دیکھئے!“

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ”الحمد للہ لاکھوں سے اچھا ہے۔“

معاً ارشاد فرمایا کہ ”لاکھوں سے بُرا بھی تو ہے۔“

پھر فرمایا کہ ”دیکھ بھی لیجئے!“ ————— ڈاکٹر صاحب نے آئہ سماع اللہ

لے حرکت قلب سننے کا آلہ جس کو انگریزی میں ”اسٹتھتھس کوپ“ کہتے ہیں۔

ساتھ نہ ہونے کا غر فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ

”سنتا آ کہ ہے یا انسان کا کان“

اس سوال کے ساتھ ہی اپنا گریبان کھول دیا اور ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ
”کان لگا کر قلب کی حرکت سنیں“

ڈاکٹر صاحب نے قیبل ارشاد کی تو مسکرا کر فرمانے لگے کہ

”بس یہی چاہتا تھا کہ آپ کا کان مس کر جائے“

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تلبس کی یہ سعادت تو خود مجھ کو بخشی گئی ہے۔

حضرت والا مسکرا دیئے!

بات ختم ہو گئی، کچھ دیر بیٹھ کر جب ڈاکٹر صاحب تشریف لے جانے لگے، تو
معذرت فرمائی کہ میں نے حضرت کا کافی وقت لے لیا حضرت والا نے فرمایا کہ
میں تو دن رات بیکار پڑا رہتا ہوں، مجھے کام ہی کیا ہے؟

اس ارشاد پر ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے ایک مصرعہ کیا خوب ہوزوں فرمایا جو
حضرت کی حالت کا آئینہ دار تھا، فرمایا کہ حضرت بیکار کب رہتے ہیں حضرت کا تو
یہ حال ہے کہ ”بہت مشغول رکھتا ہے دل باماجرہ مجھ کو“

حضرت والا نے معنی خیز تبسم کے ساتھ فرمایا:

”کاش ایسا ہوتا!“

واقعہ بیان ہو چکا، اب اس کی ایک تصدیق بھی ملاحظہ ہو، انہی دو چار
دنوں میں ایک روز شام کو احقر حاضر خدمت تھا، حضرت والا آنکھیں بند کئے بلکہ
ایک ہاتھ سے چہرہ مبارک کو چھپائے ہوئے لیٹے تھے، گویا سو گئے ہیں، ایسے میں
نقشبندیہ سلسلہ کے ایک صوفی صاحب تشریف لائے اور چپکے سے بیٹھ گئے، ان کو ملنا
عاصم صاحب سے تھا، مجھ سے حضرت کی خیریت دریافت فرمائی، مختصر عرض کر دی

گئی، ایسے میں صوفی صاحب جو حضرت والاؒ کے رو برو بیٹھے ہوئے تھے، دقت مرآقب ہو گئے اور اس وقت تک رہے جب تک ماصم صاحب باہر نہ آگئے یعنی کوئی دس پندرہ منٹ!!۔۔۔۔۔ بات آئی گئی ہو گئی، حضرت کی رحلت کے بعد ایک روز جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے صوفی صاحب سے اس یکا یک مراقبہ کی تفصیل پوچھی تو فرمایا کہ :-

”میں یہ سمجھتا تھا کہ حضرت سید صاحب محو خواب ہیں آپ سے بات کر رہا تھا کہ ایسے میں مجھ سے کسی بزرگ نے فرمایا کہ بیٹھے کیا ہو یہ تو لوٹنے کا وقت ہے سید صاحب کی طرف متوجہ ہو جاؤ، چنانچہ میں ان کے قلب مبارک کی طرف متوجہ ہوا تو انوار کی بارش ہو رہی تھی۔“

لیجئے اب تو ڈاکٹر صاحب کے مصرعہ کا یقین آ گیا کہ

ع ”بہت مشغول رکھتا ہے دل باماجر مجھ کو“

بحمد اللہ سبحانہ کہ حضرت اقدسؒ کو انقطاع کامل اور ذات حق کا حضور دائم حاصل تھا،۔۔۔۔۔ اور ان کے متبیین میں جو جانتے تھے ان کا تو دستور یہی تھا کہ حضرت والاؒ متوجہ ہوں یا نہ ہوں، کلام فرمائیں یا نہ فرمائیں اپنے قلوب کو اس چشمہ فیض کی طرف متوجہ رکھتے تھے اور بڑی سکینیت پاتے تھے۔۔۔ وہ سکینیت جو قبیل و قال سے پیدا نہیں ہو سکتی!!

ایک اور خاص بات طبعیت کی لطافت اور احساس کی نزاکت کی تیزی تھی جو چیز سامنے آتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ حضرت اقدسؒ سے اس کی اصلیت بلا قصد و ارادہ بھی چھپ نہ سکتی تھی، چنانچہ ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہوگا،۔۔۔۔۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب مظاہ کی دوا حضرت والاؒ استعمال فرما رہے تھے،۔۔۔ ہو ہو پیتی اصول کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے چونکہ اونچی طاقت کی دوا دی تھی اس

لئے چند روز کا توقف ضروری تھا انفسیاتی تشفی کے لئے البتہ چند پٹریاں سادہ گولیوں کی باندھ کر بھجوا دی تھیں کہ روزانہ ایک پٹریا استعمال فرمایا کریں حضرت والارڈ نے پہلی ہی پٹریا ان میں کی جب استعمال فرمائی تو زبان پر گولیوں کے آتے ہی احقر سے فرمایا کہ ۔

”ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں کوئی نادان بچہ تو نہیں، اگر دوا کی ضرورت نہ تھی تو فرما دیتے کہ اتنے روز تک کسی دوا کی ضرورت نہیں یہ سادہ گولیاں باندھنے کی کیا ضرورت تھی، میں دیدہ و دانستہ تو ان سے تشفی نہیں پاسکتا۔“

مجھے اس نزاکتِ احساس پر حیرت ہوئی، دوسرے روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ بات پہنچا دی تو ڈاکٹر صاحب بھی حیران رہ گئے اور فرمایا کہ یہ نہیں کہ سادہ گولیاں دی تھیں بلکہ ان میں صاف الکحل بھی جذب کر دی تھی تاکہ کوئی شبہ ہی نہ پیدا ہو سکے۔ مگر اللہ رے لطافتِ احساس کہ پھر بھی پہچان ہی لیا!

اسی طرح کوئی شخص ادنیٰ انقباض یا کھوٹ لے کر خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اس کا اثر قلبِ مبارک پر فوراً پڑ جاتا تھا اور گوا ظہار نہ فرماتے تھے مگر چاہتے یہی تھے کہ یہ غیر مخلصانہ صحبت جلد سے جلد ختم ہو جائے، اسی طرح عام طور پر میل ملاپ سے احتراز ہی فرمانے لگے تھے، میں نے ایک مرتبہ جرات کر کے یہ بات عرض کر دی کہ مجھ کا یہ رویہ احساس ہے کہ حضرت والارڈ کو اب لوگوں سے ملنے میں تعب ہوتا ہے تو اپنے ننھے نواسے عادل میاں سلمہ کو بچہ پڑتے ہوئے

لے ہو یہ یہ تک دوا میں جو کچھ ذائقہ یا بو ہوتی ہے وہ الکحل اور شکر ہی کی ہوتی ہے ورنہ دوا تو اپنا کوئی ذائقہ نہیں رکھتی، اس لئے بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی محض کچھ کہتا نہیں سکتا کہ کیا دوا ہے؟ یا یہ کہ ہے بھی یا نہیں؟۔

بکمال بلاغت فرمایا کہ :-

”بس ہمارے دوست تو یہ لپچھے ہیں، دل میں کچھ رکھتے نہیں ،
بگڑاتے ہیں تو نانا آبا کو مار بھی دیتے ہیں“

چنانچہ پھر اپنے اس معصوم نواسے کے ساتھ کھیلنے لگ گئے۔

حضرت اقدس کے اس جملہ اور حال سے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ ”فطرۃ اللہ
المتی فطر الناس علیہا“ والی معصومیت کی طرف عود فرما چکے تھے اور اب
اس دنیائے مکرو فریب کا ایک ایک لمحہ ان کے لئے شاق تھا۔ بندہ کا نفس
رافضیہ مضمیتہ کے نقطہ کمال پر پہنچ کر اب مولیٰ کے اشارہ ”اجبی الی ربک“
کا منتظر تھا۔

ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

رحلتِ شیخ

یوم وداع کی کرامات | انتظار کی مدت اب تمام ہوئی جا رہی ہے اور کسی عارف کے بقول یہ

من زمن عریاں شدم اور خیال
می خورام در نہایات الوصال

کا مرحلہ اب قریب ہے، اتوار ۱۴ رجب الاول ۱۳۵۳ھ (م ۲۲ نومبر ۱۹۳۳ء) کی شب بس آنکھوں ہی آنکھوں میں گزری، پچھلی رات کو قلب کا ایک دورہ پڑا، منفس تیز ہو گیا، پیرانی صاحبہ پریشان ہو گئیں، مہم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لانا چاہا مگر ارشاد ہوا: ”ابھی نہ جاؤ، ڈاکٹر صاحب سو رہے ہوں گے، نماز فجر کے بعد جانا“۔

صبح ہوئی ڈاکٹر صاحب بلانے گئے مگر ان کے پہنچنے تک حضرت والا کی طبیعت بہتر ہو چکی تھی، ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن دراصل طبیعت نے یہ آخری سنبھال لیا تھا اور غالباً منشاء خداوندی یہ تھا کہ اہل و عیال سے آخری مرتبہ ضرورت کی گفتگو بھی ہو جائے اور خود کو چھ کرنے والے کی بھی تشفی ہو جائے کہ قدرت کا دستِ کرم اس کے پسماندوں کے سر پر قائم ہے۔ چنانچہ دونوں ہی باتیں پورے اطمینان سے ہو گئیں۔

پہلے حضرت والا نے تنہائی میں اپنے بھتیجے اور داماد جناب مہم کو طلب فرمایا اور ان سے یہ گفتگو فرمائی:۔

س۔ عاصم میاں!

ع۔ جی!

س۔ آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا!

ع۔ جی نہیں (کیونکہ تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے تو مہلت ہی کم ملی اور جو وقت

ملا اس میں بھی قرب بہت کم حاصل رہ سکا)

س۔ تمہیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا!

ع۔ جی نہیں! (وہی تعلیمی مشغولیت اور قیام علی گڑھ کی وجہ سے)

س۔ (حسرت بھری نگاہ اور لہجہ درد میں) لیکن اس مرتبہ تمہیں موقع مل گیا!

ع۔ (ہلکا کر) میرے باپ! میں نے آپ کی کوئی خدمت نہ کی!

اس پر حضرت والا مسکرا دیئے۔۔۔۔۔ گویا زخم پر مرہم رکھ دیا اور رخصت

فرمایا، عاصم صاحب سمجھ نہ سکے کہ یہ قیامت تک کے لئے وداعی پیام ہے۔

اس کے بعد اہلیہ محترمہ کی طرف خطاب کا رخ ہوا، دریافت فرمایا گیا کہ:-

”آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہیں؟“

اہلیہ محترمہ نے بات ٹالنے کی کوشش کی کہ یہ بھی کوئی سوال ہے؟

مگر وہاں تو اتمام حجت اور اطمینان آخر مقصود تھا، اصرار ہوا کہ میرے سوال کا

لے حضرت والا نے یہ بات بیرانی صاحبہ کی مرضی پر چھوڑ دی تھی کہ وہ خواہ عاصم صاحب کے ساتھ مستقل

سکونت تجویز کر لیں یا سید حسین صاحب کے ساتھ، کیونکہ ابھی صاحبزادہ سلمان زیر تعلیم تھے اور گو

بڑے صاحبزادے سید سہیل (انسپیکٹر کسٹمز چانگام) اس خدمت کے پہلے حق دار اور اس

سعادت کے دل سے خواہاں تھے، مگر چونکہ ان کی معاشی حالت اچھی نہ تھی اور ملازمت بھی ایسی

ہے کہ کسی ایک جگہ قرار نہیں، اس لئے دونوں داماد ہی میں قرعہ پڑ گیا تھا اور یہ اسی کے نام اٹھا

جس کو وہ ہری نسبت حاصل تھی،

جواب دیجیے، بیکار باتوں میں نہ الجھائیے۔ تب اہلیہ مخترمہ کو فرمایا ہی پڑا کہ :-
”بے شک“ (عام کے ساتھ مطمئن ہوں)

اس جواب سے حضرت والا بھی مطمئن ہوئے اور فرمایا :- ”الحمد للہ میرا قلب بھی
بہت مطمئن ہے!“ _____ گفتگو ختم ہو چکی تھی۔

اطمینان و سکون کے ساتھ اہل و عیال سے یہ آخری دوائی گفتگو خود ایک اصلی
کرامت ہے، جو اتباع سنت کے صدقہ میں کسی کو مل جاتی ہے۔ مگر اس کے علاوہ
بھی ایک حتی کرامت کا ظہور ہو گیا، جس میں رخصت ہونے والے کو دکھایا گیا کہ اس
کے غیاب میں قدرت کا دستِ کرم اس کے پسماندگان کا دستگیر رہے گا، ہوا یہ کہ اُسی
آخری دن نمازِ ظہر کے بعد حضرت پیرانی صاحبہ حسب معمول حضرت کی صحت کے لئے
دعا مانگ رہی تھیں کہ یکا یک ایک سفید پوش ہستی دفعۃً نمودار ہوئی اور اس نے دو دھیا
رنگ کا گلاس مخترمہ (مدظلہا) کی خدمت میں پیش کیا، مخترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے،
اور پیچھے مڑ کر حضرت والا سے (جو بنگلہ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا کہ:
”آپ نے کچھ دیکھا؟“

جواب ملا :- ”کیا ہوا؟“

پیرانی صاحبہ نے اپنا مشاہدہ بیان کیا، تو خلافِ عادت اس کی تصدیق فرمائی،
اور پورے اطمینان سے ارشاد فرمایا :-
”یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے۔“

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ بندہ اپنے رب سے کوچ کا اشارہ پا چکا تھا۔
اب اندازہ لگائیے کہ کس راحت و سکون سے، کس یک سوئی اور اشتیاق سے بندہ کی روح
لے تشریف فرات کے سوا اصل گفتگو سب مخترمہ صاحب کے معنوں مولدِ سابق سے ماخوذ ہے۔

لے ورنہ از دوسے احادیث یہ معاملہ حضراتِ انبیاء کے ساتھ خاص ہے!

اپنے رب کی طرف پرواز کر گئی ہوگی!

شام و دُاع کا منظر | اتوار کا دن اب ختم ہونے کو ہے، عام دنوں سے آج صحت

چونکہ زیادہ بہتر نظر آئی، اس لئے اہلیہ محترمہ نے شام میں کچھ دیر کے لئے کسی عزیز کے ہاں جانے کی اجازت چاہی۔ بہت دنوں سے جانا چاہتی تھیں، مگر حضرت والا کی طبیعت کے آثار چڑھاؤ سے ارادہ ملتوی ہوتا چلا جا رہا تھا، آج اس کا اظہار قدرت کی طرف سے مقدر تھا۔ حضرت والا نے فرمایا:-

”مزدور جانیئے، مگر جلد واپس آئیئے، ایک گھنٹہ کا وقت ہے۔“

اس جواب کے آخری جز پر سننے والوں کی توجہ پھیر دی، مگر جب وقت گزر گیا تو وہی بات یاد آ کر تیر چوست کی طرح کھٹکتی رہی۔

بہر حال پانچ بجے پیرانی صاحبہ صاحبزادیوں کو لے کر چلی گئیں، حضرت والا کے پاس صرف ان کے قابل رشک خدمت گزار فرزند سلمان میاں موجود تھے اور گھر میں عاصم صاحب بھی!۔ عصر کے فوراً بعد میری حاضری کا وقت بھی تھا، مگر مائے رے محرومی کہ آج ہی لہو و لعب میں کچھ ایسی دیر ہو گئی کہ میں برسوں کے معمول کے خلاف مغرب سے قبل پہنچ ہی نہ سکا، میرے ہم وطن پیر بھائی مشتاق جوہری آج قبل مغرب حاضر تھے، حضرت اقدس نے ان سے فرمایا کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا تھا مگر اب اچھا ہوں۔ ایسے میں نماز مغرب کا وقت آ گیا، سلمان میاں نے ضروری اہتمام فرمایا، حضرت والا نے دوزانو بیٹھ کر اور سامنے دو تکیے رکھ کر بیٹھے بیٹھے نماز ادا فرمائی، اور نماز سے فارغ ہو کر تبسم ہوئے، صاحبزادے نے جاں نثاری کے ساتھ تبسم کی وجہ پوچھی، فرمایا:

”آج میں نے شوکت علی مرحوم کی کسی نماز پڑھی ہے۔“

سلمان میاں نے اس کی وضاحت چاہی تو ارشاد فرمایا:-

”وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔“

اس کے بعد صاحبزادے نے عرض کی کہ ”ابا سو جائیے، آپ رات کو بھی نہیں سوئے ہیں۔“

حضرت نے فرمایا ”بہت اچھا“

یہ نطق سلیمانی کے آخری کلمات تھے۔

اس کے بعد داہنی کروٹ، قبلہ رخ، دائیں ہاتھ کو گال کے نیچے دبائے اور پاؤں کو سیکڑے حضرت عین مطابق سنت لیٹ گئے اور آنکھیں بند فرمالیں۔ ایسے میں راقم عاجز بھی پہنچ گیا، دیکھا کہ مشتاق صاحب اور عاصم صاحب کمرے کے باہر چوتھرے پر باتیں کر رہے ہیں، میں بھی وہاں کھڑا ہو گیا، خیریت پوچھی تو عاصم صاحب نے فرمایا کہ رات کو تکلیف بڑھ گئی تھی، دن اچھا گزرا، ابھی لیٹے ہیں۔ جی بہت چاہا کہ پھر کمرہ میں جا کر دیکھوں، مگر اس خیال سے کہ کہیں آہٹ پا کر آنکھ نہ کھل جائے میں باہر ہی بٹھرا ہوا۔

ہم تینوں بالکل مطمئن ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ سلمان میاں کچھ پریشان سے باہر آئے اور مجھ سے فرمایا کہ ذرا جلد آکر دیکھئے، میں مضطربانہ کمرے میں داخل ہوا اور عاصم صاحب و مشتاق صاحب بھی لپک آئے، میں نے نبض دیکھی، چہرہ مبارک کو دیکھا، خطرہ کی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔

نہ تنفس ہی کچھ تیز تھا، نہ اضطراب کی کوئی کیفیت، التنبہ نبض کمزور تھی، مگر یہ ضعف تو موت سے قائم تھا مگر سلمان میاں نے بتایا کہ چند ہی لمحے گزرے کہ حضرت پر شدت ضبط کے آثار پیدا ہو گئے تھے، اور مٹھیاں بچھن لگی تھیں، اس پر میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر کو فوراً بلوالیا جائے۔

لے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا جسم آخر زمانہ میر بھاری ہو گیا تھا۔ رکوع و سجود سے معذور تھے۔

اب میں حضرت والا کے مواجہ میں اس طرح بیٹھ گیا کہ ان کا دست مبارک میرے ہاتھ میں تھا، میری انگلیاں ان کی نبض پر اور نظریں چہرہ جمال پر جمی ہوئی تھیں مگر ہوش و حواس اڑے جا رہے تھے۔ پاس ہی سلمان میاں تصویر وحشت بنے کھڑے تھے۔

عاصم صاحب نے فوراً ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کیا، مگر انہوں نے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا تو پھر کسی اور ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑ نکلتے، ان کے جاتے ہی سلمان میاں نے کرنل جمن وغیرہ سے ٹیلیفون پر بات کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود ہوئی۔

میں اپنی جگہ ایک حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہلکا سا جھٹکا تنفس میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہچکی آگئی ہو، چہرہ پر دفعۃً خون کی لہر دوڑ گئی اور بس طائر روح نفسِ عنقریب سے پرواز کر گیا تھا۔۔۔۔۔ اتنا کٹھن مرحلہ اس آسانی اور اس سکینیت و سمرعت کے ساتھ طے ہو گیا کہ گویا گرہ کھل گئی ہے۔۔۔۔۔ اس وقت شام کے ۱۲ بجے تھے۔

اب میں اٹھا، حضرت مرشد علیہ الرحمۃ کے پاؤں سیدھے کر ہی رہا تھا کہ سلمان میاں نے آبدیدہ ہو کر پوچھنا شروع کیا۔ "کیوں غلام محمد صاحب کیا بات ہے؟ کئیے کیا بات ہے؟ میں کیا عرض کرتا، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، سلمان میاں بے تابانہ ڈاکٹر کرنل جمن کو بلانے کے لئے گھر سے نکل گئے، عاصم صاحب بھی ابھی تک واپس نہ آ سکے تھے۔۔۔۔۔ اس خادم حقیر نے اپنے مخدوم قدس سرہ کو چپٹ لٹا کر ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیے، نورانی پیشانی پر بوسہ دے کر پاؤں سے سڑک چادر

لے کر مرید شریف میں آتا ہے کہ مومن کی روح اس آسانی سے نکال جاتی ہے کہ گویا گرہ کھول دی گئی ہو۔ اس سلسلہ کی ساری احادیث حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ شوقِ وطن "میں جمع فرمادی ہیں، اس رسالہ کو پڑھ کر موت محبوب ہو جاتی ہے۔

نہ دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے مغرب کوئی پونے چھ پر ہو رہی تھی۔

اڑھادی، اور عاصم صاحب اور پیرانی صاحبہ کی واپسی کا منتظر ہی تھا کہ عاصم صاحب
نشریف لائے، مجھے مغموم دیکھ کر وجہ پوچھی بے زبانی نے ماحر اسنادیاء ان کی حالت دفعۃً
متغیر ہو گئی، دل بیٹھنے لگا، ایسے میں پیرانی صاحبہ مع صاحبزادیوں کے لوٹ آئیں، ایک
کہرام مچ گیا۔۔۔۔۔ اتنے میں سلمان میاں بھی ڈاکٹر جن کو لے کر آئے تھے مگر اب ڈاکٹر کا
کام ہی کیا تھا، ایک نظر دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بس جو ہونا تھا ہو چکا، سلمان
میاں کی رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی، بے تحاشا رونے لگے۔

ہم لوگوں کو اس کا ہوش نہ تھا کہ اس سانحہ کی اطلاع عام کا فکر کرتے مگر کسی
ذریعہ سے نشر گاہ والوں کو یہ خبر مل گئی اور آٹھ بجے شب کی خبروں میں نشر کر دی گئی،
پھر تو کیا تھا، مختلف اخباروں کے دفاتر سے ٹیلیفون آنے شروع ہو گئے کہ کب انتقال ہوا
انتقال کے وقت مولانا کے پاس کون تھا؟ کیا تفصیل رہی، مولانا کا سن پیدائش کیا تھا؟ بھی
میں نے اور کبھی عاصم صاحب نے جوابات دیے۔۔۔۔۔ ادھر ننگساروں کی آمد
کا تانا بندھ گیا تھا، توسلین و منتبین آئے، عمائد شہر و حکام آئے، علماء و اہل سیاست
آئے، عام قدر شناس اور اہل محبت آئے ۱۰، ۹ بجے رات تک سیکڑوں کا اجتماع ہو گیا۔

پیرانی صاحبہ کی حالت رفیعہ

ننگین کون نہیں تھا؟ پر جو اندوہ و غم
حضرت اقدس کی اعلیٰ محترمہ کے قلب حزین

کو سہنا پڑا اس کا اندازہ کوئی اور کیا لگا سکتا ہے! ان کا سب کچھ ٹٹ گیا تھا، وہ اگر
اس سانحہ پر بے قابو ہو جاتیں تو معذرت تھیں، مگر ایک ولی کامل کی رفاقت نے
دین کا رنگ کچھ ایسا چڑھا دیا تھا کہ عین اس وقت جب قلب و جگر خون ہو چکے تھے
وماغ پر شریعت غالب اور زبان سے حدود اللہ کی تلقین جاری تھی، آنکھیں اشکبار
آواز بھرتائی ہوئی، مگر بات زبان سے وہی نکل رہی تھی جس کی ایک صاحب مقام اور
خوگر عبدیت ہستی سے توقع کی جا سکتی ہے،۔۔۔۔۔ و فود غم میں صاحبزادیوں

کی زبان سے بعض کلمات ایسے نکل گئے جو خلاف شرع توہم گز نہیں تھے مگر صبر و ضبط کے منافی تھے، پیرانی صاحب نے ایک بار درود بھرے لہجہ میں لٹکا کر فرمایا۔
 ”تم ایک ولی اللہ کی اولاد ہو، خبردار جو تمہاری زبان سے کوئی کلمہ خلاف ادب نکلا، تم سے اگر ضبط نہیں ہو سکتا تو کلام پاک کی تلاوت شروع کر دو۔“

ہمت کا یہ عالم تھا کہ ادھر عاصم صاحب کی حالت دیکھ کر انہیں غمیو کا وزبان چٹایا، ادھر اپنے لخت جگر سلمان میاں کو دلاسا دیا اور صبر کی تلقین فرمائی، پھر اس خادم حقیر کو یاد فرمایا گیا اور کواڑ کی آڑ سے ارشاد ہوا۔

”دیکھو بیٹا! عاصم اور سلمان کا تو بُرا حال ہے اب تم ہی کو سب کچھ کرنا ہے، عاصم دل کے کمزور ہیں اور سلمان کم عمر دونوں کا خیال رکھو!!
 اور دیکھنا تمہارے مرشد ایک ولی اللہ تھے، عاشقِ سنت تھے، کوئی بات خلاف سنت نہ ہونے پائے، غسل میں کرسی خراب عقیدہ والے کا ہاتھ نہ لگنے پائے۔“

اللہ اللہ سنت مقدسہ سے یہ شغف اور اس کا ایسا خیال!! اچھے اچھے زاہدوں و عابدوں کو رشک آجائے تو کیا عجب ہے! چنانچہ اس کے بعد عاصم صاحب کے ہاتھ سو روپے کا نوٹ بھجوایا اور اس خادم کو ہدایت فرمائی کہ کفن کا کپڑا عمدہ قسم کا ہو اور پہننے والے کے مزاج کی نزاکت و نفاست کا پورا لحاظ رہے!

انہی دو تین واقعات سے اندازہ لگائیے کہ عین اس قیامت خیز عالم میں پیرانی صاحبہ کی حالت ایمانی کس درجہ ارفع و اعلیٰ تھی اور یہ بھی دراصل حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت کی نشانی ہے کہ ان سے جو جتنا قریب تھا، اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی اس کی رستگیری فرمائی!!

اور اس ناکارہ کا عجب حال تھا، ایسا جانکاہ حادثہ، مگر نہ گریہ و زاری
راقم کا حال اور نہ بدخواہی! بلکہ دل و دماغ دونوں پرسکون! جب تک حضرت شیخ

کی روح نے پرواز نہیں کیا تھا۔ میرے ہوش و حواس اڑے جا رہے تھے لیکن جب وہ پرواز کر گئی
 تو گویا میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ حضرت عالم سرور و راحت
 میں پہنچ گئے ہیں، دنیا کے پھیرٹوں سے نجات کٹی میسر آئی ہے، بڑی کش مکش کے بعد اب
 آرام کی نیند سو گئے ہیں۔ موت و مفارقت کا عایانہ تصور ذہن سے محو تھا

اور اس کی وجہ محض حق تعالیٰ کا ایک کرم خاص تھا، یعنی مین رحلت کے ساتھ اس
 تصرف الہیہ کی حکمتیں ذہن میں اُتر آئیں اور اس کے الطافِ خفیہ مکشوف ہو گئے جن
 کے افشا کی نہ ہمت ہے نہ مصلحت اس کی اجازت دیتی ہے، بہر حال اس کا یہ اثر تھا کہ
 رحمت الہیہ کے غلبہ نے اپنی ذاتی غرض یعنی شیخ سے مفارقت کی تکلیف کو نامحسوس بنا دیا۔
 حق تعالیٰ کی اسی استعانت کا نتیجہ تھا کہ تجہیز و تکفین اور تدفین کے آخری مراحل
 میں اپنی حیثیت و استحقاق سے کہیں نامزد خدمت کی سعادت حاصل رہی، اور یہ کیفیت
 اس وقت تک رہی جب تک کہ حضرت شیخ کے جسد مبارک کو پیوند خاک کر کے گھر
 لوٹ نہیں آ گیا۔ پھر یہ کیفیت جاتی رہی اور بتائی کا خیال اور بے سہارگی کا احساس اتنا
 شدید ہونے لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پسلیاں ٹوٹ جائیں گی اور دل بیٹھ جائے گا۔ اسی
 درد و کرب میں صرف ایک مصرعہ زبان سے نکلا کہ

و احسرتا کہ چارہ درد و دلم نماند

مہینوں بعد جا کر کہیں رفتہ رفتہ اس کیفیت میں تخفیف ہوئی۔

عرض کر چکا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے عالم حواس کی
تجہیز و تکفین اور جنازہ حفاظت فرمادی تھی اور پیرانی صاحبہ نے تجہیز و

تکفین کا انتظام میرے سپرد فرما دیا تھا۔ ضروری سامان کی فراہمی تو ہاتھوں ہاتھ یوں ہو گئی

کہ حضرت والا کے دست گرفتہ اور معتقدین موجود تھے، میں نے یہ کام ان کے سپرد کر دیا اور بہت جلد وہ بدرجہ احسن انجام بھی پا گیا، مگر میرے لئے اہم اور مشکل مسئلہ نماز جنازہ کی امامت کا تھا، ذہن کے پردہ پر کئی صورتیں سرکاری امام اور لیڈر مولویوں کی آ رہی تھیں کہ وقت پر کہیں ان میں کا کوئی آگے نہ بڑھ جائے، یہ تو آخرت کا معاملہ ہے، اس میں شرط اخلاص و محبت کی مقدم ہونی چاہیے، اسی سوچ میں تھا کہ یکایک ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ تشریف لائے اور ایسے تشریف لائے کہ حج اے لے لے لے تو جواب ہر سوال — کی حقیقت لئے ہوتے! اس عقدہ حل ہو گیا، دل نے کہا کہ حضرت اقدسؒ کے محبوب و محب کے ہوتے ہوئے کسی اور کو امامت کا حق کب پہنچتا ہے، سلمان میاں کے ذریعہ اپنی اس سائے کی توثیق پیرانی صاحبہ سے کروالی اور ڈاکٹر صاحب کو اس فریضہ کے لئے راضی کر لیا، اس وقت رات کے کوئی نو بجے ہوں گے۔

یہ بات طے ہوئی ہی تھی کہ مولانا محمد حسن کا کوروی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا تمیز الدین خان صاحب آگئے، مولانا راغب احسن مولانا قدوس بہاری وغیرہ پہلے ہی آچکے تھے، ان نئے آنے والوں نے فرمائش کی کہ حضرت والا کی زیارت کرائی جائے۔ احقر ان کو کمرہ میں لے گیا جب حضرت شیخ کے خیرہ انور سے چادر اٹھائی تو اس کی چمک سے سب کی آنکھیں چندھیا گئیں، مفتی صاحب کی زبان سے سبحان اللہ کا کلمہ نکلا۔ مولوی تمیز الدین خان ٹھٹھک کر رہ گئے، مولانا محمد حسن صاحب نے بڑھ کر ادب سے پیشانی پر بوسہ دیا، ڈاکٹر صاحب لڑکھڑاتے ہوئے بڑھے اور بیٹھ گئے، پھر حضرتؒ کے دست مبارک کو لے کر چومنا اور آنکھوں سے لگایا، غرض ہر ایک نے حد تعلق کے مطابق اثر لیا،

اس طرح کا سلسلہ تو غیر جاری ہی رہا، مگر منتظنین کے سامنے اب دو باتیں طے شدنی تھیں، ایک تو یہ کہ جنازہ کب اٹھایا جائے؟ دوسرے یہ کہ قبر کہاں بنے؟

اور سلمان میاں کے ایک ماموں جن کو وہ شہوتوں ماموں کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب صوفی صاحب
اور یہ خادم حقیر، ————— ڈاکٹر صاحب بہشتی زلیو رکھول کر کھڑے ہو گئے،
سلمان میاں میری عرض پر تصویر حیرت بنے کھڑے تھے، عاصم صاحب اور شہوں ماموں پانی
بنا کر دیے جاتے تھے میں لوٹا بھر کر پانی ڈالتا جا رہا تھا اور صوفی صاحب دستا نے
چپٹھائے جسم دھو رہے تھے، صوفی صاحب نے پیٹ کو دبا دبا کر قلا کہ کوئی شائبہ نجاست
کا نہ رہ جائے، مگر دستا نہ کی سپیدی پر ایک دھبہ بھی آنے نہ پایا۔ پانی کا اہتمام مرنے
والے نے پہلے ہی کر لیا تھا! عجیب تر مشاہدہ احقر کو یہ ہوا کہ چہرہ کا وقار اور مستم کی
جھلکیاں تو تھیں ہی مگر ہاتھ کے جوڑوں میں لچک تک باقی تھی! جسم ایسا نرم اور اور
بے داغ تھا جیسے کسی زندہ صحت مند کا ہوتا ہے۔

غرض غسل ہو چکا، سفید براق سا کفن پہنا دیا گیا، سر اور ناک میں کاغذ لگایا گیا
اور ریش مبارک معطر کر دی گئی، جنازہ تیار ہو گیا۔

سفر لے مصر و حجاز اور ڈاکٹر محمود حسین وغیرہ نے زیارت کی تمنا ظاہر کی، کرا دی گئی
پھر کمرہ بند کر کے گھر کی مستورات نے زیارت کا شرف پایا،
اس وقت ڈار منزل کے باہر ہزاروں کا مجمع ہو چکا تھا، میت کا ڈول اچھاٹک سے
باہر رکھا گیا اور اس کے دونوں طرف خوب لانسے لانسے بانس باندھ دیے گئے تھے۔
کہ وقت واحد میں سینکڑوں آدمی کندھا دے سکیں۔

اب جنازہ کمرے سے باہر نکالا گیا، کہرا چڑ گیا، گھر والے رو رہے تھے، باہر والے
چیمیں مار رہے تھے، اس نالہ و فغاں کے ساتھ میت کو پھاٹک سے باہر لا کر ڈول
چھوٹا سا چاقو تھا ————— ان تبرکات کی تقسیم یوں ہوئی کہ چانو تو غالباً گھر میں نہ لے گیا۔ انگوٹھی

ساجزادہ سید کے حصہ میں آئی اور سید پرانی صاحبہ نے منظر ہائے راقم خیر کو عنایت فرمائی۔

لے گیا ہوا حصہ حسین کا نام بہشتی گوہر ہے، اس میں ان سائل کی تفصیل ہے۔

میں رکھا گیا اور یوں پورے وقار و مکننت کے ساتھ ہزار ہا شیدائیوں کے کندھوں پر جنازہ چلا۔

ط عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

زیر لب ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“

کی تسبیح کے ساتھ بعد ادب و احترام نیوٹاؤن کی جامع مسجد میں جنازہ پہنچا جہاں آخر دنوں میں حضرت والاؒ نماز جمعہ پڑھا کرتے اور اپنے ارشادات سے لوگوں کو کچھ دیر کیلئے مستفید بھی فرمایا کرتے تھے۔ نیوٹاؤن کی مسجد ابھی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھی، مسجد کے سامنے سارا میدان کھلا پڑا ہوا تھا، جنازہ کو مسجد کی درمیانی بیڑھیوں کے سامنے رکھ کر میدان میں لائبریری صفیں (کہ ایک ایک صف میں چار چار پانچ پانچ سو آدمی ہونگے) بن گئیں، علماء، سفراء و ذرار، حکام اعلیٰ اور عوام سے میدان پُر گیا، مگرین کے انتظام کے ساتھ ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اب لوگوں کا اشتیاق تھا آخری بار حضرتؒ کی زیارت کرا دی جائے، مناسب بھی یہی معلوم ہوا کیونکہ یہاں زیارت کروانے میں زیادہ آسانی تھی، جنازہ کے قریب چند لوگ انتظام کے لئے کھڑے ہو گئے، معام صاحب اور سلمان میاں وغیرہ چہرہ مبارک پر چادر تان کر کھڑے ہو گئے کیونکہ دس بج چکے تھے اور سورج کی شعائیں تیز تھیں، زائرین نے قطار بندی کے ساتھ باری باری سے زیارت کی، اور کس کا دل تھا جو اس چہرہ مبارک کی تابانی سے اس کے سکون و وقار اور اس پرہیزگار کی جھلک دیکھ کر متاثر نہیں ہو رہا تھا، جس نے دیکھا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس کے دل نے تصدیق کی کہ وہ ایک ولی اللہ کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے!!

کوئی گھنٹہ بھر میں یہ سلسلہ زیارت ختم ہو سکا۔

جامع مسجد نیوٹاؤن سے میت اٹھا کر مدفن پہنچائی

تدفین کا دل گداز منظر | گئی، قبر ابھی پوری طرح تیار نہ تھی، جنازہ چہرہ ترہ پر

دکھ دیا گیا، اور مولانا عثمانیؒ کی قبر پر کسی نے مائیکروفون لگا دیا، عالم و فاضل اور شعلہ با۔ خطیب ابوالخیر عرقوسی (کلچرل ایچ می سفارت خانہ شام) خود ہی خوش عقیدت و حزن سے تقریر کے لئے کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ ایک اردو ترجمان بھی تھے۔ ابوالخیر صاحب نے حضرت علامہ کی خدماتِ ملی و کمالاتِ علمی کو اس دل گداز پیرایہ میں خراج تحسین ادا کی کہ سفراء و وزراء عوام اور علماء سب دھڑائیں مار مار کر رونے لگے اور سارا ماحول ماتم کردہ بن گیا، جذبات کچھ ایسے مجروح تھے کہ اس بیس پچیس منٹ کی رواں دواں تقریر کا صرف ایک حصہ یاد رہ گیا کہ :-

"اے سلیمان، تیری مفارقت کا ایسا رنج نہیں، مگر آہ غم اس کا ہے کہ ایک گنجینہ علم و عرفان آج اپنے ہاتھوں دفن کر دیا جا رہا ہے۔"

بے چارہ ابوالخیر صاحب ابھی دو تین روز قبل ہی تو اس گنجینہ علم و فضل سے چند حواہر معانی حاصل کر چکے تھے، اسی کا تاثر ان پر زیادہ ہونا ضروری تھا۔

اس رقت انگیز تقریر کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ تشریف لائے، کھڑے نہ ہو سکے تھے، کرسی پر بٹھا دیے گئے تھے مائیکروفون منہ کے قریب کر دیا گیا پھر بھی آواز نہ وقت تمام نکل رہی تھی، درد بھرے لمبے میں بڑی موزونیت سے حضرت ابوبہریرہؓ کا یہ شعر مفتی صاحب نے پڑھا۔

لنا سہم دلی الیوم ہمان

فقد الجراب و قتل الشیخ عثمان

اور فرمایا کہ ہم ابھی غم عثمانی (مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ) کو بھلائے نہ پائے تھے کہ رسول اللہ

ﷺ نے جہان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت ابوبہریرہؓ نے جیسا اشارہ کیا ہے، یہ ہے ہم

یہ ہے کہ آج لوگوں کے لئے تو ایک غم ہے (شہادت عثمانؓ) اور میرے لئے دو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

علا فرمودہ تو شہدائے دین کے ٹھکانے کا اور دوسرے حضرت عثمانؓ کے رخصت ہونے کا۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نشانی (یعنی حضرت سید سلیمان رحمۃ اللہ علیہ) بھی ہم سے کھو گئے۔
 مفتی صاحب ممدوح اپنے اظہار جذبات پر پوری طرح قابو نہیں پا رہے تھے، اور
 ادھر قبر بھی تیار ہو چکی تھی، اس لئے تقریر ختم کر دی گئی، اب قبر میں سرہانے کی طرف راقم بہجور
 پائینتی کو عبد المنان صاحب (مالک کتب خانہ اشرفیہ) اور وسط میں عاصم معنوم کھڑے ہو
 گئے، سلمان میاں بھی اس سعادت میں شرکت کے لئے بے تاب تھے، مگر ہم لوگوں کے
 عرض کرنے پر وہ سر بالیں پیکر حسرت بنے کھڑے تھے، اب میت کو بہ تمام ادب —
 ”بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی مِلّتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ“ کہتے ہوئے اتار لیا گیا اور قبلہ رخ کر کے کفن کے
 بندھن کھول دیے گئے، ہم لوگ اب اوپر آگئے، کیسی حسرت اور کس قدر الم کا موقع تھا،
 جس کے دل پر جو بھی گزری حیرت ہے کہ سہا کیسے گیا؟ کلیجہ پھٹ کیوں نہ گیا؟ دم آخر کیسے
 اٹکارا گیا؟ — بس اس ذاتِ محمدیت ہی کی امانت تھی ورنہ بات سمجھ میں آنے
 والی نہیں!

قبر پاٹ دی گئی اور سب شرکاء جنازہ نے ”مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ“ — دیکھا
 نَعِيْدُكُمْ — ”وَمِنْهَا نَخْرُجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی“ کے تسکین بخش عقیدے کو
 دہراتے ہوئے مٹھیاں بھر بھر کر مٹی ڈالنی شروع کی اور بس قبر تیار ہو گئی، اب یاد نہیں کہ سرٹنے
 اور پائینتی کھڑے ہو کر کن اصحاب نے سنوں طریقہ پر تلاوتِ کلامِ پاک کی؟ بہر حال اس
 کے بعد سارا مجمع گردن جھکائے، اُداسی کی خاک سر پہ ڈرائے منتشر ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ ۔

ماتمِ سلیمانی

حضرت اقدس کے سانحہ ارتحال پر پاکستان و ہندوستان میں گہرے تاسف و رنج کا اظہار ہوا، دونوں حکومتوں کے صدور، وزرائے اعظم اور علمائے نے تعزیتی پیام جاری کئے اور ان کی عظمت اور گراں قدر خدمت کو سراہا، ملک کے سربراہ و درودہ افراد نے مضامین لکھے، جلسے منعقد کر کے اظہارِ الم کیا، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعزیتی قراردادیں پاس کی گئیں، مدارس دینیہ نے چٹھی کر کے ملک کے طول و عرض میں ایصالِ ثواب کے لئے قرآن پاک کا ختم کیا پاکستان ریڈیو نے خصوصی پروگرام نشر کئے۔ مدت تک دونوں ملکوں کے علمی و ادبی حرائد نے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ پر خصوصی مضامین شائع کئے اور بعض رسائل نے سلیمان غبر مرتب کر کے حضرت کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو محفوظ کیا، شعرائے کرام نے نوحے لکھے تاہم انہیں نکالیں، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں حضرت والارہ کی یادگار کے طور پر علمی ادارت اور لائبریریوں کی بنیاد ڈالی گئی، پاکستان کے دارالعلوم میں بھی سلیمان اکیڈمی کا خاکہ تیار کیا گیا، مگر قوتِ محرکہ کی کمزوری کے باعث تصورِ ذہنی وجود خارجی کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ پاک و ہند سے باہر ممالک اسلامیہ میں بھی حضرت والارہ کی رحلت کو ملتِ اسلامیہ کا حادثہِ عظیم قرار دیا گیا، مصر و شام و حجاز کے علماء اور ادیبوں نے مضامین لکھے، اور اس سے بڑھ کر مفید بات یہ ہوئی کہ حضرت والارہ کی مرتب کردہ سیرت النبی اور خطباتِ مدراس کے ترجموں کا کام تیز تر کر دیا گیا، چنانچہ خطباتِ مدراس کا عربی ترجمہ تو شائع بھی ہو چکا ہے سیرۃ کی جلدیں، عربی، ترکی، فارسی میں منتقل ہو رہی ہیں، کئی کئی جلدوں کے تراجم ہو چکے ہیں حضرت والارہ کے عربی و یونانی کی اشاعت بھی مشرق وسطیٰ میں عنقریب ہونے والی ہے!

غرض لکھنے بیٹھتے تو ”مرگ سلیمان کا عالمگیر ماتم“ ایک مستقل موضوع ہے، مگر یہاں
 سیکڑوں میں سے صرف دو چار قطعات اور نوے نقل کر کے قلم کو روک لیا جاتا ہے اور اس
 انتخاب کا معیار شاعر کی اپنے مدوح سے حقیقی واقفیت اور اس کے رُتبے و منزلت سے
 پہچی آگاہی ہے، نہ محض شاعرانہ کمال اور مباغہ آرائی !!

تاریخی قطعات یوں تو بہت سوں نے لکھے مگر ہمارے ملک کے مشہور شاعر جناب
 حفیظ ہوشیار پوری سے آگے کوئی نہ بڑھ سکا حفیظ کا قطعہ بالکل الہامی ہے، ملاحظہ ہو:-

قطعہ ثانی بیچ

کشتودہ پر بہ تمنائے عالم باقی
 ز خاکدانِ فنا رختِ زندگی بر بست
 نشانِ صاحبِ عرفان بہ زیرِ خاکِ نجو
 ہمیں کہ تختِ ملیماں باوجِ فردوسِ اُلت

۱۹۵۳ء

اب حکیم الشرا حضرت امجد حیدر آبادی کا ایک مقبول عرفانی قطعہ اودھن رباعیات
 غم ملاحظہ ہوں۔

قطعہ مقبول

سلیمان سریرِ علم و حکمت رواں شد ہوئے عرشِ ربِ اعلیٰ
 بآبِ دیدہِ الشِ نوشتم علیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ

۱۳۷۳ھ

اس قطعہ کے متعلق خود حضرت امجد کا ارشاد ہے کہ :-
 ”یہ قطعہ عالم خواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا گیا، اے مگر سبحان اللہ
 فرمایا۔“
 حکیم الشعراء نے اسی تاثر میں ڈب کرتین رباعیات اور کہی ہیں، جو یہ ہیں :-

رباعیات

اصلیت اگر نہیں تو دھوکا ہی سہی اللہ! بہت نہیں تو تھوڑا ہی سہی
 تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو رویت ممکن نہیں تو رویا ہی سہی

دل شاد اگر نہیں تو ناشاد سہی لب پہ نغمہ نہیں تو فسیاد سہی
 ہم سے دامن چھڑا کے جانے والے جا، جا، اگر تو نہیں تری یاد سہی

کیا جانے وہ نور تھا یا سایہ تھا شعلہ سا کسی نے دل میں بھڑکایا تھا
 آیا کس وقت، یہ تو معلوم نہیں جاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں آیا تھا

”دریغایسد سلیمان ندوی“

(از حضرت حکیم اشفاق حسین صاحب بریلوی ثم لاچوی رحوم، مجاز صحبت حضرت حکیم الامت)

دریغاکه سید سلیمان ندوی	که بوده سر عالمان زمانه
فتیبه و مفسر ادیب و محدث	مؤرخ، محقق، یگان زمانه
کلاه سر افتخار و بزرگی	عمید و عمود سران زمانه
تقی، نقی، صفی، ولی	سبق برده بر صوفیان زمانه
چه صاحب دے منبع علم و عرفان	ستودند صاحب دلان زمانه
قلیل الطعام و قیسر المنام	قلیل الکلام میان زمانه
مفیض علوم و معارف به دنیا	که بردار دستا، اوستان زمانه
به اقوام عالم معرفت مشرف	مکرم به اسلامیان زمانه
مخلی زسوء و محلی باحسان	بر و مند از و محسان زمانه
حیات زمان طیبه از علو مشش	زمان مثل جسم او روان زمانه
چو رخت سفر بست با نادر و رطله	لگو گیر شد خاندان زمانه
ازیں حادثه عالمی دل گرفته	دریں فاجعه عالمان زمانه
گزین آشیان طیر و وحش به سدره	پریده ازیں آشیان زمانه
فلکیان بگفتند اهل اوسه لا	به غم مبتلا فانیان زمانه
به فردوس یاب سلیمان سریرے	دعا از من و دوستان زمانه

به محشر شفیعش شفیع الوری کن

بجنتات با مخلصان زمانه

نوحہ سلیمانؑ

یا

”عقیدت کے چند آئینے“

(از حضرت مولانا سید مناظر (حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ)

لے سلیمان! آہ پیغمبر کا وہ سیرت نگار
آج محفلِ علم کی افسوس سونی ہو گئی
اب کرے گا کون ہم میں دین کے اسرار کو
خدمتِ بے مزد کرتا کون ہے اسلام کی
ذوقِ علمی کی ترے عربی زبانِ ممنون ہے
گوڑا حاندوہ میں تھا لیکن علی گڑھ دیوبند
خندہ زن یورپ تھا قرآنی قصص پر چہل سے
ہند اور تاریخِ اسلامی کے اسرار و رموز
چاک پر دوں کو کرے گا کون استشراف کے
حوصلہ افزائیاں تیری خدا بخشے تجھے
اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی
آج ہیں مہبوت تیری راہ کے سایے رفیق
کھوئے کھوئے آجکل ہیں جوش بھی و ہوش بھی
خلاق تیرا، حلم تیرا، تیسرا شرمیلا مزاج

جس پہ نازاں ہند تھا اور فخر کرتا تھا بہار
دین و دانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار
کاوشِ تحقیق کی صیقل گری سے آشکار
کس پہ ہوگا مفت کے اس عشق کا سودا سوار
مددے کی تعلیم کا مانا گیا تو شاہکار
تیرے علم و فضل کا کرتے تھے دونوں اعتبار
تیرے خامہ نے بتایا اس کا تاریخی وقار
سود ہو تم بھی جہاں سویا تمہارا راز دار
ان کی چالوں پر کرے گا خود انہیں کو شرمسار
کتنے ناکامے بنے انہی بدولت اہل کار
راے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار
گم وہی ہے ان میں جو تھا سب سے بہتر شہسوار
حضرت امجد بھی چپ ہیں اور جگر بھی دلفگار
یاد میں انکی رہیں گی اپنی آنکھیں اشکبار

لے یہ عنوان بھی خود مولانا گیلانی کا اختیار فرمودہ ہے!

فتنہ بھائے تُو بہ نو سے ہو گئی آزاد تُو
 جن کے تو قابل نہ تھا ان سے ملی تجھ کو عجبات
 اہل دنیا اب نہ آتیں گے ستانے کے لئے
 اب بیاں چاہیں گے نہ تجھ سے محافت کے سفیر
 کا کیا ہے اب خدا والوں کا ایسے عہد میں
 پیری و بیماری میں اللہ رے جیستی تری
 بس گئے ہوں جسکے دل میں جڑ لے لعلین
 دل بھی کہتا ہے کہ تو مرحوم ہے مغفور ہے
 ہے یہی کافی کہ تجھ کو تھا نو سی دربار سے
 گرچہ تو تنہا گیا ہے پر دلاتا ہوں یقین
 حق کی مرضی تھی دگر نہ آرزو اپنی یہ تھی
 ہے جہد مد فون تو کیا روح تو آزاد ہے
 قافلہ سالار اب بھی غمزدہ مسعود ہے
 رو رہے ہیں منہ چھپائے مولوی عبدالسلام
 شاہ مولانا معین الدین احمد کو بھی دیکھ
 اور عزیز خاص تیرا وہ صباح الدین عزیز
 راہ میں آئے گا کھنڈ اور دیا باد بھی

میر قادی میں یہی اک چیز ہے وجہ قرار
 وہ بھی ہلکے ہو گئے جنکے دلوں کا تھا تو بار
 ایک ہی مسئلہ کو پوچھیں گے نہ تجھ سے بار بار
 وقت کو ضائع کر گئی اب نہ پبلک کی پکار
 خود نمائی خود فروشی کی ہو جب دنیا شکار
 جست اکا ایسی لگائی ہو گیا دنیا سے پار
 گود میں اسکو نہ لے کیوں رحمت پروردگار
 مصطفیٰ تیرے شفیع اور رب ترا آمرزگار
 جانشینی اور خلافت کا تھا حاصل افتخار
 آرہے ہیں آگے پیچھے سب تسک احباب یار
 ہوتا اعظم گدھ میں یا دسندھی میں تیرا مزار
 اپنے تصنیفی ادارے کی تماشا کر بہار
 بعد تیرے پشت پر اپنے اٹھائے تیرا بار
 دل بھی اور آنکھیں بھی انکی آج ہیں خونبار
 چاک ہے جن کا گریجاں اور دامن تار تار
 تیرے ہی در پر پڑا ہے خستہ و زار و نزار
 بس جہاں تھامے کلچیر تیرے کچھ یاد ان غار

ہو کبھی آنا جو دسندہ تو رہے اس کا خیال

ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوؤں کا مزار

لے گیلانی نام اس قصبہ کا ہے جو مولانا مناظر حسن رحمۃ اللہ علیہ کا وطن تھا، مولانا بجائے گیلانوی کے اپنے
 نام کے ساتھ محض گیلانی تحریر فرماتے تھے جس پر بہت سوں کو یائے نسبت کا گمان رہا۔

”آہ سید صاحب!“

(از شاہ معین الدین احمد ندوی ”مدیر معارف“)

علم و اخلاق کی دُنک اُجڑ گئی

رفتی واز رفتن تو عالمے تار یک شد تو مگر شمعنی چور رفتی ہر دم بہم ساختی
 آہ گذشتہ مہینہ ۲۶ نومبر کی رات کو کراچی ریڈیو اسٹیشن سے یہ جانکا و خبر بجلی بن کر
 گری کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی
 شب کو طبعاً بچے اس جہان فانی کو الوداع کہا، یہ خبر وابستگان دامن سلیمانی کے لئے ایسی
 ناگہانی اور ہوش ربا تھی کہ کچھ دیر تک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو گیا، مگر مشیت الہی پوری ہو
 سکو رہی اور بالآخر یقین کرنا پڑا کہ اس مسیحانفس نے بھی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی،
 جو عمر بھر اپنی زبان و قلم سے مردہ دلوں میں روح پھونکتا رہا، اور امراضِ ملت کا وہ ماہر
 طبیب اٹھ گیا، جس نے اس کے نالواں جسم میں نئی طاقت و توانائی پیدا کی، وہ چشمہ
 فیض خشک ہو گیا، جس کی آبیاری سے دین و ملت کا چمن سیراب تھا، وہ شیخ کا مل
 اٹھ گیا، جس نے دلوں کی دنیا منور کی، وہ شمع خاموش ہو گئی، جو نصف صدی تک علم و
 فن کی ہر مجلس میں ضیا با رہی، وہ تاجدارِ رخصت ہو گیا، جس کا سکہ علم و فن کی پوری
 اقلیم میں رواں تھا، اسلامی علوم کا وہ امام و مجدد اٹھ گیا، جس نے ان کونئی زندگی بخشی
 مذہبِ اسلام کا وہ منکتم اور اسلامی تاریخ و تمدن کا وہ محقق اٹھ گیا جس نے ان کو
 ان کی اصل شکل اور نئے لباس میں جلوہ گر کیا۔ پیغامِ محمدی کا وہ شارح و ترجمان خاموش

ہو گیا، جس نے اپنی دینی بصیرت سے اس کے اسرار و حکم بے نقاب کئے، اور اس کی ذات جامع الصفات پر علوم کی جامعیت کا خاتمہ ہو گیا۔

لیس من الله بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

وہ مذہب و سیاست، علم و فن، تالیف و تصنیف، تعلیم و تدریس، تقریر و تحریر، انشاء و خطابت، وعظ و پند، ارشاد و ہدایت، ہر مجلس کا صدر نشین اور اپنے علمی کمالات میں آئمہ سلف کی یادگار تھا، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، مغازی و سیرت طبقات و تراجم، تاریخ و جغرافیہ، شعر و ادب، جملہ فنون پر اس کی نظر عہدہ اندہ، اور اس کے زبان و قلم کی روانی و حکمرانی یکساں تھی، اور ان میں وسعت و دقت و نظم و فہم و بصیرت تلاش و تحقیق اور مہارت فن کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کرتی رہیں گی، اس کے علمی کمالات کا لوہا دنیا نے اسلام کے نامور علماء اور یورپ کے مستشرقین تک ماننے نہ تھے،

وہ جدت و قدامت کا سنگم، اسلامی علوم کے ساتھ جدید افکار و تصورات، نئے رجحانات اور عہد حاضر کی تحریکات سے پوری طرح واقف اور تلاش و تحقیق اور نقد و نظر کے جدید طریقوں کا بھی ماہر تھا، اس دور کا وہ پہلا منکلم ہے جس نے اسلامی علوم اور مذہبی عقائد و خیالات پر فکر و تدبر اور ان کی تعبیر و ترجمانی کا ایسا حکیمانہ طریق اختیار کیا کہ دین و مذہب، نقل و روایت اور سلفیت و قدامت کی روح کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے ان سے عقل و ہدایت اور جدت و روشن خیالی کی نقیض منادی اور ان کا معاون و مددگار بنادیا اور مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے معترضین اور تکفہرینوں کی جہالت کا پردہ چاک کر کے ان کو ایسے

حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ مخالفین و منکرین بھی ان کی عظمت ماننے پر مجبور ہو گئے اور علمائے امت نے بھی اس کو تحسین کی نظر سے دیکھا، اور اس طرز فکر اور طریقہ تعبیر کی ایسی شاہراہ قائم کر دی کہ آج اس راہ کے سارے راہروا سی راستہ پر گامزن ہیں۔

اس کی ذات میں روشن ضمیری و روشن دماغی ذوق کے تنوع، علوم کی جامعیت عقائد میں رسوخ و پختگی، اعمال میں استقامت، ثقاہت و منانیت، قلب و نظر کی وسعت، مسلک میں اعتدال و توازن، لوح اور نرمی، حسن مذاق، اور لطافت مزاج کا ایسا عجیب و غریب اجتماع تھا کہ طبقہ علماء میں اس کی نظیر شکل سے ملے گی اور اس مسلک اعتدال کا وہ مبلغ بھی تھا، اس لئے مختلف مشرب و مسلک کے مسلمانوں میں وہ مقبول رہا۔

اس کا مزاج و مذاق ابتداء سے دینی تھا، کس دور میں بھی اس کا قدم جادہ مستقیم سے نہ ہٹا اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ برابر گہرا ہوتا گیا، اور آخر میں تفسیر النبی کی برکت اور سلوک و تصوف کے فیض سے ہو ہو سلف صالحین کی تصویر، اور سراپا حلیف و اثر بن گیا تھا، اس کی صحبت میں بیٹھ کر اس کی باتیں سُن کر اور اس کی صورت دیکھ کر ایمان میں تازگی پیدا ہوتی تھی، اس کے اعمال و اخلاق "خلق عظیم کی عملی تفسیر" تھے، وہ فطرۃ پاک دل، پاک طینت، سراپا شرافت و انسانیت، سراپا خلق و مروت، سراپا مہر و محبت اور سراپا جمال تھا، عزیزوں کا معاون و مددگار، دوستوں کا ہمدرد و نمکسار اور غریبوں اور بے کسوں کا ہمدرد و غمخوار تھا، ضبط و تحمل کا پہاڑ، ایشار و قربانی کا سیکر اور غفو و درگزر کی تصویر تھا، اس کو خدا نے حقیقی بڑائی بخشی تھی، اس

لئے مصنوعی اور خود ساختہ بڑائی کے پیچھے سمجھی نہیں پڑا، اور دنیاوی جاہ و اقتدار کی ہوس سے ہمیشہ دور اور کبر و نخوت سے نفور رہا۔

اس کی پوری زندگی ایثار و قربانی اور حلم و عفو کا نمونہ تھی، اور یہ وصف حدود اعتدال سے بڑھ گیا تھا، اس کا سینہ بے کینہ، اور اس کا دل ایسا شفاف و خلی آئینہ تھا، جس میں دشمن کے لئے بھی گرد و کدورت کی گنجائش نہ تھی، اس نے قدرت اختیار کے باوجود کبھی دشمنوں سے بھی انتقام نہیں لیا اور بداندیشوں کے ساتھ بھی ہمیشہ بھلائی کی، اور اس کے لئے ہر نقصان گوارا کیا اور بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا، اس لئے وہ محبوب القلوب تھا اور اس کی عزت و محبت دلوں میں جاگزیں تھی جو عند اللہ اس کے مقبول ہونے کی سب سے بڑی سند ہے، قلم اس کے کمال و جمال کی مصوری سے عاجز و درماندہ ہے، اس کی جو تصویر کھینچی جائے گی، وہ ناقص و ناتمام ہی ہوگی،

ع ہر چند مدحت می کنم لیکن اناں بالاتری

ملک و قوم، دین و ملت اور علم و فن کا کوئی رخ اور کوئی پہلو بھی اس کے خدمات سے خالی نہیں ہوتا اس راہ میں اس کے کارنامے بڑے عظیم الشان اور گونا گوں ہیں، اس لئے اس کی موت و حقیقت ایک حادثہ نہیں مجموعہ حوادث ہے اور اس کا ماتم ایک شخص، ایک وصف، ایک کمال، ایک قوم اور ایک ملک کا ماتم نہیں بلکہ دین و مذہب کا ماتم ہے، ملک و ملت کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، علم و فن کا ماتم ہے، خلق و شرافت کا ماتم ہے اور پوری ملت اسلامیہ اس کے غم میں سو گوارا ہے، کہ آج غزالی و نازکی، ابن تیمیہ و ابن قیم، رومی و سنائی شاہ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی یادگار دنیا سے اٹھ گئی اور شہنشاہ کی مسند و میران ہو گئی، ایسی ہستیایا صدیوں

میں پیدا ہوتی ہیں،

سرد درختہ باز آید کہ ناید نسیمے از جہان آید کہ ناید
برفت از بزمِ عرفان آن چکے دگر دانے باز آید کہ ناید

اُس نے علم و ادب کی ہر شاخ اور ہر موضوع پر ہزاروں صفحات لکھے، مگر اس کی عمر عزیز کا بڑا اور بہترین حصہ آستانِ نبوی کی خدمت گزاری میں بسر ہوا، اس کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہے، جو سوانحِ نبویؐ کے ساتھ پیغامِ محمدیؐ کا بھی خلاصہ و عطر ہے، دارالمصنفین کی تصنیفی زندگی کا آغاز اس مبارک کام سے ہوا تھا، اور ابھی جلد ہفتم زیرِ تالیف تھی کہ اس پر اس کا خاتمہ ہو گیا، اور رحمۃ للعالمین کا مدح و سیرت نگاریہ سوغات لے کر خود اس کے حضور میں حاضر ہو گیا ع : خدا کا شکر ہے کہ یہ خاتمہ بالآخر ہونا تھا،

بارِ الہا! تیرے دینِ متین کا خادم، تیرے پیغام کا شارح و مبلغ، تیرے محبوبِ نبیؐ کا ہر گوشہ و سیرت نگار تیرے حضور میں حاضر ہے، اس کے طفیل میں اس کو اپنے دامنِ رحمت سے ڈھانک لے، اس کو شہداء و صدیقین کا درجہ عطا اور اس کی تربت کو اپنے انوارِ رحمت سے مہر و منور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما۔ اللہُمَّ صَبِّبْ عَلَیْهِ شَائِبِیْبَ رَحْمَتِكَ وَضَوَانِكَ یَا رَحِیْمُ الرَّاحِمِیْنَ، آمین۔
اے خدا کے مقبول بندے الوداع لے استادِ شفیقِ الفراق۔

(معارف دسمبر ۱۹۵۳ء)

چند مبشرات

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل ذوق اور اہل باب بصیرت کے لئے چند دیائے صادقہ جن کی تبشیری حیثیت نص حدیث سے ثابت ہے پیش کئے جائیں جو حضرت اقدس کی رحلت پر بعض اہل دل اور اہل محبت بزرگوں نے دیکھے، سب سے اہم، صاف و صریح اور سچا خواب اس سلسلہ میں حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا کا ہے جو موصوفہ نے ۳۱ دسمبر ۱۳۵۶ء (یعنی رحلت کی ساتویں شب) کو دیکھا اور مکرر دیکھا ہے۔

خواب حضرت محمد و حم کے الفاظ ہی میں سنئے۔

مقامِ اخروی ”وہ کسی جگہ سبز چادراوڑھے کھڑے ہیں، میں بھی وہاں اتفاق سے پہنچ گئی تو تعجب سے کہنے لگے، اچھا آج بھی یہاں آگئیں، دیکھئے میں آپ سے کہا کرتا تھا کہ بچوں سے زیادہ اُنس نہ رکھئے، مجھ سے تعلق رکھئے مگر آپ نے نہیں سنا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو حکم دیئے رہو“ یا ”آجاؤ“ تو میں نے ”آجاؤ“ کو پسند کیا اور پھر کراچی میں زیادہ رہنا مناسب نہیں معلوم ہوا، اس لئے میں جلدی سے یہاں آگیا اور اب حضرت نوحؑ کے ہاں قیام ہے!

لے اس معاملہ کا انبیاء کے ساتھ خاص ہونا تو نص حدیث سے ثابت ہے، باقی شاہدہ یہ نہ اہل سنت کے طفیل میں غیر نبی کے ساتھ بھی اکرام کا یہ سلوک یادگار رب العزۃ سے ہوجاتا ہے۔

لے گویا صوفیاء کی زبان میں حضرت والاہ قدم نوح پر تھے، علی پہلو بھی اس کا صاف مٹیہ ہے حضرت نوح علیہ السلام کا امتیازی وصف خود حضرت والاہ کی زبان میں ”جوش تبلیغ“ تھا اور ان کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے۔ (خطبات مدراس) اور حضرت والاہ کا اصلی کارنامہ دو درجہ حاضر کے غاؤ کفر کے

جب میں آنے لگی تو پوچھا کہ کیا آپ جا رہی ہیں؟ میں نے کہا ہاں! — ایک
روح کی طرف اشارہ کر کے کہا، اس کو پڑھ لیجئے، مگر میں اس کو پڑھ نہ سکی، پھر آنکھ کھل گئی۔
تھوڑی دیر میں آنکھ لگی تو پھر یہی خواب دوبارہ دیکھا۔“

مولانا سید عبدالجبار صاحب حیدر آبادی جن کو رویائے صادقہ کا
وسعت برزخ خاص ملکہ حاصل ہے اور حضرت والاد سے ارادت بھی حاصل
ہے، انہوں نے عالم برزخ میں حضرتؑ کی حالت کا مشاہدہ فرمایا، مولانا نے مدوح کا
خواب خود انہی کی زبانی سُنیے، فرماتے ہیں:-

”میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سفید لباس
میں ملبوس ایک وسیع میدان میں آرام فرمائیں، میں قریب جا کر قدموں
سے متصل بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ حضرتؑ کو یہاں (عالم برزخ میں) کوئی کمرہ
علیحدہ مل گیا ہے، تو سکوت اختیار فرمایا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ حضرتؑ کو
بہت وسیع جگہ مل گئی ہے تو ارشاد فرمایا —
”بہت وسیع جگہ مل گئی ہے!“

میں نے عرض کیا یہاں بھی عبادت ہوتی ہے؟ فرمایا؛ ”کیوں نہیں“
ایسے میں عشاء کی اذان سنائی دی، میں نے پوری اذان سنی اور حضرتؑ سے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) خلاف معرکہ آرائی ہی رہا! جس کا اظہار خود حضرتؑ کے قلم سے یوں ملتا ہے:

”یورپ کے مذہبی و علمی حلقوں کے مقابلے میں اسلام کی خدمت کا دلولہ ہے اور اب تک یہیں جس کا زمانہ انہی
مشاغل میں گزرا، اس محاذ کفر سے چونکا کر اہل دین طبقہ میں بے خبری ہے، ایسے مآں طور پر اغاڑہ نہیں حضرتؑ علامہؒ نے دین کی
کیا خدمت انجام دی، مگر مآں الفیوب پر تو سب کچھ آشکار ہے اور وہی بڑا شکوہ اور قدر دان بھی ہے!!
لہٰذا حضرتؑ میرانی صاحب مدظلہا کے درمیان بتوسط مسلمان میاں سلیم علیہ کو ملی تھی، منظر احتیاطاً موقوف
دیا، فت کر کے اب میں نے یہاں نقل کی ہے۔

عرض کیا کہ اتنی جلد عشاء کا وقت ہو گیا؟ فرمایا "ہاں" اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

برزخ میں نماز سے شغف | اوپر کے خواب میں آپ نے دیکھا کہ نماز کا ذکر آیا ہے بلکہ اس سے شغف کا اشارہ بھی موجود ہے،

اور یہ بات احادیث نبویؐ سے ثابت ہے کہ جس بندہ کو جس عمل سے مناسبت و خاص اور تعلق خاص ہوتا ہے اللہ تعالیٰ عالم برزخ میں اس کو اسی عمل کی توفیق عطا فرماتے ہیں حضرت والا رحمہ اللہ سلوک نبوت کے راہی اور قرب فرائض سے متاثر تھے اور فرائض میں ام الفرائض یعنی نماز سے خاص شغف تھا، نتیجہ یہ کہ برزخ میں بھی صلوٰۃ دائم سے سرفرازی ہے اور اس پر بہت سے حضرات کے خواب شاہد ہیں، چنانچہ حضرت مولانا محمد ہاشم مجددی مدظلہ (المعروف بہ پیر ہاشم جان) اپنے ایک مکتوب میں احقر کو تحریر فرماتے ہیں:-

سید صاحب قدس سرہ کو خواب میں دیکھا، ضعف و ناتوانی تو کچھ چہرہ نور پر جوانی کی رونق ہے، محاسن سیاہ ہیں، نماز کے لئے سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، میں سید صاحب سے کہتا ہوں کہ آپ نماز پڑھائیں، آپ فرماتے ہیں کہ "اب تو تمہیں نماز پڑھانی ہے۔"

خود اس راقم آٹم کے خوابوں کی گو کوئی اہمیت نہیں مگر بیسیوں مرتبہ یہی دیکھا کہ کبھی عصر اور کبھی مغرب کی نماز سے قبل حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہے، حضرت والا رحمہ اللہ نے شفقت و انبساط سے کچھ گفتگو فرمائی اور ایسے میں نماز کا وقت آگیا تو فرمایا کہ چلیے نماز پڑھ لیں، امامت کے لئے احقر کو آگے بڑھایا، جماعت ہو چکی تو آنکھ کھل گئی، اس بار بار کے یکساں مشاہدہ کا ذکر حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی خدمت میں کیا گیا تو جواب یہ شرف صدور لایا کہ

"حضرتؐ کو نماز سے ایسا ہی شغف تھا۔"

۔ تعارف کچھ باب میں گویا جا چکا۔

اس یقینی اور پُر قوت جواب سے پوری طرح تشفی ہو گئی کہ حضرت سیدی قدس سرہ کو اصل دولت ”معراج المؤمنین“ ہی کے رسوخ کی صورت میں حاصل تھی، اور اسی میں وہ اپنے دیدہ و دل کی ٹھنڈک پاتے تھے!!۔ اس سے ارفع و اسلم بندہ کے لئے اور کون سا قرب ہو سکتا ہے؟

حیاتِ ناسوتی کی منزلت حضرت مفتی صاحب دام فیوضہ نے فرمایا کہ مرحوم عبدالحجید قرشی کی اہلیہ محترمہ نے خواب میں دیکھا کہ آفتاب غروب ہو گیا۔۔۔۔۔ صبح جب آنکھ کھلی تو پہلی خبر ممدوحہ کو حضرت والا کے رحلت ہی کی ملی، اور خود ان کے دل نے بھی یہی تصدیق کی کہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ آفتاب تھے۔

یہ خواب سنا کہ حضرت مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ حضرت سید صاحب ایک آفتاب تھے!

حکایتِ ناسوتی ہی میں نیابتِ رسول اکرم کی بشارت سیکڑوں مبشرات میں چند روئے صادقہ جو پورے نقل کئے گئے ہیں وہ سب حضرت اقدس کے رحلت کے بعد کے ہیں، اب ایک اور خواب بھی

ایک اور سلسلہ کے سالک کا اور تصدیق بھی خود انہی کے پیروم رشد کی نقل کی جاتی ہے کہ حضرت والا کی حیات میں دیکھا گیا تھا اس سے حضرت سیدی قدس سرہ کی عند اللہ مقبولیت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کا شرف خاص بالکل حیاں ہے، ملاحظہ ہو۔

”مولوی سید خلیل صاحب مرید شاہ وارث علی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ صاحب سے درخواست کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو جائے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ پڑھنے کیلئے بتایا، مولوی صاحب پڑھتے رہے مگر تین رات مسلسل حضرت مولانا سید سلیمان

رحلت فرمائی متعدد علماء، مثلاً مولانا سید بدر عالم صاحب اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ) اور دوسرے زائرین سے فرمایا کہ اس وقت حضرت سید صاحب بہت ہی ارفع اور خاص مقام پر فائز ہیں، فرماتے تھے کہ میں حضرت سید صاحب سے واقف نہ تھا، مگر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں بھی یہی میں مقیم تھا اور وہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے، گو ہماری ملاقات نہیں ہوئی مگر میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، جس سے ان کی عظمت مجھ پر کھل گئی اور معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے رتبے کے بزرگ ہیں۔ بعض حضرات نے خواب معلوم کرنا چاہا مگر یہ صاحب نے اس کے انہار سے انکار فرمایا اور میں یہی فرمایا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ قدر کرو اور ان سے بیش از بیش استفادہ کرو۔

ایک مرتبہ ملک غلام محمد جو اس وقت گورنر جنرل بن چکے تھے پیر صاحب کی تعریف سن کر ان کی زیارت کے لئے ملیر حاضر ہوئے اور دستور عام کے مطابق دعا کی درخواست کی پیر صاحب نے کیا عجیب اور بے لاگ جواب دیا، فرمایا کہ۔

”دعا تو خیر ہوگی، مگر اصل بات یہ ہے کہ انسان کو جو اختیار اور قوت حاصل ہو وہ اس کو دین کی راہ میں خرچ کرے، آپ گورنر جنرل ہیں، اگر آپ واقعہً کچھ دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت آپ کے ہاں ایک نہایت گراں قدر ہستی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی موجود ہے، ان سے کام لیجیے میری ان سے ملاقات نہیں، مگر ان کی عظمت و منزلت سے واقف ہوں!“

تھے، اُن کا سرخ و سفید نوالی چہرہ باق سی ڈاڑھی بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھوپا کے صاف سفید لباس سب اس وقت تصور کے پردہ پر اس طرح آجایا ہے گویا سامنے موجود ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ۔
لہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ملاقات ہو گئی تھی۔

زائرینِ مرقہ سلیمانی کے تاثرات

حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ

حضرت والا کی رحلت کے بعد جب پہلی مرتبہ حضرت مفتی صاحب کراچی تشریف لائے تو اس ناچیز سے فرمایا کہ ”حضرت سید صاحب کے مزار پر حاضری دینی ہے اور آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ چنانچہ دوسرے دن عصر کے بعد احقر کے ساتھ تنہا مزارِ سلیمانی پر تشریف لائے۔ دیر تک مراقب کھڑے رہے، پھر دفعۃً کھکھلا کر ہنس پڑے اور ہنسی کا اثر چہرہ پر دو ایک منٹ رہا پھر استغراقی اثر چھا گیا۔ جب مراقبہ سے فارغ ہو چکے تو میری طرف دیکھ کر مسکراتے جاتے تھے اور بار بار زبان سے ”سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ“ کے کلمات نکلتے رہے واللہ اعلم ۛ

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

حضرت مولانا عبد الباقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۵۵ء میں حضرت ممدوح جب کراچی تشریف لائے اور سعادتِ میزبانی اس بے مایہ کونجش رکھی تھی تو احقر کو لے کر حضرت والا کے مزارِ مبارک پر پہنچے، موحجہ میں دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور دیر تک مراقب رہے جب مرقہ سلیمانی سے ہٹے تو احقر سے فرمایا:

”جوابات یہاں ہے اور جگہ نہیں ہے“

حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۵۵ء میں پہلی اور آخری بار جب مولانا دریابادی کراچی تشریف لائے تو ازراہِ فہم نوادی

اس عاجز کو گھر سے لے کر مرقد سلیمانی پر پہنچے۔ مزار پر انوار پر دیر تک ساکت و صامت کھڑے رہے، جب مراقبہ سے فارغ ہو کر لوٹنے لگے تو احقر سے فرمایا:

”یہاں قلب پر وہی اثر رہا جو تھا دکھون میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضری میں حاصل رہا تھا۔“

حضرت مولانا سعد اللہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت والا کے مرقد سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ایک غیم معروف مگر عالم و عارف بزرگ۔ وطن سمر حدی، مذہب احنفی اور مشرب اچشتی — مولانا سعد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے اور اس دور کے مشہور چشتی بزرگ سلیمان نور اللہ مرقدہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ حضرت والا کی رحلت کے مہینہ دو مہینہ بعد ہی انہوں نے ادھر ادھر پوچھ پچھ کر پتہ چلایا کہ حضرت والا کا خادم خاص کون ہے اور کہاں ہے؟ اور پھر اس ناچیز کو کہلوائے وہ ملنے کے مشتاق ہیں۔ جب میں حاضر ہوا تو بڑی محبت اور شفقت سے ملے احترام کا معاملہ فرمایا پھر گلہ محبت کے طور پر فرمایا:

”ہم تو کچھ بھی نہیں مگر ہاں بزرگوں کو دیکھا ہے اور بزرگوں کے قدر دان ہیں۔ آپ کے حضرت شیخ کو ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا تھے اب بھی یہ ناچیز اکثر ان کے مزار مبارک پر حاضری دیتا ہے، مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ مزار کے احترام و حفاظت کا جو اہتمام حد و شرع میں کیا جاسکتا ہے، وہ نہیں کیا گیا ہے میں نے اپنے ہاتھ سے مزار کے قریب سے گندگی ہٹائی ہے یا تو آپ کریں ورنہ اجازت دیں تو یہ ناچیز اتنا تو کر سکتا ہے کہ مزار کے اطراف ایک چادر دیوادی بنوا دے تاکہ کوئی جانور قریب نہ آ سکے۔“

اس ارشاد کو سن کر یہ خادم غرقِ ندامت ہو گیا اور وعدہ کر لیا کہ انشاء اللہ یہ کام ہو جائیگا

چنانچہ محترم سید ابوعاصم صاحب سے التجا کر کے ضروری بندوبست کروادیا۔

السید محمد امین الحسینی مفتی اعظم فلسطين رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۹۹ء میں جب مفتی اعظم کراچی تشریف لائے ہوئے تھے تو دو چار احباب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ تجدیدِ تعارف کے ساتھ ہی مفتی اعظم نے شفقت سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”علامہ سید سلیمان تو ہمارے بڑے بھائی تھے، اُن کے مزار پر حاضری لازمی ہے اور کل عصر کے بعد آپ ہی کے ساتھ ہوگی۔“

چنانچہ دوسرے دن _____ باوجود اس کے کہ مفتی اعظم کی ایڑی میں زخم تھا، اور نہ شکل چند قدم چل لیتے تھے _____ راقم الحروف اور مولانا جمال مسیاں فرنگی محلی کے ہمراہ وہ سید عالی مقام کے مزار پر تشریف لے گئے فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہے پھر مزار مبارک سے ہٹ کر صاحب مزار کے فضائل کا ذکر فرماتے رہے۔

صدر مملکت براستائہ سید الملکت علیہ الرحمۃ

پاکستان کی تاریخ میں فضیلت مآب جنرل محمد ضیاء الحق (ایدہ اللہ بنصرہ العزیز) پہلے صدر مملکت ہیں جو حضرت والا اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے مزارات پر حاضری ہوئے اور حکم دیا کہ ان مزارات کے تحفظ کا مناسب سامان کیا جائے چنانچہ اس وقت یعنی اگست ۱۹۸۳ء تک ان مزارات کے اطراف خوبصورت اور بلند محراب دار چودلواہری (بلاچیت کے) بنادی گئی ہے، سنگ مرمر کا فرش کر دیا گیا ہے، اور دونوں بزرگوں کے مزارات کی متصل دیواروں پر اسی تصانیف اور کارناموں کا تذکرہ سنگ مرمر پر کندہ کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ صدر ضیاء کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

خالد سلیمانی

حضرت والدہ کا پہلا عقد غالباً ۱۹۰۳ء میں ہوا، اور تیرہ برس لطف و محبت کی رفاقت رہی، ۱۹۱۷ء میں جب دستِ اجل نے اس رشتہ کو منقطع کر دیا تو حضرت والدہ پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا، جس کا اظہار ”فراقِ یار“ کے عنوان سے چند اشعار میں برملا فرمایا، یہ نظم آئندہ بابِ ششم میں آئے گی۔ اکرال آبادی مرحوم نے شاعرانہ زبان اور اپنے مخصوص حکیمانہ پیرایہ میں اس غم کو ہلکا کرنے کی کوشش فرمائی، چنانچہ پہلے تعزیتی خط میں یہ شعر لکھا ہے

اگرچہ تلخ ملا جامِ عمر فانی کا مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا
پھر ایک اور خط میں چند متفرق اشعار دلجوئی کے لئے لکھ بھیجے، جو یہ تھے،
صدیوں فلاسفہ کی چناں اوجنیں رہی لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

ساتھی جو تھے رنج و راحت کے اس موت کے ہاتھوں چھوٹ گئے
اب یاس گرائے دیتی ہے، سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

مرنے والا مرجکا اور رونے والا روچکا
وائے برستی اگر مقصود، سستی ہوچکا

لے حضرت والدہ نے منہ و قات (خلافت) تحریر فرمایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۳ سالہ رفاقت رہی (ملاحظہ ہو ”یادِ رفتگان“) اس حساب سے عقد ۱۹۰۹ء ہی میں ہوا ہوگا۔

ان اہلیہ نے دو اولادیں چھوڑیں، ایک صاحبزادی اور ایک صاحبزادہ محترم ابو سہیل صاحب (کسٹم آفیسر مشرقی پاکستان)

حضرت والار نے اپنی اسی اولاد سے دل بہلا کر بقیہ زندگی گزارنے کا تہیہ کیا تھا، مگر اپنے والد ماجد کے اصرار پر ۱۹۷۲ء میں عقد ثانی فرمایا، یہ اہلیہ شکل سے ڈیڑھ برس تک حق رفاقت ادا کر کے سدھا رگئیں، اس سانحہ نے پچھلے زخم ہرے کر دیے، چنانچہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

”دیسند اور اس کے مکان کی ایک کوٹھری میرے لئے تاریخی غم کی یادگار

بن گئی اور میرے احساس کو صدمہ پہنچتا رہتا ہے“

اس کے بعد ایک لطیفہ پیش آیا جس کا ذکر خود حضرت والار نے اس حقیر سے فرمایا تھا خواجہ حسن نظامی دہلوی نے ایک رشتہ حضرت کی خدمت میں بھیجا، مگر کس کا؟ سکندر آباد (دکن) کے سب سے بڑے تاجر کوڑی پتی احمد علاؤ الدین (جو بعد کو احمد نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے) کی صاحبزادی کا!، بلاشبہ احمد علاؤ الدین مرحوم نہایت نیک سرشت، دین دوست اور صاحب خیر (میر تقی) لیکن رشتہ ناتہ میں تو سب سے بڑی چیز ماحول کی یکالکت معاشرت کی یکسانیت اور ذہن و فکر کا توافق ہے، محض مال و دولت تو زندگی کو خوشگوار نہیں بنا سکتے، مگر ص

فکر ہر کس بقدر ہمت اور ست!

مصورہ فطرت نے فطرت کے سارے تقاضوں سے صرف نظر کر کے نہ صرف یہ رشتہ بھیجا بلکہ اس پر پُر زور اصرار بھی کیا، حضرت والار نے اس کے جواب میں صرف ایک جملہ تحریر فرما کر اس قصہ کو ختم فرما دیا۔

لے ان صاحبزادی اور انکے خاندان کی جوان مری کاظم بھی حضرت کو سہنا پڑا، البتہ ان کی اکلوتی اولاد اور یادگار فیضی اشرف صاحب اس وقت اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں کسی عہدہ پر فائز ہیں۔

قیامِ یادگارِ علمی کی کوششِ ناتمام

پہلی کوشش | حضرت علامہ کا سانحہ ارتحال ایک ملی علمی خسارہ تھا، کراچی کے اعلیٰ علمی حلقوں میں حضرت کی یادگار کے طور پر ایک علمی ادارہ کے قیام کا خیال جوش زن تھا، انتقال کے ہمینہ بھر کے اندر ہی اندر جناب شعیب قریشی صاحب وزیر حکومت پاکستان کی صدارت میں ”سیمان ندوی اکیڈمی“ کے قیام کی عرض سے چند اہل علم کی مشاورتی مجلس ہوئی اور طے پایا کہ اس اکیڈمی کے بنیادی اداکین حسب ذیل ہوں گے:-

- ۱۔ جناب شعیب قریشی وزیر حکومت پاکستان (صدر)
- ۲۔ ہزار کیلینسی عبدالوہاب عزام بے، سفیر مصر تعینہ پاکستان۔
- ۳۔ ”السید عبدالحمید الخطیب، سفیر سعودی عرب تعینہ پاکستان۔
- ۴۔ ”جناب جواد المراتب، سفیر حکومت شام تعینہ کراچی
- ۵۔ ڈاکٹر محمود حسین، (سابق وزیر تعلیم حکومت پاکستان)
- ۶۔ حاجی وجیہ الدین صاحب۔
- ۷۔ ڈاکٹر حمید اللہ، (پیرس)
- ۸۔ پروفیسر محمد شفیع
- ۹۔ پیر غلام محمد سرہندی
- ۱۰۔ پیر ہاشم جان (مولانا محمد ہاشم مجددی)
- ۱۱۔ مولانا راغب (حسن) (ڈھاکہ)

۱۲۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی۔

۱۳۔ حکیم محمد نصیر الدین احمد جمیری ندوی۔

۱۴۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔

۱۵۔ مولوی انوار ندوی۔

۱۶۔ سید ابوعاصم (ایڈوکیٹ) سکریٹری۔

مگر یہ کام کسی محرک و فعال شخصیت کی عدم موجودگی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس کے ایک آدھ سال بعد مولانا راغب احسن مرحوم

دوسری کوشش

اس ایڈمی کے قیام کا ایک مکمل خاکہ تیار فرمایا اور اس کا اصل نام "سید سلیمان ندوی دائرۃ المعارف اسلامیہ" اور مختصر نام "سیدان ندوی" ایڈمی آف اسلام" تجویز کیا۔ یہ خاکہ انگریزی ٹائپ میں قُل اسکیپ کے ۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی ایک کاپی احقر کے پاس اس وقت تک محفوظ ہے۔ اس کے اعراض و مقاصد میں وقت کے جملہ علمی قتنوں کی مدافعت اور ضرورتِ حاضرہ کے جملہ مسائل کا صحیح تحقیقی اسلامی لطیفہ تیار کرنا تھا، مولانا راغب احسن نے اس خاکہ میں یہ ثابت کرتے ہوئے کہ حضرت علامہ نور اللہ مرقدہ کے اصول تحقیق ٹھیک دہی تھے جس کی بنیاد امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ڈالی تھی، اس بات پر زور دیا ہے کہ ایڈمی میں علمی تحقیقی کام کرنے والے علماء اور جدید اہل علم کے پیش نظر وہی اصول رہنے چاہئیں اور وہ خود بھی اپنے آپکو دنیوی لالچ اور حکومت کے دباو سے الگ رکھ کر کام کریں۔ اس ادارہ کے ابتدائی عہدہ داروں کے نام یہ تجویز ہوئے تھے۔

۱۔ صدر، ڈاکٹر محمد حیدر اللہ (مقیم پیرس)

۲۔ مقامی صدر، ڈاکٹر محمد محمود احمد، (صدر شعبہ فلسفہ و دین آف آرٹس کراچی یونیورسٹی)

نائب صدر، علامہ سید عظیم الاحسان (مفتی اعظم و صدر مدرسہ مالہ ڈھاکہ) (برائے مشرق پاکستان)

- ۳۔ ناظم، مولانا راغب احسن (ڈھاکہ)
- ۵۔ چیف ریسرچ اسکالر، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی (تلمیذ حضرت علامہ ندوی)
- ۶۔ معتمد اعزازی، جناب ابراہیم احمد باوانی (کراچی)
- ۷۔ نائب مستند، مولوی غلام محمد بی۔ اے (عثمانیہ) (کراچی) * ستر ستر حضرت علامہ ندوی
- ۸۔ ریسرچ اسکالرز اور
- اراکین:-

- ۱۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی (کنٹب) ڈی، ایس سی (علیگ)
- ۲۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی (مصنف "اسلام اور سود")
- ۳۔ ڈاکٹر علیم الرضی۔ ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی، ہار ایٹ (لندن) و فاضل وکال مدرسہ
- ۴۔ مولانا ڈاکٹر عبدالباری۔ ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی (آکسن) صدر جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان
- ۵۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی (مصنف "مجدد الف ثانی کا نظریہ توحید")
- ۶۔ ڈاکٹر محمد احسان اللہ، ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی (علیگ)، (پشاور یونیورسٹی)
- ۷۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ ایم۔ اے۔ پی، ایچ ڈی (پیرس) و انس چانسلر علیگڑھ یونیورسٹی (ہند)
- ۸۔ جناب شجاعت علی صدیقی، ایم۔ اے (مصنف "اسلامک پبلیک فنانس")
- ۹۔ جناب امیر الدین قدوائی۔ ایل ایل بی (علیگ)
- ۱۰۔ سید ابو ماسم صاحب (ایڈوکیٹ) ایم، اے، ایل ایل بی۔
- مگر یہ کارروائی بھی آگے بڑھ نہ سکی، اب جہاں تک یاد ہے مولانا راغب احسن، جن کی

شخصیت تنہا فعال بھی تھی اور عملاً مرکزی بھی، وہ سیاسیات عملی میں خواہی نہ خواہی پھنس گئے اور زیادہ تر ڈھاکہ ہی میں مقیم رہے، اس لئے، یہ منصوبہ بھی تجویزی یا دیگر بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد سے سناٹا ہے اور اب تو ان افراد کو ڈھونڈنا پڑے گا جو اس عظیم کام کا نمایاں شان منصوبہ بھی تیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔



باب ہفتم

بعض خصوصی کمالات اور اصولِ تربیت

ضروری بات

حضرت دالدار کے ظاہری و باطنی، اخلاقی و ایمانی محاسن کا مشاہدہ آپ کرتے آئے ہیں کہ ابتداء حیات سے آخری لمحات تک ہر دور میں کس قدر گوناگوں اور نمایاں ہیں ان خوبیوں کو واقعات زندگی سے الگ کر کے دکھانا، ان کی آراستگی کو مجرد کرنا ہوتا، اس لئے ہر تخلیقی حیات کو اسی دمان و مکان میں دیکھا اور دکھایا گیا ہے، اس میں ایک افادیت یہ بھی پیدا ہو گئی ہے اب کتاب جس جگہ سے کھولی جائے گی، نگاہ انشاء اللہ صاحبِ تذکرہ علیہ الرحمۃ کے کسی نہ کسی جمالی پہلو سے ضرور بہرہ اندوز ہوگی۔

مگر اس اہتمام و التزام کے باوجود پھر یہ باب جو کھولا جا رہا ہے تو اس کی غایت بعض ایسے ذہنی اور انسانی کمالات اور شیخ کے اصول تربیت کو پیش کرنا ہے، جو خصوصی نظر اور مرکز توجہ ہی کے محتاج ہیں، میرا مادہ اصول تربیت کی ترتیب کا نہ تھا کیونکہ مہاج سلطانی کے باب میں اہل نظر ان کو تلاش کر سکتے تھے۔ مگر حضرت محترم مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ نے اس کی اہمیت پر زور دیا اور جب ان کے ارشادِ گرامی کی تعمیل پائی تو اب اس کا اعتراف ہے کہ اگر ان اصولوں کو الگ الگ کر کے بیان نہ کیا جاتا تو بڑی کمی رہ جاتی۔ اب یہ اصول بیانِ طریقت کے لئے انشاء اللہ نہایت مفید ثابت ہوں گے۔

حلیہ | میانہ قد، متوسط جسم، توازن مزاج کی دلیل حکم، پُر نور مہتابی چہرہ، خوبصورت سفید
 گھٹی داڑھی، تقدس کا ہالہ، فراخ دہکتی ہوئی پیشانی، غنمتِ سیما کی نشان، رخسار
 اُبھرے اُبھرے، روشن کہ عینِ مرضِ موت میں بھی ضعف و نقاہت کو جھٹلاتے رہے آنکھیں
 بڑی بڑی، مگر دُف و حیا سے اکثر چھپی ہوئیں! ابرو بھرے بھرے خمدِ محبت و دلداری کے
 ضامن، مینی دُگوش توازنِ حسن کو قائم کئے ہوئے، اور کان کی لویں پیوستہ عقل و فرست
 اور قوتِ خطابت پر گواہ! ہونٹ پتلے پتلے اور دوردہن تنگ، احتیاط و ایجازِ کلام پر شاہد
 رنگ کھلا ہوا مگر سفید نہیں، بلکہ ”آٹا ملیج“ والی جاذبیت لئے ہوئے! ہاتھوں کے پنجے
 چھوٹے اور نرم قوت و حسنِ تحریر کی دلیل بنے ہوئے! پاؤں چھوٹے قدم چھوٹے رفتار پر وقار!
 لباس خوش وضع، ثقہ، صاف اور ہتھرا، حسنِ ذوق اور جمالِ باطن کا آئینہ، نشست
 و برخاست میں منانت، میلِ جول میں تواضع اور عزتِ نفس کا حیرت انگیز امتزاج! —
 سکوت میں وہ عرب کے بلا امتیاز ہر اہلِ محفل کی تابِ سخنِ مسلوب ہو جائے اور تبسم میں وہ
 ترحم کہ ادنیٰ سے ادنیٰ حاضرِ مجلس میں بے تکلفاً عرضِ معروض کا حوصلہ پیدا ہو جائے۔

ان کا مقام ولایت اور ان کی نسبت مع اللہ تعارفِ غیر سے بے نیاز، اجنبی بھی،
 ان کے چہرہ انور کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے کہ یہ تو فرشتہ معلوم ہوتے ہیں! اہلِ ترکِبت
 تھے کہ نہیں یہ تو رشکِ فرشتہ ہیں، جبریتِ کاملہ کا پیکر، صغنتِ اللہ کا منظر!

فتبار اللہ احسن الخالقین

بہ قسم کہتا ہوں کہ اپنی نظر جب جب ان کے چہرہ حق نما پر پڑی، دل میں بے اختیار
 اللہ کی ہو گئی اور کتنی ہی بار زبان سے بے اختیار کرم اللہ وجہہ کی دُعا نکل پڑی۔

کراچی کے چند روزہ قیام کے بعد یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو عشقِ مجسم حضرت مولانا مفتی
لطیف | محمد حسن مظاہر لاہور مراجعت فرما رہے تھے، وداعی ملاقات کیلئے حضرت
 مرشدِ ہی ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور یہ خادم بھی ساتھ تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت والا

کی صحت بار بار خراب ہو جاتی تھی حضرت مفتی صاحب نے ایک تعویذ حضرت مرشدیؒ کو عنایت فرمائی اور اس ارشاد کے ساتھ کہ

”حضرت اس کو اپنے پاس رکھ لیں نظر بد سے حفاظت رہے گی، حضرت کو بار بار نظر لگ جاتی ہے۔“

حضرت سیدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مجھ میں کیا رکھا ہے؟ مجھے کیوں نظر لگے گی؟ مفتی صاحب نے فرمایا ”وہی ——— طر
بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے۔“

اس پر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

”مگر ——— طر دکتا ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں ——— وال بات کہاں؟“

صاحبِ نظر مخاطب نے فرمایا:

”وہ بھی ہے اور ہم کو دکھائی دیتی ہے، کسی اور کی نظر نہ لگتی ہو تو میری ہی نظر رنگ جاتی ہوگی۔“

اس پر مسکراہٹوں کے انوار میں اخلاص و محبت کی بات ختم ہو گئی ——— ابنِ شوق و معرفت کی یہ محبت افزا باتیں اور ان کی یہ جنونِ لوازمِ مجلس اب کہاں ملیں گی۔

ایامِ ہمہ بود کہ با شیخ بسر رفت

باقی ہمہ بے حاصل و بے خردی بُود

حضرت والا لباس بڑے قرینے سے اور اپنے حسبِ حیثیت پہنتے تھے،
لباس

صفائی، موقع و محل اور موسم کی رعایت بھی ضرور فرماتے تھے، عمومی لباس کی صورت یہ تھی کہ صاف ستھرا سفید کرتا گھٹنوں کو چھپائے ہوئے اور ٹکھے کا پاجامہ ٹخنوں سے لے و تہ یہ حضرت مجددِ دہلی کے مصرعے میں جو انھوں نے اپنے شیخِ باجمال کے نثرِ عشق میں ڈوب کر کہے تھے۔

مجدوب صاحب کے اصل دو شعر یہ ہیں۔

علاوہ ادنچا، ڈھیل ڈھال مگر جسم پر موزوں اُتری ہوئی نصف ساق تک لائبی شیروانی جس کی اوپری بایں جیب میں گھڑی اور فوٹین پن لگا ہوا، عید بقر عید کو شیروانی پر سیاہ رنگ کا عبا، پاؤں میں اکثر معمولی کام کا سلیم شاہی جوتا اور کبھی سیاہ پمپ شوز، سر پر براق سا سفید ملل کا صافہ، کہنے کو صافہ مگر بندش و موزونیت کے اعتبار سے تاج سیلانی سج کی صحبت میں سفید دوپلیہ ٹوپی بھی بڑی دلکش نظر آتی تھی بایں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں خاتم سلیمانی چاندی کے بیضوی حلقہ میں عقیق پر سید سلیمان ندویؒ "بخط ٹلٹ کندہ تھا۔

یوں تو حضرت والا در تھے ہی جامہ زیب مگر سفید و سیاہ شیروانی اور سیاہ عبا میں تو ان کو دیکھ کر نظر میری نہ ہوتی تھی اور صافہ کی بندش و موزونیت تو ان پر ختم تھی، چھ ہاتھ کا صافہ باندھتے تھے، نہایت بے تکلفی اور ہلکے ہلکے ہاتھ سے مگر پیچ بہت صحیح آتے، اور آخری پیچ ختم کر کے صافہ کا سرا اس انداز سے لٹبے تھے کہ چھوٹا سا طرہ اوپر نکل آتا تھا اور ایسا استادہ رہتا گویا اس میں شعور سر فرازی پیدا ہے۔ شملہ کو بھی اسی خوبی کے ساتھ پچھلے حصہ میں اڑٹس کر دونوں شانوں کے درمیان لٹکاتے تھے۔ اس صافہ پر نہ جانے کتنوں کو رشک آکر رہا، مگر بندھ کسی سے نہ سکا، خود مولانا شبلیؒ نے بھی جو نہایت قیمتی عمامہ باندھتے تھے، اس معمولی صافہ کو دیکھ کر سر مغل اظہار رشک فرمایا کہ،

"دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہے، اور تمہارا چھٹکے کا صافہ ہے، مگر اس قرینہ سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے۔"

کبھی بے کچھ ایسے کہ تیر تو دیکھو جہاں آج پیسہ مغان ہو رہا ہے
دست ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں بڑھاپے میں بھی جاں جاں ہو رہا ہے

تہ کہ بہ باعوم سوئے سارے کپڑے کا ہوتا اور اگر ملل کا زیب تن فرماتے تو اس کے اندر نیم اتین لائبی بنیان ضرور ہوتی خواہ موسم کوئی ہو، یہ غایت حیا اور تہذیب کا اثر تھا۔
نے عربی رسم الخط کا سب سے خوبصورت طرز!

(حیاتِ نبویؐ ص ۷۳۱)

حضرت والار نے خود فرمایا کہ حضرت تھا نوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کے بعد کبھی کبھی خیال آیا کہ لباس کی ہیئت بدل دی جائے۔ صرف کرتے اور پاجامے پر اکتفا رہے، مگر فرمایا کہ پھر یہی خیال مانع رہا کہ جب حضرتؐ نے اس لباس پر کوئی ٹکیر نہیں فرمائی تو اب اسکو بدلنے کی کیا ضرورت ہے!

درس۔ خیرہ تو لباس کی تفصیل ہوئی، سننے اور یاد رکھنے کی بات تو یہ ہے کہ یہ ساری نفاست اور ذوقِ تحمل کس بے تکلفی سے دینی تقاضے پر قربان ہو جاتا تھا، ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے بتایا کہ جو تپو میں ایک روز حضرت والارؐ کہیں سے پیدل چلے آ رہے تھے اور حضرت والارؐ سر سے پیر تک مفید پوشاک پہنے ہوئے تھے، راستے میں مغرب کا وقت آ گیا اور اذان ہونے لگی، ایک چھوٹی سی مسجد کا جس میں محض مٹی کا فرش تھا، حضرتؐ نے رخ فرمایا۔ جب داخل ہونے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مٹی میں کپڑے خراب ہو جائیں گے، حضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”تو کیا ہوا، پھر بدل لئے جائیں گے، مگر جماعت چھوٹ گئی تو پھر کہاں ملے گی؟“

چنانچہ ڈاکٹر صاحب شاہد ہیں کہ حضرتؐ نے ادنیٰ تا مل کے بغیر اسی مٹی پر نوافل تک پورے اطمینان سے ادا فرمائے، گو لباس اور پیشانی خاک آلود ہو کر رہی۔ جمال ظاہر کے دلدادہ، اس کمال باطن پر فریفتگی کا حوصلہ پیدا کریں، ورنہ انکی پسند ناقص رہے گی اور وہ عظمتِ سلیمانی کو پہچان نہیں سکیں گے۔

حضرت والارؐ کے بول بڑے انمول تھے اور ان میں محاسن کے کئی محاسنِ گفتار

اہم اوصاف کو الگ الگ کر کے دکھانا زیادہ مفید ہوگا۔

(۱) وہ کم سخن تھے مگر ان کی زبان جواہرِ دولتی تھی، حضرتؐ کے چھوٹے چھوٹے صاف

و سادہ جملے اہل فکر کے لئے کلیدِ علم و حکمت ہوتے تھے دو تین مثالیں پیش ہیں ذرا غور سے ملاحظہ ہوں۔

(د) فرمایا کہ لا الہ الا اللہ "میں اللہ" کا لفظ ساری صفاتِ الہیہ کا جامع ہے جب کبھی اس کے مفہوم کو کسی ایک صفت کے ساتھ خاص کر کے اس کلمہ کی توجیہ کی گئی تو گمراہی کا دروازہ کھل گیا، جیسے صوفیاء نے لا الہ کی تعبیر لا موجود سے کی، اس کا نتیجہ وحدۃ الوجود اور اس کی موثر گائیوں کی صورت میں ظاہر ہوا اور آج مودودی صاحب لا الہ کی تعبیر لا حاکم سے کر رہے ہیں، لہذا ان کو سارا دین سیاست و حکومت ہی نظر آتا ہے!

(ب) فرمایا کہ علم کو علم کی خاطر چاہنا قلبی جہل ہے!
(ج) ایک عالم دین نے نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا، ایک تو ہے "علم نبوت" جو قرآن اور حدیث کی صورت میں موجود ہے (اور دوسری چیز ہے "نور علم نبوت" علماء علم نبوت کے حصول پر مطمئن ہو جاتے ہیں حالانکہ اصل چیز "نور علم نبوت" ہے جس کے حصول کے بغیر علم لفظی تشذہر جاتا ہے۔

(د) فرمایا کہ دارا شکوہ اگر تخت پر بیٹھا تو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی مگر اسلام ختم ہو جاتا۔ عالمگیر کے تخت پر بیٹھنے سے، اس کے بعد گو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی نہیں رہی مگر اسلام باقی رہا۔

(۲) حضرت کی گفتگو کا خاص وصف مخاطب کے ذہن کی رعایت، اس کی سطح پر نزول اور اس کے محاورہ میں کلام فرمانا تھا، اس پر حسن تعبیر کا سلیقہ متنازعہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو باتوں باتوں میں حل فرما جاتے تھے، سننے والا حیران رہ جاتا تھا کہ جس کو پرست سمجھا تھا وہ تو رائی کا دانہ نکلا صرف دو مثالیں نمونہ پیش ہیں۔

(۱) ایک سالک طریق جو معاشیات کے گریجویٹ تھے اور ذکر میں فائدہ محسوس

نہ کرتے تھے انہوں نے جب اپنی اس ناشافی کا اظہار کیا تو حضرت والار نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان کو یہ احساس لگتی ہے تو وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیتا ہے پہلے دوسرے یا میرے گھونٹ میں اس کی کوئی تسکین نہیں ہوتی، لیکن بالآخر ایک نوبت پر وہ سیر ہو جاتا ہے مگر اس کے معنی یہ تو نہیں ہوتے کہ بس آخری ہی گھونٹ نے اس کو سیراب کر دیا اور پہلے سارے گھونٹ بے فائدہ رہے، نہیں بلکہ فائدہ آخری گھونٹ پر محسوس ہوا۔ گو اس نفع رسائی میں ہر گھونٹ کا مساوی حصہ ہے، پہلا گھونٹ نہ پیا ہوتا تو آخری کی نوبت کہاں آتی، یہی حال ذکر کا ہے مذہبیت ہو تو بالآخر یہ اثر دکھا کر رہتا ہے۔ گو اس کا نفع اول ہی روز سے شروع ہو جاتا ہے۔

سبحان اللہ قالون افادہ غنیمت کی طرف توجہ کر کے معاشیات کے ایک طالب علم کی کیسی تشفی فرمادی کہ اب شبہ کی جڑ ہی کٹ گئی۔

(ب) غیر اللہ سے استمداد کی جو صورتیں مسلمانوں نے پیدا کر رکھی ہیں اس کا رد فرما رہے تھے اور حاضرین میں زیادہ تعداد تو تعلیم یافتہ حضرات کی تھی، مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

”برہمنیوں نے اللہ میاں کی حکومت کو بھی بس شاہ انگلستان کی حکومت سمجھ رکھا ہے کہ نام بادشاہ کا اور اختیارات پارلیمان کے، زبان پر لا الہ الا اللہ“ باقی جو مانگنا ہے وہ بڑے پیر صاحب سے خواجہ اجیریؒ اور دوسرے اولیاء اللہ سے!“

شرک کی قباحت کے اظہار کا اس سے بہتر، واضح تراور مؤثر ترین پیرایہ، خصوصاً تو تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے؟

(۲) حضرت اقدسؒ کی گفتگو کا تیسرا نادر وصف مخاطب کی دل نوازی اور اس کے حال پر شفقت تھا، وہ کسی کو ذلت کی نظر سے دیکھنا، یا تحقیر کے لب و لہجہ میں خطاب کرنا جانتے ہی نہ تھے، اسی لئے ہر طبقہ کے افراد کو ان سے اُنس محسوس ہوتا تھا اور وہ ان سے

لے فن معاشیات کی ایک اصطلاح ہے!

مستفید ہوتے تھے، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس وصف عالی کا ذکر کرتے ہوئے حوالت لکھی ہے وہ ہمارے علمائے کرام کے سننے اور غور کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت والاؒ کے متعلق لکھتے ہیں:-

”ان کو دیکھ کر اور ان کو پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے اور سوا نہ کریں گے۔“

چنانچہ اس کے ثبوت میں گذشتہ ملفوظات کافی ہیں، مگر اس کے لئے بڑے حوصلے علم اور ضبط کی ضرورت ہے جو حضرت والاؒ میں بہ تمام و کمال موجود تھا۔ رشید صاحب کی تصدیق سنئے:

”مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، عملی مسائل ہوں یا کوئی اور بحث، سید صاحبؒ بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال کرتے تھے اور دوسروں کا نقطہ نظر سننے میں بڑے تحمل سے کام لیتے تھے، بحث میں وہ کبھی جزبہ نہ ہوتے بلکہ آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، کوئی پھبتی، فقرہ، یا دل آزادی کی بات نہ کہتے، گفتگو میں کوئی کتنا ہی لب و لہجہ نا واجب اختیار کرتا، سید صاحب کے رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آتا تھا۔“

(۳) حضرت والاؒ کی گفتگو کا چو تھا وصف ظرافت ہے، اس کا اندازہ گذشتہ ملفوظات سے بھی کچھ ہو ہی گیا ہوگا، دو ایک شکر پارے اور حاضر ہیں:-

(۱) مرض الموت میں چند لوگ حاضر ہوئے اور دیر تک سناتے رہے کہ ہم لوگوں نے حضرتؒ کی صحت کے لئے خود بھی دعا کی اور فلاں فلاں اجتمعات میں بھی کروائی جب یہ لوگ چلے گئے تو حضرتؒ نے راقم حقیقہ کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا:

”آپ کے میر عثمان علی خان (نظام حیدر آباد دکن) بعض اجنبی جملے بڑے مزے کے کہہ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ منہ سے کہا کہ مولانا! لوگ دعا کرتے ہیں اور مڑ کر

لے دے۔ سلیمان نمبر معارف! صحیح گرامر! ص ۱۱۱۔

دیکھتے بھی ہیں کہ حضور دیکھ بھی رہے ہیں یا نہیں!“

(ب) ایک مرتبہ ہندوستان کی ایک بلند پایہ شخصیت حضرت کی مہمان مہمی، ایک روز یہ دونوں اکابر عصر شبی منزل کے سبزہ زاد (لان) پر ٹہل رہے تھے کہ ایسے میں ایک گدھا کمپونڈ میں گھس آیا، مہمان نے اندازہ مزاح میزبان پر طعن کیا کہ

”اچھا یہاں گدھے بھی رہتے ہیں“

حضرت نے نہایت سادگی سے فرمایا،

”جی نہیں، باہر سے آجاتے ہیں“

(ج) حضرت دالار کا شعر ہے

ہر ضربِ نیشہ ساغرِ کیف وصال دوست

فساد کی جو بات ہے مزدور کی نہیں

میرے ایک دوست نے عرض کیا کہ حضرت اس شعر کا پہلا مصرعہ کیا غالب کا ہے؟

حضرت مسکرائے اور فرمایا،

”جی نہیں، مغلوب ہی کا ہے“

(۵) پانچواں وصف خاص گفتگو کی سلاست و سادگی کے باوجود اس کا سوز و گداز

تھا، خصوصاً دورانِ گفتگو کبھی کبھی زبانِ مبارک سے بے ساختہ ”اللہ“ یا ”لا الہ الا اللہ“

یا ”استغفر اللہ“ کے کلمات آہستہ مگر اس قدر پُر سوز نکلتے تھے کہ سننے والوں کے قلب پر

جگمی سی گر جاتی تھی بلکہ بعضے اہل جذبہ افراد تو بے خود ہو جاتے تھے، دورانِ قیام بھوپال ماسٹر

شفیق احمد صاحب (مجاز صحبت حضرت علیم الامت) کو تو دیکھا کہ حضرت کے ایک ایک جملہ پر

ان کی چیخ نکلی جاتی تھی، یہاں ہمارے برادرانِ طریق میں مولوی محمد اشرف خان صاحب کو

بھی باریا دیکھا کہ وہ دورانِ گفتگو بار بار مچل جاتے تھے اور کبھی کبھی خود ان کی زبان سے بھی

کوشش ضبط کے باوجود لفظ ”اللہ“ ایک خاص انداز سے نکل جاتا تھا، اسی طرح

حضرت دالار کے ایک اور دستِ گرفتہ جناب سید عبدالرحمن صاحب (اسٹنٹ ڈائریکٹر

پاسپورٹ لاہور نے جن کو شعر گوئی کا ستھرا ذوق تھا حضرت والارہ کی زبان سے اسی لفظ ”اللہ“ کی صدا سن کر اور اس کے کیف میں ڈوب کر ایک شعر کہہ دیا تھا جس کا مصرعہ ثانی سننے والوں کے تاثر کا صحیح ترجمان ہے، وہ شعر یہ ہے :۔

نام اُن کا اور جان کے ساز پر
اللہ ^{موجود} ہر رنگ جاں بچھ گئی آواز پر

ایک اور صاحبِ ارادت کا یہ حال تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتے تھے، نہ زبان سے کچھ کہتے تھے، نہ کہنا چاہتے تھے۔ ایک دوسرے تھے جو مسکرا کر سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے اور اپنے اس والہانہ انداز پر شرمندہ بھی ہوتے۔ غرض تاثر سے کوئی خالی نہ رہتا۔

عجیب کیفیت تھی کہ گفتگو میں جوش تھا، نہ لہجہ میں زور، مگر جو بات نکلتی تھی وہ دل میں اتر جاتی تھی! بقول عارف شیرازؒ

جمالِ معجزِ حسنت لیکن
حدیثِ غمرہ ات سحرِ بنیست

محاسنِ تقصیر | حضرت والارہ کم گو اور کم آئیز ہونے کے باوجود اردو اور عربی زبان کے قادر الکلام مقرر تھے، بلکہ ان کی عالمانہ عظمت کا تعارف ہی وصفِ خطابت سے ہوا تھا، مگر ہر مقام کی طرح یہاں بھی حضرت سلیمانؑ کا ایک انفرادی رنگ تھا، حضرتؑ کا بیان جوش و خروش سے پاک مگر اثر و کیف سے مملو ہوتا تھا، انہی تقریر و لگاز نہیں دِلنواز ہوتی تھی، وہ عام مقررانہ حربوں (ادعا، تحکم، تکرار، حرکات و انداز) کے استعمال سے مستغنی تھے، پھر بھی ان کی شخصیت چونکہ عظیم و قادر اور ان کی باتیں مراقبت کا معیار تھیں، اس لئے وہ جو کچھ فرماتے تھے اس سے سننے والوں میں اعتماد و یقین کی پائیدار کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

حضرت کی تقریریں کی طرح جاندار، روان، مربوط، نہایت ذمہ دارانہ اور فصاحت و بلاغت کا آئینہ ہوتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا جیسے پوری تقریر قلب بند ہے۔ نگینیں رکاوٹ، نہ کہیں موضوع سے گریز، نہ آواز میں خواہ مخواہ کا آنا جڑھاؤ، مسطح، نرم میدان میں ایک بہتا ہوا دریا کی کئی گھنٹوں تقریر میں موقع کی مناسبت سے کل دو تین مرتبہ، لئے حضرات کا کلمہ زبان فیض سے بڑی شفقت لئے ہوئے نکلتا تھا۔

خالص علمی تقریروں کا تذکرہ ہی کیا، تذکیریں تقادیر میں بھی حضرت والا قرآن و حدیث کی بنیاد اور مستند و محکم تاریخی روایات کے تذکرہ سے ہٹ کر کبھی قصص اعتبارات شیطانیات یا دالہانہ اشعار سے کام نہ لیتے تھے نہ اس کی ان کو حاجت تھی، کیونکہ باطن شیخ کا فیض جاری اس سادگی اور بے رنگی کے باوجود سننے والوں کو کیف ایمانی میں غرق کر جاتا تھا۔

حضرت کی صوفیانہ تقریروں کا محور دُرائل و فضائل اخلاق کی توجیہ و تشریح تھا باطنی تربیت کی نزاکتوں کو اس سہل متنع پیرایہ میں بیان فرماتے کہ اس قدرتِ بیان پر اہل فن سر دھنتے تھے، ان تقریروں میں شیخ کی نسبت باطنی کا اثر اس قدر نمایاں رہتا کہ سننے والے اپنے دلوں سے کدورت و ظلمت مٹتی ہوئی اور ہدایت کا نور آتا ہوا صاف محسوس کر لیتے تھے۔ اسی تقریروں کے ختم پر شیخ اقدسؒ کی یہ سادہ اور مختصر دعا بھی بڑی ہی موثر ہوتی تھی، دونوں ہاتھ اٹھا کر کمالِ بحر سے عرض رسا ہوتے کہ:

”اے اللہ یہ جو کچھ بیان ہوا اس سے بیان کرنے والے اور سننے والوں کو مستفید فرما۔“

مزانج کا کمال توازن | توازن مزاج کا اندازہ و فوجِ جذبات ہی کے موقع پر لگایا جاسکتا ہے اور سارے جذبات خیر میں محبت ہی کا جذبہ سب سے زیادہ نشہ مردانگی کی تاثیر رکھتا ہے جو محبت کے شعلہ پر کھڑکی دہی طبیعت

سہجائی ہونے کے باوجود قائم الہام ہے اور نادرونایاب! آئیے! اس معیار پر حضرت والاؒ کے مزاج کو دیکھیں!

شبلیؒ! کون شبلیؒ؟ حضرتؒ کے استاد، مربی، محسن اور محبوب، زندگی کے آخری لمحات میں بھی جن کے احسان کا تذکرہ شاگرد سعید نے ڈیڑھ گھنٹے کی آگے بڑھائی ہوئی آنکھوں اور بھڑائی ہوئی آواز میں یوں فرمایا تھا کہ یہ دو لفظ لکھنا پڑھنا جو آگیا یہ سب انہی کی شفقت کا صدقہ ہے انہی شبلیؒ نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھنے کا مرحلہ آیا تو محبت کے بحر متلاطم کو کس کمال ضبط سے آب زیر کشتی بنائے رکھ دیا حیاتِ شبلیؒ کے تعارفی ادراک میں اپنے محبوب کے تعلق اس صفائی کا اظہار کہ

”بہر حال شبلیؒ شبلیؒ تھے، جنیدؒ و شبلیؒ نہ تھے۔“ (ص ۹)

توازنِ مزاج کی کیسی مستحکم دلیل ہے!

اور آگے چلے شاگرد و استاد کے تعلق میں محبت پھر بھی شرط لازم نہیں لیکن مرید و پیر کا ربط تو اس جذبہ مستحکم سے عبارت ہے، اسی لئے یہاں نشہٴ محبت کے مدھوش ہر طرف نظر آجاتے ہیں، مگر وہ جو مستی و ہشیاری کا تناقص مٹاتے ہوئے اور جذبات ذاتی اور تعاضیٰ سنت میں توازن قائم کئے ہوئے ہوں خال خال ہی ملیں گے، اس دور میں حضرت حکیم الامت کے وابستوں میں ایسی کیا ب مثال حضرت والاؒ ہی کی ذات گرامی تھی شدتِ عشق کا جو عالم تھا، اس کی تفصیل ”پیر و مرید کے ربط و تعلق“ کے زیر عنوان گزر چکی، اس زورِ عشق کے باوجود ضبط و توازن کا جو حال تھا اس کے ثبوت میں جامع المجددینؒ کا ریاچہ بہت کافی ہے۔ پھر بھی عنوان کی مناسبت سے ایک واقعہ اور سنئے،

ایک صوفی صاحب نے جو باضابطہ مولوی بھی تھے، حضرت سے اقطاب و ابدال کے بارے میں پوچھا کہ آیا ان کا وجود قرآن و حدیث میں مصرح ہے؟ جواب عطا ہوا کہ واقعہ موسیٰ و خضرؑ (علیہم السلام) میں اس کا صرف اشارہ ملتا ہے، قطعیت نہیں، البتہ بہ کثرت

بزرگوں کی کشفی تصدیقات ملتی ہیں اور وہ کافی ہیں! اس پر مولوی صاحب نے مکرر سوال کیا کہ احادیث میں اس کا ذکر نہیں؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ ایسی صحیح اور قوی حدیث ایک بھی نہیں ملتی! اس پر انہوں نے محض دباؤ ڈالنے کے لئے یہ نازیبا استدلال کیا کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے تو تعلیم الدین میں اس کی تائید میں حدیثیں لکھی ہیں! ————— اب نزاکت موقوف دیکھئے کہ ایک طرف شیخ عالی مقام کا پاس و لحاظ ہے اور دوسری طرف حدیث رسولؐ کی تحقیق کی ذمہ داری ————— حضرتؒ کو مولوی صاحب کے اس طرز کلام پر بڑا رنج ہوا، ناراضی کے لہجہ میں صاف فرمادیا،

”حضرتؒ نے لکھا ہے، میں نے تو نہیں لکھا“

جب وہ صاحب چلے گئے تو احقر سے مخاطب ہو کر حضرت والاؒ نے فسر دیا کہ حدیث کے معاملہ میں میں تو بہت ڈرتا ہوں، میں کیا کروں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہ سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جو کسی غیر قول کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرے اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ ————— حضرت والاؒ جب یہ ارشاد فرما رہے تھے تو آناؤنٹشیت چہرہ بشرہ سے عیاں تھے۔

محبت و عقیدت کے بعد تو اذن مزاج کو پر کھنے کے لئے دوسری حساس ترازو دوسرے اہل کمال کے معاملہ میں عدل اور خصوصاً معاصرین کے حق میں انصاف ہے، اس اعتبار سے ”حیات شہلی“ کے دیباچہ اور یاد رفتگاں کے سیکڑوں اوراق پڑھ جائیے اور دیکھئے کہ کس انصاف پسندی کے ساتھ ہر خادم دین کو سراہا ہے ورنہ ادارتی حد بندیوں کا فرق کب کسی کو اس نقطہ اعتدال پر قائم رہنے دیتا ہے۔ دل کو بہت تھام کر کسی کی تعریف پر اگر زبان کھلتی بھی ہے تو ایک لفظ ”مگر“ کے ساتھ پھر اندک کا اثر باہر آ کر رہ جاتا ہے، حضرت والاؒ کی تحریریں اس ”اگر“ ”مگر“ سے پاک ہیں جو ان کے صفائی باطن کا کھلا اثر ہے۔ علامہ محمد یوسف بنوری مدظلہ راقم ماجز سے فرماتے تھے کہ جب حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا انتقال

ہوا تو ان کے ذہن میں خیال گزرا کہ دیکھیں اب علامہ سید سلیمان ندویؒ کے معارف کے صفحات پر اس معاصر شہیر کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں؟ مگر فرمایا، کہ جب وفیات کے حصہ میں حضرت والاؒ کا مضمون انہوں نے پڑھا تو پہلے سے زیادہ معترف و متعقد ہو گئے کہ حضرتؒ نے انصاف پسندی اور بے نفسی کی مثال قائم کر دی!

مالی ایثار | مالی ایثار میں حضرت والاؒ عباد الرحمن کی جتنی جاگتی مثال تھے جن کی مدح قرآن پاک میں یہ آئی ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَفْقَقُوا لِعَيْسٍ فَأَوَاد
لَا يَقْتَرُوا وَكَانَ بَيْنَهُمْ ذَالِكُ
اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول
خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی اور ان کا اتفاق
اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

چنانچہ اس کی برکت حضرتؒ کو یہ حاصل رہی کہ آخرت کا سامان بھی کر گئے اور دنیا میں بھی استغناء حاصل رہا۔ آخر زمانہ میں ایک مرتبہ اہل و عیال کا ذکر آیا تو نہایت سکینت سے فرمایا:

”الحمد للہ ان کے لئے جو کچھ کرنا چاہیے تھا، اس سے کچھ زائد ہی بند و بست کر چکا ہوں اب میرے ذمہ کچھ نہیں۔“

فراغت قلبی کی یہ دولت عظمیٰ، اسی اعتدال پسندی کا نتیجہ تھی جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔

حضرتؒ کے ایثار مالی کا دوسرا وصف اخفا تھا، جو کچھ خرچ کرتے حتی الامکان چھپا کر خرچ کرتے تھے۔ حضرتؒ کے عزیز قریب سید صباح الدین عبد الرحمن کا بیان ہے کہ حضرتؒ کی ایک عزیزہ اپنی رانگی کی شادی میں خرچ کی کمی محسوس کر رہی تھیں، حضرتؒ نے چپکے سے دو سو روپے بھجوا دیئے، بعد کو ان عزیزہ نے اس حسن سلوک کا تذکرہ اور اعزہ میں کر دیا اور اس کی خبر حضرتؒ تمکنت پہنچی تو اس افسانے باز سے حضرتؒ کو دکھ ہوا، اسی طرح ایک اور مقروض عزیز کی چار سو روپے سے اعانت کرنا چاہتے تھے تو ان کو تحریر فرمایا کہ:

”اگر وہ (یعنی قرض خواہ) چار سو روپے اسی وقت لینے پر مصر میں تو یہ بھی بفضلِ خدا ہو سکتا ہے، مگر اچھا ہو کہ اکتوبر کی تعطیل تک آپ مہلت لیں، یہ اس لئے کہ ڈاک سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا اور یہ کچھ اچھا نہیں۔“

سبحان اللہ کیا جذبہٴ اخلاص ہے!

جامعہ احمدیہ پال کے تعلیمی معیار کی بلندی کی حضرت کو خاص فکر تھی، اس کے لئے اعلیٰ اساتذہ کی فراہمی ضروری تھی، شعبہٴ حدیث کے لئے حضرت کی نظر انتخاب مولانا اشفاق الرحمن کا نہ ہلوی پر پڑی حضرت نے ان کو سہارنپور سے بلا کر یہاں حدیث کا درس اولیٰ یا شیخ الحدیث بنا دیا، مولانا کے آجانے سے مقامی استاد حدیث کا درجہ ٹالوی ہو گیا، بعض اہل ہوائے مقامی بزرگ کو ملکی و غیر ملکی کے مسئلہ کی آڑ لے کر اُکسایا اور انہوں نے مولانا کا نہ ہلوی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ مولانا کا نہ ہلوی معطل کر دیے گئے اور مقدمہ چلتا رہا اور اس میں سال بھر لگ گیا، حضرت والا ۱۷ سال بھر تک اپنی حبیب خاص سے مولانا کو تنخواہ دیتے رہے اور ان کی راحت میں فرق آنے نہ دیا اور کسی کو ہرگز تک چلنے نہ پایا کہ مولانا کی رقی اعانت کس سمت سے ہو رہی ہے۔ یہ بات تو اقم الخروف کو حضرت کے وصال کے دس برس بعد قاری عبد الرؤف صاحب بھوپالی ثم مکی کی زبانی معلوم ہوئی جو حضرت کی پیش میں کام کرتے تھے اور ان کے منشی خاص تھے۔ حضرت سلیمان کی خاموش فیاضی بھی عجیب ہی تھی، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعہً۔

غرض اس کی تفصیل بہت ہے، ان سے بہت کچھ عجز و بزدلی نے بھی پایا، شاگردوں نے بھی اور مریدوں نے بھی، بس اپنا واقعہ لکھ کر قلم کو روک کر لیتا ہوں، میرا کوئی حال حضرت سے مخفی نہ تھا چنانچہ میری مقررہ وضیت سے بھی وہ واقف تھے، مگر مجھ سے بے خبر کو اس کا علم نہ تھا کہ علاوہ دعا کے وہ اس کی ادائیگی کا بھی خود ہی سامان فرما رہے تھے، حضرت اقدس کی رحلت کے کچھ ہی دن بعد پیرانی صاحب نے ایک بڑا ساجند لفا ذرا سا ہدایت کے ساتھ مرحمت فرمایا کہ اس کو گھر جا کر کھولا جائے۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ کوئی داز کے کاغذات ہوں گے، یا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات

مگر جب گھر جا کر اس لفاظ کو کھولا تو اس میں تو تو روپے کے دس نوٹ اور اس کے ساتھ
پیرانی صاحبہ مظلما کا یہ شفقت نامہ

عزیز القدر سلمہ۔ السلام علیکم

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، بجز صبر کے انسان اور کیا کر سکتا ہے حضرت مولانا حبیب
حیات تھے تو اکثر دینتر آپ کو ایک ہزار روپے ہدیہ دینے کو کہا کرتے تھے میں
اپنی غفلت یا ان کی علالت کا الجھاؤ کہنے کہ ان کی حیات میں اس کو پورا نہ کر سکی
اب یہ ان کی خواہش کے مطابق آپ کو ہدیہ کر رہی ہوں، آپ اس کو قبول کر
کے منوں فرمائیں، آپ کو یہ رقم دے کر میرا قلب بہت مطمئن ہے اور اللہ پاک
کی رحمت سے امید ہے کہ ان کی روح کو بھی مسرت اور سکون ہوگا، رب جیم ان
کو اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائیں۔ میرے خاندان بائیر کے لئے ہمیشہ دعا کیجئے۔

والدہ سلمان

مادر روحانی کے اس کرم نامہ کو پڑھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور دل بھرا آیا کہ حضرت
شیخؒ کو آنا خیال اپنے ایک ایسے خادم کا تھا، جس سے کوئی بھی حق خدمت ادا نہ ہو سکا!
حضرت والاہر کی ایک ایک ادا ذوقِ جمال کی شاہد تھی اور ان کی ہر چیز
حُسن ذوق ان کے حسن ذوق کا آئینہ! ————— لیٹر پیڑ کو دیکھئے تو سرورِ ذوق اپنی
طرف نہایت خوبصورتی کے ساتھ یہ آیت پاک چھپی ہوئی ملے گی۔

”إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“۔ (نمل)

اسی طرح گھر میں ریڈیو کے لئے ایک عمدہ غلاف تیار کیا گیا، حضرتؒ سے درخواست کی گئی
کہ اس پر کاٹھن کے لئے کوئی عبارت تجویز فرمادیں، موزونیت اور حسن ذوق کا کمال دیکھئے کہ فوراً
یہ آیت کھنکھ دی،

أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم السجده)

ایک صاحب ارادت نے جو فوٹوٹین پن کے تاجر تھے، اپنے کاروبار میں برکت کے لئے دعا کی درخواست کی، حضرتؑ نے دعا فرمادی اور ساتھ ہی مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اپنی دو کان میں یہ آیت لکھ کر آویزاں کر دیجئے،

نہ وَالْفَلْکِ وَمَا یَسْطُرُونَ (ن)

مذاق کا یہی نکھار بچوں کے ناموں کی تجویز میں بھی نمایاں رہتا تھا، بالعموم لڑکیوں کے نام والدہ کے اور لڑکوں کے نام والد کے نام کے ہم قافیہ تجویز فرماتے یا کبھی اس میں صرف آغاز حرف کی رعایت ملحوظ ہوتی، مگر ہر صورت صوت و معنی کا امتزاج نہایت دلکش ہوتا تھا۔

مقامات سلوک میں تواضع "عبدیت کا ایک اعلیٰ مقام ہے مگر خود مدح و ذم ایک اس مقام میں بھی رسوخ کے اعتبار سے ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق پیدا ہو جاتا ہے، "کامل تواضع" وہ ہے جو نفس کے انفعالات سے بلند و بالا ہو جائے، اسی کو حدیث شریف میں "ہجرت نفس" سے تعبیر فرمایا گیا اور اصل ہجرت "قراردیا گیا ہے، ایسے ہاجزالی اللہ" یا کامل انسان کی شناخت یہ ہے کہ اس کے لئے اپنی مدح و ذم ایک سی ہو جاتی ہے، نہ واہ وا سے وہ پھوٹتا ہے اور نہ ملامت سے مرجھاتا ہے! خال خال ہستیوں کو اس مقام تک رسوخ میسر آتا ہے مگر اللہ کی دین کہ سلیمانؑ عالی بخت نے ان کی آن میں اس مقام کو بھی فتح کر لیا۔

ڈاکٹر بیٹ کے اعزاء خاص پر آپ نے دیکھا کہ سلیمانی نفس نے اپنے اندر اتنا تغیر بھی محسوس نہیں کیا جتنا کہ ایک نیا کپڑا پہننے پر کسی میں پیدا ہو جاتا ہے اور شیخ الشیوخ حضرت تھانویؒ نے اس کی تصدیق بھی فرمادی کہ بے شک وہ اس انفعال سے برتر و بالا ہو چکے تھے۔ اب ایک واقعہ تنقیص کی بے اثری اور عرفانِ نفس کا بھی ملاحظہ ہو:

ایک روز راقم کی موجودگی میں دو مخیرین حدیث حضرت والدہ کی خدمت میں آئے اور اپنے مسلک کی گفتگو آغاز کی، دعوئے یہ کیا کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہت آسان بھی ہے اور تائید میں یہ آیت پڑھ دی کہ "وَلَقَدْ یَسِّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْکِرٍ"

حضرت والارحہ مخاطب کی لیاقت کو متاثر نہ کئے، دریافت فرمایا کہ آیا عربی سے واقفیت ہے؟ جواب اثبات میں ملا تو فرمایا اسی آیت کا ترجمہ کر دیجئے! مخاطب نے مفہوم بیان کیا تو حضرتؑ نے فرمایا کہ میں نے تو ترجمہ پوچھا تھا، پھر فرمایا کہ خبر ہی بتا دیجئے کہ یہ لفظ ”مکذ“ کیا ہے؟ اور اس کا مادہ کیا ہے؟ مسئول نے فوراً کہا کہ یہ لفظ ”در دت“ سے بنا ہے اور اس کے معنی سمجھنے کے ہیں! حضرتؑ نے فرمایا کہ مجھ کو ٹھیک اسی جواب کی توقع تھی، یہ تو آپ حضرات کی عربی دانی ہے اور اس پر قرآن نہیں کا دعویٰ! پھر ان دونوں کو حضرتؑ نے نہایت شفقت سے سمجھایا کہ یہ لفظ ”مکذ“ سے مشتق ہے اور فلاں قاعدے کے تحت ”ذ“ ”ڈ“ سے بدل گئی وغیرہ، اس کے بعد نصیحت فرمائی کہ پہلے عربی زبان، پھر متعلقہ علوم قرآنی کے حصول کی طرف توجہ کی جائے اور پھر قرآن پاک میں غور و فکر کریں! اس گفتگو سے بظاہر وہ دونوں حضرات متاثر اور ہشیمان بلکہ ممنون ہو کر گئے مگر یہاں سے جا کر اپنے مرشد جناب پر دیز کو نہ معلوم کیا روئیداد سنائی کہ تازہ طلوع اسلام میں میں پر دیز نے حضرت والارحہ کے اخلاق پر حملہ کرتے ہوئے نہایت سخت بازاری لب و لہجہ میں ایک نوٹ لکھا جس کا حاصل یہ تھا کہ ہمارے دو آدمی ان سے بات کرنے گئے تو وہ نہایت بد اخلاقی سے پیش آئے، اصل گفتگو بالکل قلم انداز کر دی۔

اس تذکرہ کو پڑھ کر حضرت والارحہ کے سب سے ہی جاننے اور ماننے والوں کے دل کو جزاحت پہنچی، مگر صاحبزادہ سلمان سے رہا نہیں گیا، انہوں نے حضرت والارحہ سے عرض کی اس غلط بیانی اور اتہام کا جواب ضرور دیا جائے، حضرت اقدسؑ نے نہایت ناگواری کے لہجہ میں فرمایا: ”کیوں دیا جائے ناچا بیٹے، کسی ایک شخص نے کبھی کوئی بات خلاف لکھ دی تو اس پر اتنا غصہ! جب لوگ تعریف کے پل باندھتے ہیں تو اس وقت بھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ لکھ دیں کہ ہمارے آبا جنان میں اتنے اوصاف تو نہیں ہیں؟“

اللہ اکبر! کس مقام ارفع سے فرما رہے تھے!! غرض اس جواب کو سن کر صاحبزادہ

سداً خاموش ہو رہے اور گھر میں چلے گئے، پھر اس راقم حقیر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے حضرت نے ارشاد فرمایا:

”لوکلین ہے، اس لئے اس قسم کے خیالات ہیں، ہم بھی اپنی نوعری میں بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ایک معنوں ایسا لکھ دیں گے کہ مخالف کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔۔۔۔۔ یہ سب طفلانہ باتیں ہیں، اب تو محمد اللہ نہ کسی کی واہ واکاچہ اثر ہے نہ کسی کے طنز و تشبیہ کا، مخلوق کی مدح و قدح سے کیا ہوتا ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ خالق و مالک ہم سے راضی ہے یا نہیں؟“

بات بظاہر آئی گئی ہو گئی مگر دو ہمتیں ہفتے گزرے ہوں گے ملتان سے ماہنامہ ”الصدیق“ کا نیا شمارہ جو آیا تو مدیر فاضل کی طرف سے اس میں پرویز صاحب کا ترکی بہ ترکی جواب بھی تھا اور حضرت والا کے اخلاقِ کریمانہ کی توصیف بھی۔ مرشدِ عارف کی نظر اس پر پڑی تو صاحبزادہ کو طلب فرمایا اور سنہستے ہوئے بہ کمال بلاغت ارشاد ہوا:

”یہجے لیجے سلمان میاں جلدی دیکھتے اس رسالہ میں طلوع اسلام کا جواب چھپا ہے اور آپ کے آبا کی بارات اور بڑی تعریف چھپی ہے اب تو آپ کے آبا اچھے ہو گئے اور آپ کی تمنا پوری ہو گئی!“

اللہ اللہ، عارف کی نگاہ میں خلق کی تعریف یا مذمت کس درجہ مضحکہ خیز ہوتی ہے! ہم ہیں کہ فانی مخلوق کو پیمانہ عزت و ذلت بنائے ہوئے ہیں ایک عارف ہے کہ ہر فانی کو لا احب سے قطع کر کے صرف محبوبِ ازل پر ٹٹکی لگائے رہتا ہے۔ ع

بہیں تغاوت رہ از کجا ست تا کجا

خلوت و جلوت کی یکسانی

کامل سیرت وہی ہے جو ہر پہلو سے اور ہر مقام پر ایک سی حسین ہو، جلوت و خلوت کی دھوپ چھاؤں سے اس کی آب و تاب میں کوئی فرق نہ آنے پائے حضرت والا کے دس سالہ تعلق اور تین

ان کے مزاج کا غیر تھا، ہر بات میں سنت نبوی اور خیر اقرون کی سند کو حتیٰ قرار دیتا یہاں تک کہ زبان و بیان میں بھی متکلمین، فلاسفہ اور صوفیاء کی پیدا کردہ اصطلاحات کے بجائے قرآنی اور حدیثی اصطلاحات کے اختیار اور ان کی ترویج کا عزم ان کے ذہن کا فیصلہ تھا۔ وہ اپنے نفس کے معاملہ میں سراپا حلم اور تمام تر مغرور و دگرگشتہ مگر دین کی مدافعت میں ایک بے باک سگر شاستہ قلم اور ششستہ زبان مجاہد تھے، خلاف حق بات کی گرفت میں وہ اپنے پرانے کے فرق سے نا آشنا تھے یہی ان کا مذاق تھا،

باطنی نسبت کے اعتبار سے حضرت والا کی ذات نقشبندیہ و چشتیت کا سنگم تھی کیونکہ نقشبندی جوہر کا گشتہ چشتی آگ میں پھینک گیا تھا، حضرت والا کی طبیعت میں سوز تھا مگر جوش نہ تھا، گداز تھا مگر بے خودی نہ تھی، مست و مدست تھے مگر بودگی نہ تھی، شیخ اکبر قدس سرہ کے معارف کا انکار نہ تھا مگر دل کا میلان مجدد الف ثانی قدس سرہ کے ذوق اتباع سنت کی طرف زیادہ تھا، اور نسبت باطنی کا یہ رنگ ٹھیک وہی تھا جو شیخ الشیوخ مرشد تھانوی قدس سرہ کا تھا، ذیل میں حضرت تھانوی کے فیض یافتہ ایک سالک کا مکمل کا مکتوب جو حضرت والا کو لکھا گیا تھا مع جواب نقل ہے، اس سے میرے معروضات کی صداقت معلوم ہوگی، ملاحظہ ہو:

جواب

مراسلہ

حیدر آباد دکن حامد اومصلیٰ

۱۹ اپریل ۱۹۷۹ء

محرم و محترم ادام اللہ تعالیٰ فیوضہم

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ تعالیٰ بخیریت ہوں۔

حضرت مولانا قبلہ دام عجبکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، سامعی نامہ

لے حضرت محمد عبدالرحیم صاحب حیدر آبادی مرحوم، ہمارے حضرت والا سے عمریں زیادہ ہی تھے بڑی نورانی اور صاحب کلمات شخصیت تھی۔ شیخ اکبر قدس سرہ کا مسلک و مذاق انکا حال و قال تھا نیز اتباع سنت و تقویٰ انکی طبیعت انہیں بچہ کی حق یہ عتوبانی کی عنایت سمجھ کر ملاحظہ تھا۔ اس سے پہلے مکتوب نگار نے صرف خیریت طہی کا خط لکھا تھا۔

مورخہ یکم اپریل، شرف صدور لاکھنؤ
مزاج عالی سے مطلع کیا۔ اللہ جل شانہ اپنے
فضل و کرم سے کھانسی کو بھی رفع فرمادیں
آمین۔ بمصدق اس شعر کے ہے

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب
بوئے گل را از چہ جویم چہ ساز گلاب

(۲) شوق مطالعہ کے ساتھ انشاء اللہ
شوق عمل میں بھی کمی نہیں ہونی ہوگی کہ اصل
مقصود یہی ہے دھو و لیکھ جا کنتر
تعملون (الآیہ) یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت
و قربت و ولایت۔ صحت عقائد کے
بعد عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ مسائل اصل میں علم کلام کے ہیں
حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی
تحقیق ہے مگر حضرات صوفیہ نے ان
مسائل میں اپنا خیال بھی ظاہر فرمایا ہے
بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اتباع
میں اس فقیر و سچہ راہ کو ان مسائل سے
انذار تصوف کوئی دلچسپی نہیں۔

حضرت والاؒ کے ارشاد کے معنی میرے
خیال میں یہ ہیں، "استعداد" دو معنی میں

(۲) حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
کی مختلف تصانیف اور آپ حضرات کا
وجود و وجود مجھ جیسے عامی اور نار کاہ
کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ بوجہ
کبر سنی و خرابی صحت حاضری سے قاصر ہوں
مگر شوق مطالعہ میں کمی نہیں ہوتی، اس لئے
جربا میں مجھ پر سچ مدد کی سمجھ میں نہیں آتی
ان کی تفہیم و توضیح کے لئے حضرت والاؒ کو
کبھی کبھی تکلیف دوں گا امید ہے کہ میرے
حال پر رحم فرما کر میری دستگیری فرمائی جائیگی
چنانچہ کئی دن سے بواور النوادر کے حصہ
دوم کا رسالہ الارشاد فی مسئلہ الاستعداد
کے صفحہ (۷۴) سطر (۲۱) کی یہ عبارت
سمجھ میں نہیں آئی :-

"میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں پر یہ استعداد

اور استعداد بمعنی امکان ذاتی مخلط ہو گئی
وہ امکان ذاتی قدیم اور غیر معمول ہے اور
اس کے غیر معمول ہونے میں کوئی محذور نہیں

بولاجاتا ہے۔ ایک بمعنی قابلیت اور دوم
بمعنی امکان ذاتی اول معنی کی بنا پر استعداد
معمول ہے اور ثانی معنی کی بنا پر استعداد
غیر معمول ہے۔ یعنی استعداد بمعنی اول معمول ہے
کیونکہ وہ وجودی چیز ہے اور استعداد بمعنی
دوم غیر معمول ہے کیونکہ وہ عدمی ہے اور
عدمی غیر معمول ہوتا ہے اور اس کے غیر معمول
ہونے میں کوئی قباحت نہیں۔ بقصود یہ
ہے کہ اضافہ نور ہدایت کے قبول کی یہ
صلاحیت بندوں میں اللہ تعالیٰ کی بنائی
ہوئی اور دی ہوئی ہے

اللہ تعالیٰ سے حیر کے الزام کے رفع کے لئے
بعض صاحبوں نے یہ ماہ اختیار کی ہے کہ
بندوں میں اچھے اور بُرے اور سعید و شقی
ہونے کا بذات امکان ہے اور امکان ذاتی
غیر معمول ہوتا ہے اور قدیم، اس لئے اچھے
اور بُرے ہونے اور سعید و شقی ہونے کا
بندوں کے طبائع میں امکان اللہ تعالیٰ
کے جعل سے نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ
امکان ذاتی قدیم کے تقضی کے خلاف
کر سکتا ہے اور نہ بدل سکتا ہے کیونکہ قدیم

تبدیلی سے پاک ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ پر حیر کا الزام نہیں آتا۔ حضرت مولانا اس تاویل یا نظریہ کو اس لئے نہیں مانتے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا مجبور ہونا لازم آتا ہے اور وہ قادر مطلق اس سے بڑی ہے یہ مجبوری اس لئے لازم آتی ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امکان ذاتی قدیم کے خلاف کسے پر قدرت نہیں رکھتا (۳) مولانا جامیؒ کی رباعیات کی شرح مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک رسالہ میں کی ہے وہ مجھے نہیں ملا، میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔

بندہ، پچراں

ستید سلیمان

(۳) علاوہ ازیں کسی کتاب میں حضرت جامی علیہ الرحمۃ کہ یہ رباعی میری نظر سے گذری ہے اعیان بحضیض عین نا کردہ نزول حاشاکہ بود بہ جعل جبال مجہول

گر جعل بود افاضۂ نور وجود تعریف عدم بہ آن نباشد مقول براہ بندہ لوازی "امکان ذاتی" اور رباعی متذکرہ صدر کا مفہوم سلیس الفاظ میں تحریر فرمادیں بشرطیکہ مزاج گرامی پر کسی قسم کا بار اور تعب نہ ہو،

لغافہ نکٹ چسپیدہ بغرض جواب ملفوف ہوا ہے، خادم

محمد عبدالرحیم غفرلہ

دیکھ لیا آپ نے کہ کلامی مسائل پر عربوں کے باوجود ازراہ تصوف ان سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ نگاہ تمام تر قرآن پاک و سنت نبویؐ ہی کو معیار و سند بنائے ہوئے ہے !! اور ذوق قمری کا اثر یہ ہے کہ حضرت کا جواب پا کر محترم مراسلہ نگار نے کلامی مسائل سے توبہ کر لی اور اس کا اظہار خود راقم سے فرمایا۔

انہی بزرگ نے پھر ایک اور ریضہ ذیل میں اپنے احوال لکھے جن کے جواب سے مذاق سلیمانی کا مزید اندازہ ہوگا

جواب

مراسلہ

محرمی و محرمی ادام اللہ فیہ وسلم و زادکم عرفانا

حیدر آباد دکن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، الحمد للہ

۲۹ اگست ۱۹۵۳ء

خیریت ہے،

حضرت اقدس و امت فیوضہم

(۱) اللہ تعالیٰ اس حب فی اللہ کو طرفین کے لئے باعث خیر و برکت بنائے۔

السلام علیکم، مزاج مبارک بہ مافیت ہوگا

(۱) اس ناکارہ کو آں محترم سے حب فی اللہ

ہے، اسی جہت سے اپنے بعض احوال

خدمت والا میں بجز من تصحیح و تصدیق

پیش کر رہا ہوں۔

(۲) یہ معمول مناسب ہے،

(۲) نماز تہجد کے بعد ذکر و دازدہ تسبیح کا

یہ کیفیت محمود ہے اور مبارک ہے بلکہ

معمول ہے۔ ذکر لفظی و اثبات کے بعد جب

مقصود ذکر ہے بشکر فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ

”اللہ اللہ“ کا ورد ہوتا ہے تو اولاً اپنے

نے یہ دولت آپ کو عطا فرمائی۔

لاشعے ہونیکا استحضار ہوتا ہے، پھر لفظی کلی

ہو کر محض اثبات حق رہ جاتا ہے، بلا اتحاد

و حلول، اور نہ صرف اپنی ذات کی نفی ہوتی

ہے بلکہ ہر شے معدوم نظر آتی ہے ہر طرف
محض وجود مطلق کا ظہور نظر آتا ہے۔ یہ اکثر
ذکر کے بعد بھی طاری رہتا ہے تا آنکہ خود کو
بالقصد کسی کام میں مشغول نہ کر لوں،

(۳) علاوہ ذکر کے ہر وقت یہ حالت طاری
رہتی ہے کہ موجود صرف ایک ذات مطلق
ہے اور اسی کا ظہور ہر سہ ہے، باقی سب
عدمات ہیں نہ معلوم یہ حالت کیسی ہے؟

(۴) حضرت سے بہ ادب التماس ہے کہ اس
عاجز کے حسنِ خاتمہ کے لئے دعا فرمائیں

(۲) اپنے اور آپ کے دونوں کے لئے
حسنِ خاتمہ کی دعا ہے،

والسلام

سید سلیمان ندوی

یکم محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

(۵) اپنی کیفیتِ عرصہ سے لکھوانا چاہتا تھا
مگر ایک طرف معذوری بصرارت، دوسری
طرف کسی موزوں لکھنے والے کے نہ ملنے
سے تاخیر ہو گئی، دعا خواہ

عبدالرحیم

بہ قلم غلام محمد

لے احقر پاکستان سے حیدر آباد گیا ہوا تھا۔ حضرت عبدالرحیم صاحب اس وقت تک ہم، برس کے سن کو بہ چکر بصرارت
سے معذور ہو چکے تھے۔ اپنا حال کسی پر ظاہر نہ فرمانا چاہتے تھے، احقر کو دیکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو میرے
لئے بھیج دیا اور یہ عریضہ فوراً لکھوایا۔

اِسے ستودہ صفات ہستی کیوں نہ اللہ کی محبوبیت کا شرف پائی! یقیناً وہ

شانِ محبوبیت

عیاں تھے، ان سے رشتہ محبت جوڑ کر اہل جنت نے حب الہی کے جواں عالم پائے اور حسبِ محبت پارہے ہیں اس کے تذکرہ کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ البتہ دو ایک واقعات بطور عبرت کے ایسے نقل کر دینا کافی ہیں جن میں ان کا احترام ملحوظ نہ رکھنے پر تنبیہ اور ان کی مخالفت پر عتاب الہی صاف نمایاں،

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ایک خلیفہ حضرت حافظ محمد بلین رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کے ایک مرید حافظ صاحب ہیں، پختہ سن اور بڑے بڑے بزرگوں کو دیکھتے ہوئے مگر طبیعت کے آقا اور کم ہی کسی کے معتقد ہوتے ہیں، ان کی ماتے میں اب بزرگی تو رہی نہیں ہے، اس کا ایک نامہ لیا ہے، بہر حال یہی حافظ صاحب ایک روز حضرت والدہ کی خدمت میں آئے اور اپنے انداز میں ہنس ہنس کے اور قہقہے لگا لگا کر کافی دیر تک حضرت سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور دورانِ گفتگو میں یہ بھی کہہ ہی ڈالا کہ مولانا غلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا تھانویؒ تھے، اب بزرگ کہاں! حضرت والدہ ایک تواضعیت اور پھر اپنی افتاد طبع کی بنا پر اکثر خاموش ہی رہے۔ کچھ دیر بعد حافظ صاحب رخصت ہو گئے، قصہ ختم ہو گیا، مگر دوسرے دن پھر حافظ صاحب آ موجود ہوئے مگر ادب سے بیٹھے اور لجاجت سے اپنی گزشتہ بے تکلفانہ گفتگو کی معافی چاہی۔ حضرت والدہ نے فوراً فرما دیا کہ دل سے معاف ہے، اس میں بات ہی کیا تھی! راقم کو بڑی حیرت ہوئی، خصوصاً حافظ صاحب کی طبیعت نے اُفتیت کی بنا پر اور کبھی تعجب ہوا کہ یہ کسی سے نہ دبنے والے آج خود بخود کس طرح اس قدر رام ہو گئے جب حافظ صاحب حضرت سے اجازت لے کر بے ادب رخصت ہوئے تو میں بھی باہر نکل گیا اور ان سے پوچھا کہ حافظ صاحب یہ کیا قصہ ہے، زور سے ہنستے ہوئے کہنے لگے:

”اُسے کچھ نہ پوچھئے، رات خواب میں بڑی ڈانٹ پڑی، میں تو لرز گیا۔“

ہر چند میں نے خواب کی تفصیل پوچھی مگر انہوں نے بتانے سے انکار کیا اور صرف اتنا ہی

فرماتے رہے کہ ”میں حضرت سید صاحب کو اس رتبہ کا انسان نہ سمجھتا تھا، کہ ان کا اذہب نہ کرنا آفت مول لینا ہے، میں تو آج سے ان کا قائل ہو گیا۔“

یہ تو خیر خواب کی تیسرہ تھی جو معمولی بے ادبی پر مبنی۔ اب ایک عین عالم شہادت کا واقعہ اس سے برسوں قبل (۱۳۹۳ھ) کا سنئے۔ مدوہ جس کی آبرو اور جس کا علم افتخار ذات سیلانی تھی، ۱۳۳۹ھ میں مدوہ میں ایک اسٹرائیک کا طوفان خاص اسی ذات عالی کے خلاف بپا کیا گیا۔ اس ہنگامہ میں نمایاں حصہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بعض عزیز شاگردوں کا تھا اور اس کی قیادت انکے عزیز ترین ذکی و ذہین شاگرد علی احمد کیانی مرحوم کے ہاتھ میں تھی اور اس کا مقصد حضرت والاؒ کو معتمدی کے عہدہ سے ہٹانا تھا، ————— حضرت والاؒ کے قلب کو اس ناپاسی و ناشائستگی سے چوٹ لگی اور ادھر علی احمد کیانی پاگل ہو گیا۔ مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں کہ ”مرحوم کو جب رسیوں میں بندھا ہوا دیکھا تو آنکھ میں آنسو آ گئے کہ یہ نوجوان جو اپنی ذکاوت اور صحیح الدماغی میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی قابل رشک تھا، اس حالت میں ہے، بہر حال پھر مولانا موصوف ہی کو خیال آیا کہ یہ سید عالی مقام کی شان میں گستاخی کا خمیازہ ہے، انہوں نے حضرت کی خدمت میں جب بہ اصرار اپنی قلبی کھٹک کا اظہار کیا اور کیانی کی صحت کے لئے دعا کی درخواست کی تو حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر دوسرے یا تیسرے دن مولانا سے فرمایا کہ ”مولوی علی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔“ ————— چنانچہ علی احمد کیانی بالکل صحت یاب تھا۔

اللہ اکبر، محبوبیت کا یہ کرشمہ کہ محبوب کی دشمنی پر دفعۃً گرفت اور اس کی معافی پر فوراً

رہائی

ایک مولوی صاحب جو پہلے حضرت سے بڑے عقیدت کا اظہار کرتے تھے، لیڈرانہ زعم میں مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور یہ سمجھ لیا کہ جیسے اور بڑوں سے جھگڑا چکے تھے ایک اور سے بھی پر عا ش سہی، مگر کلیجہ پانی ہوتا ہے یہ لکھتے ہوئے کہ جب سے حضرت والاؒ کی انہوں نے دل ڈاری کی ایک ایک سعادت سے محروم ہوتے چلے گئے، روزانہ صبح درس تفسیر کا سلسلہ تھا وہ ختم ہو گیا،

لے اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا علی میاں صاحب کی تالیف ”پراسنہ چراغ“ صفحات ۴۲ تا ۴۳۔

جماعت سے نماز کا التزام تھا، وہ رخصت ہوا، ماہ و مال کی حرص ایسی بڑھی کہ اس کی خاطر بدعات تک میں ملوث ہو گئے۔ مسلک حق چھوٹ گیا۔

وما بعد ذالک الا بفساد!

اور یہی ایک مثال نہیں، محترم ماسم صاحب نے برسبیل تذکرہ فرمایا:-

”ہم لوگوں نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ جس نے چچا جان (یعنی حضرت صاحب تذکرہ)

کی دل آزاری کی، گو چچا جان نے کبھی کچھ نہیں فرمایا، مگر وہ پھر پنپ نہ سکا۔“

یہ آثار صاف طور پر بتلاتے ہیں کہ حضرت والاؒ محبوب سبحانی تھے، کیونکہ حدیث قدسی میں

آتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کو ستاتا ہے اس کو حق تعالیٰ دعوت رزم دیتے ہیں!

معمرہ زبان مبارک سے جو نکل جاتا، اس سے باطنی کیفیت کا اشارہ مل جاتا تھا اور وہ اس قدر پر کیف ہوتا تھا کہ رات کو بہار کا دن بنا جاتا تھا، مثلاً ایک روز ختم تراویح کے بعد حسب معمول احقر نے پانی کا گلاس پیش کیا تو نظر بھر کر دیکھا اور ارشاد فرمایا:

عالم بخروش لا الہ الاہوست

یقین جانئے کہ یوں نظر آ رہا تھا کہ سارا عالم معدوم ہے، جلوہ گر صرف ذاتِ باری ہے اور یہ کیفیت وقتی بھی نہیں تھی، کئی دن تک قائم رہی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کو نماز میں کیسی معراجی کیفیت حاصل رہتی ہوگی؟

غرض اس قسم کے ظاہری اور معنوی آثار سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اقدس کو حقیقتِ صلوٰۃ میں رسوخ حاصل تھا مگر اس ظن و تخمین میں یقین کی کیفیت خود حضرت کے بعض ارشادات سے ہوتی ہے مثلاً جب کبھی حضرت سے امامت کی درخواست کی جاتی تو مسکراتے ہوئے یہی جواب ملت کہ

”بھئی مجھے نماز پڑھنا تو آتا ہے مگر پڑھانا نہیں آتا“

اس سے واضح تردد و ایت مولانا محمد اویس ندوی نگرانی مدظلہ سے ملی، کہ حضرت والا نے

ارشاد فرمایا:-

”نماز کا فلسفہ اور اس کے اسرار و رموز تو بہت پڑھے اور لکھے تھے مگر نماز پڑھنا حضرت مولانا تھا نوی کے تعلق کے بعد ہی آیا“

”یہ نماز پڑھنا آیا“ اور ”نماز پڑھنا آتا ہے“ کا اقرار کس درجہ واضح اور صاف ہے۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے اور حضرت ہی کے ارشاد سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ نماز تہجد میں اکثر سورۃ یٰس اور اٰہین میں سورۃ ق تلاوت فرماتے تھے، اس اظہار کے ساتھ حضرت والا نے احقر سے بھی ارشاد فرمایا کہ اس سے یہ مقصد نہیں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نماز تہجد میں سورۃ مزمل پڑھا کرتے تھے اور اس کا لفظ محسوس

کرتے تھے۔

ذکر حضرت والدہ کے ذکر کی کیفیت بھی عجیب تھی، خصوصاً جہری ذکر حیرت انگیز تھا، شروع تعلق میں ذکر جہری کا غلبہ دیکھا تھا، مگر بعد کو معمول کے علاوہ جہر کا اہتمام نہ پایا، دائمی ذکر خفی میں مشغول رہتے تھے۔

پہلے ذکر علی (مفرد و مرکب) کی کیفیت سنئے، چار زانو ہو کر سیدھے قبلہ رخ بیٹھ جاتے، سر کا ہلکا سا اشارہ قلب صافی کی طرف ہوتا، آنکھیں بند ہوتیں اور ہونٹ بھی بند، اب ذکر فرماتے، مگر جسم کے کسی حصہ کو ذرا بھی حرکت نہ ہوتی، ساکت و صامت رہتے۔ بار بار دیکھا اور بہت سوں نے دیکھا۔ ہر ایک کی نظر ہر وقت تو دھوکا نہیں کھا سکتی کہ اس عالم سکوت میں ذکر کی آواز صاف اندر سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور گو حضرت کی آواز بھاری تھی اور غنا سے تو حضرت کو دُرُود کا واسطہ بھی نہ تھا، مگر صوتِ ذکر اس قدر مترنم اور شیریں ہو کر نکلتی تھی کہ سننے والے مست و مرشار ہو جاتے تھے حیرت ہوتی تھی کہ

ط از کجانی آید ایں آواز دوست

اس کیفیت کی شہادت اپنے بڑوں میں مولانا دریا بادی مدظلہ اور مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ نے بھی اپنے اپنے مضامین میں پیش کی ہے، افسوس ہے کہ اس وقت صدقِ جدید کے وہ شمارے میرے سامنے نہیں ہیں۔

حضرت والدہ فرماتے تھے کہ ذکر "نفی و اثبات" کے دوران مجھ کو

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ التَّوَكُّلُ الْحَقُّ الْمُبِينُ۔

کہنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اس ارشاد سے شیخِ قدس سترۃ کی یافت کا اندازہ اہل بصیرت بخوبی لگا سکتے ہیں۔

لے اس کے بعد حضرت والدہ نے ایک ہی سورت کو بار بار پڑھنے کو جو فقہانے حکم دیا ہے اس کی علت

بیان فرمائی اور پھر اس کے حوالے کے دلائل بیان فرمائے۔ !!

بہر حال یہ تو ذکرِ حلی کا عالم تھا، خفی کی کیفیت کا دھندلا سا اندازہ ان آثار سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ذکرِ دائم (قدس سرہ) کے پاس بیٹھے ہی ظاہری و باطنی سبب الجبنیں ختم ہو جاتی تھیں و سادس و خطرات کا فوراً ہو جاتے تھے۔ اوہام و اشکالات بلا قیل و قال دفعۃً عمل ہو جاتے تھے یہ تو منفی منفعت تھی، اثباتی نفع یہ محسوس ہوتا تھا کہ خود اپنا دل بھی اللہ اللہ کرنے لگتا، جو کیفیت اور جگہ مسلسل توجہ اور مراقبات کے اہتمام سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہاں قریب ہو کر خود بخود حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ اثر دوام ذکر ہی کا تو تھا، اور ذکر بھی خفی، کیونکہ ظاہر پر تو وہ اکثر کوئی کتاب مطالعہ فرماتے ہوتے یا تحریر میں مصروف! ایک واقف طریق بزرگ نے راقم سے ارشاد فرمایا کہ ”ماشاء اللہ حضرت سید صاحب کے تو ساتوں لطائف جاری ہیں“ ایسے بہت سے اہل دل حضرات سے یہ بات سننے میں آتی رہی کہ حضرت دائماً ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔

اسی ذیل کا ایک واقعہ سننے کے لائق ہے، ہمارے ایک محترم برادر طریق نے بتایا کہ ایک روز حضرت والدہ لیٹے ہوئے تھے اور تنہائی تھی تو انہوں نے حضرت سے پاؤں دابنے کی اجازت چاہی، ایسی اجازت بھلا کہاں مل سکتی تھی، مگر ان کے جوش عقیدت کی رعایت فرما کر حضرت نے ہاتھ کی طرف اشارہ فرمایا، محبت گرامی نے اپنا ہاتھ جیسے ہی حضرت کے بازو پر رکھا تو ان کے سر سے پاؤں تک ایک برقی روشنی دوڑ گئی جس میں حرارت و جلالتِ ذکر کا اثر تھا وہ حضرت اقدس کا بازو دباتے رہے اور اس بات کو مسلسل محسوس کیا کہ جب ان کا ہاتھ جسم مبارک سے ہٹ جاتا تو برقی ردِ منقطع ہو جاتی اور جب پھر مس کرتا تو وہ برقی پھر سارے جسم میں گوند جاتی جب یہ خدمت ختم ہوتی تو وہ کیفیت بھی جاتی رہی۔ برادر گرامی کا بیان ہے کہ خدمتِ شیخ کی یہ سعادت پھر نہ مل سکی اور یہ کیفیت بھی کہیں اور نہ پائی جاسکی۔

ع اک قدر بشکست و ان ساقی نماں

اے جو سالکین کامل ہیں وہی جانتے ہیں کہ وقتِ واحد میں دو تین لطائف کا قیام ہی کس درجہ مشکل ہوتا ہے جو چاہئے کہ اس سوزنا و خصوصاً ساتوں لطائف کا جاری رہنا تو اور ہی سہ ہے۔ ذلک فضل اللہ یؤتی من یشاء۔

حضرت شیخؒ کے اصول تربیت

کسی شیخ محقق کے اصول تربیت میں بعض امور تو خاص طور پر ذات شیخ سے متعلق ہوتے ہیں اور بعض کا خصوصی تعلق مرید کی ذات سے ہوتا ہے اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے اصول تربیت کے اظہار میں بھی اس تقسیم کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ البتہ یہاں ان اصول کا صرف شمار ہی ہوگا۔ ان کی خوبی اور کمال کے تفصیلی اور عملی مشاہدہ کے لئے منہاج سلیمان کا مطالعہ ضروری ہے۔

اصول متعلقہ ذات مرشد اقدسؒ

برکت و صرف ہمت | حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ہی کا ارشاد ہے کہ کامل شیوخ میں بھی دو قسم کی ہستیاں ملتی ہیں، ایک وہ جن کے ہاں کام "برکت سے چلتا ہے" یعنی وہ خود زیادہ مشقت اٹھاتے ہیں اور مریدوں کی اصلاح میں بجائے زہر و تلویخ کے "صرف ہمت" سے زیادہ کام لیتے ہیں اور دوسرے وہ جن کے ہاں "حرکت" سے کام چلتا ہے، یعنی وہ اپنے مریدوں کو خوب ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں، اویان کے بار کو خود ان ہی سے اٹھواتے ہیں، یہ اختلاف دراصل شیوخ کے انفرادی مزاج کا نتیجہ ہے۔ یہاں حضرت والاؒ کے ہاں بھی "برکت" کا مشاہدہ عام تھا اور وہ صرف ہمت ہی سے غافلوں کو ہوشیار، کاہلوں کو چست اور قدم قدم پر تھک جانے والوں میں عزیمت کی قوت پیدا فرماتے تھے۔ وابستگان سلیمانی کا یہ متفقہ تجربہ ہے کہ حضرتؒ نے ان سے کام بہت کم لیا مگر ان کو ثمرات کہیں زیادہ ملے۔ حضرتؒ کے صرف ہمت کی یہ بین دلیل ہے کہ ان کے دست گرفتوں میں شدت طلب پہلے پیدا ہوتی تھی اور ترقی کا جذبہ پہلے ابھرتا تھا، پھر کہیں حضرت والاؒ مناسب عمل کی تلقین

فرماتے تھے۔

اسی طرح حضرت شیخ کے ہاں گو مرنی توجہ کا کوئی اہتمام نہ تھا مگر ان کے فیضانِ توجہ فیض جاری کی یہ برکت تھی کہ ان کے قریب بیٹھ کر دعتہ قلب سے وسوس اور خطراتِ مط جاتے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ دل سکینت سے معمور ہو گیا ہے بلکہ جو برکات صحبتِ مبارکہ میں پائی جاتی تھیں وہی مراسلت و مکاتیب کے ذریعہ بھی براہِ مواصلت رہتی تھیں! فیضِ معنوی میں کیا قرب و کیا بعد!

سید عارف صاحب، رشتہ میں حضرت والا کے بھانجے ہوتے ہیں اور حضرت سے بہت بے تکلف بھی تھے، انہوں نے اپنا واقعہ سنایا کہ ایک روز ظہر کی غماز سے پہلے میں نے ماموں جان سے عرض کیا کہ آپ کو میرا نام معلوم ہے؟ حضرت نے فرمایا "ہاں، عارف" میں نے عرض کیا کہ میرا یہ نام کس نے رکھا تھا، حضرت نے فرمایا "میرے والد ماجد نے"۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ نام تو "عارف" ہے اور معاملہ بالکل برعکس ہے! حضرت نے پوچھا: "کیا نماز و نماز کچھ نہیں" میں نے عرض کیا "کچھ نہیں"۔ دریافت فرمایا کہ "جمعہ کے جمعہ بھی نہیں" عرض کیا "جمعہ کی بھی نہیں" پھر دریافت فرمایا کہ "عیدین کی!" میں نے عرض کیا کہ "بس سال میں صرف دو نمازیں عیدین کی تو ہو جاتی ہیں"۔ بات ختم ہو گئی ظہر کی غماز کے لئے اٹھے تو مجھے بھی وضو کرنے کا حکم دیا، چنانچہ میں نے وضو کیا، ماصم اور سلمان بھی وضو کر کے آگئے، ہم تینوں نے ماموں جان کے پیچھے نماز پڑھی، سنت و نفل پڑھ کر ماصم اور سلمان اپنے کمرے میں چلے گئے، میں بھی اٹھنے لگا تو فرمایا کہ آپ بیٹھے رہیے، چنانچہ میں بیٹھ گیا، میں نہیں جانتا کہ مجھ پر کیسی توجہ فرمائی کہ اس روز سے آج تک جب کہ حضرت کی رحلت کو تیرہ برس ہو چکے ہیں غماز و غفلت نہیں، بلکہ جب تک حضرت زندہ رہے نماز کی ادائی بالکل ایسی محسوس ہوتی تھی گویا بلا ارادہ ہی خود بخود ہو رہی ہے البتہ اب الاداء کا احساس بھی ہوتا ہے،

خود اس راقم عاجز کے انقلابِ روحانی میں بھی اصل فعل توجہ سیمانی ہی کا رہا جس کی تفصیل

حصہ دوم کے آغاز میں آئے گی، پہلی ہی حاضری اور وہ بھی غیر معتقدانہ حاضری میں صرف باتوں
 ہی باتوں میں حضرت اقدسؒ کے فیضانِ توجہ نے اپنا ہی بنا ڈالا، بقول عرفی یہ

آں دل کہ رم نمودے از خوب و جواناتان

پیرانہ سال مردے بردہ بہ یک نگاہے

اس قسم کے خصوصی واقعات کے علاوہ اہلِ اداست کے روزمرہ تجربہ کی بات یہ بھی کہ
 جب حضرت اقدسؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو گو حضرت والاؒ بہت کم گفتگو فرماتے تھے
 اور اکثر کسی کتاب یا رسالے کے مطالعہ میں مصروف رہتے مگر حاضرین مجلس اپنے قلب میں روحانی
 فیضان کا اثر صاف محسوس کرتے تھے،

شفقت | کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کو مایوسی نہ فرماتے تھے، بلکہ دو لفظوں سے حضرتؒ کو
 نفرت تھی، ایک مایوسی اور دوسرے بد قسمتی، فرماتے تھے کہ صاحبِ ایمان
 ہو کر پھر بد قسمتی اور مایوسی کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو کافر کے لئے ہے چنانچہ ایک صاحبِ ارادت
 سے ایک بڑی نفرت ہوئی جس پر وہ نام و ثمر سار بھی تھے، حضرتؒ نے ان کی بھی دل دہی یوں
 فرمائی کہ متبسم ہو کر بڑی قوت سے ارشاد فرمایا کہ توبہ و استغفار کے پانی سے ہر داغ و ہل جاتا ہے
 اللہ کی رحمت سے مایوسی کی کسی حال میں بھی کوئی وجہ نہیں ہے پھر وہ سالک طریقِ مسلسل
 ایک ہفتہ تک یہی خواب دیکھتے رہے کہ ایک زبردست صاف و شفاف آبشار کے
 نیچے وہ کھڑے ہوئے ہیں اور دھلتے جا رہے ہیں، اس کے بعد ان کی کیفیت کامل رجا سے
 بدل گئی۔ یہ آبشار کیا تھا؟ شیخِ قدس سرہؒ کی سراپا شفقت توجہ و ہمت
 کی مثالی صورت! قدس سرہؒ۔

اسی طرح ایک غیر سلسلہ کے سالک کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اعمالِ صالحہ پر تو گودام نصیب
 ہے، مگر ان کی قبولیت کا کیا بھروسہ؟ یہ خطرہ انہوں نے اور جگہ بھی پیش کیا مگر کہیں تشفی
 نہیں ہوتی تھی، آخر کھٹنوں میں حضرتؒ والاؒ سے ملاقات ہوئی تو اپنی پریشانی کا اظہار فرمایا۔

حضرت والا رحمہ اللہ نے ان سے پوچھا کہ کبھی بنگ کے نام چیک لکھ کر بھی ہوتا ہے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ ہو، دستخط ملیں یا نہ ملیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ”نہیں“! حضرت والا رحمہ اللہ نے فرمایا کہ معاملہ تو یہ بھی ممکن تھا، مگر یہاں احتمال پر یقین غالب رہا اور حق تعالیٰ کے معاملے میں کھٹک باقی رہ جاتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور ان سے سچا کس کا وعدہ ہو سکتا ہے کہ جو طاعت ان کے حکم کے مطابق ہو اس کو وہ قبول فرما لیتے ہیں۔

اس جواب کو سن کر ان پریشان حال سالک کا خطرہ کا فور ہو گیا اور انہوں نے اعتراف کیا کہ کامل شفی ہو گئی اور دل امید سے معمور ہو گیا۔ شیخ کامل کے اس انداز شفقت کو عارفِ رومی فرماتے ہیں:۔

زال کہ او ہر خار را گلشن کند دیدہ ہر کور را روشن کند

طریق عشق | اتباع سنت سب ہی شیوخ کا مقصود اور رضائے الہی سب ہی کا مدعا ہے، مگر میدوں میں اس مقصد و مدعا تک رسائی کی آمادگی پیدا کرنے کے لئے شیوخِ محققین نے مختلف محرکات یا ذرائع اختیار کئے ہیں، چنانچہ حضرت والا رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ کوئی صبر و شکر کے ذریعہ طے سلوک کر داتا ہے جیسے حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کا طریق ہے۔ کوئی محض اتباع سنت کے ذریعہ جیسے حضرات نقشبند رحمہم اللہ ہیں۔ اور ہمارے حضرت (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کا طریق، طریق عشق ہے! یعنی یہاں جذبہ عشق کی بیداری کو امراضِ نفسانی سے شفا کے کامل اور حصولِ نسبت کا ذریعہ بنایا جاتا ہے جیسے کہ اس طریق کے امام حضرت پیر رومی قدس سرہ کا ارشاد ہے۔

شاد باش لئے عشق خوش سودائے ما لئے طیب جملہ ملتہائے ما

اور اس کی قرآنی اصل والذین امنوا اللہ حبائہ۔ اور یحبہم ویحبونہ۔ نہایت مستحکم ہے۔

البتہ حضرت والا رحمہ اللہ حبِ طبعی نہیں بلکہ حبِ عقلی کے قائل تھے جو اعمالِ صالحہ کا محرک

ہو اور دلیل قرآنی میں یہ آیت شریفہ تلاوت فرماتے تھے کہ ان کنتم تحبوت اللہ
فاتبعونی یحبکم اللہ۔

تطہیر فکر و تعین راہ | جذبہ اور محرک جو بھی استعمال کیا جائے اولین اہمیت کی بات
یہ ہے کہ بہر و طریق میں اپنی منزل مقصود کا صحیح شعور اور اس
تک رسائی کے طریق کا یقینی علم پیدا ہو جائے اور اس کی ذمہ داری بہر و طریق پر عائد ہوتی ہے۔
ہمارے حضرت والارہ زبانی افہام و تفہیم کے علاوہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنے شیخ حضرت
حکیم الامت کا مرتب فرمودہ "نصاب" استعمال فرماتے تھے، یعنی تطہیر فکر اور سنت و بدعت دوسم
میں امتیاز کا مکمل پیدا کرنے کے لئے تعلیم الدین، ہشتی زیور، اغلاط العوام اور اصلاح الرسوم کے
مطالعہ کی اور مقصود و طریق اور خود راہ طریقت کا یقینی شعور پیدا کرنے کے لئے قصد السبیل کے
مطالعہ کی تاکید فرماتے تھے اور سوالات کر کے عازم طریق کی فہم کا اطمینان فرمایتے تھے کیونکہ یہ
معاہدہ صرف ہمت یا توجہ کا نہیں بلکہ تعلیم و علم ہی کا ہے۔

پاک فکر اور تعین راہ کا یہ اہتمام جیسا سلسلہ اشرفیہ میں ہے اور کہیں نہیں۔ یوں کرنے
کو تو اور شیوخ بھی سنت کی تلقین و تاکید کرتے ہیں مگر کوئی نہیں بتاتا کہ ہر قدم پر سنت کا
نقش کون سا ہے اور بدعت اور رسم کے خطوط کیا ہیں؟ اسی طرح مقصود و طریق کیا چیزیں ہیں اور
غیر مقصود کیا؟ اسی لئے جہاں تمام تربعات اور وجد و حال ہی کا ہنگامہ نہیں وہاں بھی غلط و آمیزش
ضرور ہے اور یہ صورت کم فہم کے لئے اور زیادہ خطرناک ہے۔

انفرادی مزاج اور مرض کی رعایت | حضرات چشتیہ کا یہ امتیاز قائم ہے کہ ان کے
ہاں سلوک کا کوئی نصاب متعین و مقرر نہیں

بلکہ وہ اپنی بصیرت سے مریض کے مرض کو مشفق کر کے اس کے مزاج کی رعایت کے ساتھ اس کا
علاج تجویز کرتے ہیں، اس سلسلہ میں شیخ وہی ہو سکتا ہے جو مکائد نفس و شیطان سے پوری طرح
واقف اور تجویز علاج میں مجتہدانہ قوت رکھتا ہو چنانچہ ہمارے حضرت والارہ کے ہاں بھی یہی

تھا کہ ہر طالب کے ساتھ اس کے انفرادی مزاج اور استعداد کے مطابق معاملہ فرمایا جاتا تھا مثلاً کسی کو مدت تک ذکر کی تلقین ہی نہیں فرماتے تھے اور کسی کو اول روز ہی ذکر بتا دیا جاتا تھا پھر کسی کو چہری ذکر کی تاکید ہوتی تھی اور کسی کو ستر کی ہدایت، یہاں تک بھی دیکھا گیا کہ بعض صالح علماء کو اول ہی مرحلہ پر مراقبات کی تلقین فرمائی گئی اور بعض سالکین کو محض ذکر ہی پر رکھا گیا انفرادی مزاج کی اس رعایت سے نفع بھی بہت جلد حاصل ہوتا رہا۔

ملکات کی اصلاح | اپنے شیخ مجدد قدس سرہ کی تقلید میں حضرت والارہ کی نگاہ بھی سالکین کے افعال و اعمال سے کہیں زیادہ ان کے ملکات اور باطنی رجحانات پر رہتی تھی وہ ملکات کی اصلاح فرمادیتے تھے جس کی وجہ سے اعمال و افعال کی اصلاح خود بخود نہایت سرعت سے ہو جاتی تھی مجھے یاد نہیں کہ ایک مرتبہ بھی حضرت والارہ نے کسی کو داڑھی نہ رکھنے یا انگریزی وضع کے بال توڑوانے وغیرہ پر بصراحت ٹوکا ہو، مگر حالت یہ تھی کہ خود مستببین کے دل ہی میں اصلاح کی امنگ زور شور سے اٹھتی تھی اور ہر وہ مخالف سنت ادا کو مٹا دیتی تھی سچ یہ ہے کہ دل حاکم ہے اور اعضاء و جوارح محکوم، حاکم کا رجحان بدل جائے تو محکوم کی کیا مجال ہے کہ اس کے خلاف قائم رہیں!

توجید افعالی سے توجید ذاتی تک | حضرت والارہ کا ایک امتیازی انفرادی اصول یہ نظر آیا کہ توجید کی تکمیل اور اس میں رسوم کا مل کے لئے وہ توجید افعالی ہی پر تمام تر زور دیتے تھے اور اسی کی انہام و تفہیم فرماتے رہتے تھے، حضرت کا ارشاد تھا کہ توجید افعالی میں رسوم کے بغیر توجید کامل نہیں ہو سکتی، قرآن پاک نے اسی لئے تمام تر زور توجید افعالی ہی پر دیا ہے۔

اس توجید افعالی کے اہتمام کا نتیجہ خود بخود توجید ذاتی کی صورت میں حاصل ہو جاتا

تھا، اور وہ بھی بلاشبہ، سرا سر مغزیہہ لئے ہوئے جو کہ منتہائے حصول ہے!
 حضرت شیخؒ کا یہ طریق نہایت اقرب، محفوظ اور پاک تھا اور کیسے نہ ہوتا جب کہ یہ
 کسی صوفی کا معلوم کیا ہوا راستہ نہیں بلکہ خود خالق فطرت کی متعین کردہ راہ ہے، اور یہی طریق
 نجوم ہدایت (صحابہ کرامؓ) کا طریق رہا ہے۔



اصول متعلقہ ذاتِ مرید

حضرت والاد کے ہاں عمومی بات یہی تھی کہ جب تک اپنے معائب پر آپ نظر | رذائلِ نفس کی معتد بہ اصلاح نہ ہو جاتی تھی ذکر کی اجازت نہ ہوتی تھی کہ سوئے ہضم یا تپ محرقہ میں مقوی غذا کی اجازت ملین کی ہلاکت کا سامان ہے! لیکن رذائلِ نفس کی فہرست مرتب کرنے اور اس کی درماں طلبی کا کام خود سالک کے تفویض رہتا تھا، البتہ شیخ کی باطنی معاونت یہاں بھی برابر شامل رہتی تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت سے تعلق قائم کرتے ہی قریب و بعید کے ہر سالک کو فوراً کشفِ عیوب ہونے لگتا تھا اور اس کی اتنی شہرت ہوتی تھی کہ وہ اس کو اپنی نگاہ میں ذیل و خواہ بنا کر رکھ دیتا تھا جیسا کہ حدیث شریف میں دعا آئی ہے کہ ”اللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا“۔ دراصل یہی کیفیت خود کتنے خباثت کا علاج ہے مگر اس سے بڑھ کر یہ جذبہ بھی اُبھر آتا تھا کہ اپنے ہر مرض کا علاج طلب کر کے اپنی صحت کے سامان کئے جائیں!

تدریجی طور پر مشق ذکر | جب امراضِ نفس سے ایک گونہ شفا میسر آتی تو پھر ٹانگ تجویز فرمایا جاتا اور اس کا اثر بھی فوراً ہونے لگتا تھا، آغاز ذکر مفرد یک مرتبہ (اللّٰهُ - اللّٰهُ) سے فرماتے اور نظرِ کیت سے زیادہ کیفیت پر ہوتی، جب یہ ذکر رائج ہو جاتا تو اب اپنے سلسلہ کا خاص ذکر یعنی ذکر بارہ تسبیح تعلیم فرماتے اور یہاں بھی

پہلے لا الہ الا اللّٰہ دو سو مرتبہ - پھر لا اللّٰہ چار سو دفعہ - اس کے بعد اللّٰہ اللّٰہ چھ سو مرتبہ یہ کل بارہ تسبیحیں ہو گئیں۔ آخر میں اللّٰہ اللّٰہ سو مرتبہ! یہ سلسلہ امدادیہ کا خاص ذکر ہے، نہایت مختصر اور از حد مفید!

تدریج مملوفاً خاطر رہتی۔ ارشاد تھا کہ:-

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے دو جز ہیں، ایک لَا إِلَهَ یعنی ہر حادث کی نفی —————
 (الاحب الالف لیست) اور دوسرے اِلَّا اللّٰہ یعنی صرف ذات الہی کا اثبات۔
 چونکہ اس کلمہ کے دو جز ہیں اس لئے ابتداً اس کا کلی تصور قائم ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے اس
 لئے مبتدی کو چاہیے کہ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰہ کے ذکر کے وقت اولاً صرف لَا إِلَهَ کا تصور
 کرنے کی کوشش کرے کہ دل سے ہر ایک محبوب شے کی نفی ہو رہی ہے اور پھر ”إِلَّا اللّٰہ“
 کہتے وقت اثباتی تصور قائم کرے۔“

حضرت دارالفرمانتے تھے کہ شروع سے آخر تک تمانتر
 سارا زور لطیفہ ”قلب ہی پر“ توجہ ”لطیفہ قلب“ ہی کی اصلاح پر مرکوز رہنی چاہیے کیونکہ
 یہی لطیفہ منصوص ہے اور اس کی اصلاح مقصود، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے:
 ”مَنْ جَاءَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ“ اور حدیث شریف میں ہے ”الادھم القلب“ اس کی
 اصلاح سے اور لطائف بھی (جو کشف سے ثابت ہیں) خود بخود صاف ہو جلتی ہیں، یہی حاجی
 امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا ارشاد ہے۔

ہر غیر مقصود سے صرف نظر کی تاکید | تنکلا نہ مسائل اور فلسفیانہ اصطلاحات کے متعلق
 حضرت متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ ان سے بچنا
 چاہیے کیونکہ:-

”بہت سی باتیں کلام و فلسفہ کی راہ سے تصوف میں داخل ہو گئیں اور پھر میں
 تصوف سمجھی جانے لگیں، خصوصاً فلسفیانہ اصطلاحات کو دینی اہمیت دی گئی اور
 پھر ان کی بنیاد پر ایلیاتی مسائل کی تشریح و توضیح کی گئی اور اس کو تصوف یا فن
 احسان قرار دیا گیا، اس اصطلاحی تصوف کے شیوع سے بڑی گمراہیاں پیدا
 ہوئیں اور نبوت و مہدیت کے دعویدار پیدا ہو گئے۔“

وحدۃ الوجود و شہود و تنزلات سلسلہ کے بارے میں ارشاد تھا کہ :-

”اول تو یہ مدار طریق نہیں، پھر ان میں سے بعض تو حال کا درجہ رکھتے ہیں (جیسے وحدۃ الوجود و شہود) اور بعض محض افلاطونی فلسفہ کی متبدل شکلیں ہیں (جیسے مسئلہ تنزلات) انکی طرف توجہ نہ ہونا چاہیے۔“

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ :-

”سلطان الاذکار، شغلی اسد، کشف قبور اور اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں، آرٹ میں حقیقت کہاں؟ تصوف کا مقصد تو رخصتے الہی اور اتباع سنت ہے، ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ اور بات ہے۔“

اس سے بھی بڑھ کر پتہ چلے کہ :-

”منشوی مولانا رام بھی تصوف نہیں، بلکہ فلسفہ تصوف ہے اور صرف فلسفہ سے بچڑے ہوئے دماغوں کا علاج نہ کہ ہر ایک کا۔“

اپنے عمل سے ہٹ کر احوال پر نگاہ کے پہنچنے کو بھی حضرت والارہ سخت مضر سمجھتے تھے، ایک مرتبہ راقم نے عرض کیا کہ عمل پر تو محمد اللہ دوام ہے لیکن اس کی عدم قبولیت کا گمان ہوتا ہے، معاً پروردگار میں فرمایا :-

”لے چنانچہ خود حضرت والارہ ہی کو کشف قبور کی استعداد بھی ایسی حاصل تھی کہ شاید وہ بایں :- ایک روز حضرت والاؒ پاسے بند کی نوری سجدہ (واقع جہانگیر روڈ) کراچی میں عصر کی نماز کیلئے تشریف لئے جماعت میں کچھ دیر تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر صحن میں بیٹھ گئے، آخر صحن پاس ہی بیٹھ گیا، مسکرا کر چپے سے مٹا ارشاد فرمایا کہ یہ قبر تو خالی ہے۔ وہ ایک نو زائیدہ لونٹ لابی قبر ہے صحن مسجد سے متصل، اتنی بات تو آنکھوں کو بھی ہے کہ پہلے جو کتبہ لگا تھا، اس پر صاحب مزار کو ”صالحی“ لکھا تھا، مگر پھر تبدیل کیا گیا تو وہ لفظ بھی نکال دیا گیا اور سن وفات بھی بدل دیا گیا (مجھے حیرت اس کی رہی کہ حضرتؒ نہ تو ظاہراً اس قبر کی طرف متوجہ ہوئے نہ مرقبہ فرمایا، مگر فوراً حقیقت کو پا گئے) !

”خوب! اپنے احوال کو اللہ میاں کے سر قہو پ دیا، ان کی رضا و قبولیت کا حال تو صرف دوسری دنیا میں معلوم ہوگا، یہاں تو صرف عمل مقصود ہے۔ عمل میں لگے رہیے!“

احقر نے مزید عرض کی کہ جسارت کی کہ حضرت قرب کے آثار کچھ تو یہاں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے ارشاد ہوا:-

”یہ بھی بندے ہی کے ظنون ہیں، بڑے سے بڑے ولی کی ولایت کا بھی جو اعتقاد ہے وہ محض ظن غالب کی بنا پر ہے اور اپنے میں آثار قبولیت تلاش کرنا تو عجب ہے! کیسے آثار اور کیسی بزرگی؟ اس راہ میں تو اپنے آپ کو ٹٹانا ہی اصل شے ہے۔“

ایک اور مرتبہ اس حقیقت نے تنہائی میں اپنے بعض احوال عرض کئے تو ارشاد فرمایا:-

”میرے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ جب سوتے وقت لائٹ بند کر دیتا ہوں تو سارا کمرہ نور سے معمور دکھائی دیتا ہے، مگر میں فوراً آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ
”ہر انچہ دیدہ می شود ہمہ غیر خدا است“

احوال و کیفیات کی طرح خوابوں پر توجہ کو بھی سالک کے حق میں مضر تصور فرماتے تھے اور اسی لئے اکثر تعبیر سے احتراز فرماتے تھے، مگر جب کبھی تعبیر عطا فرماتے تو معلوم ہوتا کہ علامہ ابن سیرین کے ذوق کی تجدید ہو گئی ہے!

مذکورہ ساری باتیں کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں استثناء بہر حال موجود تھا، ذی فہم صاحب استعداد سالک کو حضرت والا اصطلاحات کی تفہیم، احوال کی حقیقت اور سزا دل راہ کی اطلاع بھی فرمادیتے تھے، اور ارشاد یہ تھا کہ ہم جن امور کی نفی کرتے ہیں وہ مقصودیت کے اعتبار سے ہے یہ نہیں کہ ہم ان سے محروم ہیں، مجد اللہ سب کچھ حاصل ہے مگر مقصد طریق (یعنی حصول رضا سے الٹی) بھی ہم کو معلوم ہے جس کے سامنے یہ سب کچھ ہیچ ہے!

صرف طلبِ رضا مقصود ہے | فرمایا ”ہر عمل میں طلبِ رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے۔

اسی علاقہ کا استحکام نسبت ہے | اور جب خدا اور بندے کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اسکو

نسبت کہتے ہیں اور قرآنِ پاک کی زبان میں اس کی تعبیر ”محبہ و یحیونہ“ اور رضی اللہ عنہم درضوا عنہما کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ یا ایتھا النفس المطمئنة ارجی الی ربک راضیۃ مرضیۃ، انہی کیلئے نویدِ بشارت ہے۔

کمالِ اتباعِ سنت کا مفہوم اور اس کی تاکید | ”اتباعِ سنت میں اس کا نام نہیں کہ وضع قطع مطابق سنت کرنی چاہئے، بلکہ کاملِ اتباع یہ ہے کہ فکر و نظر اور جذبات و احساسات بھی ذوقِ نبویؐ کے تابع ہو جائیں۔

فراغتِ قلبی کی ہدایت | فی زمانہ فراغتِ قلبی کا مدار معاشی فراغت پر ہے اس لئے حضرت والدہؑ اپنے متبعین کی توجہ اسباب و وسائلِ رزق سے ہٹنے نہیں دیتے تھے اور تاکید فرماتے تھے کہ رزقِ حلال کی کوشش واجب ہے، اس تاکید کے ساتھ سب کے لئے فراغتِ رزق کی دعا بھی بطور خاص فرماتے تھے ایک مرتبہ ایک طالب نے اپنی مالی پریشانی کا حال بکھا تو حضرت والدہؑ نے اس کیفیت کو سناتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ فرمایا کہ:

”میں تو اپنے سب دوستوں کے لئے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاشی فراغت نصیب فرمائے۔

طہ پراگندہ روزی پراگندہ دل“

اس ضمن میں حضرت والدہؑ کی ایک نہایت مختصر اور جامع نصیحت اگر ہم لوگوں کے پیشِ نظر رہے تو انشاء اللہ ہر شخص کو اپنی اپنی حیثیت میں فراغِ خاطر میسر آجائے فرماتے تھے کہ:

لے مکاتیبِ سلیمان مکتوب لے امیرؑ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔

”آمدنی کثرت مدراعل کا نام نہیں بلکہ قلتِ مصارف کا نام ہے۔“

پس نظر کسب سے زیادہ صرف کی مدت پر رہنی چاہیئے ایسی قناعت کی راہ ہے۔

تقلیلِ مباحات | حضرت اقدسؒ کا ارشاد تھا کہ سالک کو مباحات میں بھی کمی کرنی چاہیئے کیونکہ کثرتِ مباحات سے بھی قلب میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔

علم کا حصول عمل کی نیت سے | حصولِ علم دین پر حضرتؒ بہت زور دیتے تھے اور طالبانِ علم سے خوش ہوتے تھے اور ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے مگر غایتِ علم سے بے خبری یعنی ”علم برائے علم“ کو قلبی جہل سے تعبیر فرماتے تھے!!

مواعظ و ملفوظات اشرافیہ کے مطالعہ کی تاکید | حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ:-

”ان میں (حضرت تھانویؒ کی تصانیف میں) حضرت والاؒ کا فیض بند ہے

اس لئے جو شخص اس فیضِ خاص سے بہرہ اندوز ہونا چاہے اس کو بار بار ان کا

مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے خواہ وہ ان مضامین سے واقف ہی کیوں نہ ہو جائے

جو ان میں بیان کئے گئے ہیں۔“

خود اپنی کیفیت کو بطور مثال پیش فرماتے تھے کہ:-

”حضرتؒ کا ملفوظ پڑھ کر جان سی آجاتی ہے۔“

ہمارے ایک برادرِ طریق کے متعلق جب حضرتؒ کو معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الامت

کے مواعظ و ملفوظات ان کے زیر مطالعہ نہیں رہتے تو تاکیداً جوابات ارشاد فرمائی اسکا لفظ

لفظ غور طلب ہے:-

”ملفوظات و مواعظ پڑھئے، وہاں ہر چیز اندر سے پھوٹ کر نکلتی ہے ان کا

مطالعہ ضرور کیا کریں۔ بے حد منافع بخش اور علم صحیح اللہ تعالیٰ عنایت فرمائیں گے

اور تیز حق و باطل عطا ہوگی۔

ایک اور طالب کو اسی طرح کمال بلاغت سے تحریر فرمایا۔

”ان کتابوں کا بغور اور بغرض استفادہ مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ مفید علم، محرکِ عمل اور مشربِ برکات ہوگا۔“

”انفاس عیسیٰ“ (مرتبہ مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مطالعہ کو بھی حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ فہم سالکین کے لئے بے حد مفید تصور فرماتے تھے، حضرت کا ارشاد تھا کہ یہ ”اشرفی مطب کی بہترین قرابادین ہے۔“

دوسرے سلسلہ کے طالبین | اب تک جو اصول بیان کئے گئے وہ خاص اپنے ہی کے ساتھ اصول اصلاح متوسلین سے متعلق تھے، جو لوگ پہلے کسی اور سلسلے میں تربیت رہ کر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع ہوتے تو دیکھا یہی کہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے سابقہ بیچ ہی میں ان کی تربیت فرماتے اور معمولات کی تفصیل معلوم کر کے اگر کوئی بات قابلِ تکریر ہوتی تو اسی طرح برقرار رکھتے تھے، _____ یہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ کامل ہونے کی بین دلیل تھی اور اسی لئے ان کے دامنِ فیض میں ہر رنگ کے سالک کو جگہ مل جاتی تھی، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

اصول بیعت :-

عام طور پر بیعت میں تاخیر فرماتے تھے، ہاں اگر صدقِ طلب اور عزمِ استقامت کا یقین ہوتا تو جلد بھی بیعت فرمالتے تھے، ایک صاحب کو آٹھ نو برس کے تعلق کے باوجود لے اس میں حضرت حکیم الامتؒ کے معاملات کا انتخاب و تقسیم امراض کے ساتھ انکی ترتیب ہے حکیم الامتؒ نے اس کو پسند فرما کر ترتیبِ عارف کے نام پر اسکا نام ”انفاس عیسیٰ“ تجویز فرمایا تھا، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کو ”اشرفی مطب کی قرابادین“ اور بھی مطلقاً ”قرابادین تصوف“ فرماتے تھے۔

بیعت نہیں فرمایا، پھر ان سے ایک ایسی ناشائستہ حرکت سرزد ہوئی کہ جس سے صاف معلوم ہوا کہ اب تک صدق طلب ہی پیدا نہیں ہے اور ”ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں“ کے مختصہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ حضرتؑ نے ان کی اس حرکت پر راقم احقر سے فرمایا کہ ”دیکھئے یہ اتنی مدت سے میرے سر پر ہے جس کی بیعت کر لوں اور میں انکار ہی کرتا رہا، اگر کر لیتا تو آج بزرگوں کی کیس بنامی ہوتی“۔ پھر اپنے شیخ اقدسؒ کا مقولہ مسکراتے ہوئے سنایا کہ:-

”اتنا ٹھونک بجا کر لیتا ہوں پھر بھی کھوٹا نکل ہی جاتا ہے۔“

(۲) ناگھڑا لڑکیوں کو بیعت نہ فرماتے تھے کہ نہ معلوم آئندہ ان کو کیسا ماحول ملے اور شادی شدہ عورتوں کو بھی ان کے خاوند کے ایمان کے بغیر بیعت نہ فرماتے تھے بلکہ بلا بیعت بھی تعلق اصلاح قبول نہ فرماتے تھے۔

(۳) عورتوں کو بیعت پردہ کے پورے اہتمام کے ساتھ اور اکثر بزرگ بیعت خط ہی فرماتے تھے۔

(۴) مرد ہو یا عورت، محض بیعت کی خاطر سفر کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے بلکہ خط کے ذریعہ داخل سلسلہ فرما لیتے تھے، اور غیاب میں بھی وہی برکات حاصل رہتی تھیں جو حاضری میں ملتی تھیں۔

(۵) دست بدست بیعت کی صورت ”منہاج سلیمانی“ میں ملاحظہ فرمائیں، مراسلت کے ذریعہ بیعت کی مثال درج ذیل ہے:-

میرے خسر محترم مولانا محمد علی حیدر آبادی نے کچھ عرصہ تعلق کے بعد درخواست بیعت کردی حضرتؑ کا جواب بھوپال سے آیا:-

بسم اللہ علی برکت اللہ، یہ فقیر پھر ان اپنی بے بضاعتی کے باوجود حسب استطاعت خدمت کو حاضر ہے، آپ اس خط کو پا کر کسی اطمینان خاطر کے وقت اچھی طرح وضو کر کے غلوں میں دو گانہ نفل توبہ ادا کریں اور اس کے بعد استغفر اللہ ربی من کل ذنب والتوب الیہ۔

سود فہم پڑھ کر درگاہ باری تعالیٰ میں جملہ گناہوں اور تقصیرات سے توبہ کریں اور اپنی اس عزیمت توبہ پر قائم رہیں کہ آج سے میری نئی زندگی شروع ہوتی ہے :

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ اور اے بعد الحمد اور قل ھو اللہ احد تین بار اول و آخر درد پاک کے ساتھ بزرگانِ چشتیہ صابریہ پر علی العموم اور خصوصیت کے ساتھ نام کے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ اور حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب قدس سرہ کو اس کا ثواب بخشیں اور زبان سے عہد کریں کہ آج سے میں اپنے شیخ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر صداقت سے بغیر تغافل کے عمل کروں گا، پھر یہ آیت کریمہ پڑھیں ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ سید اللہ فوق ایدیم فمن نکث فانما ینکث علی نفسه ومن اوفی بعاہدہ علیہ اللہ فسیؤتیہ اجرًا عظیمًا۔

اس کے بعد مجھے اطلاع دیں !

الفقیہ الی اللہ

سیمان احمد سترشدی حضرت شاہ مولانا اشرف علی قدس سرہ

جب مولانا نے تعمیل ارشاد کر کے خدمت شیخ میں اطلاع کر دی تو جواب آیا :

”آپ کو بیعت میں داخل کر لیا گیا، یہ میرے لئے موجب سعادت ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے آپ کو اس ذرہ بے مقدار کے ذریعہ اس آفتابِ رشد و ہدایت کے

ساتھ نسبت عطا فرمائی ہے

گرچہ خود دیم نسبتے است بزرگ ذرہ آفتابِ تابانیم

خواتین کے واسطے اور زیادہ تسہیل سے کام لیا جاتا تھا، یعنی عبارت سہل تحریر فرماتے

اور نصیحت بھی زیادہ لطاف اور مزحج پیرایہ میں فرمائی جاتی تھی۔

خصوصیاتِ بیعت | ایک خاص بات حضرتؑ کے ہاں یہ دیکھنے میں آئی کہ کسی کو عرفِ چشتیہ سلسلہ میں کسی کو اس کے ساتھ ساتھ مزید ایک یا دو یا تین سلسلوں میں داخل فرماتے تھے اور یہ بات محض تبرکاً نہیں تھی بلکہ اس میں گہری معنویت مضمر ہوتی تھی جس میں دُورِ راوِ توغالبائیہ تھے کہ طالب کے لون اور وسعتِ ظرف کی خاص رعایت فرمائی جاتی تھی نیز بعض مرتبہ کسی میں سلسلہ کی عصبیت (جس کی وجہ سے اور سلاسل میں تنقیص کا اندیشہ ہو) مٹانے کے لئے بیک وقت چاروں سلاسل میں داخل فرما لیتے تھے، اس کے علاوہ اور جو مصلحتیں ہوں گی ان کا علم اس عاجز کو نہیں۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت والاؑ جب کسی کو بیعت فرماتے تو اقلانے نسبت کی کیفیت مرید کو صاف محسوس ہو جاتی تھی، چنانچہ بعضوں نے اس کو بہت ہی محسوس پایا اور اس کے اثر سے مرید نے "ید اللہ فوق ایدِ ہم" کی کیفیت کو محسوس کیا، کسی پر سکینت کا اثر طاری ہو گیا، کوئی سراپا حیرت بن گیا اور عام طور پر اکثر مریدوں نے شکستگی کی دولت پائی، ان کا سینہ سوز و گداز سے معمور ہو گیا اور شدتِ گریہ نے برسوں کے دنگ کو آن کی آن میں دھوٹا ڈاکٹرِ برصِ صاحبِ مرحوم صدرِ شعبہ عربی فارسی الہ آباد یونیورسٹی حضرت والاؑ کی خدمت میں فقیہِ پور (منسوخ) حاضر ہوئے جہاں کچھ غصہ کے لئے حضرت والاؑ اپنے دامادِ حسین صاحب کے گھر قیام فرماتے تھے۔ تنہائی میں درِ زمک نہ معلوم کیا گفتگو رہی، بہر حال طالب نے بیعت کی درخواست کی جو قبول ہو گئی۔ "نہین گھنڈہ بعد" ڈاکٹر صاحب برآمد ہوئے تو شدتِ گریہ سے بڑھال تھنے اور طوفانِ اشک اس وقت بھی نہ ٹھکراتا تھا جب وہ شام کو واپسی کے لئے ٹرین میں سوار ہو چکے تھے، بعد کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کب اشکِ ندامت تھنے۔

حضرتؒ کی دو وصیتیں

کوئی تحریری وصیت نامہ تو حضرتؒ والا نے چھوڑا نہیں البتہ راہ طریقت کے بارے میں ایک وصیت راقم خستہ حال کو ضرور فرمائی تھی اور دوسری وصیت بعد کو مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے موسومہ ایک مکتوب میں اُسی پر اثر لب و لہجہ میں ملی۔ ان دونوں وصیتوں میں لطیف فرق افراط و تفریط سے بچاؤ کی تاکید کا ہے اور جامعیت کے اعتبار سے یہ دو جملے ہی چوڑی فہرت و سایا پر بھاری ہیں۔۔۔۔۔ راقم آشتیہ حال کو ہدایت فرمائی۔

”ادھر ادھر مت دیکھئے، سیدھے سیدھے صحابہ کرام کے طریق پر چلیے۔“

اور

مولانا مسعود مرحوم کو تحریر فرمایا ہے :-

”سلف کی راہ سے سر موٹجا وزنہ ہو، یہی اپنی وصیت ہے اور یہی زندگی کی آخری فرمائش“

بارِ الہا! ہم سب کو عدل و توازن کی راہ پر قائم رکھ اور ہر وہ رُو طریق کی دستگیری فرما کہ راہ نازک ہے اور چلنا آخر دم تک ہے !!



باب ہشتم

عارفانہ دور کا کلام اور تحریریں

غزل الغزلات

یہ حضرت والارہ کا عارفانہ کلام ہے، اس حسن ذوق کی داد دیجئے کہ کس قدر موزوں نام اپنے اس مجموعہ کلام کا تجویز فرمایا ہے کہ لفظی و معنوی دونوں مناسبتیں جمع ہو گئیں "غزل الغزلات" دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام کے لاشعری نغمات کا عنوان ٹھہرا۔ اشتراک اسمی سے حضرت والارہ نے یہاں بھی فائدہ اٹھالیا۔

یہ مجموعہ کلام وہ آئینہ ہے جس میں حضرت والارہ کی روحانی سیر کے منازل اور مقامات دکھائی دیتے ہیں۔ خود فرماتے تھے کہ "یہ تو میرا سفر نامہ ہے"۔ اس سفر نامہ کی ہر غزل پر تاریخ درج ہے جس سے سالک طریق کے تربیتی ارتقا اور اس کے مشاہدات راہ کا حال معلوم ہوتا ہے اس مجموعہ نغمات میں کل اثنالیس غزلیں تین قطعے اور ایک فرد ہے، ان میں سے ایک غزل ایک قطعہ اور ایک شعر فارسی زبان میں ہے اور باقی سارا کلام زبان اردو کے حصہ میں آیا ہے۔

لے تورا کی بانیسویں کتاب کا نام غزل الغزلات ہے، اس میں ایک اعلیٰ پایہ کی تخیلی شقیہ نظم ہے جسے حضرت سلیمان سے منسوب ہے، یہ نظم آٹھ الجواب پر مشتمل ہے نظری ابتدا اس طرح ہوتی ہے، ایک حین اپنے محبوب کے فراق میں غمخوار ہے:-

"وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چومے

کیونکہ تیرا عشق مئے سے بہتر ہے

تیرے عشق کی خوبی لطیف ہے

(غزل الغزلات باب ۲ و ۳)

تیرا نام عطرِ نعتہ ہے"

ماخوذ از انبیائے قرآن (ج ۳ ص ۱۳۸) مصنف محمد جمیل احمد ایم۔ لے۔

کرنا ہو گا جو کلام کی معارف و لوازی، اس کی مستی و سرشاری اور اس کی چرچا تیزی اور انقلاب آفرینی کو پاسکے اور پرکھ سکے۔ بقول حضرت والار کے ہے

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں
غیر یہ تو ایک ضروری فقرہ معترضہ تھا، بات یہ ہو رہی تھی کہ حضرت والا کا زیرِ نظر کلام فیض روحانی کا ایک کرشمہ ہے، ذہنی تخلیق سے اس کا کوئی تعلق نہیں، خود فرماتے ہیں سے
فیض ہے یہ کس ولی وقت کا اب مرا جو شعر ہے ابہام ہے
ایک اور جگہ تصریح فرمائی ہے ۔

جو شعر بھی میرِ وقم کر رہا ہوں میں سب واردات عشق رقم کر رہا ہوں میں
دیوانگانِ عشق کو دیکر صلائے عام آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں
اس لئے اس کلام کو ”دیوانِ نگاہِ عشقِ الہی“ کے فوق اور معیارِ نظر سے دیکھئے، کیا عجب کہ آپ کی روح بھی سرشار ہو جائے اور کچھ دیر کے لئے مادی کشافتوں سے نکل کر سرمدی لذتوں کا کیف آپ بھی محسوس کر جائیں !

سفرِ نامہ کی حیثیت سے آئیے پہلے اس نقطہٴ نظر سے اس کلام کا جائزہ لیں جس کی
کلام کا جائزہ طرف خود صاحبِ کلام نے اشارہ کیا ہے کہ ”یہ تو میرا

سفرِ نامہ ہے“ ————— سیرِ افغانستان یا سفرِ یورپ کا نہیں بلکہ سیرِ الی اللہ اور سیرِ فی اللہ کا۔
راہِ طریقت کے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ اس راہ میں پہلا مرحلہ ”حبِ شیخ“ کا آتا ہے
یہ طے ہو جائے تو ”حبِ رسول“ کی منزل آتی ہے پھر اس سے گزر کر سالک ”حبِ الہی“ کے مقام کو پا تا ہے
یہاں اس کو پہلے صفات کی یرنگیاں نظر آتی ہیں اور وہ ان میں محو ہو جاتا ہے، اس کو سیرِ الی اللہ سے تعبیر کرتے ہیں، پھر جب سالک کا مشاہدہ اور قوی ہو جاتا ہے تو اس کا منتہائے نظر صرف ذاتِ الہی رہ جاتی ہے اور اب وہ اس مشاہدہ میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اسی کو سیرِ فی اللہ کا نام دیا گیا ہے جو نامحدود ہے، ہمارے حضرت والار نے راستے کے یہ منازل اس برق رفتاری

سے آنا فالٹے فرماتے کہ اچھے اچھے سالک بھی ان کی قوت پر قادر نہ دنگ تھے ادیبی وجہ ہے کہ ان کے سفرنامہ روحانی میں خط فاصل لگانا کمنازل کو الگ الگ کر کے دکھانا کم از کم اس طفلِ طریقت کے لئے تو ناممکن ہے۔ البتہ ملے جلے جو احوال اس میں نظر آتے ہیں ان میں سے ایک ایک حال کو ایک ایک مقام سے متعلق کر کے دکھانا زیادہ دشوار نہیں اور اسی کی سعی یہاں کی جا رہی ہے۔

ہم کو حضرت والاہ کی امانت شیخ اور کمال محبت میں کوئی فصل نہیں ملتا، ہاتھ میں ہاتھ دیا تو دل و جان بھی نذر کر دی، اب محبوب کی گفتار و رفتار، طرز نشست و برخاست بلکہ اس کے بیٹھنے کی جگہ تک محبوب بن گئی، چنانچہ شیخ کی ایک ایک ادا اور خانقاہ کے در و دیوار تک کی جاذبیت کلام میں نمایاں نظر آتی ہے۔ دیکھئے خانقاہ میں مریدوں کے اجتماع اور ان کے حسنِ ادب، شیخ کے افادات اور ان کی پرتائیری کا نقشہ کس حسنِ ادا اور جوش و محبت سے کھینچا ہے۔

ذرہ ذرہ عالم محسوس کا خاموش ہے	یا رہے گرم سخن محفل سراپا گوش ہے
چشم ساقی میں بھری کیا بادہ پر جوش ہے	جس طرف آنکھ اٹھائی گئی وہ مست ہر مہوش ہے
جہل پیر مخاں دریا دل و دریا نوال	جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے
تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں	دل سراپا جوش ہے لیکن زباں خاموش ہے
اب تو حے نوشی ہے سین شرع بر فتوائے شیخ	
اب وہی ہوگا فقیہ شہر جوئے نوش ہے	
ایک اور بحر میں اسی طوفانِ عشق و محبت کا منظر دیکھئے	

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیت مستان	آباد رہے یا رہے تاحشر وہ مے خانہ
چھاتی ہے یہاں متی ہر ایک نسا دی پر	حیرت ہے یہ گھر لے دل مسجد ہے کہ میخانہ

اس سراپا جذب و اثر ماحول میں پہنچ کر خود حضرت والاہ کو جو سرور و نشاط حاصل ہو گیا

اس کی تصدیق بھی ملاحظہ ہو۔

سازگار اب گردشِ ایام ہے دور میں ہشتاد سالہ جام ہے
 ”یہاں ہشتاد سالہ جام“ سے مراد انٹی سالہ پیر مارف ہے۔ آگے اپنے انجذاب کا ذکر ہے
 حقی جو آزادی تو ہر سودوڑ تھی قید میں آرام ہی آرام ہے
 اب دیرِ سمنان چھوڑے نہیں اس کی مٹی میں بھی کیفِ جام ہے
 اب شیخ کے لطف نگاہ اور حلاوتِ کلام کی کچھ تفصیل بھی زبانِ عشق سے سنئے،
 حضرت تھانویؒ و فورحیاءے آنکھ سے آنکھ ملا کر دیکھ نہ سکتے تھے، بس ذرا پلک اٹھا کر
 دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں، کبھی کسی سمت ترچھی نظر دوڑائی اور فوراً سمیٹ لی، البتہ یہ ضرور تھا
 کہ اس دزدیدہ نگاہی کے لطف سے کسی کو محروم نہ فرماتے تھے اور اس اچھٹی نگاہ میں تاثر اس
 بلا کی تھی کہ جس پر پڑی اس کو بے تاب کر دیا، اس کیفیت کو حضرت والاؒ کی زبانِ محبت سے
 سنئے اور محسوس کیجئے۔

بزم میں دیکھا کئے اس ناز سے جس طرف دیکھا نشانِ دل ہوا

اس کی دزدیدہ نگاہی کے نشاء آج ہی آغاز کا انجام ہے
 دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ کس غضب کا ہے۔

شیخ کی نگاہ یہی نہیں کہ تڑپا جاتی تھی بلکہ جس پر پڑتی اس کو حیاتِ عشق بخش دیتی تھی،
 حضرت والاؒ اپنا تجربہ سنار ہے ہیں۔
 حیاتِ نو مجھے ان کی نگاہِ ناز نے بخشی بھرا ہے آبِ حیا ان کا سہ نہ پرلاہل میں
 دل اس پیری میں بھی غرق ہو سنا کہ دزدی ہے پھنسی پر کشتیِ عمر رواں گرد اب ساحل میں
 ایک اور مطلوب میں اسی کیفیت کو یوں ادا فرمایا ہے۔

تری نظریں میں ہے تاثیرِ مستیِ صہبَا تری نگاہ جسے چاہے بادِ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں وہ چاہے مست کرے چاہے ہنسنا کرے۔
یہاں مستی و بیشیاری سے مراد مکر و مچو ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے ساتھ حسن صوت اور حسن بیان بھی
ایسا عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر نہ پایا جاتا ہو تو نادر ضرور تھی، ہوا میں جوارِ تلاش ان کی بہ اثر آواز سے
پیدا ہوتا تھا، اس کی ایک ایک لہر سامعہ نواز اور وجد آفریں تھی، حضرت والارہ اسکی توصیف
فرما رہے ہیں۔

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
بارغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں بارغ اب مرے جوشِ جنوں کا ادب کی انداز ہے
حضرت تھانویؒ کے بیان کا ایک وصف مالی یہ بھی تھا کہ اس سے ذہنی الجشیں مٹتیں
و ساوس کا فور ہو جاتے اور ایمان و ایقان بڑھ جاتا تھا، اس کا اعتراف حضرت والارہ کی زبانی
ہو رہا ہے۔

ایسے کچھ انداز سے تفسیر کی پھر نہ پیدا شبہ باطل ہوا
آج ہی پایا مزہ ایمان کا جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا
گھول کر کیا جانے کیا دے دیا خلق سے اُترا کہ شیدا دل ہوا

جادو بیانی کا تذکرہ ختم کر کے اب شیخ تھانویؒ کی سحر نگاری پر آئیے۔
مرشد تھانویؒ کے ہاں حضراتِ نقشبندیہ کا طریق توجہ تو نہ تھا مگر وہ خط و کتابت کے تعلق سے
اس کی کو پورا فرماتے تھے اور اسی لئے اس کی پابندی پر پورا زور دیا جاتا تھا، ان کی اس مجتہدانہ
تدبیر سے سائلین کو عجیب و غریب فائدے حاصل رہے ہمارے حضرت والارہ بھی اس مکتوم
توجہ سے فیض یاب رہے، اس لئے تصدیق فرما رہے ہیں۔

نسخہ اکیر دراروئے شفا تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

ایک مرتبہ ایسے ہی اکیر صفت مکتوب کو پڑھ کر مکتوب الہی کی روح فرط نشاط سے

جہویم گئی اور یوں مترنم ہوئی ہے

قوتِ جاں قوتِ دل سرمدِ بخشِ تحسیر روح افزا دل آویز و دل آرا مکتوب
روشنائی نظر آئے گی سوادِ خط میں دیدہ گور بھی دیکھے جو تہہ ہا مکتوب
سرسبز شوق و ہمہ درد ہمدردی تحسیر سرسبز مایہ تسکین ہے تہہ ہا مکتوب
شیخ سے کمال محبت کے سبب سالک کی نگاہ معرفت وا ہوئی، عمر گزشتہ پر افسوس ہونے
لگا کہ ہائے اتنی ٹرا س میخانہ سے دوری میں کیوں بسر ہوئی، اب تھوڑی سی مدت میں طویل
غفلت کی تلافی کیسے ہو شیخ عالی مقام سے بار بار التجا کرتے ہیں کہ اپنی ہمت عالی سے مجھ کو آگے
بڑھائیے۔ تنہا میری جدوجہد سے تو کام نہیں بنے گا ہے

جاں پر جام مجھ نے کمر بنائے سرست صبر سر خوشی اذکار کہاں سے لاؤں

دیر سے آیا ہوں ساقی دُور سے آیا ہوں میں ہو عطا ئے خاص مجھ کو جو عطا ئے عام ہے
ماقم نے ڈاکٹر صاحب مظلّم سے سنا کہ ایک روز خانقاہ اشرفیہ کے دروازے پر کھڑے
حضرت والا رہیوں فرما رہے تھے کہ جو کچھ پڑھا لکھا تھا سب ان بڑے میاں کے (یعنی حضرت
شیخ رح کے) قدموں پر لا ڈالا۔ اسی کیفیت کو حضرت کا یہ شعر بے نقاب کر رہا ہے

میرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں

لگا دے برقِ ایمین آگ تو اس میرے حاصل کو

اور یہ جو برسوں کے جمع کردہ خرمن ہوش کو چھوٹے بیٹھ گئے تو کچھ تو دل کی دولت مل گئی تھی کہ
سارا سرمایہ خرد ہیچ نظر آ رہا تھا۔ ذرا مستی و سرشاری تو دیکھئے ساقی میخانہ سے
مخاطب میں سے

بہرے شاداب بر سرِ آب ہے گلزارِ دل

تیرے اک چھینٹے کو لے ابر بہاری ان دنوں

بن رہا ہے آپ ہی انگارِ دل افسارِ دل

عشق کا رہبر و دلیل راہ جس دن سے بنا

جوش ہے گرمی دستی ہے دفور شوق سے شکر ہے رونق پہ ہے امروز کا روباہر دل
 یہ ۱۳ اپریل ۱۹۳۲ء کی غزل ہے، اس کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۴ اپریل ۱۹۳۲ء
 کو بھوپال سے لکھنؤ جاتے ہوئے ٹرین پر ایک اور غزل ہوئی جو سلطان الودکار کی کیفیت کا
 آئینہ ہے۔ فرماتے ہیں :-

کس نے بھردی یہ صدائے دل نواز	ہر گرجاں سازِ الا اللہ ہے
کوئی ہوا آواز میرے کان میں	ہر صدا آوازِ الا اللہ ہے
کار فرما ایک آتا ہے نظر	منکشف اب مازِ الا اللہ ہے
اس تجلی گاہ کا ہر نمازیں	کشتہ اندازِ الا اللہ ہے
ہے اسی کی سانسِ افاس حیات	جو کوئی دمسازِ الا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند	قلبِ ذاکر سازِ الا اللہ ہے

وجد میں جاں ہے تو اعضا و قفس میں

حسِ نئے آوازِ الا اللہ ہے

یہ جوش و انبساط تو اس وقت تک ہے جب تک کہ سالک کی نظر انوار و تجلیات پر
 ہے مگر جہاں اس کا رخ خود اپنی ذات اور اپنی بے بضاعتی کی طرف ہوا اور وہ تڑپنے لگا،
 بلبلانے لگا، یہ تغیر احوال بھی نعمتِ عظمیٰ ہے کیونکہ بقول عارفِ رومی :

گر یہ ابراست و سوز آفتاب	استن دنیا ہمیں دور شستہ تاب
گر نہ بودے سوزِ ہر و اشکِ ابر	کے شدے اجسام مازفت و سطر

چنانچہ یہی معاملہ یہاں بھی پیش آیا، جتنے اونچے ہوتے گئے بلندیاں پست نظر آنے لگیں اپنا
 ہر عمل خام اور طاعت ناکام نظر آنے لگی، نگاہ جس افقِ نمک پہنچ رہی تھی وہ اپنی قوتِ پرواز
 سے بہت دور نظر آ رہا تھا، اسی کرب و اضطراب میں دل سے آئیں جو ابھیں تو زبان پر آکر
 نالہ بن گئیں۔

شکستہ دلی کا شاہکار ملاحظہ ہو۔

دل حریف نگہ یار کہاں سے لاؤں
نورِ ہی نورِ جہر دیکھو نظر آتا ہے
جو نہ بخود ہر وہ مے خوار کہاں سے لاؤں ؟
تابِ نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں ؟
وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں ؟
دل حریف مے بہار کہاں سے لاؤں ؟
جو نہ ٹوٹے میرے غفار کہاں سے لاؤں ؟
فطرتِ دیدہ خونبار کہاں سے لاؤں ؟
ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہاں سے لاؤں ؟
دوسرا سایہ دیوار کہاں سے لاؤں ؟
مدرسہ چھوڑ خسرِ ابات میں آکر بیٹھا

جام پر جام مجھے دے کے بنا دے بدست

میرِ سر جو شہی اذکار کہاں سے لاؤں ؟

(۱۲، اپریل ۱۹۹۷ء)

اسی کرب و بلا کے عالم میں آہ و فریاد کی ایک اور درخیزی ملاحظہ ہو۔

کوئی چوٹ ایسی لگ جائے الٹی میرے سینہ میں
کہ فتوہ سا بن جائے یہ زخمِ خونچکانِ دل کا
اگر ساقی تری چشمِ فسونِ گر کام کر جائے
بدل جائے نظامِ دل بدل جائے جہانِ دل

لے حضرت والا کی غزلوں میں، میں سمجھتا تھا کہ ان کی غزل سے

سما جا میرے دل میں ارمان ہو کر
دوئی دُور کر دے میری جان ہو کر

قلب والا کی سب سے بہترین تریمان ہے، لیکن جب زیرِ نظر موضوع پر اپنی استطاعت کے موافق لکھ رہا تھا تو عالمِ رویا میں حضرت والا کی زیارت سے متشرف ہوا، سرورِ حقے اور دستِ مبارک میں غزلِ اغزلات کا مجموعہ تھا فرمایا ہمارے سب سے اچھی غزل یہ ہے: دل حریف نگہ یار کہاں سے لاؤں ؟ آنکھ کھلے پڑیاں آیا کہ واقعی شکستگی اور عبدیت ہی تو حضرت والا کا وصفِ خاص تھا۔

دل کی اس تڑپ اور شیخ کی توجہ عالی نے مل کر سالک کو اور آگے بڑھایا، وہ دفعۃً فنا فی الشیخ کی منزل سے فنا فی الرسول کے ذنبہ کو پہنچ گئے ۲۵، شوال ۱۱۹۳ھ (نومبر ۱۹۷۳ء) کو خانقاہ تھانہ بھون میں ایک نعمت کہی ہے جس میں حسن ادب اور وفور محبت کا ایسا پاکیزہ امتزاج ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نعمت گو مشاہدہ نبوی سے مشرف ہے اس کے تلب پر محبت و عظمت چھا گئی ہے اور اسی سرشاری سے زبان سخن قدر بڑھے

میں طفلانہ شوقی سے یوں تو ہر بات حضرت والا سے پوچھ بیٹھتا تھا مگر اس خصوص میں جب کبھی زبان کھولنے کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی غیبی ہاتھ میرے منہ کو بند کر رہا ہے کہ یہ نہ پوچھنا، اپنی اس کیفیت سے یہ یقین اور گہرا ہو گیا کہ ضرور خواب یا نیم بیداری میں سالک عارف کو قرب خصوصی حاصل رہا ہے جس کے اثر سے جذبات محبت بجز متقارب میں موجزن ہو گئے، چند نیند تبرکاً پیش ہیں۔

نام محمد صل علی نور محمد صل علی	حدود وصل علی قدم وصل علی
چہرہ انور شمس ضعی زلف معبر بیل سبھی	قلب مطہر نور ہدی ذکر محمد صل علی
کوچہ جنت کو پچے تمسے خار خوش دھچول تمسے	خاک قدم ہے میرے لئے سرسماں وصل علی
جی میں ہے عاشق جد کے تو نیچاں پر پاؤں دھر	اور شوق و ذوق پڑھے محضر مر وصل علی

حضرت اقدس سید زادے تھے، شروع ہی سے عاشق سنت تھے، فنا فی الرسول کے مقام کو پاتے ہی یوں معلوم ہوتا ہے کہ دست قدرت نے ان کو فوراً اور اونچا کر دیا اب میرا اللہ شروع ہوئی، بعد جہر نظر اٹھتی "یا توئی یا ختمے تو یا بوئے تو" کا سماں نظر آتا تھا اسی یافت کو آیہ کریمہ "اللہ لیس السلطوت والارض" اور حدیث قدسی "انا جلیس من ذکری" سے موید کر کے یوں ادا فرمایا ہے۔

جہاں ڈھونڈیں وہیں پائیں جہاں دیکھیں وہیں تو ہے
تجھے جو یاد کرتا ہے، اسی کا ہم نشین تو ہے

تو ہی روشنی ہر چار سو پھیل ہے عالم میں
کہیں مہر فلک تو ہے، کہیں نور زمیں تو ہے

اس قطعہ پر ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ کی تاریخ پڑی ہے، اس کے بعد رمضان ۱۳۱۶ھ
(۲۶ ستمبر ۱۹۲۷ء) کے آخری دسے تک دو تین غزلیں اسی سیر صفائی کی آئینہ دار ملتی ہیں مگر اب
رحمتہ باری نے چاہا کہ سالک کا عرفان اور ترقی کرے، کامل سے کامل تر ہو جائے، چنانچہ
اس کے سامان عجیب ہوئے۔

حضرت والاہ کی ایک غزل پر ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۱۶ھ کی تاریخ پڑی ہے اور
حاشیہ کے ایک گوشہ میں "بوقت خاص" کا اشارہ بھی موجود ہے، میں نے جرات کر کے اس
اشارہ کی رمز کشائی کی درخواست کی تو حضرت نے فرمایا کہ:-

"اتیسویں شب کو تہجد کے بعد ذکر کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ دفعۃً یہ پوری غزل
قلب پر وارد ہوئی، فارسی میں میری یہی ایک غزل ہے۔"

یہ تو حضرت والاہ کا ارشاد ہے، خود اس الہامی غزل کو پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا
ہے کہ قدر والی رات میں شاہرازل نے سالک عارف کی نظر سے صفات کا پردہ بھی ہٹا
دیا اور قرب و معرفت کا وہ درجہ عطا فرمایا کہ اب تجلیات ذات سامنے آگئیں، سیر
فی اللہ شروع ہو گئی، اس طرح یہ الہامی غزل اسی تکمیل سیر کی تہدید نظر آتی ہے سینے اور سر دھنیے
فرماتے ہیں:-

سینہ آعشتہ بخونم آرزو دست	شیوہ صید زبونم آرزو دست
ارحبی و راجونم آرزو دست	گوش می جوید پیام از وصل دوست
باہم ہوش این جنونم آرزو دست	عشق را گونی جنوں لے بے خبر
مژدہ لایحہ خونم آرزو دست	داغ بردل از غم انجب دل
فی صلوة خاشعونم آرزو دست	خوش نمی آید سجود بے حضور
فی صلوة دائمونم آرزو دست	قرب بے غیبت نماز عاشقان

ستم بھی کرم ہے کہ شورِ محبت مزہ دے رہا ہے تمکدان ہو کر
 جہاں کو معطر بنائے ہوئے ہے وہ زلفِ معنبر پریشان ہو کر
 یہ کس میکے سے اٹھی موج ہے چلی آ رہی ہے جو فیضان ہو کر

اس کے بعد جیسا کہ آپ پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں سیرت نگار رسولؐ کو جب ۶۱۴ھ میں حرمین کی حاضری کا شرف ملا اور بارگاہِ رسالت میں صلوٰۃ و سلام کے ساتھ عاشقِ نبویؐ نے جب وہ نعمت پیش کی جس کا مطلع یہ ہے ۔
 آدم کے لئے غریہ عالی نسب ہے مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے
 اور آخر میں یہ عاجزانہ التماس بھی گدراں دی کہ

بُجھ جائے ترے چھینٹوں سے لے ابر کرم آج
 (مختم ۳۶۹ھ)
 جو آگ میرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

تو سالک عارف کو تمکین کی لازوال دولت بخشی گئی ، اب وہ سارے خرمیزہ عشق و عرفان کے باوجود بظاہر اس قدر سادہ ، پرسکون اور مطمئن ہو گئے کہ ان کے مقامِ رفیع کو پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔

اسی سفر مبارک سے مراجعت کے دوران میں جہاز پر حضرت والار نے ایک اور نعمت کہی جس کے بعد زبانِ عشق ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئی۔ خود اس نعمت کا مطلع بھی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اب حضرت والار کو مقامِ تمکین حاصل ہو چکا ہے اور اس کا باعث فیضانِ نبویؐ ہے ، چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

عشقِ نبویؐ دردِ معاصی کی دوا ہے ظلمتِ دہر میں وہ شمع ہوا ہے
 پڑھتا ہر دہر و آپ ہی تجھ پر ترا خالق تصویر پہ خود اپنی مصوٰر بھی فدا ہے
 آمد تری لے ابر کرم رونقِ عالم تیرے ہی لئے گلشنِ ہستی پہ بنا ہے

بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت جو پیر و احمد ہے وہ محبوب خدا ہے
 نے جائے گاہر و کوہ منزل سے بہت دور
 جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

مسائل تصوف کے اعتبار سے کلامِ نیر

سفر نامہ روحانی کے بعد اب غزل الغزالات کے چیدہ چیدہ بعض مسائل تصوف پر بھی غور کیجئے کہ کس خوبی و سادگی سے اس میں ادا ہو گئے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عام بھی ہے اور خاص بھی، ربوبیت عامہ سے تو یہ مخلوق فیضِ یاب ہے البتہ انسانی شرف یہ ہے کہ وہ ربوبیت خاصہ کا محل بن جائے اور لیان کے بغیر تو ممکن ہی نہیں، مگر محض لفظی ایمان کے ساتھ بھی نہ اسکا مشاہدہ ہو سکتا ہے نہ ظاہرِ خلہ استفادہ بلکہ اس کے لئے اہتمام اور قلبی انتظام کی ضرورت ہے جو صوفیائے کرام کا امتیازی شرف ہے، حضرت والا نے ربوبیت عامہ اور خاصہ کے اس فرق کو ”رونقِ محفل“ اور ”جلوۂ خلوت“ کے کنایہ سے یوں ادا فرمایا ہے۔

محفل میں نظر آتیں تو رونقِ محفل ہیں

جلوہ ہے وہی جلوہ جو جلوۂ خلوت ہے

(۲) حقیقت کی نگاہ میں یہ کائنات کوئی حجاب نہیں بلکہ صفاتِ الہیہ کا مظہر ہے کی وجہ سے معرفتِ الہیہ کا ذریعہ ہے، اس حقیقت کو کس شاعرانہ خوبی سے ادا فرمایا ہے

ہے وا کرے مجنوں تولد پنے دیدہ شتاق کو
 یللیں پردہ نشیں ہر پردہ عمل میں ہے

(۳) فاینما تولوا فثمّ وجہ اللہ۔ ایک قرآنی فقرہ ہے، ضرورت صرف نگاہ شوق پیدا کرنے کی ہے، فرماتے ہیں سے

دیکھنا ہو تو نگاہ شوق بن اس کی ہر سو بارگاہ عالم ہے

(۴) حق تعالیٰ کی ذات یحیون وبے چگون ہے۔ وہ ”ہوالظاہر“ ہو کر بھی ”ہوالباطن“

ہی ہے، اسی لئے اس کو پانا بھی دراصل اس کے مظاہر ہی کو دیکھنا ہے، ذات ہمیشہ دراء الوراہ ہے۔ اس نازک حقیقت کو کس سادگی اور حسن ادا کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے، فرماتے ہیں سے

نہ جانے وہ میں جلوہ فرما کہاں جدھر دیکھئے نور ہی نور ہے

(۵) صوفیائے کرام کے نزدیک ساری کائنات عشق ہی کی آفریدہ و پروردہ ہے، اسی نظریہ کو حضرت والدہ نے یوں بیان فرمایا ہے سے

کشش پر ہے قائم نظام وجود یہ گھر اک محبت سے معمور ہے

(۶) مگر آج کی زبان میں ہماری زندگی میں جو حادثات پیش آتے ہیں ان سے حیات

انسانی غم آلود ہو جاتی ہے اور یہ غم وہ ستم ہے جو لطف زیست کو کھا جاتا ہے۔ کیا اس کا کوئی

علاج بھی ہے؟ ہے اور وہ بالمثل ہے، زبان رسالت میں اس نسخہ کو یوں بیان کیا گیا ہے

”مَنْ جَعَلَ الْمَهْجُومَ هِمًّا وَاحِدًا هُمًّا آخِرَتُهُ كِفَاهُ اللَّهِ“

یعنی جس نے سارے غموں کو غم آخرت میں ضم کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ہر فکر سے

آزاد کر دیا، چنانچہ صوفیائے کرام اس نسخہ کو پی کر مسرت و سرشار رہتے ہیں۔ ہمارے حضرت والدہ

بھی فرماتے ہیں سے

اک غم نے بنایا ہے ہر غم سے مجھے فارغ اندرہ محبت بھی گنجینہ عشرت ہے

(۷) عارف اہل دنیا کی طرح احوال نہیں ہوتا بلکہ وہ نفع و ضرر کو اسی شائبہ ازل کا کرم

و ستم سمجھتا ہے۔ اسی لئے محبوب کے قہر میں بھی اس کو برباد نہ ہر کی لگاؤٹ محسوس ہوتی ہے

اسی کو فرماتے ہیں سے

ستم بھی کرم ہے کہ شورِ محبتست مزا دے رہا ہے نمکدان ہو کر
اس حقیقت کو یاد رکھو کہ حالتِ قہر میں بھی اپنے محبوب ہی کے دامن سے چمکتا ہے کہ:
لَا مَلْجَا وَلَا مَنجَا مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ————— اس حسنِ تدبیر کو حضرت والاؒ
نے یوں ادا فرمایا ہے ۷

پناہ لے دل خدنگِ نازِ قاتل سے نہیں ملتی
جو مل سکتی ہے تو پھر سایہ و امان قاتل میں

(۸) دنیوی جدوجہد کے برعکس اخروی سعی و کوشش میں ناکامی کا شائبہ تک پیدا نہیں
ہوتا بلکہ اس راہ کا ہر قدم قرب کا ایک یقینی زینہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے یہ ذریعہ خود مقصود
بھی بن جاتا ہے، حضرت والاؒ نے اس حقیقت کو کیا خوب ادا فرمایا ہے ۷

جدوجہدِ دید میں ہے ذوق و شوق و لطفِ دید حاصل ہر سعی میری سعی لاحاصل میں ہے
منزلِ مقصود ہے راہِ طلب کا ہر قدم وہ سہر منزل ہے جوابِ تک رہ منزل میں ہے
(۹) سلوک کی راہ عقلی موٹنگائیوں سے نہیں بلکہ شیخِ کامل کی رہبری میں عملی نراہتوں
سے طے ہوتی ہے، یہاں اعتقادِ جازم کی ضرورت ہے اور چون و چرا قاطع راہ ہے حضرت
تھانویؒ کا قول ہے کہ مرید کے لئے چار باتیں ضروری ہیں، اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد
اسی گرو کو حضرت والاؒ نے شاعرانہ زبان میں یوں ادا کیا ہے ۷

چل کھڑا ہو رہنا سے پوچھ کر راہِ سفر بحث میں الجھا مسافر تو سفرِ ناکام ہے
میری عرضِ شوق ہو ہر چند محروم قبول مجھ کو کہنے سے غرض ہو میرا کہنا کام ہے
(۱۰) سیرِ روحانی میں سالک کو کچھ مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں اور کچھ نعمات بھی سنائی
دیتے ہیں مگر یہ سب غیر مقصود ہے کیونکہ بقول خواجہ نقشبندؒ ”ہر آنچہ دیدہ می شود و شنیدہ
می شود ہر غیر خداست اور ہر غیر سے قطعِ تعلق ہی تقاضائے ایمانی اور وجہِ قربِ ربانی ہے
اس حقیقت کو حضرت والاؒ نے نہایت موثر پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، پہلے سالک کے

حال کی تائید فرما رہے ہیں اور پھر حقیقت کے اعتبار سے اس کی نفی ہے، سنیئے سے ہے ان کا تصور بھی کس درجہ سرد پانور گویا کہ قرین دل اک شمع فرداں ہے آنے ہو تصور میں بھر بھر کے نئے تم روپ ان سب کے الگ تم کو جابن تو یہ ایماں ہے (۱۱) مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر طریق باطن میں تصورات و مراقبات کی تلفیق کیوں کی جاتی ہے۔ حضرت والا نے اس کا عجیب جواب دیا ہے کہ یہ محض وساوس و خطرات کا علاج ہے تاکہ حواس ظاہری دیدار کے لالچ میں آکر دل کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان کے انتشار سے کیسوی میں جو غل پڑ رہا ہے وہ ختم ہو جائے، غور سے سنئے اور سن کر غور و فکر کرنے کا شعر ہے، فرماتے ہیں ے

مے کر کچھ حواس فریب نوید وید اجزائے منتشر کو بہم کر دیا ہوں میں
(۱۲) اس کیسوی میں کچھ بھی ذکر یا مراقب کے قلب پر کوئی وارد، کوئی کیفیت بجلی کی چمک کی طرح آکر گزر جاتی ہے حواس منتشرہ متلاشی بن جاتے ہیں کہ جھپک تود کھائی دی تھی، آہٹ تو سنائی دی تھی، پھر محبوب کہاں غائب ہو گیا؟ سالک کی اس تصویری کیفیت کو حضرت والا نے جس خوبی سے ادا فرمایا ہے سچ یہ ہے کہ اس سے بہتر باطن کی شوکاکی ممکن نہیں ملاحظہ ہو ے

آواز مے کے کوئی ادھر سے ابھی گیا ہر سو تلاش نقش قدم کر رہا ہوں میں
(۱۳) کرنے کو تو احکام الہی کی پابندی ایک نرا عابد بھی کرتا ہے اور ایک صوفی صافی بھی، مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، عابد اس کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتا ہے اور اس پر جذبہ کا متنی ہے مگر صوفی اس میں اپنے جبلی جذبہ فدویت کی تسکین پاتا ہے اور توفیق طاعت پر عمن حقیقی کا ممنون ہوتا ہے گویا ایک مزدور ہے اور دوسرا بندہ عشق، اسی فرق کو حضرت والا نے ایک شعر میں واضح فرمایا ہے، وہ شعر کیا ہے اہل ذوق کے لئے ایک جام سرشار ہے سنیئے ے

بر ضربِ تیشہ ساغرِ کیف وصالِ دوست — فرہاد کی جو بات ہے مسندِ دور کی نہیں!
 (۱۴) نرا عابد جب سجدہ کرتا ہے تو اپنی پیشانی خاک آلود کرتا ہے، اس پر نماز کی حقیقت
 کھلتی ہے نہ سجدے میں قربِ الہی کا کوئی حظ محسوس ہوتا ہے یعنی وہ محلِ قرب میں آکر بھی
 طفیلِ وصل سے محروم رہتا ہے، مگر عارفِ سجدے میں کیا کرتا ہے اپنی جبینِ شوق و نیاز کو
 محبوبِ ازل کے بے کیف و کم قدم پر رکھ کر کششِ جہات سے گزر جاتا اور قرب کی لذت میں
 کھو جاتا ہے، اس کیفیت کو حضرت والادہ کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:۔

سجدے میں رکھ کے سر ترے پائے خیال پر تعمیر اک بہشتِ ارم کر رہا ہوں میں
 (۱۵) ارشادِ نبویؐ ”کُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ“ صوفیاء تعمیرِ حیات کا اصل
 سنگِ بنیاد ہے اور عارفانہ موعظت کا لب لباب، دیکھئے کہ حضرت والادہ کی زبانِ فیض اثر
 سے یہی وصیت کس موزونیت سے قطعہ بند ہو گئی ہے — طرزِ ادا اس قدر سادہ
 اور صاف کہ سہل متبع کی ایک مثال اور جذبِ روحانی کا یہ عالم کہ کوئی حساس دل اس کو
 سن کر محرومِ اثر نہ رہ سکے، سنئے اور فیض لے کر اٹھئے، فرماتے ہیں:۔

ہم ایسے سہیاں کہ ویسے رہے وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
 حیاتِ دور و زہ کا کیا عیش و نسیم سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اسباب ہیں دستِ قدرت میں یوں

قلمِ دستِ کاتب میں جیسے رہے

والسلام علی من اتبع الهدی۔

عارفانہ تصانیف

تصوف یا احسان کے موضوع پر حضرت والاؒ کی تصانیف بہت کم ہیں، اور اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سلسلہ کی مہلت ہی بہت کم ملی اور جو کچھ ملی وہ چٹے درپٹے اضطراب یعنی ترک مستقر (اعظم گڑھ) ترک وطن اور پھر مہاجرانہ الجھنوں کی تدریج ہو گئی۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی رہی کہ ان کو سید العارفین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے جمع و ترتیب کی سعادت حاصل تھی، یہ وہ معیاری کام تھا جس کے بعد اور کچھ لکھنا افحسے تنزل کی طرف آتا تھا، خصوصاً سیرت النبیؐ کی چھٹی جلد جو اخلاق نبویؐ کا مرقع ہے وہ یقیناً تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے موضوع پر ایک جامع اور مستند ترین کتاب ہے۔

بہر کیف قلت تصانیف کا سبب جو کچھ بھی رہا ہو، مگر دو تین ہی تحریریں جو اس رنگ کی لکھی جاسکیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان (قدس سرہ) جس اقلیم میں بھی نکل جاتے ہیں وہاں انہی کی سطوت قائم ہو جاتی ہے۔

جامعہ حینیہ راندر (ضلع سوٹ) کے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ ۱۳ شعبان ۱۳۶۷ء میں حضرت والاؒ نے ایک خطبہ دیا تھا

جس کے عنوان یا انداز تحریر میں اپنے شیخ عالی مقام کے طرز کی پیروی کی تھی۔ اس خطبہ کا عنوان ہے ”الجدد والجدد العلمی لمعاش والمعاد“ اس میں علم معاش اور علم معاد کا فرق، قرآنی روشنی میں ان دونوں کی تشریح اور ان کی ہم آہنگی کی ضرورت و اہمیت کو بڑی خوبی اور کمال سے بیان فرمایا گیا ہے، خطبہ ماثورہ کے بعد علم معاش (مادی علوم) اور علم معاد (علم وحی) کا عنوان ان دو آیات قرآنی کو قرار دیا گیا ہے:-

(۱) وعلم ادم الاسماء کلہا

(۲) علم الانسان ما لم یعلم

پھر اسماء کی توضیح "تسحیر کائنات" کا قرآنی مدعا "امانت اللہ کا مفہوم و منشاء نہایت دلپذیر انداز میں بیان کر کے "نظام تعلیم کی وحدت" یا یوں کہیے کہ اسلام کے نظریۂ تعلیم کی جامعیت و کمال کو اس حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر یہ رسالہ جدید و قدیم ماہرین تعلیم کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔

اس خطبہ کا دوسرا نمایاں وصف اس کی پرتاثری ہے اس کو پڑھتے جاتیے تو صاف محسوس ہوگا دل میں ایک فیض آرہا ہے جس سے روشنی پھیلی جا رہی ہے، جگہ جگہ منتخب اشعار اور نامحاشا پیرایہ بیان نے عجیب گھلاوٹ پیدا کر دی ہے واعظانہ زبان اور محققانہ کلام کا امتزاج اردو میں بہت کم ملے گا، اور گو حضرت والارہ نے اس میں اپنے شیخ قدس سرہ کے طرز کی پیروی کی ہے مگر تحقیق، تعبیر اور زبان ہر اعتبار سے یہ مقالہ اپنا منفرد مقام رکھا ہے۔

سیلان ڈی جاہ جس طرح شلوی ہو کر کبھی انفرادی شان کے حامل میں اسی طرح اشرفی بن کر کبھی ان کا انفرادی شرف قائم ہے!

حضرت والارہ کبھی کبھی فرماتے تھے کہ:-

حیاتِ اشرف | حیاتِ شلویٰ لکھ کر تو اپنے استاد کا حق ایک درجہ میں ادا

کر چکا ہوں اب جی چاہتا ہے کہ اپنے پیرومرشد کی بھی کچھ خدمت کا شرف ملے۔

اس طرح حضرت والارہ کے دل میں یہ تقاضا موجود تھا کہ حضرت عظیم الامت قدس سرہ کے سوانح حیات مرتب فرمائیں، اور بعض مخلصوں کا بھی یہی تقاضا ہوا کہ یہ کام ان ہاتھوں سے انجام پانا چاہیے، اس اصرار میں سب سے پیش پیش حضرت تھانویؒ کے علائی بھائی خان بہادر محمد مظہر مرحوم تھے، میں نے خود دیکھا کہ جنوری ۱۹۴۷ء میں جب حضرت والارہ

جیدر آباد کن تشریف لائے تھے اور چند روز منظر صاحب کے مہمان تھے تو تقریباً روزانہ ہی وہ حضرت والارہ کو اس کام کی یاد دہانی فرمایا کرتے تھے مگر حضرت والارہ کو جواب میں یہ فرماتے سنا کہ:-

”ابھی کچھ انتظار ہے۔“

آخر ایک روز شام کی نشست میں جب منظر مرحوم نے پھر یہی ذکر چھیڑا تو حضرت والارہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:-

”آج تو معاملہ طے ہو گیا، انشاء اللہ اب قلم اٹھاؤں گا۔“

منظر صاحب نے فرمایا کہ معاملہ کیا تھا؟ حضرت والارہ نے بات طمانی چاہی، مگر پھر مرحوم کے اصرار پر فرمایا کہ دوپہر کو لیٹا تھا کہ خواب میں حضرت والارہ (حکیم الامت) کی زیارت نصیب ہوئی اور حضرت کے دست مبارک سے ہدیہ خاص ملا۔

اس تائید کی روایا کے بعد حضرت والارہ نے ترتیب سوانح کا ارادہ فرمایا، اور حیات اشرف کے نام سے حالات قلم بند فرمانے لگے۔ یہ کام قیام بھوپال کے زمانہ میں انجام پا رہا تھا، ابھی حضرت تھانویؒ کے قیام کا پورنک کے حالات ضبط تحریر میں آسکے تھے کہ سقوط ریاست اور اس کے بعد کی بے اطمینانیوں نے قلم کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کام ناتمام رہ گیا۔ کراچی کے دوران قیام میں محترم ڈاکٹر صاحب نے خصوصیت سے اس کی تکمیل پر اصرار فرمایا تو واقعہ حقیقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارادہ لطف ارشاد ہوا کہ:-

”اب تو یوں بھی اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، انہوں نے مختصر سوانح لکھ دی

ہے اور میرا مجوزہ نام (حیات اشرف) بھی اڑا لیا ہے۔“

میں نے عرض کیا کہ حضرت میری تحریر کو آپ کی تحریر سے نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ رہا نام تو

ملہ افسوس کہ احقر کو پورا خواب اس وقت یاد نہیں نہ اس وقت اس کو قلمبند کرنے کا خیال آیا تھا اور

حضرت والارہ نے تفصیل سے سنایا تھا۔

میں نے تو سمجھا کہ حضرت کا مجوزہ نام (اشرف الحیات) ہے! فرمایا ”نہیں میں نے حیاتِ اشرف ہی تجویز کیا تھا، چلیے تو ارد ہو گیا ہوگا اس میں ہرج ہی کیا ہے۔“

مہربانِ حیاتِ اشرف کے زیر عنوان حضرت والار نے جتنا کچھ تحریر فرمایا ہے جب وہ چھپ کر اس علم و نظر کے سامنے آئے گا تو پڑھنے والے محسوس کر لیں گے کہ اشرف السوانح کے ہوتے ہوئے بھی ایک اور سوانح کی یقیناً ضرورت تھی جو کاش کہ تکمیل پا جاتی!! مؤلفین کے فرق و امتیاز سے مولفات کا تذکرہ ظاہر ہے!

اس ناتمامِ حیاتِ اشرف کا ایک پیش لفظ بھی حضرت والار نے تحریر فرمایا تھا جواب مولانا عبدالباری ندوی مظلہ کی کتاب ”تجدید تصوف و سلوک“ کا مقدمہ بنا دیا گیا ہے، اس کا فقرہ آغاز ترکا یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

”پیش نظر اوراق میں ایک اسی کا مرقع پیش کیا جا رہا ہے جو اپنے وقت میں مجموعہ کمالات اور جامع الواع و فضائل تھی، حافظ، قاری، مدرس، مفسر، محدث، فقیہ، داعی، صوفی، شکر، مناظر، ناظم، ناشر، ادیب اور خانقاہ نشین شیخ سب کچھ تھی۔ لیکن اس نے سب سے بڑھ کر اپنے تمام فضائل و کمالات کو فنِ تصوف کی اصلاح و تکمیل میں صرف فرما دیا اور ان علوم و فنون میں سے ہر ایک پر مالانہ اطلاع اور محققانہ عبور کے باوجود کسی کو اپنا تنہا اور مخصوص شغل نہیں بنایا، بلکہ اپنے تمام علوم و فنون کو اسی ایک فنِ شریف کی خدمت میں لگا دیا، اس لئے یہ کہنا گویا صحیح ہے کہ اس کو تمام دوسرے علمی

لے یہ غلط فہمی مجھ کو مولانا عبدالباری ندوی مظلہ کی کتاب ”تجدید تعلیم و تبلیغ“ کے دریاچہ سے ہوئی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ ”سید صاحب“ اشرف الحیات کے نام سے حضرت کی سوانح حیات کا ارادہ بلکہ شاید آغاز فرما چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ نئی)۔

اے یہ مسورہ صابر ارادہ سید سلمان سلیم کے پاس محفوظ ہے۔

دہلی ممالک دیے جا سکتے تھے کہ اس فن کی تجدید موجود دنیا میں کس جہتی کی
مالت میں اور ہندوستان میں بحالت غربت تھا۔

مقدمہ جامع المجددین

مولانا عبدالباقی ندوی مدظلہ نے حضرت حکیم الامت کی تجدیدی
شان کو آشکار کرنے کے لئے جو سلسلہ تجدیدین ”آغاز فرمایا
جامع المجددین اس کی پہلی ادھام کڑی ہے، اس پر مقدمہ حضرت والار کے قلم اعجاز رقم کا لکھا ہوا
ہے۔ سترہ صفحات کے مقدمہ میں علوم و معارف کا ایک عزیز محفوظ ہو گیا ہے، حدیث تجدید کی
تینقح، اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح و توضیح حضرات مجددین کی تاریخ اور اسمائے گرامی کی
فہرست، مسئلہ ”مجددیت“ کی حیثیت اور اس کی نزاکت پھر اس میں کلام کرنے والوں کو تنبیہ اور
اس کے بعد چودھویں صدی میں حضرت حکیم الامت کی خدمات کی تجدیدی حیثیت، سب کچھ
بکمال خوبی اس مقدمہ میں آگیا ہے۔ چند مختصر اقتباسات سے اس کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

نفس حدیث تجدیدان اللہ یمبعث فی امتی علی راس کل مائتۃ من یجد دلہا
دینہا، کے متعلق ارشاد ہے۔ ”ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جن کی صحت میں کلام کیا گیا ہے مگر
واقعہ نے ان کی صداقت کی توثیق کر دی ہے یہی حال اس حدیث کا بھی ہے اور تاریخ اسلام
اس کی صداقت کی شاہد ہے۔“

پھر لفظ مائتہ کی تشریح ہے۔

”پھر لفظ مائتہ جیسا کہ محققین نے اصول فقہ میں ثابت کیا ہے کسی خاص کے لئے اس
کا ہونا ضروری نہیں بلکہ عموم بھی اس سے سمجھا جاتا ہے۔“

پس۔ ”بالکل ممکن ہے کہ مختلف ملکوں میں یا مختلف اصلاحوں اور مختلف مقامات کے
مقابلے میں تجدید دین کے لحاظ سے کئی مجدد ظہور کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ علمائے بعض دفعہ
ایک ہی وقت میں کئی کئی بزرگوں کو مجدد مانا ہے۔“

آئے ان حضرات کے ناموں کی تفصیل ہے، اب ”زاس کل مائتہ“ کی گرہ کشائی
ملاحظہ ہو:-

”سر (رائس) ابتداء اور انتہا دونوں پر بولا جاتا ہے اس لئے صحیح ترجمہ صدی کے سرے پر
کے بجائے تخصیص کے ساتھ ابتداء اور انتہا نہیں آنا چاہیئے۔“

”صدی کے سرے پر مجدد کی پیدائش ہونا ضروری نہیں بلکہ اس وقت اس کے
تجدیدی مشن کا آغاز ہوتا ہے جس کو حدیث میں بعثت کے لفظ سے ادا کیا
گیا ہے۔“

”مجدد کی بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تلقین اور جدوجہد اور دعوت سے
زمانہ کی ظلمتیں، خیالات کی بدعتیں اور اعمال کے مفاہد دور ہو کر وہ اصل دین
منور اور جہالت سے جس کی صحیح تصویر نبی کریم علیہ التیمۃ والتسلیم کے نگار خانہ کتاب
وسنت میں محفوظ ہے۔“

اس کے بعد منبہ فرمایا گیا ہے:-

”چونکہ اس حدیث کا سہارا لے کر بعض مدعیان باطل نے نئے نئے دعوے کئے
ہیں یہاں تک کہ موت کے حدود حرم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے یہ
لغزش گاہ بھی ہے اور اس مقام پر قلم اور قدم کو چھونک چھونک کر چلنا چاہیئے۔“
اسی لئے صاف طور پر اعلان فرما دیا گیا کہ:-

”مجدد اپنی شخصیت کی دعوت نہیں دیتا، یہاں تک کہ مجدد کو محمد و ماننا ایمان کا
ادنیٰ جزو بھی نہیں۔“

اور یہ کہ:-

”اس تعین کے مسئلہ میں نیک نیتی سے دو شخصوں کی راہیں حسب عقیدت و
محبت مختلف ہو سکتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک پر اعتراض اور ایراد نہیں

کیا جاسکتا کیونکہ یہ مسئلہ محض گمان و تخمین اور قیاس کا ہے۔
ان محدود کو تسلیم کرتے ہوئے اور انہی قیود کے ساتھ اپنے شیخ حضرت حکیم الامت رحمہ کی
تجدیدی حیثیت کی تائید فرمائی گئی ہے باقی نفس تالیف (جامع الجہودین) کے متعلق صاف طور پر
تحریر فرما دیا ہے کہ:-

”کسی کو یہ شبہ نہ گزرے کہ اس تحریر یا اس تالیف کا مدعا کس شخص کے مجددیت
کے دعوے کی تشبیہ یا منصب تجدید کی دعوت و تلقین ہے بلکہ یہ مؤلف کی عقیدہ مندانہ
تعبیر ہے کہ وہ حضرت رحمہ کی اسلامی سماعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
صفحہ ۲۷۱“

اس مقدمہ سے حسرت والاہ کی وہ شانِ جامعیت آشکار ہے جس کو کسی شاعر عارف نے ج
”برکتنے جا شریعت برکنے سندان عشق“ سے تعبیر کیا ہے۔ اس مقدمہ کو ملاحظہ فرما کر حکیم الامت رحمہ کے
مذاق آشنا اور خلیفہ مجاز حضرت مشتق صاحب مدظلہ نے خود حضرت والاہ سے فرمایا تھا کہ:-
”مولانا عبدالباری صاحب نے تو یہ کتاب غلبہ محبت میں لکھی ہے اور حضرت (یعنی
مولانا سید سلیمان) نے مقدمہ ایسا تحریر فرمایا ہے جیسے خود حضرت والاہ رحمہ (حکیم الامت)
تحریر فرماتے۔“

اور مارف و محقق حضرت مولانا گیلانی نے اسی مقدمہ کی بابت اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا
تھا کہ:-

”کتاب خوب ہے مگر اس کا مقدمہ تو لا جواب ہے۔“

یہ بلند پایہ مقدمہ بھی اپنی جامعیت، علمیت اور افادیت کے
اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔ میں صفحات میں اتنے مضامین
کی وسعتوں کو سمیٹ لینا یہ حضرت ہی کا حصہ تھا صرف عنوانات

مقدمہ ”مولانا محمد الیاس
اور ان کی دینی دعوت“

کے شمار ہی سے اس کی گونا گونی کا اندازہ لگائیے جو یہ ہیں :-

- ۱۔ امت مسلمہ کا فریضہ، ۲۔ دولت و سلطنت مقصودِ اول نہیں، ۳۔ امت مسلمہ جانشین بنی ہے، ۴۔ تعلیم و تزکیہ میں تفریق، ۵۔ تعلیم و تزکیہ کی یکجائی، ۶۔ فلاح دونوں کی یکجائی میں ہے، ۷۔ مزاج نبوت قوامِ ملت ہے، ۸۔ صاحبِ سوانح اس معیار سے، ۹۔ سلسلہ و لکھی، ۱۰۔ صاحبِ سوانح کا سلسلہ لب، ۱۱۔ اس عہد میں تبلیغی ناکامی کے وجوہ، ۱۲۔ انبیاء کے اصول و دعوت۔
- اس آخری عنوان کے تحت قرآنِ پاک اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں حسبِ ذیل اصول گنا کران کی مختصر تشریح فرمائی گئی ہے۔

- (۱) وہ اپنے کام کی اجرت و مزدوری کسی مخلوق سے نہیں چاہتے۔
- (۲) ان کی تبلیغ و دعوت کا محرک بندگانِ الہی پر شفقت و رحمت اور خیر خواہی کا جذبہ ہے
- (۳) نرمی، سہولت، آہستگی، دانشمندی اور ایسے اسلوب سے گفتگو کہ جس سے مخاطب پر دلی کے خلوص و محبت و شفقت کا اثر پڑے اور بات مخاطب کے دل میں اتر جائے۔
- (۴) دعوتِ تبلیغ میں اَلَاھِمْ فَاَلَاھِمْ کی ترتیب مدنظر رہے۔
- (۵) ”عرض“ یعنی لوگوں کا انتظار نہیں بلکہ خود ان تک پہنچ کر دین کو پیش کرنا۔
- (۶) ”نفیر“ یعنی دین کی طلب اور تبلیغ کے لئے نرک و ظن کر کے ایسے مقامات پر جہاں دین حاصل ہو سکے اور پھر وہاں سے لوٹ کر اپنے وطن میں آکر اپنے قبیلہ اور ہم قوموں کو اس فیض سے مستفید کرنا۔
- (۷) اصحابِ معقہ کی طرح ایک گروہ خاص کا انتظام رکھنا۔
- (۸) زیادہ تر فیضِ صحبت، ذہانی تعلیم و احکام و مسائل کا ذکر اور مذاکرہ۔
- ان دریں اصولوں کو گنا کر آخر میں تبلیغ کی اہمیت پر ایک پُر اثر فقرہ تحریر فرمایا ہے جو بڑھنے ہی سے نطق رکھتا ہے۔

اس مقدمہ سے حضرت اقدسؒ کے مشرب و مسلک اور وسعتِ قلبی کا اندازہ ہوتا ہے

اپنے شیخ عالی مقام مجدد وقت کے ایک معاصر بزرگ کے کمالات اور ان کی خدمات کا علانیہ اعتراف و اعلان فرما دکھا تو دیکھئے کہ کسی اور کی زبان و قلم سے اس صفائی سے ہر لہجے۔

اس بے نظیر مقدمہ کا سب سے زیادہ اعتراف تبلیغی حضرات کو ہونا چاہیئے تھا اور ہے مگر سچ یہ ہے کہ ان کی قدر دانی بھی گہری نہیں بلکہ سطحی ہے، ان کی پہنچ مقدمہ کی اسپرٹ تک نہیں چوبہ ہے کہ دین کی خدمت جہاں کہیں جس کسی قالب موزوں میں ہو رہی ہے اس کا اعتراف و حق الامکان اس سے تعاون کیا جائے نہ یہ کہ جس کام میں خود مشغول ہوں اس کو وقت کی تنہا ضرورت اور دین کی تنہا خدمت قرار دیں اور اس کے سوا کسی دینی خدمت کو خدمت ہی نہ سمجھیں!

اچھے اچھے کام اور اچھی اچھی تحریکیں اس غلو کی وجہ سے خود اپنے ہی حلقہ اثر کو تنگ کر لیتی ہیں اور مختلف دینی خدمت گزاروں اور اداروں میں اسی وجہ سے وہ ربط پیدا نہیں ہونے پاتا جو ملت کی ہمہ جہتی صلاح و فلاح کے لئے ضروری ہے، حضرت والارح کی ساری زندگی اسی ربط باہمی کے قیام اور رفع غلط فہمی میں گزری تھی، جس نے اس کو نہیں سمجھا، اس نے حضرت کو نہیں پہچانا۔!

(تمت)



تذکرہ سلیمان حصہ دوم

یعنی

منہاج سلیمانی برائے سالکِ رحمانی

باسلیمانِ حُکُن اے خفاشِ رَد
 تاکہ درِ ظلمتِ فانی تا ابد
 یک گزے رہِ گردِ آنسوِ میروی
 اچھو گز، قطبِ ساحتِ میثوی
 (روحی)

حاصل و منتہائے طریق

ہر عمل میں طلبِ رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے
اور

جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے
توصوفیہ کی اصطلاح میں اس کو "نسبت" کہتے ہیں، اور
قرآنِ پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یحبہم ویحبونہ
اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے لفظوں
میں کی گئی ہے

یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک
راضیة مرضیة۔ انہی کے لئے نویدِ بشارت ہے!

(ارشادِ سلیمانی)

فہرست منہاج سلیمانی

صفحہ	عنوانات
۴۱۶	میری پہلی حاضری
۴۲۲	دارالسلام میں تقریر
۴۲۳	دوسری اہم حاضری
۴۲۶	دو صاحبِ دل کی ملاقات
۴۲۸	ریلوے اسٹیشن پر
۴۳۰	مکتوبات ۵۱
۴۴۳	حضرت کا آخری سفر حیدر آباد دکن
۴۴۵	نقاشِ نامہ
۴۴۷	خان بہادر محمد مظہر مرحوم کی میزبانی
۴۴۹	خادمِ نوازی
۴۵۰	ایک خدامتِ بزرگ سے ملاقات
۴۵۱	ایک اصرار بے جا
۴۵۲	واپسی
۴۵۳	مکتوبات ۳۱ تا ۴۶
۵۲۰	بھوپال کی پہلی حاضری

صفحہ	عنوانات
۵۲۱	رقم خود کی پیش کرنے پر منسلک ثروت کی تفہیم
۵۲۳	ایک شدید دوسوسہ اور اس کا کشفی علاج
۵۲۴	درخواست بیعت کی منظوری
۵۲۶	شب قدر میں شرف بیعت
۵۲۸	بشارت
۵۲۸	خواب
۵۲۸	تفسیر
۵۲۹	عید اور عید گاہ
۵۳۰	میری واپسی
۵۳۰	مکتوبات ۵۲ تا ۳۳
۵۴۸	بھوپال کی دوسری حاضری
۵۴۸	امتحان شوق
۵۴۸	اسٹیشن پر
۵۴۹	دوران سفر
۵۴۰	بھوپال اسٹیشن
۵۴۰	قیام
۵۴۱	مکتوب ۵۳
۵۴۲	حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ
۵۴۳	سیاسی حالات کی لہری اور واپسی کی اجازت
۵۴۵	ہوائی اڈے پر

صفحہ	عنوانات
۵۷۷	مکتوبات ۵۳ تا ۷۹
۶۲۱	بھوپال کی آخری حاضری
۶۲۱	کوڑک ناداں
۶۲۲	ذرہ نوازی
۶۲۳	حضرت حاجی محمد شفیع بجنوریؒ سے شرف نیاز
۶۲۴	والہی
۶۲۵	مکتوبات ۷۷ تا ۱۰۱
۶۷۵	"خاتم المکاتیب"
۶۷۶	کلمہ آخر
۶۷۷	تصدیقی ارشاد
۶۷۸	توثیقی بشارت
	نوٹ:-
	مندرجہ ذیل مکاتیب اپنی خصوصی نوعیت کے اعتبار سے خاص طور پر
	قابلِ دید ہیں۔
	۱۱ - ۱۲ - ۲۴ - ۲۹ - ۳۷ - ۵۱ - ۵۹ - ۶۲
	۶۵ - ۶۶ - ۷۰ - ۷۲ - ۷۹ - ۸۵
	اور آخر کے ۳ خطوط!
	❖ ❖ ❖

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روايت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ۔ ”تمام اعمال کے نتائج نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر شخص کے لئے (اُس کے عمل کا) وہی نتیجہ ہے جو اس نے نیت کی ہو۔“	عن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إنما الاعمال بالنیات وإنما لكل امرئ ما نوى۔ (بخاری)

بشوریدے دوستانِ این داستان خود حقیقتِ تقدیرِ حالِ ماست آن
تقدیرِ حالِ خویش را گر پئے بریم ہم ندُنیا ہم زعقبا بر خودیم
(رومیؒ)

حضرت والاہ کی خدمت میں پہلی حاضری

فروری یا مارچ ۱۹۵۳ء کی بات ہے، حضرت والاہ حیدر آباد کن تشریف لائے تھے، میرے ایک ہم عمر مخلص دوست مولوی سید احمد فرید الدین صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے شائق تھے مگر ان کو قیام گاہ کا پتہ نہ تھا مجھ سے فرمایا کہ درامولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کے گھر لے چلیے معلوم ہوا ہے کہ علامہ ندوی وہیں قیام فرما رہے ہیں، بات ماننے کی کوئی وجہ نہ تھی، اپنے دوست کو ساتھ لے کر مولانا عبدالباری مدظلہ کے گھر پہنچ گیا، دیکھا کہ صاحب خانہ اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے درمیان آدم کرسی پر ایک ہستی جلوہ فرما ہے، میانہ قد و قامت، متوسط جسم، بارعبا و پر نور گول چہرہ، گرداگرد گھنی ڈاڑھی، خوش وضع ترشی ہوئی، فراخ دہکتی ہوئی پیشانی،

س۔ (پوری منانت کے ساتھ جو شعرا سلیمانی تھا) آپ کس درجہ میں پڑھتے ہیں؟

غ۔ ایل ایل، بی کے ابتدائی سال میں!

س۔ بی۔ لے میں آپ کا مضمون اختیار کیا تھا؟

غ۔ معاشیات۔

س۔ اس وقت آپ کی عمر کیا ہے؟

غ۔ اکیس برس!

س۔ اچھا یہ بتائیے کہ ہمارے ملک میں عمر کا اوسط کیا ہے؟

غ۔ اٹھائیس برس

س۔ (سکراتے ہوئے) خیر یہ تو آپ نے اپنے فن کے اعتبار سے کہا، ویسے فرض کیجئے کہ تقریباً

(۴۰) سال ہے تو اس چالیس سال کا نصف سے زائد حصہ آپ نے کس چیز کے حصول میں

صرف کیا؟

غ۔ ڈگری حاصل کرنے میں!

س۔ اور اس سے مقصود کیا ہے؟

غ۔ (پوری بے تکلفی سے) کوئی اچھا عہدہ حاصل کرنا!

س۔ تو گویا آپ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ایک ایسی شے کے حصول میں صرف کیا جو یقینی نہیں

بلکہ اکثر جس میں ناکامی ہی رہتی ہے، لیکن آخرت کا اجر تو مختل نہیں بلکہ یقینی ہے! اس

جملہ کے بعد ”اللہ“ کا لفظ بڑے ہی سوز کے ساتھ زبان حق ترجمان سے نکلا، اور اس

عمر کے بڑے حصہ میں اس کے لئے کچھ بھی نہ ہو سکا، رہی باقی عمر، اس میں بھی نہ جانے کتنا

حصہ صرف تلاش معاش ہی کی نذر ہو، جس میں حسب مرضی کامیابی کی توقع بھی نہیں

اور یہ سب اس چند روزہ زندگی کے لئے جدوجہد ہے جس کی بے ثباتی کا ثبوت آئے

دن ملتا ہی رہتا ہے اور جس کے فنا کا یقین حاصل ہے مگر اس زندگی کے لئے جس کا

دوامِ مسلم ہے کوئی اہتمام و کوشش نہیں!!

غ۔ (طالب علمانہ شوخی کے ساتھ) یہ سب بجا، اور کبھی کبھی دل بھی یہی چاہتا ہے کہ اس دنیا کی فکر کی جائے مگر جب "بجاہ ہا" (شہر جبراً آباد کا بہت ہی مغرب زدہ امراء کا محلہ جو ہارڈی سلسلہ پر واقع ہے) کی طرف جانا ہوتا ہے تو جی یہی چاہتا ہے کہ ایسا ہی مالی شان بنگلہ ہو، یہی کہ وہ فرہوادرا سی ہی ہوشیں ہوں!

س۔ (اب یا تو یہ تھا کہ میری سادگی پسند آگئی یا پھر نوزدان کا حکیمانہ اندازِ کریم تھا کہ فوراً مکرراتے ہوئے بڑی ہی محبت سے فرمایا)

آپ مجھ سے خط و کتابت رکھتے۔۔۔۔۔ (پھر متاثر کن لہجہ میں فرمایا) اصل یہ ہے کہ جب دین کی فہم پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا کی حقیقت کھل جاتی ہے تو یہ سب چیزیں بچ نظر آتی ہیں۔۔۔ اللہ۔۔۔ کیا یہ عقلمندی ہے کہ چند روزہ حیاتِ عیش و عشرت سے گزار کر آخرت کی دائمی تکلیف برداشت کی جائے یا یہ کہ چند دنوں تھوڑی سی شفقت اٹھا کر ہمیشہ کی راحت کا سامان کیا جائے؟۔۔۔۔۔ پھر اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اسباب و علل کے تحت ہے اور یہ سارے اسباب ایک مسببِ الاسباب کے ہاتھ میں مسخر ہیں تو اگر کسی کو یہی دنیا حاصل کرنا ہے تو بھی اس کا صحیح طریقہ کیا ہے نہ ہوگا کہ ان اسباب سے نظر ہٹا کر مسببِ الاسباب کو اپنانے کی کوشش کی جائے؟۔۔۔ (پھر تبسم ہو کر) آپ کو شاعری سے دلچسپی ہے؟

لہ حضرت والادہ رمی آداب سے خوش نہ ہوتے تھے بلکہ سادگی اور سببِ تکلفی کے دلدادہ تھے۔

لہ اکثر فرماتے تھے کہ طیبہ اگر رمضان کی حالت پر رحم نہ کھائے تو وہ علاج کیا کرے گا؟ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک بھی تو رحمت و رافت ہی سے مملو تھا)

لہ گفتگو کے دوران میں کبھی کبھی بے ساختہ لفظ "اللہ" حضرت جی کی زبان سے نکلتا اور لوگوں کو ہلا دیتا تھا۔

(کہ) بہترین کتاب ہے!

س۔ (پھر بھی اس اجمال کی تفصیل طلب ہی کرنی گئی کہ) کیا یہ مکمل ہے؟

(اب میرے پاس سوال کی تائید میں کوئی دلیل حاضر تھی نہ اس کی نفی کی جرأت! لا جواب و حیران رہ گیا)

س۔ (متبسم ہو کر) جی نہیں یہ مکمل نہیں ہے، اس میں تو صرف سیاسی پہلو کو نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے، جس وقت یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت سیاسیات کا دور دورہ تھا، اگر یہی کتاب آج لکھی جاتی تو حضرت عمر فاروقؓ کے معاشی تدبیر و تنظیم کو زیادہ اجاگر کر کے دکھایا جاتا کیونکہ اب کمیونزم کا عروج ہے! (گفتگو ختم)

غ۔ (گہرے قلبی تاثر کے ساتھ رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے) اجازت ہو تو حضرتؓ کے دوران قیام میں کبھی کبھی حاضر ہوا کروں۔

س۔ ضرور تشریف لائیے!

پھر کبھی کبھی کا کیا سوال تھا، بار بار بلکہ کالج کا درس چھوڑ چھوڑ کر خدمت والا میں حاضری ہوتی رہی، کیونکہ ایک نگاہ میں بساطِ دل ہی کچھ ایسی اُلٹ دی گئی تھی کہ زندگی کی قدیس بدل گئیں، مقصدِ زندگی کچھ سے کچھ ہو گیا۔

ہوشم بہ نگاہ ہے برد جانانہ چنینیں باید

یک جرعه خرابم کرد پیمانہ چنینیں باید

جی تو یہ چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس انہی کا ہوم رہے کہ کچھ گذشتہ کی تلافی اور

آئندہ کا اہتمام ہو سکے ورنہ ناپائیدار زندگی کا کیا بھروسہ!!

ط۔ شاید ہمیں نفس، نفس واپسین بود

لے میری بساط ہی کیا ہے، خود حضرت والاؒ کے شاگردوں سے سنا ہے کہ اچھے سے اچھے طلباء بھی اُن کے

سوال سے گھبراتے اور بچنے کی کوشش کرتے تھے!

دارالسلام میں تقریر | مسلمانانِ دکن کی واحد نمائندہ جماعت "مجلس اتحاد المسلمین" نے شہر حیدرآباد کے ایک مرکزی مقام پر ایک وسیع زمین جس میں

قدیم وضع کی دو عالیشان عمارتیں بھی موجود ہیں حاصل کر لی تھیں، انہیں میں مجلس کا صدر دفتر بھی تھا اور طلباء کا دارالاقامہ بھی اور اسی میدان میں مجلس کے عام جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔

مجلس اتحاد المسلمین کے صدر اور مسلمانانِ دکن کے دلوں کے قائد نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ سے ایسا ہی تعلق تھا جیسے ایک باادب شاگرد کو اپنے استادِ شفیق سے ہونا چاہیے، وہ علامہؒ کو ایک غیر جانبدار محقق دین اور بے مثل مورخِ اسلام مانتے تھے ان کی ہر بات کو خوب دل لگا کر سنتے اور فقہی مسائل میں جہاں دیوبندی اور بریلوی اسکول میں اختلاف نظر آتا، انہیں کے قول کو قولِ فیصل سمجھتے تھے۔

انہی دنوں جب راقمِ ماصم کو حضرت والارہ سے ابھی ابھی تعارف حاصل ہوا تھا، قائدِ ملت مرحوم نے مقامی اخبارات میں ایک شخصیت اپیلِ شائع کی کہ انگلے دن علامہ سید سلیمان ندویؒ دارالسلام میں خطاب فرمائیں گے مسلمان زیادہ سے زیادہ اس میں شریک ہوں! اپیل اور مسلمانوں کے محبوب قائدِ ملت کی طرف سے! دوسرے روز چار بجتے بچتے دارالسلام میں خواص و عوام کا ایک زبردست اجتماع ہو گیا، پہلی تقریر مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ کی ہوئی اور پھر حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی گھنٹہ بھر خطاب فرمایا، جہاں تک خیال پڑتا ہے قرآنِ پاک کی آیت: "کنتم خیر امتٍ اخرجت للناس تا مدون بالمعروف وتنہون عن المنکر"

کو موضوع بنایا گیا تھا حضرتؒ نے پہلے آیتِ پاک نہایت سادگی و ادب کے ساتھ تلاوت فرمائی اور پھر بلا تمہید و تکلف راست نفسِ مضمون پر آگئے، تقریر ایسی مرتب اور رواں تھی کہ گویا قلم بند ہے اور گو بیان تمام تر محلی اور جوش سے خالی تھا لیکن سوز و جذبہ کچھ ایسا تھا کہ ہزاروں کا مجمع ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا اور ضرورت بھی کامل توجہ ہی کی تھی کیونکہ سلسلہ تقریر کی ہر گڑھی یکساں اہم و اراں و آخر ہے پوست تھی۔ میں قائدِ ملت مرحوم کے قریب ہی بیٹھا ہوا دیکھ

رہا تھا کہ ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جو جاتی تھی اور دبی زبان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کے کلمات احترام نکلنے جا رہے تھے۔

حضرت والاہ کی اس بصیرت افزا تقریر کا حاصل آج تک یاد ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کے لئے اس میں سرمایہ کامرانی ہے۔ فرمایا۔

(۱) اسلام کا سرچشمہ مصافی جہاں سے پھوٹا ہے وہیں سے شفاف پانی مل سکتا ہے۔

(۲) مسلمان خیر امت بن کر ساری دنیا کی طرف مبعوث ہیں اس لئے ان پر اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی بڑی ذمہ داری عائد کی ہے، اگر ان میں وہ برائیاں پیدا ہو جائیں جو غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں تو وہ دینی اعتبار سے غیروں سے بھی زیادہ جلد تباہ ہو جائیں گے۔
اس کی مثال بڑے مؤثر انداز میں یہ بیان فرمائی :-

”اے حضرات! جو تے کو غلامت لگ جائے تو کچھ بھی چل جاتا ہے لیکن ٹوپی کو لگ جائے تو فوراً اتار پھینکتے ہیں“

(۳) حکومت کفر کے ساتھ توجہ کر سکتی ہے لیکن بے انصافی کے ساتھ زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔
(۴) حکومت بالذات مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصد بھی تبلیغ و اشاعتِ دین ہے مگر افسوس ہے کہ حکومت حیدرآباد اس فریضے کی سرِ نافر ہے۔

(۵) حیدرآبادی مسلمانوں کا ۱۲ فی صدی کی اقلیت میں ہوتے ہوئے صرف سرکاری ملازمتوں پر تکیہ کئے بیٹھنا نہایت خطرناک ہے ضرورت ہے کہ ناسعت، تجارت اور صنعت و حرفت پر قابو حاصل کریں۔

حضرت والاہ کی تقریر ختم ہوئی تو قائد ملت اٹھ کھڑے ہوئے، ان دنوں ان کی تقریر پر حکومت کی طرف سے امتناع عائد تھا، مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں فرمایا کہ میں تو زبان ہندی کی مدت کاٹ رہا ہوں اس لئے میرا تقریر کرنا خلافِ قانون ہو گا البتہ جو باتیں ابھی بیان کی گئی ہیں ان کا اعادہ کر دوں تو اس میں کیا ہرج ہے۔ چنانچہ پہلے تو مولانا گیلانی کی

میں نے اپنی آنکھی منہ پر رکھتے ہوئے اشارہ کیا کہ چپ بھی رہو، اور فوراً آگے بڑھ کر اس کو بلوایا اور جتنا دیا کہ میرے آنے کی اطلاع حضرت کو نہ کرنا کہیں بار خاطر نہ ہو جائے۔

————— سید حضرت والدہ کا مزاج شناس، یہ کہتے ہوئے کہ نہیں نہیں مولانا فارغ ہیں کوہ میں چلا گیا اور پھر آکر اطلاع کی کہ ”آئیے یا دفرما رہے ہیں۔“

دل میں بہ وقت کی حاضری سے خوف ضرور تھا لیکن اب مسرت اس پر غلبہ پاتی جا رہی تھی بے پاؤں کرہ میں داخل ہو کر سلام عرض کیا، حضرت والدہ سر کی رنگ کی شال اوڑھے، پلنگ پر لیٹے لیٹے کوئی کتاب مطالعہ فرما رہے تھے، احقر کو سرہانے کی طرف میٹھے کا اشارہ فرمایا اور پھر سرہانے سے ایک تپتی سی کتاب نکال کر اس کی ایک عبارت جو خصائلِ رؤفہ کی اصلاح سے متعلق تھی، پڑھنے کی ہدایت فرمائی، کتاب کا نام جو دیکھا تو یہ تھی ”قصداً سبیل“ جو بعد کو معلوم ہوا کہ سلوک شریفہ کی ترجمان اور جامعیت کے اعتبار سے دریا بہ کوڑہ کا صحیح مصداق ہے۔ غرض پوری عبارت غور سے پڑھ لی اور پھر عرض کیا کہ حضرت پڑھ چکا، ارشاد فرمایا:

”ان باتوں پر خوب توجہ رہے۔“

گو یا پہلے ہی قدم پر معاملہ صاف کر دیا کہ سارے تصوف کا حاصل میں رذائل اخلاق سے پاک اور فضائل اخلاق سے آراستگی ہے، احقر نے حکم تسلیم کرتے ہوئے عرض کیا کہ اسی قسم کی ایک کتاب اور بھی ہے لیکن وہ ایک اور بزرگ کی لکھی ہوئی ہے، کتاب کا نام ہے ”علاق السالکین“ اور اس کے مولف میں حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب نقشبندی مجددی، فوراً ارشاد فرمایا: ”ہاں ہاں، ابھی مدراس سے جو آ رہا تھا تو راستہ میں ایک صاحب نے یہ رسالہ مجھ کو دیا، اس میں توصیف کے صفحے قصداً سبیل سے نقل ہیں۔————— یہ کون بزرگ ہیں؟“

سید حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب مدظلہ ان باخدا ہستیوں میں سے ہیں جن کا چہرہ ان کی دلالت پر گواہ اور جن کی زندگی زہد و ریاضت کا نمونہ ہے، ابتدائی تعلیم کسی دیوبندی عالم سے پائی، پھر حدیث کی سند مولانا حکیم عبدالرحمن صاحب (فرزند مولانا احمد علی صاحب محدث مہارنپوری) سے حاصل کی، مگر جذبات فقہ میں مولانا

عرض کیا کہ یہ ایک بڑے عالم اور بزرگ ہیں اور ہملا تو تقریباً سارا خاندان ہی ان بزرگ سے بیعت ہے۔ ارشاد فرمایا: ”آپ نے مجھ سے پہلے ذکر نہ کیا ورنہ میں ان سے ضرور ملتا، مجھے بعد وہ یہ خانوادہ سے خاص محبت ہے، مگر اب تو میں کل شام اعظم گڑھ روانہ ہو جاؤں گا۔“ میں نے عرض کیا کہ حضرت والا در نماز جمعہ تو مکہ مسجد (شہرک سب سے) عایشان جامع مسجد سلطان قلی قطب شاہ کی یادگار، یہی میں ادا فرماتے ہیں اور حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب بھی وہاں تشریف لاتے ہیں، اگر حضرت مناسب تصور فرمائیں تو وہیں ملاقات ہو سکتی ہے، میں بھی حاضر ہو جاؤں گا،

ارشاد فرمایا: ”جی ہاں۔۔۔ کیا حرج ہے۔“

اس کے بعد میں نے اپنے لئے دعا کی درخواست پیش کی اور سلام و معافہ کے بعد خوش خوش رخصت ہوا۔

دو صاحبِ دل کی ملاقات | آج ربیع الاول ۱۴۱۷ھ کی چودھویں تاریخ ہے اور جمعہ کا مبارک دن، میں وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ہی مکہ مسجد پہنچ گیا کچھ دیر بعد مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری مدظلہم کے ساتھ حضرت والا بھی تشریف لے آئے حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب تو صاحبِ معمول بہت سویرے آچکے تھے اور پہلی صف میں انوار اللہ خاں صاحب (بانی مدرسہ نظامیہ حیدر آباد دکن) کی طرف مائل ہیں ویسے بحیثیت مجموعی حضرت مولانا تھانویؒ کے بھی بہت قائل ہیں۔ مولانا کا علمی کا نام نہ نہجا اجتہاد المصابیح ”کی تالیف ہے جو مسلکِ نفی کی مبدعہ حدیث کا مشکوٰۃ شریف کی طرح پہلا ذخیرہ ہے۔ مولانا مدظلہ طریقِ باطن میں حضرت سید محمد باقر شاہ بخاریؒ کے تنہا خلیفہ ہیں اور وہ حضرت شاہ سعد اللہؒ کے خلیفہ تھے جن کو قطبِ وقت حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ سے خلافت حاصل تھی اس وقت حضرت مدوح کی عمر ۹۰ برس کے لگ بھگ ہوئی (۱۶ اگست ۱۹۷۷ء کو رحلت فرما گئے) طے عیسوی لحاظ سے آخر مارچ ۱۹۷۷ء کو کوئی تاریخ ہوگی، میسر ہی یادداشت میں صرف جسے تاریخ دوزخ ہے!!

امام کے قریب تشریف فرما تھے، میں حضرت والارہ کے ساتھ چوتھی صف میں بیٹھ گیا، نماز ہو چکی تو حضرت والارہ نے فرمایا، کہاں ہیں مولانا سید عبداللہ صاحب؟ میں فوراً اٹھا اور مصافحہ کر لیا۔ انہوں نے مجھ کو حیرتا ہوا مولانا کے قریب پہنچ کر آہستہ سے یہ بات گوش گزار کر دی کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں فرمایا، مولانا شملی کے شاگرد؟ عرض کیا، جی ہاں۔ مولانا نے فوراً اپنا ہاتھ مصافحہ سے کھینچ لیا اور میرے ساتھ تشریف لے آئے، حضرت والارہ مسجد کی شمالی کمان کے پاس کھڑے بعض احباب سے گفتگو فرما رہے تھے، مولانا کو آدیکھ کر فوراً آگے بڑھے، سلام میں تقدیم کی اور مصافحہ کے بعد دونوں بزرگ بغلیں ہو گئے اور دو ایک منٹ تک اسی طرح رہے پھر حضرت والارہ دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے، داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ سے تھامے، آنکھیں بند اور گردن قلب کی طرف جھکائے تصویر محویت بنے ہوئے تھے، ادھر سامنے مولانا کا یہ عالم کہ دونوں ہاتھ سینے کے قریب کف بستے، نظریں حضرت والارہ کی جبین مبارک پر گامی ہوئیں، جیسے تیز میں کوئی کھڑا اکا کھڑا رہ جائے۔۔۔۔۔ اچھے خاصے لوگ اطراف میں حلقہ باندھے کھڑے تھے مگر جو بھی تھا وہ لاچار اسیر حلقہ بنا ہوا تھا، اور غریق حیرت! خود میں بھی تعجب و حیرت سے کبھی ادھر دیکھتا تھا اور کبھی ادھر۔۔۔۔۔

بدایاں ماندم کہ ہم بزمِ است تصویر ہے بہ تصویر ہے

راقم نے دیکھا کہ کچھ دیر بعد مولانا کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور چہرہ پر آثارِ گریہ نمایاں ہو گئے، ادھر حضرت والارہ پر جو نظر پڑی تو عجیب بات دیکھیں کہ علاماتِ گریہ کے بغیر کیفیتِ گریہ محسوس ہو رہی تھی ایسے میں حضرت والارہ نے آنکھیں جو کھولیں تو ایک قطرہ اشک نکل پڑا پھر مولانا سے فرمایا، اچھا تو اب خدا حافظ۔۔۔۔۔ دونوں بزرگوں کے رخصتی مصافحہ پر ملاقات ختم ہو گئی۔

اب یہ سوچنا تو بے کار ہے کہ اس خاموش ملاقات میں کیا ہوا، کیوں کر ہوا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دو مجلی قلوب اور دو مرکئی نفوس کا آمنا سامنا تھا، دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا، معترف ہو گئے۔۔۔۔۔ صحنِ مسجد میں پہنچ کر حضرت والارہ نے اذکارِ لطف اس بے بصیرت

سے فرمایا، ”بہت غنیمت، سستی ہے!“

اسی طرح چند روز بعد جب مجددی بزرگ سے نیاز حاصل ہوا تو انہوں نے ہدایت فرمائی کہ ”مولانا کی راحت کا خیال رکھئے، بزرگ آدمی ہیں“۔ پھر حضرت والاؒ کی قیام گاہ کا پتہ بھی دریافت فرمایا مگر حضرتؒ تو اعظم گڑھ پہنچ چکے تھے۔

ریلوے اسٹیشن پر | اسی دو پہر کی شام کو جس کا ذکر ابھی ہو چکا، حضرت والاؒ اعظم گڑھ تشریف لے جا رہے تھے وقت پر میں بھی نامتلی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا، حضرت والاؒ علم و دستوں اور محبت کیشوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہوئے تھے، میں قریب پہنچا تو فرمانے لگے ”اچھا آپ بھی آگئے“۔ ایسے میں میں نے دیکھا کہ مکہ مسجد کے خطیب ابراہیم رشیدؒ بھی چلے آ رہے ہیں، حمید حافظ، دلکش قاری، اعلیٰ خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ وجہ و تمکیل بھی، ان کے والد ماجدؒ وہیں اساتذہ چکے تھے اس لئے حضرت والاؒ سے ان کے دیرینہ تعلقات قائم تھے، آئے اور حضرت سے بڑے ادب و محبت سے ملے، آج ہی جمعہ کے خطبہ میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو ”عید الاعیاد“ کہا تھا، سلام و مصافحہ کے ساتھ ہی حضرت والاؒ نے مسکراتے ہوئے ان کے لفظ پر گرفت فرمائی، خطیب صاحب نے پہلے تو کچھ جواب دینے کی کوشش کی مگر بہت جلد لا جواب ہو گئے اور ہنستے ہوئے اپنی لغزش کا اعتراف فرمایا، گفتگو چونکہ ٹھیک علمی تھی اور عربی زبان میں ہو رہی تھی اس لئے تفصیل لکھنے سے قلم عاجز ہے۔

خطیب صاحب سے ابھی یہ بات ختم ہی ہوئی تھی کہ خیام ثانی حضرت امجد حیدر آبادی، آپہنچے، حضرت والاؒ کا مقبسم چہرہ اوڑھ لیا، امجد صاحب نے اپنی درویشانہ سادگی کے ساتھ

ملہ بہادیاں جنگ مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے ایسے عمدہ خطیب عالم اسلام میں کم ہی دیکھے! بعد کو معلوم ہوا کہ خود حضرت والاؒ کا بھی یہی تاثر تھا!

تھ یہ خود حضرت والاؒ کا عطا کردہ لقب ہے!

سلام و مصافحہ کر کے ایک المونیم کا گول ڈبہ جس میں کچھ ناشتہ تیار کر لائے تھے، حضرت والارہ کی نذر کیا، _____ یہ ان جیسے عرلت پسند اور مستغنی مزاج انسان کی محبت و عقیدت کی انتہا تھی۔

اب ٹرین چلنے والی ہے، حضرت والارہ ڈبہ میں سوار ہو گئے، لوگوں نے مصافحہ شروع کیا، میں نے بھی اس کا شرف پایا مگر کس قدر حسرت میں ڈوب کر اودہ بان حال سے عرض کرتے ہوئے کہ: ط

ویدہ سعدی و دل ہمراہ تست
تاناہ پنداری کہ تنہا می روی

✽ ✽ ✽

مکتوب (۱)

حضرت والاہ تشریف لے چکے، اب ان کی یاد اور ان کا خیال مونس و مہم بھی تھا اور قوتِ دین و ایمان بھی، بار بار ان کی پُر شفقت ہدایت سامنے آنے لگی کہ ”آپ مجھ سے خط و کتابت رکھئے۔“ لیکن ایک بے علم و بے ہنر ایک علامہ عصر کی خدمت میں عرض حال کرے تو کس نہج سے؟ نہ آدابِ تحریر معلوم نہ آئینِ مخاطبت کا کچھ پتہ! یہی خیال کچھ عرصہ رکاوٹ بنا رہا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ خود اس نقص کا اظہار اور اس جہل کا اعتراف بھی تو ضروری ہے، بلا تکلف جو چاہا چاہا لکھ دیا۔ اب میرے معروضات اور حضرت والاہ کے ارشادات اسی علامات (رغ) و (س) کے فرق سے ملاحظہ ہوں!

رغ۔ ۵۸۹۔ ریڈ ہلز

حیدر آباد دکن

مورخہ ۸ اپریل ۱۹۲۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محرمی و مکرمی مدظلکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا بات ہے کہ حضرت قبلہ سے صرف چند ہی بار شرفِ ملاقات حاصل رہا لیکن ہر وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شفیق استاد اور قدیم کرم فرما، جو ایک عرصہ سے ہم میں موجود تھا اب ہم سے دور کھنڈ میں ہے؟

س۔ اعظم گڑھ

لئے القاب کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں اس بے علم کو ہمیشہ ناکامی رہی!

س۔ انی پچھاں سلیمان برحق العزیز صلح اللہ شانکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
یہ آپ کی محبت ہے جو اس پچھاں ناکارہ کے ساتھ ہے، اگر اس محبت کی دلیں پرورش
کی جائے تو فریقین کے لئے نافع ہو، انشاء اللہ العزیز۔
(شان تحقیق ملاحظہ ہو کہ محب فی اللہ کو پیر و مرید دونوں کے لئے یکساں نافع قرار
دیا گیا ہے)،

غ۔ حضرت والا اور مولانا سید عبداللہ صاحب مدظلہ کی مکہ مسجد والی ملاقات نے قلب
پر گہرے اثرات چھوڑے، اب تک جو بات سنتے آئے تھے، اس کو اس جمعہ محسوس و معلوم
پایا، قلب کی بیداری اور بیدار قلب کی ماہیت کا اندازہ گو بقدر ظرف ہی، بہر حال
ہو گیا، اب بھی جب وہ سماں نظروں کے آگے آتا ہے تو قلب اسی طرح متاثر ہوتا ہے!
س۔ جو کچھ آپ نے دیکھا یا پایا وہ خود آپ کا تاثر تھا جو بہر حال مفید ہے، (اب آگے کسی قلم
سے الفاظِ عجز و نقل کروں) آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کے بدولت ان بزرگ سو ملاقات
نصیب ہوئی، مجھے مجددی خالوادہ سے دلی تعلق ہے، سبب یہ ہے کہ میری تربیت
میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم کے زیر سایہ ہوئی جو مجددی سلسلہ کے شیخ تھے، اور
حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر مکی کے خلیفہ حضرت شاہ ابوالاحمد صاحب
بھوپالی کے خلیفہ تھے۔

غ۔ پھر گزارش ہے (بالشاذ بھی پہلی ہی حاضری میں عرض کر چکا تھا) کہ راج میں اعتدال
و استقلال نہیں، آثار چڑھاؤ مہبت ہے اسی وجہ سے اکثر حالات اعتدال میں یہ شعر
زبان پر جاری رہتا ہے۔

کہ نبو زرم پر سنگ کہ پائے غم غلظم
ساقیا مرج از من عالم جو اینہاست (صاحب)
و عافرمائیے کہ خدا صراطِ مستقیم پر چلائے اور ثبات قدم عطا فرمائے۔

س۔ دل سے دعا ہے۔ (حضرت والاہ کا دستور یہ تھا کہ پہلے دعا فرمادیتے تھے پھر اسکا اظہار قلم سے فرماتے تھے)

غ۔ میں نے اپنی حصول ملازمت کی کوشش کا بھی ذکر کیا تھا، بحمد اللہ میں امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو گیا اور منتخب کر لیا گیا، دعا فرمائیے کہ حصول دنیا مطمح نظر نہ بن جائے بلکہ اصل شے حاصل کرنے کی فکر ہمیشہ لگی رہے، (یہ تمیز بھی حضرت والاہ نہیں کی ایک نگاہ فیض اثر نے پیدا کر دی تھی،)

س۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا، اپنی طرف سے نیت درست رکھئے۔

غ۔ حضرت والا کی روانگی کے بعد مولانا سید عبداللہ صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا تھا اور شاید پھر چند روز بعد حاضر خدمت رہوں۔

س۔ میرا سلام اور میرے حسن خاتمہ و سلامتی ایمان کی دعا کی درخواست پیش کر دیجئے۔

غ۔ سنا تھا کہ مولانا تھا نوی ۷ سے خط و کتابت کا عام طرز یہی تھا اس لئے اسی کے مطابق لکھنے کی کوشش کی گئی ہے اگر کوئی بات ناگوار خاطر ہو تو پراٹے خدا معاف فرمائیے اور غلطیوں سے اذراہ عنایت مطلع فرمائیے۔ دعا کا طالب

غلام محمد

س۔ کوئی بات نہیں! والسلام

مکتوب (۲)

اب ہمت جو ہندھی تو پہلے سے زیادہ طول طویل عریضہ لکھ بھیجا اور جواب بھی دیا
ہی شافی ودانی ملا، خوب غور سے پڑھیئے

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۵ مئی ۱۹۴۴ء

مولانا نے محترم و محترم مدظلکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بے حد مشکور ہوں کہ حضرت والا نے اپنے شفقت آمیز اور گراں قدر نصائح
سے کمترین کو سرفراز فرمایا۔

س۔ از دینہ ضلع پٹنہ

انہیچھاں سلیمان غفر اللہلہ بہ محبوب درویشاں سعادتمند باشند۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزدور جو مزدوری کرتا ہے وہ اس پر شکر یہ کا مستحق نہیں کہ اس
نے تو اپنا فرض ہی ادا کیا۔ (سبحان اللہ کیا وعدہ آفریں جواب ہے اور منصب ارشاد کی
نراکت کا کیسا المینہ دار ہے

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بہاشت
غ۔ طبیب روحانی کے معیارات جو مولانا تھانویؒ نے "قصد السبیل" میں بیان فرمائے
ہیں، مطالعہ کرنے کی عزت حاصل ہوئی، لیکن تشفی نہ ہوئی۔ میری فہم ناقص میں ایک
طبیب حاذق یا "پیر کامل" کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا عکس ہونی
چاہیے، اس سے میری مراد یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں وہی توازن ہونا چاہیے جو
سیرتِ مقدسہ میں پایا جاتا ہے، یعنی "پیر کامل" اگر زہد و تقویٰ کے اعتبار سے افضل ہو
تو دوسری طرف اجتماعی اور ملی حقوق و فرائض سے بھی غافل نہ ہو اور اس طرح اسکے
انفرادی اور اجتماعی پہلو نہایت متوازن ہوں، آج اس معیار کی ہستیاں دکھائی
نہیں دیتیں، جو بھی دکھائی دیتا ہے ایک لحاظ سے اعلیٰ دوسرے اعتبار سے ناقص
ممکن ہے اس میں میری کوتاہ نظری کا دخل ہو، براہ کرم اس باب میں رہنمائی فرمائی جائے۔
س۔ حضرت والا (مولانا تھانویؒ) رحمۃ اللہ علیہ نے جو معیار بتائے ہیں وہ تمام تر حضرت
سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و محاسن ہی کو پیش نظر رکھ کر بتائے ہیں
چنانچہ ارشاد فرمایا کہ اس کے عقائد اور اعمال تمام تر شرع کے مطابق ہوں، تعبیر کا

فرق ہے آپ شرع کی جگہ اسوۂ رسول اللہ رکھ دیجئے، ایک ہی بات ہے، اجتماعی پہلو اگر شرع ہے تو وہ بھی اس میں آگیا، اور اگر مقصود موجودہ زمانہ کی موثل و پولیٹیکل تحریکات ہیں تو ان کی نسبت بھی وہی سوال ہے کہ کیا وہ شرع سے باہر ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو انفرادی و اجتماعی کوئی پہلو شرع کے دائرہ سے خارج نہیں۔

(سوال کا دوسرا جزو جواب طلب رہ گیا یا چھوڑ دیا گیا، لیکن اب خود اپنے پاس اس کا شافی جواب موجود ہے، وہ یہ ہے (۱) جامعیت کمال کسی نہیں بلکہ وہی ہے، اس لئے عدم جامعیت نقص نہیں بلکہ جامع شخصیت کی تلاش میں سرگردانی تصنیع اوقات ہے جس پہلو میں بھی کہیں کمال نظر آئے بشرطیکہ وہ کمال معیارِ شریعت پر پورا اترے، فوراً لائق تقلید ہے (۲) طریق اصلاح کا مدار مصلح کے اجتہاد پر ہے، اگر وہ اجتماعیت سے علی وجہ البصیرت گریز کر کے انفرادی تزکیہ میں مشغول ہے تو اس پر محض اس ایک وجہ سے عدم جامعیت کا لگانا اپنی ہی فہم کا قصور ہے)۔

دوسرے یہ کہ اگر ایک سے زیادہ ہستیاں ایسی ہوں جن کو ہم اپنا رہبر بنا سکیں لیکن عقل فیصلہ نہ کر سکے کہ کس کی اتباع کی جائے اور اس طرح تذبذب پیدا ہو تو کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟

اگر ایک سے زائد ہستیاں نظر کے سامنے ہوں تو غور کرنا چاہیے کہ دل کا میلان کس کی طرف زائد ہے اور کس سے اس کی عقیدہ مندی زیادہ ہے، اُسی کی صحبت اس کیلئے نافع ہوگی، جی چاہے تو استخارہ کر لیا جائے۔

ایک گزارش یہ ہے کہ نماز میں اکثر خیالات پرانگندہ رہتے ہیں، کبھی تو نماز میں دل لگتا ہے اور اکثر محض فرض کی ادائی ہو جاتی ہے اس لئے کوئی رہبری ایسی فرمائی جائے کہ لطف سے محروم نہ رہیں۔

نماز میں دل لگنا یا نہ لگنا اپنے اختیار کی بات نہیں اور جو چیز بندہ کی اختیاری نہیں وہ

اس کا مامور بھی نہیں۔ (یہ ذریعہ اصول ذہن میں محفوظ رہے تو بیسیوں اشکالات اور الجھنوں سے خود بخود نجات مل جائے) بندہ پر اپنی طرف سے دل لگانے کی کوشش ہے جو اختیار ہی ہے، جس طرح مریض کا کام دوا کا پینا ہے جو اس کے اختیار میں ہے، شفا کا حصول نہیں جو اس کے اختیار سے باہر ہے۔ نماز میں استغفار اور خشوع خضوع کے حصول کے لئے کوشش چاہیئے اور اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ معافی ادھیہ و سورۃ قرآنی جو پڑھے، اون پر نظر رہے اور ہر لفظ ارادہ سے نکلے، دوسری بات یہ ہے کہ توجہ کثرت دکر کا اہتمام رہے، اس سے انشاء اللہ تعالیٰ مطلوب حاصل ہوگا، یعنی یہ نسخہ ہے جس سے شفا کی امید ہے مگر شفا کا ہوجانا یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور بخشش کی بات ہے مگر جس طرح عادت الہی یہ جاری ہے کہ عموماً صحیح نسخہ کے استعمال کے بعد وہ شفا عنایت فرماتے ہیں، ایسے ہی اس طریقہ سے نماز میں استغفار و خضوع بفضلہ حاصل ہوجانا ہے اور اگر کوشش کے بعد بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ محدودی انشاء اللہ مضر نہیں، طمانیت رکھیں۔ لَا يَكُفُّ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسْعَهَا (سبحان اللہ اصول اور یقین نفع کو کس خوبی سے ذہن نشین کر دیا)۔

ع۔ آخری التجا یہ ہے کہ پانچ چھ برس سے میری حالت دائمی مریض کی سی ہو گئی ہے، ہاں جو علاج معالجہ اور اصول حفظانِ صحت کی پابندی کے اکثر کوئی نہ کوئی مرض لگا رہتا ہے، تو وہ استغفار بھی کیا کرتا ہوں (یہ بھی محض حضرت دالار کی لگاؤ کی کیا اثر کا ایک نتیجہ تھا کہ خود بخود توبہ و انابت کی توفیق ملی) مولانا بھی دعا فرمائیں تو اولیٰ ہے!

س۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کا ملکہ عنایت فرمائیں اور یہ دعا پڑھا کریں:
 اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَ دُنْیَایْ وَ فِیْ نَفْسِیْ
 وَ اَهْلِیْ وَ مَالِیْ (یہ حدیث دعا ہے)، اور اگر دعا بعینہ قبول نہ ہو تو مصلحت الہی پر صابر رہنا چاہیئے اور اس کو کفارہ سبّات کا ذریعہ جاننا چاہیئے۔

غ۔ حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب نے بھی حضرت والا کو سلام فرمایا ہے۔ فقط

دُعا کا طالب، غلام محمد

س۔ حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب کی خدمت یا سعادت میں اس پیغمبرِ نذیٰ کی طرف سے بھی سلام پہنچا دیں اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کہ میری بہتری اور محسنِ خاتمہ اور ترقی و تکمیل مدارجِ ایمان کے لئے دعا فرمائیں۔ ۴۔ جمادی الثانیہ ۱۳۷۸ھ (یہ الفاظ کس شانِ تواضع کا پتہ دے رہے ہیں جب کہ کہنے والے کے متعلق یہ بات متحقق ہے کہ وہ ذاتِ گرامی رسمی باتوں سے نفور اور سراپا صدق و اخلاص تھی)

مکتوب (۳)

غ۔ حیدرآباد۔

حضرت مولانا محمد منار ظلم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
حضرت والا کے شفقت آمیز جواب سے نہ صرف عزت افزائی ہوتی ہے بلکہ بڑی ہمت
افزائی بھی اور ذوقِ عمل میں تقویت محسوس ہونے لگتی ہے۔

س۔ اعظم گڑھ۔

از پیچمدان سلیمان بہ اثنی فی اللہ غلام محمد صاحب زادکم اللہ تعالیٰ توفیقاً۔
(السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ؛ عزت افزائی غیر مطلوب ہے حالانکہ کہنے بے بھراسی کو
مطلوب سمجھے ہوئے ہیں) عزت اصطلاح میں اس قدر و منزلت کو کہتے ہیں جو اس کو
ہم چشموں میں حاصل ہوتی ہے فقرائے خطوط سے ظالمین کی عزت افزائی غیر مقصود ہے
ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سعادت حاصل ہوئی (قربان اس اصلاحِ فکر و نظر کے) بہر حال آپ کو
اس پیچمدان کے خطوط سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں
جو آپ کو آپ کے حسنِ نیت اور اخلاص پر عطا ہوتے ہیں۔ اللہم زد فی زد (دیکھتے

جائیے کہ ہر جگہ اپنی ذات کی کیسی نفی ہے)

غ۔ کچھ عرصہ سے قلب کی کیفیت یہ ہے کہ بعض اوقات (خصوصاً بعد نماز مغرب) دل چاہتا ہے کہ خوب روؤں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب دور رہا ہے لیکن آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلتا، پھر خیال ہوتا ہے کہ کسی بزرگ سے سپٹ کر دل کی بھر اس نکالوں لیکن اس کا موقع بھی حاصل نہیں، ایسی صورت میں ویسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے اب خوب گھر آنے لیکن نہ تو برے اور نہ ہی کھلے اور جلس ہو جائے۔

س۔ یہ کیفیات بالکل صحیح ہیں (ایسی یقینی بات ایک شیخ محقق ہی کر سکتا ہے ورنہ رسمی پیروں کو حال و حال اور خود احوال کی صحت و عدم صحت کی تمیز کہاں، طے نہ ہر کہ سہر تر اشد قلندری دانہ) یہ کیفیات آثار میں انابت الی الحق کے گویا کہ اب زمین تیار ہے، اسی کو قلب منیب کہتے ہیں، آنکھوں سے آنسو پیکنا ضرور نہیں، دل کا رونا کافی ہے اور وہی مقصود ہے، بس اب تھوڑی ہمت درکار ہے استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ، پڑھائی کیجئے اور ہو سکے تو تہجد کی مداومت اختیار کیجئے، (کیا شفقت آمیز اور بہت افزا پیرایہ تلقین ہے!)

غ۔ الحمد للہ کہ اوائل رمضان سے نماز تہجد کا بھی اہتمام جاری ہے (یہ حضرت والاؒ کی عند اللہ مقبولیت کی دلیل ہے کہ ان سے تعلق کے بعد از خود ایک ایک عمل صالح کی امنگ دل میں پیدا ہوتی چلی گئی، اسی کو برکت شیخ سے تعبیر کرتے ہیں) بعض دفعہ اس میں ایک لطف بھی محسوس ہوتا ہے، حضرت والاؒ اس نماز کے مستحب طریقتہ ادائی سے آگاہ فرمائیں تو باعث الطاف نوازی ہو گا۔

س۔ خدا کا شکر کیجئے کہ رمضان میں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ اب شوال ذیقعدہ و ذیحجہ کو بھی رمضان بنائیے یعنی وہی تہجد پر مداومت، و درود کر کے آٹھ رکعتیں عشاء کے بعد سے وقت سحر تک کسی وقت (دا کیجئے اور دل میں تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں ہو رہی

میں، (یہ تصور ایک مسلم حقیقت کا باندھا جا رہا ہے تاکہ حقیقت تک جتنی پہنچ ہو سکے اس کو محسوس کر کے یقین کو کامل ترک کیا جائے خوب سمجھیے!) تہجد میں وہی تیسویں بالفعل پڑھنے جو عام نمازوں میں پڑھتے ہیں مگر احادیث و ادعیہ سے وہ تیسویں یاد کر لیجیے جو تہجد میں شروع قیام میں، رکوع و سجود میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔

غ۔ ملازمت کے سلسلہ میں آج کل جو ٹریننگ ہو رہی ہے (یہ اکاؤنٹس سروس کی ٹریننگ تھی) اس کے مضامین کی طرف طبیعت کا رجحان کبھی نہ تھا، سوچتا ہوں کہ چھوڑ دوں یہ سکن نقصان مایہ سے زیادہ شہادت ہمسایہ کا خیال تکلیف دہ ہے اور اس سے ذہنی خلفشار و مایوسی اس درجہ طاری ہے کہ نہ وہی کام انجام پاتا ہے نہ عبادت کی رغبت باقی حضرت والادعا فرمائیں کہ کسی طرح معاشی پریشانیاں رفع ہوں، سکون قلب میسر آئے اور جس طرف رجحان پیدا ہو چلا ہے اس میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔

س۔ اللہ تعالیٰ سے بدل دعا ہے کہ اپنے فضل و کرم سے آپ کو معاشی اطمینان عنایت فرمائیں اس کے لئے کوشش کرنا بھی ضرور ہے، طلب رزق حلال واجب ہے اور یہ بھی حسن نیت کے ساتھ عبادت ہے، عہ پر آگندہ روزی پر آگندہ دل سعودی جیسے تجربہ کار کا کہنا ہے کہ

شب جو عقد نماز می بندم چہ خورد باسد افسردم

غ۔ بعض دفعہ حضرت سید عبداللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں، حضرت والا کی اس سے متعلق کیا رائے ہے؟ اگر حضرت کی نظر میں یہاں اور بزرگ بھی ہوں جن کی خدمت میں حاضری مناسب و مفید ہو تو رہبری فرمائیں۔

س۔ صحبت تو تمام صالحین کی مفید ہے بشرطیکہ متبع سنت ہوں، حج تمتع نہ ہو گشتِ یافتہ، مگر ارشاد صرف ایک ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے، ورنہ انتشارِ مقاصد پیدا ہو کر ہر مقصد فوت ہو جائے گا، ہر ایک کی راہ الگ الگ ہے۔

غ۔ اس سے قبل حضرت والا نے جو دعا تحریر فرمائی تھی، اس کو پڑھ لیا کرتا ہوں مزید کوئی دعا تحریر

فرمادیں جس میں جسمانی و معاشی درستی کے ساتھ بطور خاص ارتقاءے روحانیت کی تہا ہو تو نوازش ہوگی، (یہ خواہش بھی اسی وقت تک ہے جب تک اپنے عیوب اپنی نظر میں نہیں آ جاتے، ورنہ پھر طلب مغفرت کے سوا اور کچھ مدد باقی نہیں رہ جاتا)۔

س۔ اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِيْ عَنْ سَوَالِكَ وَ اَنْزِلْ قِيَّتِيْ مِنْ عَيْنِكَ غَاثِكَ
بعد ہاتھ اٹھا کر خضوع و خشوع کے ساتھ دعا میں کہا کریں اور بار بار کہا کریں۔
غ۔ احوال لکھنے کے طرز میں کوئی بات ناگوار خاطر ہو تو حضرت معاف فرمائیں اور غلطی سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ کے لئے اس کا سد باب ہو سکے۔

س۔ کوئی حرج نہیں، قابل اصلاح امور پر میں خود گرفت کرتا ہوں۔
غ۔ حضرت والا اس احقر پر توجہ رکھیں اور اصلاح حال کے لئے دعا فرمائیں۔
س۔ اپنے نفس پر ہمیشہ محاسبہ رکھئے اور اس کے دوائی کی فہرست بنا کر ہر ایک کے ازالہ کے لئے تھوڑا تھوڑا مایہ دہ کیجئے۔ والسلام، سید سلیمان، ۲، ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ

مکتوب (۴)

غ۔ حیدر آباد دکن

۳ جولائی ۱۹۴۳ء

محترمی و محرمی مدظلکم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کچھ دن پہلے پتہ چلا تھا کہ حضرت والا کا مزاج ناساز تھا، اللہ تعالیٰ سے توقع ہے کہ اب طبیعت اچھی ہوگی۔

س۔ ندوہ۔ لکھنؤ

اش فی اللہ اسعہم اللہ تعالیٰ فی الدارین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا دالا نامہ مورخہ ۳ جولائی ۱۳۶۲ء آج یکم اکتوبر ۱۳۶۲ء کو ملا،

مدرسہ بند ہونے کے سبب سے یہ خط آپ کا یہاں پڑا رہا، کل شام کو مدرسہ آیا اور آج صبح خط ملا، الحمد للہ کہ یہ پچھداں قرین مافیت ہے۔

غ۔ لَا تَقْتُلُوا الْمَنَ يَفْتَنُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَلَمْ تَكُنْ مِنْ أَهْلِ الْاٰخِیَآءِ وَلَٰكُنْ لَا تَشْعُرُ ذٰلِكَ، اس آیت شریفہ میں "یقیناً" کا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ کیا اس کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے بھی داخل ہیں جو تلوار سے قتل تو نہیں ہوئے لیکن اگر موقع ملا تو حصولِ رضائے الہی میں اس سے ہرگز گریز نہ کرتے؟

س۔ جی نہیں، یہ آیت پاک صرف اہل حق و تعالٰیٰ کی سبیل اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جنہوں نے اپنی جان خدا کی راہ میں دے دی اور وہ مارے گئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر اوس مجاہد کو یہ آیت شامل ہوتی جو یہ نیت جہاد و فرائض واد میں شریک ہوا، مگر مارا نہ گیا، کہ اس کی نیت بھی اپنی جان دینے کی تھی لیکن اوس کو یہ سعادت و شہادت حاصل نہیں۔

غ۔ اولیاء اللہ کے مزارات مقدسہ پر کبھی کبھی حاضر ہونے کی مولانا تھانویؒ نے تلمیقین فرمائی ہے دیاقت طلب امر یہ ہے کہ ان بزرگوں سے استفادہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ براہ کرم ریزری فرمائی جائے۔

س۔ مقابر و مزارات پر عبرت پذیری کے لئے جانا درست ہے، اصحاب قبور صالحین سے استفادہ یہ ایسی سنی کہ اون پر جو رحمت الہی کی بارش ہو رہی ہے اوس سے (ایک نوع کا) نصیحا حاصل ہو جائے مگر اس کے لئے دائر کو اہل استعداد میں سے ہونا ضروری ہے ورنہ وہ مستفید نہ ہو سکے گا۔

غ۔ گذشتہ دو شنبہ (یعنی ۳ رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۴۲ء) ہمارے محبوب قائدِ مملکت (بہادر یا جنگ) کی رحلت سے سخت صدمہ پہنچا (اس وجہ کہ اپنی زندگی بھی ختم معلوم ہوتی تھی) نہ جالے اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے، بظاہر ہماری بدبختی ہی کے آثار دکھائی دیتے ہیں، خدا فضل کرے!

س۔ جی ہاں، مرحوم کی وفات کے سانحہ کا علم ہوا، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے اور مغفرت عطا فرمائے۔

غ۔ حضرت والا میری اصلاح کے لئے دعا فرمائیے۔ فقط

دعا کا طالب، غلام محمد

س۔ آپ کی اصلاح و ترقی کے لئے بدل دعا ہے۔

میرا مستقل پتہ اعظم گڑھ ہے۔ والسلام

یہ محمد اسد سلیمان شوال ۱۳۴۳ھ

مکتوب (۵)

غ۔ حیدر آباد دکن۔ یکم ذیحجہ ۱۳۶۳ھ

حضرت مولانا محمد منار ظلم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تقریباً تین ہفتہ قبل ایک احوال نامہ خدمت اقدس میں گزارش کیا تھا، لیکن اب تک جواب سے محروم ہے، غالباً وصول ہی نہ ہوا اور نہ جواب سے ضرور مشرف فرمایا جاتا، اگر وہ خط نہ ملا ہو تو اچھا ہی ہے کیونکہ اس میں بعض گستاخیاں تھیں جن کو وسوسہ قلبی کی بناء پر درج کیا تھا، الحمد للہ اب وہ مشکوک خود بخود رفع ہو چکے اور حضرت والا کی طرف کشش بڑھتی جا رہی ہے۔

س۔ اعظم گڑھ، ۸ ذیحجہ ۱۳۶۳ھ

اخی فی اللہ تعالیٰ دام سعدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

لے حضرت والا کے "تاثر کا اعانہ لگاتا ہوں تو" یاد رفتگان کے اوراق ملاحظہ ہوں! زیر عنوان "ایک بہادر مسلمان کی موت" نیز میری تالیف "حیات بہادر یا جنگ" شائع کردہ بہادر یا جنگ ایڈیٹری کراچی میں بھی حضرت اقدس کا یہ مضمون شامل ہے،

آپ کے ہر خط کا جواب جاچکا، شاید اب پہنچا ہو، گستاخی کی کوئی بات نہیں، نیت نیک اور صلح ہے تو کوئی حرج نہیں۔

غ۔ یہ سن کر مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ حضرت والا ماہ دسمبر میں رونق فرمائے حیدر آباد ہوئے ہیں، طے لے آمدنت باعث آبادی ماہ حضرت والا تاریخ آمد سے مطلع فرمائیں تو لوازش ہوگی۔

س۔ دسمبر کے آخر میں یا جنوری کے شروع میں انشاء اللہ تعالیٰ۔ اصل سفر مدداس کا ہے (اور اس کی عرض آل انڈیا ہسٹری کانفرنس میں شرکت تھی)۔

غ۔ تقریباً پندرہ روز کا عرصہ ہوتا ہے کہ نماز میں وہ سرور اور کیفیت پائی نہیں جاتی جو پہلے حاصل تھی، ہر چند خیالات کو جمع رکھنے کی کوشش کرتا ہوں پھر بھی کیسوی سے محروم رہتا ہوں، استغفار ہر خالی وقت میں پڑھا کرتا ہوں۔ عرض اپنی طرف سے برابر کوشش کرتے جا رہا ہوں، اللہ تعالیٰ مدد فرمائے حضرت والا دعا فرمائیں۔

س۔ اس ماہ میں ایسا ہوتا رہا ہے، اس کی کچھ فکر نہ کیجئے، یہ سرور و لذت ہمارے آپ کے اختیار کی چیز نہیں اور جو امور اختیاری نہیں ان کے درپے نہ ہوسکیے۔ از نکاب معصیت، صحبت نامہ اس اور غفلت نہ ہو۔ اس کا علاج استغفار کی کثرت ہے اور بہت نافع ہے۔

غ۔ پہلے خط میں (جو ضائع ہو گیا) ایک خواب کا ذکر تھا جس کو اب مہینہ سے زیادہ ہوا، بعد نماز تہجد سویا تھا کہ حضرت والا کو ایک پلنگ پر قبلہ رو کوٹ لیٹے دیکھا میں بھی قریب ہی رو برو بیٹھا تھا حضرت کی آنکھیں بالکل کھلی ہوئی اور احقر کے چہرہ پر حجبی ہوئی تھیں کچھ دیر دیکھ سکا پھر میں نے گردن جھکالی اور آنکھیں بند کر لیں، کچھ دیر بعد سر اٹھایا کہ آیا احقر اس طرف متوجہ ہیں؟ کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کے اور اس احقر کے درمیان ایک بانہ کی چارپائی حائل ہے اور حضرت والا کی نظریں اس میں سے برابر پڑ رہی ہیں۔ آنکھوں کی

کیفیت و جاہلیت میں کوئی فرق نہیں لیکن اب حضرت والا رحمہ اللہ کے چہرہ پر نہ ڈاڑھی ہے نہ
 موچہ، اس کے بعد میں سیدار ہو گیا۔۔۔۔۔ حضرت رحمہ اللہ سے محبت بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی
 س۔ خواب کو اہمیت نہ دیجئے، بس یوں سمجھیں کہ رحمت الہی متوجہ ہے اور اس سے فائدہ
 اٹھائیے لہ۔

وہ چشمِ محبت توجہ یانِ محبت ہے دیکھے تو ذرا کر کے اس کو کوئی یا لانا
 (یہ شعر خود حضرت والا رحمہ اللہ ہے)۔

غ۔ ایک اور طول طویل خواب۔

س۔ دل کا تعلق مسجد و نماز سے ہونا بشارت ہے۔ حدیث میں اس کی بشارت آئی ہے
 و قلبہ معلق بالصلوٰۃ (تعبیر خواب کو آیت قرآنی یا حدیث نبوی سے مؤید کر
 دکھانا حضرت والا رحمہ اللہ کا خاص مذاق تھا)۔

غ۔ کیا خواب واقعی کوئی اہمیت رکھتے ہیں؟

س۔ خواب کی اہمیت اسی قدر ہے کہ اگر وہ رویائے صادقہ ہے تو مبشرات میں سے ہے۔

غ۔ حضرت والا رحمہ اللہ میرے اصلاح حال کے لئے دعا فرمائیں۔ دیدار کا مشنظر
 غلام محمد

س۔ دل سے دعا ہے۔ ہسپراں سلیمان

لے اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اجمالی تعبیر پر دو درجہ سے ارتقا فرمایا گیا، ایک تو یہ کہ احقر کی توجہ عالم خواب سے ہٹ
 جائے اور دوسرے یہ کہ تفصیل میں اظہارِ کمال تھا جس کو حضرت والا رحمہ اللہ کی فتاویٰ گوارا ہیں نہ کہ ممکن تھی ورنہ پاپانی
 میں سے نظروں کا گذر کا احقر تک پہنچنا، صاف اشارہ ہے کہ فیضِ سلیمانی چاروں سلسلوں کی جامعیت لئے ہوئے
 جاری ہے، اسی طرح چہرہ مبارک کا ڈاڑھی موچہ سے صاف دکھائی دینا طالبِ پیغمبر کے رنگِ باطن کا اظہار
 ہے جو غلبہ توحید سے عبارت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت والا کا آخری سفر حیدر آباد دکن | جنوری ۱۹۴۵ء کی کوئی تاریخ ہوگی کہ حضرت والا دہلوی کا نفرین میں شرکت

فرما کہ مدرسہ سے حیدر آباد تشریف لائے، قیام وہی مولانا عبدالباقی صاحب ندوی کے مکان پر تھا، اس نیازمند کو حضرت والا کی آمد کا سخت انتظار تھا اور پروگرام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بڑا اضطراب رہتا تھا کہ نہ جانے کب تشریف لائیں، ایک روز بعد نماز عصر اسی حالت اضطراب و انتظار میں دعا کرتا تھا کہ یکا یک میرے دوست نے آکر آمد مبارکی نوید سنائی،۔۔۔ دل باغ باغ ہو گیا، اب یاد نہیں کہ فوراً اسی وقت یا دوسرے روز کسی وقت حضرت والا کی خدمت میں جا پہنچا، دیکھا کہ مولانا گیلانی اور میزبان محترم سے سفر مدرسہ کے کچھ حالات بیان ہو رہے ہیں اور بڑے ہی پر لطف پیرایہ میں، چنانچہ مولانا گیلانی سے جو حضرت را کے بے تکلف دوست بلکہ دور کے عزیز بھی ہوتے تھے، مسکراتے ہوئے فرمانے لگے "مولانا مدرسہ میں تو آپ کی تقریروں کا بڑا چرچا ہے، لوگ کہتے تھے کہ سمجھ میں تو خیر کچھ نہیں آتا مگر مولانا کی زبان فنی کی طرح چلتی ہے"۔۔۔۔۔ اس قند سلیمانی سے وہی محفوظ ہو سکتے ہیں جو مولانا گیلانی کی فصیح و بلیغ اور رواں دواں تقریریں سن چکے ہوں اور اس کا تصور مدرسہ اسی اور دواں طبقہ کے درمیان کر سکیں !

غرض یہ دلچسپ صحبت نماز مغرب کے لئے برخاست ہو گئی اور ہم سب پاس ہی مسجد اقصیٰ "میں آگئے، حضرت والا نے ادھر ادھر دیکھا، امام صاحب نظر نہ آئے، مولانا گیلانی سے مسکراتے ہوئے فرمایا "آج امام العلماء دکھائی نہیں دیتے؟" ایسے میں امام صاحب آپہنچے، اس روز سے ان کا نام "امام العلماء" پڑ گیا اور یہ ظریفانہ لقب اس لئے موزوں ہوا کہ حضرت گیلانی اور مولانا عبدالباقی ندوی مدظلہم جیسے جلیل القدر علماء ان امام صاحب کے مستقل مقدمہ کی تھے۔

ظرافت سلیمانی کے ایسے چند نمونے آج پہلی بار اپنی نظروں نے دیکھے اور دل شکر کر

معمور ہو گیا کہ بہادر یا جنگ مرحوم و مغفور کی سنجیدہ، ادب پرور اور ظرافت نواز محفل کی تلافی ہو گئی، اور بڑا اطمینان اس بات سے حاصل ہوا کہ ظرافت، دامن زہد کا دھبہ ہرگز نہیں! اب تک معاملہ کچھ ایسا رہا کہ طاعت کی رغبت بھی بڑھتی رہی اور علم دین کا شوق بھی۔ چنانچہ عمل میں نماز باجماعت کے علاوہ تہجد کا اہتمام

نقائص نامہ

اور علم میں حضرت تھانوی قدس سرہ کی تصانیف کے علاوہ اکابر علماء و صوفیاء کی کتابوں کا مطالعہ زور و شور سے ہوتا رہا۔ مگر اپنے عیوب سے اب بھی بالکل بے خبری تھی حالانکہ مسلک اشرفیہ میں رد اہل نفس پر نظر ادرآن کا اپنے شیخ سے معالجہ خود سالک کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ یقیناً صحبت شیخ کا کرشمہ تھا کہ اس مرتبہ کی چند ہی حاضر یوں میں احساس زیان بیدار ہو گیا اور اپنے عیوب سے پردہ اٹھنے لگا۔ ایک روز ایک پرچہ پر بعض عیوب ایک ایک دو دو لفظ میں لکھ دیئے اور "نقائص نامہ" کا عنوان لگا کر ان کو زبردستی شیخ میں پیش کر دیا من و عن مع جواب با صواب ملاحظہ ہو۔

رغ۔ قنوطی خیالات غالب ہلذا یا اس زیادہ آس کم!

س۔ مومن قانط (Pessimist) نہیں ہو سکتا، لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اور اندہ لایئاس من روح اللہ الا الکافرون۔ بظاہر جو یا س مومن پر ہوتی ہے وہ عدم ظہور اسباب سے ہے، تو خوب سمجھ لیجئے کہ مسبب الاسباب پر نظر ہو تو عدم ظہور اسباب سے دل پر قنوط راہ نہ پائے پس ہمیشہ فتوکل علی الحی الذی لا یموت پر نظر رکھئے، یہ کیفیت انشاء اللہ دور ہو جائے گی۔

رغ۔ حُبِ عزت و جاہ!

لے ان آیات کا حاصل یہ ہے کہ مال و سی کو ف کے مترادف ہے۔ ہمارے حضرت والاؒ کو "مالوس" اور "بقسمتی" کے الفاظ سے نفرت تھی اور مسلمان کی زبان سے ان الفاظ کو سننا گوارا نہ فرماتے تھے!

ہو تغاخر پیشِ نظر نہ ہو) دینی رفعت کی طلب مبارک مگر اوس کی طلب اوس کراستوں سے ہو (یعنی خواہشات نفسانی لوجہ اللہ فنا کر کے اور مرضیاتِ الہیہ کو مقصودِ عمل بنا کر) علوم دینی میں ترقی اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا۔
 س۔ علوم دینی میں ترقی کا خیال مبارک لیکن اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کا خیال دل سے نکال دیجئے!

اصلاح بننے کے بجائے مصلح بننے کی فکر موجودہ مسلمان کی ایک خام خیالی ہے، خواہ اس عیب کو ہنر سمجھنے کے لئے اس نے کتنے ہی دلفریب عنوانات تراش لئے ہوں صحت نتائج اگر صحت فکر کا معیار ہے تو دیکھ لیجئے کہ آج کی اس خام خیالی سے مسلم معاشرہ کس درجہ گرچکا ہے اور اُس وقت کس اوج پر تھا جب کہ ہر مسلمان کو اپنی اصلاح کا خیال (امنگیر تھا)!

ان دنوں حضرت تھانویؒ کے علاقے **خان بہادر محمد مظہر مرحوم کی میزبانی** بھائی خان بہادر محمد مظہر جو حکومت ہند میں بھی بڑے عہدہ پر رہ چکے تھے۔ کثیر "انوارِ رشوت ستانی" کی حیثیت سے حیدرآباد آئے اور جو ہل ہل پریم ولا "میں سرکاری طور پر مقیم تھے، مظہر صاحب مرحوم شرافت، ذہانت اور بذلہ سنجی میں فرو تھے۔ ادھر مولانا تھانویؒ سے ان کے مرتبہ نصاب تعلیم کی تکمیل بھی کی تھی، اس لئے ان کی دینی معلومات بھی معیار کی تھیں اور ذہانت و فطانت کی بناء پر اچھے اچھے علماء کو بھی گفتگو میں زیر کر جاتے تھے۔ ہمارے حضرت والاؒ سے مرحوم کو خاص محبت تھی اور بڑا احترام فرماتے تھے اور خود حضرتؒ کو بھی اُن کا پاس خاطر ملحوظ رہتا تھا۔

مظہر صاحب مرحوم کا بار بار اصرار رہا کہ حضرت والاؒ اُن کے گھر مقیم ہیں لیکن حضرت والاؒ نے ہمیشہ دو عذر ظاہر فرمائے، ایک تو یہ کہ وہاں مسجد کا قرب میسر نہ ہوگا اور دوسرے یہ کہ

احباب (مولانا گیلانی اور مولانا عبد الباقی مدظلہم) سے دوری رہے گی لیکن مظہر صاحب کہاں چھوڑنے والے تھے، فرمانے لگے کہ حضرت مع احباب کے وہاں تشریف لے چلیں، راستہ ان حضرات سے بھی مظہر صاحب نے فرمایا کہ وہ اس مخلصانہ دعوت کو رد نہ فرمائیں، اصرار کی اس انتہا پر اپنے احباب سے پندرہ دن کی اجازت چاہی اور جو بلی ہل تشریف لے گئے۔

”پیغمبرِ دلا“ کے ماحول کدہ میں ایک اہل اللہ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس کے آس پاس دور دور تک کوئی مسجد موجود نہ تھی، سرمایہ دار فیشن پرست طبقہ کے محلہ میں خدا پرستی کے آثار و علامات کی تلاش بے سود تھی البتہ جو بلی ہل کی سرحدی سڑک پر ایک مسجد ضرور تھی جو پکے راستہ سے کوئی میل بھر کی مسافت پر ہوگی۔ البتہ مظہر صاحب کی قیام گاہ سے ایک پگ ڈنڈی کوئی دو فرلانگ لائبریری وہاں تک پہنچتی تھی، حضرت والا کو دیکھا کہ باوجود ریائی تکلیف اور خرابی صحت کے اکثر نماز کے لئے اسی راستہ سے مسجد جاتے آتے تھے، خدا کی شان کہ وہ پگ ڈنڈی جو مفلسوں اور ناداروں کی پامالی کا نشان تھی ایک فقیر اہل اللہ کے قدم سے مشرف ہو کر بہت دیر بیت کا خطا حل بن گئی!

جناب مظہر صاحب کے ہاں جتنے دن قیام رہا، عصر سے بعد مغرب تک کا وقت بڑا قیمتی اور پرکٹف رہتا تھا، مولانا گیلانی اور مولانا عبد الباقی صاحب تو روزانہ ہی تشریف لاتے تھے، ان کے علاوہ اور بھی چند قدر شناس جن میں پروفیسر غلام دستگیر شیدا و دان کے دوست خواجہ محمد امجدناظم اعداد و شمار خاص تھے، جمع ہو جاتے تھے،

ان محفلوں میں باتوں باتوں میں علمی گفتیاں سلجھ جاتی تھیں اور کتنے عارفانہ مفقودے حل ہو جاتے تھے، تقریر اور خبر و نشر کے مسئلہ کی سلیس و تشفی بخش توجیہ پہلی مرتبہ کانوں نے نہیں سنی، ذوق و شوق کا درجہ اودان کی حیثیت کا صحیح ادراک یہیں حاصل ہوا، سنت میں شائستگی اور حسنِ سلیقہ کا حوالہ اعلیٰ معیار موجود ہے اس کا درس بھی یہیں نہایت لطیف انداز میں ملا۔ اب ان محفلوں کو یاد کر کے افسوس ہوتا ہے کہ ان کی روزانہ کی روداد کیوں محفوظ نہ

کر لی گئی؟ اب اپنا حافظہ ایسا کہاں کہ اس کے بل بوتے پر یقین کے ساتھ وہ تفصیلات دہرائی جاسکیں!

خادم نوازی | اسی دوران قیام میں ایک بار حضرت والدہ نے راقم کے غریب خانہ پر تشریف لاکر رحمتِ طعماً گوارا فرمائی تھی، اور حضرت ہی کے ایمان سے ہماری درخواست پر حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب مدظلہ نے بھی اس دعوت میں شرکت قبول فرمائی تھی، دونوں بزرگوں نے نماز مغرب ہماری ہی مسجد میں ادا فرمائی اور پھر غریب خانہ پر رونق افروز ہوئے، واقعہً دونوں ایک جگہ جمع نظر آ رہے تھے، اخلاص و محبت، پاک و ولایت کے یہ دو پیکرِ حقینی دیر رونق فرما رہے اہل خانہ کے دل نے عجیب کیف و سرور اور ایمانی برکت و ملاوت پائی۔

جی تو چاہتا تھا کہ ایسی سعادتیں بار بار حاصل ہوتی رہیں مگر حضرت والدہ کی رحمت کے خیال سے عرضِ مکرر کی جرات نہ ہو سکی البتہ ایک متبادل صورت ذہن میں آئی کہ کسی روز ماحضر خود حضرت کی قیام گاہ ہی پر پہنچا دیا جائے چنانچہ اس کی اجازت طلب کی گئی جس کو حضرت والدہ اور محترم مظہر صاحب نے یہ طیب خاطر قبول فرمایا اور رات ہی کے کھانے پر بات ٹھہری، یہ موقع بھی بڑا دلچسپ رہا، دسترخوان پر مظہر مرحوم اور حضرت والدہ میر لطف و ظرافت چلتے رہے، اپنی توجہ چونکہ تمام تر ذاتِ سلیمانی پر مرکوز تھی اس لئے مرحوم مظہر صاحب کا ایک لطیفہ بھی اس وقت یاد نہیں البتہ حضرت والدہ کا ایک ظریفانہ فقرہ ناقابلِ فراموش ہے۔۔۔۔۔ کھانے کے بعد کافی کا اہتمام تھا، خود حضرت نے اپنے دستِ مبارک سے ایک پیالی بنا کر مظہر صاحب کو عنایت فرمائی اور پھر دوسری پیالی اس خادم کے لئے بنا رہے تھے، چونکہ کافی میرے مزاج میں فوراً خشکی کا اثر پیدا کرتا ہے اس لئے جیسے ہی نصف پیالی بھر چکی میری زبان سے اضطرابِ آید جملہ نکلا کہ ”حضرت کافی ہے!“ اس پر حضرت والدہ نے کمالِ ظرافت سے فرمایا، ”میں کب کہہ رہا ہوں کہ

چائے ہے!“ اور پیالی بھر دی!

حیدر آباد دکن میں ایک شہتی بزرگ حضرت
ایک خدامت بزرگ سے ملاقات مولانا محمد حسین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) بھی

تھے جن کے فیض یافتوں میں مشہور و معروف ہستیاں مولانا گیلانی، محمد ایاس برنی، سرخوڑ اور
 ڈاکٹر میر ولی الدین (صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ) کی ہیں۔ حضرت موصوف مسئلہ وحدۃ الوجود کے
 بہترین شارح اور صحیح ترین ترجمان تھے، جب وہ اس مسئلہ کو بیان فرماتے تو خود ان کا حال اس
 کی تائید و تصدیق پیش کرتا تھا، دراصل ان کا قال محبوبی حال کا نتیجہ تھا۔

عابد بنو برسر آتش میسرم کہ نجوشم (منصور علاج)

دوسری خاص بات رحمت حق پران کا ایقان کامل تھا جس کے اثر سے ان کے
 صحبت یافتہ رجاسے معور ہو جاتے تھے، مظہر صاحب مرحوم ان سے مل کر بہت متاثر ہو چکے
 تھے، ایک شام حضرت والدہ سے فرمانے لگے کہ ”جی چاہے تو کچھ دیر کے لئے حضرت محمد حسین
 صاحب کے پاس چلیں“۔ حضرت نے آمادگی ظاہر کی اور اس خادم کو بھی ساتھ چلنے کا اذن ہوا،
 ہم تینوں غلام محمود قریشی مرحوم (سابق وزیر مالگوادی حکومت حیدر آباد) کی قیام گاہ پر پہنچے، جہاں
 کچھ عرصہ سے مولانا مقیم تھے، یہ زمانہ ان کی علالت کا تھا اور صاحب فرارش تھے، حضرت رشیدی
 کو آتا دیکھ کر مولانا اٹھ بیٹھے، سلام و مصافحہ کے ساتھ ہی توحید باری اور ربط خالق و مخلوق پر
 اپنے انداز کی تقریر شروع فرمادی جو تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی۔ میں حیران کہ
 نہ تو حضرت کی غیریت دریافت کی نہ یہ پوچھا کہ کب آنا ہوا، بس اپنا ساز چھڑ دیا۔
 مگر جب تقریر ختم فرمائی تو کمال تواضع سے فرمایا:-

”میں نے آپ کے سامنے یہ تقریر اس لئے دہرا دی کہ اس میں کوئی سقم ہو تو وہ معلوم

ہو جائے۔“

حضرت والدہ نے پاس ادب سے فرمایا کہ

”تقریر کا مکمل و مکمل تھی“

اس تصدیق سے مولانا محمد حسین صاحب کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا اور زبان سے ”الحمد للہ“ کی صدا بھی نکلی۔۔۔۔۔ اس ضروری گفتگو کے بعد اب میزبان نے مہمان کی خیریت وغیرہ پوچھی، جس پر اس علوم و جہول کو یاد آ گیا کہ صحابہ کرامؓ کا یہی طریقہ تھا کہ پہلے دین و ایمان کی بات کر لیتے اور پھر ظاہری خیر خیریت معلوم فرما لیتے تھے۔

اس کے بعد ذکر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا آ گیا، حضرت محمد حسین صاحب نے بڑی قوت سے فرمایا کہ ”وہ اس صدی کے مجدد تھے“ یہ صحبت بابرکت نماز مغرب کا وقت قریب ہونے کی وجہ سے برخاست ہو گئی اور صحبت آخر ثابت ہوئی کیونکہ اس کے پندرہ بیس روز بعد پھر یہ توحید کا متوالا بارگاہِ اصریت میں جا پہنچا، رحمۃ اللہ تعالیٰ شیخ اکبر قدس سرہ کے مسلک کا ایسا ترجمان جس کا قال و حال ایک ہو پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

مذکورہ واقعہ میں مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادیؒ کی کمال بے نفسی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آج جس ہستی سے وہ اپنی تقریر کی تصدیق پر شکر ادا کر رہے تھے وہ پہلے طالب کی حیثیت میں خود انہی کے سامنے آچکی تھی!!۔۔۔۔۔ یہ بے نفسی اربابِ احسان (نصوف) ہی کا حصہ ہے!

ان دنوں حیدر آباد میں جماعت اسلامی کی شاخ قائم ہو چکی تھی اور ایک اصرار بے جا اس کے صدر (قیم) اپنے ہی ایک ملاقاتی تھے، محکمہ تعمیرات کے سب اور سیر، جوان عمر، جذباتی، معمولی تعلیم یافتہ البتہ جماعتی لٹریچر کے فارغ التحصیل! ایک شام بعض احباب کے ساتھ حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر تھا کہ انہوں نے اپنے نام کا کارڈ بھجوایا، حضرتؒ نے احقر سے پوچھا کہ ”آپ ان صاحب کو جانتے ہیں“ میں نے اقرار کیا تو فرمایا کہ اس سے پہلے بھی یہ تشریف لائے تھے اور کافی دیر تک اصرار کرتے رہے کہ میں جماعت اسلامی میں شریک ہو جاؤں، آج پھر آئے ہیں میں ابھی ان سے نمٹ آتا ہوں،

یہ فرما کر حضرت اٹھے، داعیِ جماعت سے تنہائی میں چند منٹ گفتگو فرمائی جس کے بعد وہ چلے گئے، حضرت والا نے واپس آ کر ہم لوگوں سے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ پہلی ملاقات میں میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر بات ان کی سمجھ ہی میں نہ آئی تھی، آج صاف انکار کر دیا، اب وہ نہ آئیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ پھر وہ ایسے خفا ہو گئے کہ دوبارہ نہ آئے، اس سے پہلے وہ اسی دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے دیدہ و رقائد بہادر یا دریا جنگ مرحوم سے بھی ناراض ہو چکے تھے!

یہاں دیکھنے کی چیز ایک طرف صوفیانہ مذاق کی پاکیزگی اور شائستگی ہے جو پہلے واقعہ میں پیش کی جا چکی اور دوسری طرف جماعتی مزاج کی شدت اور اس کا بگاڑ ہے جو اس واقعہ سے ظاہر ہے، یوں گنانے اگر بیٹھے تو سیڑیوں کی واقعات کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے چنانچہ یہ سن کر ذرا بھی حیرت نہ ہونی چاہیے کہ حضرت والا جب کراچی تشریف لائے تو ”دعوتِ صالحیت“ کی یہ تبلیغ جماعت اسلامی کے شاعرِ مآب کے حصہ میں آئی اور وہ وقتاً فوقتاً یہ فریضہ پورے جوش و خروش سے اچھل کر محلِ کربے قابو ہو کر انجام دیتے رہے اور چاہیے تو یہ تھا کہ بار بار کی ناکامی کے بعد وہ بھی حضرت سے قطعِ تعلق کر لیتے مگر یہاں شاعر کا طبع لہجہ اور مزاج کی فطری چمک جماعت کے عاریتی تقشف سے ٹوٹ نہ سکی اور بلاشبہ حضرت والا کا علم و ذہن بھی فصل میں وصل پیدا کرتا رہا۔

اب ٹھیک یاد تو نہیں نہ اس وقت یادداشت کا اہتمام تھا البتہ خیال یہ ہے کہ مہینہ بھر کے قیام کے بعد حضرت والا نے اعظم گڑھ تشریف لے گئے اور یہ سفر حیدرآباد کا آخری سفر ثابت ہوا۔

مکتوب (۶)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۰ مارچ ۱۹۲۵ء

حضرت مولانا دُخرو منادامت برکاتکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
 اُمید ہے کہ اب حضرت والا بہ صحت و عافیت ہوں گے، حضرت کے دورانِ قیام حیدرآباد
 میں احقر سے جو گستاخیاں ہوئی ہوں اور وہ شفقتِ معاف فرمائیں، اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل
 ہوا کہ حضرت والا کی صحبت کیمیا اثر سے بقدر حوصلہ استفادہ کی سعادت حاصل ہو گئی، حق تو
 یہ ہے کہ حضور کی محفل میں آنکھیں کھلتی جاتی تھیں اور سر جھکنا آنا تھا۔
 دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ عملِ صالح کی توفیق احقر کو عطا فرمائیں!

س۔ اعظم گڑھ

انخی فی اللہ ادام اللہ رشدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
 الحمد للہ کہ میں آٹھ روز بھوپال، چار روز لکھنؤ اور دھروڑ جو پورٹھہر کہ ۱۵ مارچ کو اعظم گڑھ
 پہنچ گیا، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق عطا فرمائیں، یہ جو کچھ ہے آپ کی محبت کا ثمرہ ہے
 اللہ تعالیٰ طرفین کو اس سے بہرہ ور فرمائیں، دل دعا ہے کہ عملِ صالح اور مسلمِ نافع کی
 توفیق بخشیں!

غ۔ عرض یہ ہے کہ کون سے درود شریف کا درود افضل ہے؟

س۔ درودِ ماثورہ کا ثواب زیادہ ہے جو نماز میں پڑھتے ہیں، مگر بطورِ معالجہ کے حضرات اکابر
 نے مختلف کلمات درود کے بنائے ہیں، عام طور سے ہمارے حضرت (مولانا تھانوی
 قدس سرہ) یہ درود پڑھتے تھے۔

اللہ صلی وسلم علی سیدنا و مولانا محمد و علیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

غ۔ چند روز پہلے ایک تقریر میں مولانا مناظر (حسن صاحب گیلانی نے) اَنَّ الْأَصْحَابَ
يُرْتَضَوْنَ عِبَادِي الصَّالِحِينَ کی توضیح میں فرمایا کہ ”صالحون“ سے مراد وہ اصحاب ہیں
جن کو اصطلاح صوفیاء میں ”اہل خدمت“ کہا جاتا ہے کیا یہ درست ہے؟
کیا صوفیاء کے ہاں جو مراتب و مناصب کی تقسیم ہے (مثلاً قطب، ابدال، اقام وغیرہ)
اس کا ثبوت قرآن و حدیث سے ملتا ہے؟

س۔ ان مراتب کا ذکر بعض ضعیف احادیث میں ہے، مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس سے
کتب تفسیر خالی ہیں۔

غ۔ بعض اہل علم (ایک صاحب تھے دیوبند کے فارغ التحصیل اودالہ آباد کے کسی نقشبندی
بزرگ کے فیض یافتہ) سے یہاں یہ بھی پتہ چلا کہ ان ”صاحب خدمت“ افراد کو اختیار بھی
ہوتا ہے کسی کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیں یا کسی کی تکلیف رفع کر دیں، اسی عقیدہ کے
تحت بعض لوگ ان اصحاب کی تلاش میں لگے رہتے ہیں تاکہ ان سے اپنی تکالیف کا
انزالہ کرائیں۔ یہ بات احقر کی سمجھ میں نہ آئی کہ حق تعالیٰ کے سوا بھی کسی
کو نفع و ضرر کا اختیار ہو سکتا ہے (حضرت، والا در سے درخواست ہے کہ اس باب میں
دیوبندی فرمائیں۔

س۔ مجھے اُن اہل علم کے ان خیالات سے اتفاق نہیں اور نہ نصوص سے ان کی تائید ہوتی
ہے البتہ حضرت خضرؑ کے واقعہ سے جو قرآن پاک میں ہے یہ ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ
اور مومنین میں بھی بعض اشخاص کو اپنے لئے بمنزلہ آلہ کے استعمال فرماتا ہے مگر یہ کہ ہمیشہ
ایسا ہوتا ہے اس کا علم مجھے نہیں۔ اودا اگر ہوں بھی تو وہ مختار نہیں بلکہ محکوم الہی
ہوتے ہیں اپنی مرضی اور اختیار سے کچھ نہیں کر سکتے،

غ۔ غرابی صحت کی وجہ سے احقر نماز تہجد بعد نماز عشاء ہی ادا کر رہا ہے اس طرح کہ فرض و
سنت و نفل کے بعد اٹھ رکعت نماز تہجد پڑھ کر واجب الوتر ادا کرتا ہوں، اس میں

کوئی قباحت ہو تو اصلاح کی درخواست ہے نیز حضرت والدہ ماجدہ بھی فرمائیں۔ ممنون ہوں گا اگر کوئی دُعا اس ضمن میں (یعنی حصول صحت کے لئے) تحریر فرمائیں۔

س۔ سر دست یہ عمل مناسب ہے، مناجاتِ مقبول اسے کوئی مناسب دُعا یاد کر لی جائے۔
غ۔ ”حیوۃ المسلمین“ (مصنفہ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) باب ”امتیاز قومی“ (روح بست و پنجم) کے ضمن میں حضرت تھانویؒ نے ایک حدیث شریف نقل فرمائی ہے جو درج ذیل ہے:

”حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کو عرب کے لہجہ اور آوازیں پڑھو اور اپنے کو اہل عشق کے لہجہ سے اور دونوں اہل کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) کے لہجہ سے بچاؤ۔“

اس میں ”اہل عشق کے لہجہ“ سے کیا مراد ہے۔ حضرت تھانویؒ نے وضاحت نہیں فرمائی ہے!

س۔ اہل عشق کے لہجہ سے مراد گانے کے قاعدہ سے پڑھنے کے ہوں گے۔
ابعد کو فنِ تجوید و قرأت کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ قاریوں کے ہاں ایک لحن ”عُشَاقِی“ بھی ہے جس میں لب دلہب بالکل عاشقانہ سوز و گداز کا اختیار کیا جاتا ہے اور بالعموم سورہ یوسف ”عُشَاقِی لحن“ میں پڑھی جاتی ہے، شاید یہ ممنوع ہو۔

غ۔ حضرت والا احقر کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے دُعا فرمائیں۔
س۔ دلی دُعا ہے۔ والسلام یہ خدا کا سلام ہے۔

مکتوب (۷)

غ۔ حیدر آباد دکن

حضرت مولانا محمد و مناد ام السلفہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض حال یہ ہے کہ زمینہ یا کھجس روز کے بعد ہفتہ عشرہ کا ایک ایسا دور آتا ہے جس میں کسی قسم کی عبادت میں کوئی دہیسی باقی نہیں رہتی، گو دلچسپی یا لذت مقصود نہیں لیکن اس کے بغیر وہ اشتیاق باقی نہیں رہتا جو ایک بندہ کو اپنے رب کی بندگی میں ہونا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز میں کبھی انتشار خاطر رہتا ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ پہلی رکعت میں کون سی سورۃ پڑھی گئی تھی، جب اس طرح کی نماز ہوتی ہے تو ہمیشہ شریف کی روشنی میں صدقہ مددگار ہی ہوتا ہے کہ فرشتوں نے اس بے حضور نماز کو منہ پر دے مارا ہوگا، اس خرابی کا تدارک کیوں کر کیا جائے؟

س۔ اعظم گدھ

۳۰ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ

الحی فی اللہ ارشدکم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایسا بے شک ہوتا رہتا ہے، اگر ایسا پیش نہ آیا کرے تو خضوع و خشوع کی حقیقت کیوں کر ظاہر ہو اور اس کی قدر کیوں کر ہو؟ بضد ہا تبیین الاشیاء صحت کی قدر عمل کو علامت ہی سے ہو سکتی ہے، شکم سیری کی قدر بھوک ہی سے ہو سکتی ہے، حالت کی یکسانی میں شے کی قدر چلی جاتی ہے اس لئے یہ تغیر احوال بن اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس پر بھی شکر کیجئے اور سمجھیے کہ یہ امور غیر اختیاریہ میں سے ہے، مولیٰ جل شانہ کی عطا ہے جب وہ دے قبول کیجئے اور نہ دے تو گلہ نہ کیجئے، اس پر جو غم ہوتا ہے وہ بھی ثواب کا موجب ہے کہ ہے

بر دل سالک ہزاراں غم بود گرد بارغ دل خلائے کم بود

اس احساس کی اور غم پر مبارک باد قبول کیجئے۔

دیہ کمال ہے شیخ محقق کا کہ سالک کو کبھی مایوس ہونے نہ دے اور اس کے راہ کے ہر کانٹے کو گل و گلزار بنانا چلا جائے، قبول عارف رومیؒ

زال کہ او پر خاد را گلشن کند دیدہ ہر کو را روشن کند

غ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نماز ایسی پڑھی جائے گویا بندہ اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم اتنا تو ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں، شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ نماز میں آخر انزک صورت پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی اس وقت جب کہ خضوع و خشوع حاصل رہتا ہے لہذا اس کیفیت کے دوام کی صورت سے مطلق فرمایا جائے تاکہ نماز میں کم از کم یہی تصور متحضر رہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں!

س۔ حدیث مذکورہ کا جو ترجمہ آپ نے لکھا ہے وہ عام طور سے زیادہ مشہور ہے مگر غلط ہے صحیح یوں ہے "اللہ کی عبادت ایسی کرو کہ گویا تم اس سے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔"

اب خواہ ہم بادشاہ کو دیکھ رہے ہیں یا وہ ہم کو دیکھ رہا ہے، دونوں کا حاصل ایک ہے کہ ہم اپنی نماز کو پورے خضوع، آداب اور انہماک کے ساتھ ادا کریں۔

نماز کے الفاظ یا معنی پر نظر رہنے سے حضور ہو جاتا ہے اور یوں سمجھئے کہ لفظ اللہ آپ کے قلب پر لکھا ہوا ہے اور دھ خیال جمائے رکھئے۔

غ۔ اگر حضرت والا مناسب تصور فرمائیں تو کسی ذکر کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

یہ شیخ قدس سرہ کا کمال تھا کہ ان کے اثر فیض سے پہلے خود اپنے قلب میں حصول نیکی کا داعیہ پیدا ہو جاتا تھا اور پھر حضرت شیخ اس کے مناسب تلقین فرماتے تھے، یاد نہیں کہ کبھی حضرت والا نے کوئی نصیحت و موعظت فرمائی ہو جس کے لئے اپنے قلب میں پہلے ہی سے آمادگی ہی نہیں بلکہ اضطراب و تشنگی پیدا نہ تھی!

س۔ اگر فرصت ہو تو کسی خاص وقت میں یہ پابندی کم از کم تین ہزار بار اللہ اللہ

لے لے کے الفاظ حدیث اس کے مؤید نہیں گاں "کا لفظ ارشاد نبوی کے جزو اول و آخر میں مشہور و مشہ

کا ملاحظہ کیا گئے ہوئے ہے حاصل دونوں کا ایک ہے!!

لئے ذریعہ بنائیں۔

(ایک نکتہ خوب سمجھنے اور یاد رکھنے کا ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی بندہ کو رزقِ فراوان عطا کرتے ہیں تو اس کا مشناہ محض یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنی صفت و رزاقی کا ذریعہ بنائیں یعنی دوسروں کو ملے مگر اس بندہ کے ہاتھ سے! پس یہی شرف مقصود ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ بندہ خود اس مال و دولت پر خزانہ کا سانپ بن کر بیٹھ رہے! سرمایہ داری و انٹر ایکٹ کی آویزش اسی فرق کو بھولنے سے پیدا ہو جاتی ہے!)

غ۔ معاشِ مایوسیوں سے بعض دفع شیطان وساوس میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن حضو کی دُعا و توجہ کی برکت سے نہ صرف یہ خیالات باطل جلد رفع ہو جاتے ہیں بلکہ ان پر بعد میں ہنس آتی ہے اور اپنے نفس کو یہ کہہ کر دھتکار دیتا ہوں کہ

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟
حضو چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ استقامت دیں اور اس قسم کی پریشانیوں کو کچھ اثر نہ کر سکے بلکہ اللہ تعالیٰ ان آدمیوں سے کمزور مندوں کو محفوظ رکھے!

س۔ الحمد للہ کہ آپ شیطان کے ان دوسروں سے محفوظ رہتے ہیں، آئندہ بھی اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو رزق بھی دیں اور کشائش بھی فرمائیں حصولِ رزق کے لئے بہتر ہے کہ آپ یا دھتکاب روزانہ وقتِ مقررہ پر پانچ سو بار پڑھتے رہیں اور شروع و اخیر میں کوئی درود۔

غ۔ کچھ علالت کے سبب سے ذکر کا آواز نہ کر سکا، دو تین روز میں شروع کر دوں گا اور انشاء اللہ حسبِ الحکم بہا بندی وقتِ جاری رکھوں گا۔

س۔ اللہ تعالیٰ بہا بندی سے ذکر کی توفیق بخشیں۔ ولہذا کہ اللہ اکبر۔

۱۔ ان اوقاتِ عارفانہ تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو مکتوب ۸۵،

مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ زیر مطالعہ ہیں، جتنے خطوط نظر سے گزرے ان سے یہ اثر ہوا کہ واقعی سلسلہ نقشبندیہ میں کس قدر اتباع شریعت ہے اور ان کا تصوف عجیب افکار کی آمیزش سے کس قدر منزہ ہے لیکن ساتھ ہی آج کل کے حالات پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس سلسلہ میں بھی بدعات نے سموغ حاصل کر لیا ہے اور اگر اس کی صحیح آب و تاب کہیں نظر آتی ہے تو وہ حضرت حکیم الامتؒ ہی کے سلسلہ میں ہے یہ چیز احقر کے لئے بڑی ہی طمانیت کا باعث بنی کیونکہ احقر کا طبعی رجحان کچھ سلسلہ نقشبندیہ (مجددیہ) کی طرف تھا، ممکن ہے کہ والدین کے اثرات کی وجہ سے ہوا۔
 س۔ صحیح ہے، مگر افسوس ہے کہ مجددیوں میں بھی مختلف بدعات نے راہ پالی، حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر بھی بچتہ کر دی گئی اور چادر و غلاف کا بھی اضافہ ہوا،
 حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نقشبندی و چشتی کا سنگم ہے، ذوق و شوق چشتی ہے اور اتباع کا ذوق نقشبندی ہے، حضرت حاجی صاحب (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ) دونوں سلسلوں کے مخزن تھے (حضرت مولانا نصیر الدین مجددی دہلوی سے سلسلہ نقشبندیہ میں اور حضرت میاجی نور محمد صاحب سے سلسلہ چشتیہ میں خلافت سے ممتاز تھے)، اور اسی لئے ہمارے ہاں چاروں سلسلوں میں ایک ساتھ بیعت ہوتی ہے!

غ۔ احقر کے پاس مکتوبات مذکورہ کا جو نسخہ موجود ہے اس میں حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح بھی دی گئی ہے مترجم و سوانح نگار کوئی عالم الدین صاحب نقشبندی ہیں اور کتاب نول کشور پریس سے چھپی ہے، سوانح نگار نے "حضرت" کے مخصوص کمالات کے زیر عنوان یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ آپ کے فیض سے اہل قبور بھی مستفید ہو کر ولی ہو گئے، ایک شخص نے لے جو حضرت مولانا شاہ محمد رفیع قدس سرہ کے خلیفہ تھے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "امداد المشتاق" مواہد حیات تھا نوری۔

دم اخیر یہ وصیت کی کہ میرا جنازہ آپ کی خدمت میں لے جا کر پیش کرنا جب جنازہ لایا گیا تو آپ نے توجہ دی، مُردہ کا دل جاری ہو گیا، اسی شب اس کے اقربا نے اس کی کیفیت کو خواب میں دیکھا۔۔۔۔۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مرنے کے بعد بھی اس طرح ملازم میں ترقی ہو سکتی ہے؟ کیا اس قسم کی باتیں حضرت مجدد صاحب سے متعلق درست ہیں؟

س۔ اس قسم کی حکایات غیر مستند ہیں، موت کے بعد عمل نہیں!!

غ۔ کیا حلقہ ذکر درست ہے؟ کیا حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں بھی یہ طریقہ رائج تھا، متقدمین صوفیاء کے ہاں تو یہ چیز ہر سلسلہ میں ملتی ہے!

س۔ ذکر بالجماہ کا دستور ہمارے ہاں نہیں، اس میں ریا اور دوسری خرابیاں ہوتی ہیں۔

غ۔ آخر میں پھر وہی درخواست ہے کہ حضور استقامت فی الدین کے لئے دعا فرمائیں، نیز دنیوی فلاح و کشائشِ رزق کے لئے بھی۔۔۔۔۔ احقر کو یقین ہے کہ اگر دنیوی و آخری سعادیں کچھ حاصل ہوں گی تو وہ حضور کی دُعاؤں ہی کی برکت سے ہوں گی۔ فقط دُعا کا امیدوار، غلام محمد عقی عنہ

س۔ دل سے دُعا ہے۔

بیچران سلیمان

مکتوب (۹)

غ۔ حیدر آباد کن

۹ جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ

لے یعنی ان خرابیوں کے پیش نظر حضرت حکیم الامتؒ نے ذکر بالجماہ کو ترک فرمادیا۔ کوئی شیخ محقق اس طریقہ کی نافییت کو محسوس کر کے اس کو اب بھی احتیاط سے اختیار کرتا ہے تو بخیر نہ کرنی چاہیے کیونکہ مسئلہ منصوص نہیں بلکہ مجتہد فیہ ہے!

حضرت مولانا محمد وسام فیوضہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
 "نہین روز ہوئے کہ ذکر اللہ، اللہ" اور "یا وہاب" بعد نماز فجر حسب ارشاد مین ہزار اور پانچ
 سو مرتبہ علی الترتیب شروع کر چکا ہوں، استقامت کے لئے حضرت والادما فرمائیں۔
 س۔ میرٹھ۔ کوٹھی سید حسین صاحب

۱۹ ج ۲ ۳۶۴ھ

اے العزیز زاد کم اللہ تعالیٰ علما و علما۔

دل سے استقامت کی دعا ہے!

غ۔ دوران ذکر لفظ اللہ کا قلب پر تصور قائم نہیں رہتا، کچھ دیر کے لئے تصور قائم ہوتا ہے،
 اور پھر ناپید ہو جاتا ہے اس کے قیام کی صورت سے ایما فرمائیں۔

س۔ جتنی دیر ہوتا ہے وہ غیبت ہے، اس پر مزید کاوش کی ضرورت نہیں، یہ مقصود بالذات
 نہیں اور کاوش سے اور پریشانی بڑھے گی۔

غ۔ ممکنہ امداد باہمی میں ملازمت ملنے کی توقع تھی مگر اس کے جواز و عدم جواز میں شبہ
 تھا۔ اس کی تفصیل عرض کی گئی تھی)

س۔ بالفعل رزق کے باب میں طمانیت کر لیں، فتنہ پھر پوچھیں، اضطراب جو صورت ہو
 رہی ہے اس کو قبول کر لیں اور بہتر صورت کی امید رکھیں اور صورت موجودہ کو بادلِ نخواستہ
 قبول کر لیں اور کام کریں اور استغفار کریں۔

(ارشادِ سیلانی کا ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے اور غور کرنے کا طالب ہے
 حضرات صوفیہ چونکہ باریک بین اور دُرُور ہیں اس لئے ظاہر پرستوں کی نظر
 میں ان کے بعض ارشادات قابلِ تحیر بن جاتے ہیں لیکن وہ عواقب پر نظر کر کے اس
 تحیر کی کچھ پروا نہیں کرتے مثلاً اکثر سالک کے ضعیف قوت کا اندازہ لگا کر اس کو کبھی
 مشتبہ امور کی بھی اجازت دے دے، "کثرت استغفار" اور صحیح صورت کی تلاش کی ہر گز نہ

قیود کے ساتھ محض اس وجہ سے دیتے ہیں کہ حرام مرتکب یا خرابی ایمان سے اسکی حفاظت ہو جائے، کیا حدیث شریف میں وارد نہیں کہ کَاذِبٌ لَّقَدْ اَنفَقَ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا؟ یعنی مجھے ڈر ہے کہ فقر و فاقہ حالت کفر تک نہ پہنچا دے!۔

غ۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت والا سے ابتدائی مراملت کے زمانہ میں جو ذوق و شوق کی کیفیت تھی وہ اب کم ہو چکی ہے، اسی وجہ سے موجودہ حالت اس حالت سے خراب ہی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

س۔ تعبیر کی غلطی ہے، بات یہ ہے کہ آپ موجودہ سے زیادہ کے متوقع ہیں اور موجود آپ کو متوقع سے کم محسوس ہوتا ہے اس لئے افسوس معلوم ہوتا ہوگا۔ اس کو آپ خرابی نہ کہیں، آپ اپنے کام میں لگے ہیں اور سو اس میں نہ پڑیں تعلق باللہ اگر بڑھ رہا ہے تو واسطہ کا تعلق نہ بھی رہے تو کیا حرج ہے؟

غ۔ گرمی کی شدت کے سبب اکثر نماز تہجد قضا ہو رہی ہے جس کا بڑا قلق ہے، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل احقر کے شامل حال ہو۔

س۔ کچھ حرج نہیں، جب ناغہ ہو دن کے اشراق کے بعد ۱۲ گھنٹیں پڑھ لی جائیں۔

غ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زمان و مکان کے قیودیں اسی عالم کی حد تک ہیں، آخرت کی دنیا ان سے پاک ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا جواب ہے کہ جنت بھی تو مکان ہے اور جب یہ مسلم ہے کہ وہاں بھی مومنین کے درجات بڑھتے رہیں گے تو پھر زمان کا تغیل بھی آہی جاتا ہے کیونکہ جس مرتبہ سے ترقی ہوئی وہ ماضی ہوا اور جس مرتبہ پر ترقی ہوئی وہ مستقبل۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمان و مکان کے قیود وہاں بھی رہیں گے، البتہ ان کی انتہاء ہوگی۔

س۔ مقصود یہ ہے کہ اس عالم کے زمان و مکان اور یہاں کے زمان و مکان کے قواعد اور قیود وہاں نہیں، وہ دوسرا عالم ہے وہاں کے زمان و مکان کی کیفیتیں اور یہاں

آفتاب کی روشنی ہے وہاں تجلی الہی کا نور ہوگا اور اس سے، دزد و شب بے گامی حال
مکان کا ہے، اوس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

غ۔ حضرت والا احقر کی فلاریح دارین کے لئے دعا فرمائیں۔

طالب دعا، غلام محمد عفی عنہ

س۔ دل سے دعا ہے۔

یچھاں سلیمان

مکتوب (۱۰)

غ۔ حیدر آباد دکن

، جون ۱۹۴۵ء

حضرت مولانا محمد و منام فیوضہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ کہ حضرت والا کے نصائح پر عمل جاری ہے، استقامت کے لئے دعا کی درخواست
ہے۔

س۔ اعظم گڑھ

انھی فی اللہ تعالیٰ رزقکم السلام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ————— بارک اللہ فیکم

غ۔ اس حدیث شریف کا مطلب سمجھ میں نہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا
کیا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات میں اس کی یہ توجیہ کی گئی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ

لہ إن اللہ خلق آدم علی صورۃ۔

تہ مکتوب ۲۸۵ دفتر اول

کی ذات بے چون و بے چگون ہے اسی طرح روح آدم کو بھی بے چون و بے چگون بنایا گیا۔ نیز یہ کہ جو تعلق ذات باہی تو کو کائنات سے ہے وہی تعلق روح کو انسان کے جسد سے ہے کہ نہ یہ متصل ہے نہ منفصل نہ اندر ہے نہ باہر!! اور اسی تشریح سے حضرت مجددؑ نے استدلال اس حدیث شریف پر بھی کیا ہے کہ ”میں ارض و سما کی پہنائیوں میں نہیں سما تا لیکن قلبِ موئن میں“ اس سے احقر کی تشفی نہ ہوئی کہ روح کس طرح بے چون و بے چگون ہو سکتی ہے؟ حضرت والا! دونوں احادیث کی تشریح فرمادیں تو احقر کی تشفی کا باعث ہو۔

س۔ اس کی بہترین توجیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنے اسماء حسنیٰ کا مظہر بنایا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ روح تو غیر مادی ہے، وہ شکل و صورت سے پاک ہے، قلب میں سمائی ہونے کے معنی اس کی معرفت کا حصول ہے۔

(سبحان اللہ چھوٹے چھوٹے جہلوں میں ہا میں کس قدر تشفی بخش آگئیں۔۔۔۔۔)

اس کو ایجا کہیے یا عجا ز سلیمانی!۔

غ۔ حضرت والا کے مضمون ”حکیم الامتہ کے آثارِ علمیہ“ کو پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اگر حضرت والا مناسب تصور فرمائیں تو حضرت تھا لویؑ کے وہ اشعار تحریر فرمادیں جو حضرت والا کو خطاب کر کے ارشاد فرمائے تھے جن کا ذکر اس مضمون میں فرمایا گیا ہے، اگر اس درخواست میں بے ادبی و گستاخی ہو تو معاف فرمائیں۔ (یہ جملہ اس احتیاط کی بنا پر لکھ دیا تھا کہ شاید ان اشعار کی نوعیت بالکل شخصی ہو اور ان کا افشاء خلاف مصلحت!)۔

س۔ وہ اشعار معارف میں چھپ چکے ہیں۔ (جو پچھلے باب میں نقل ہو چکے ہیں)

غ۔ آج کل مرحوم قائد ملت (محمد بہادر خان) کی سوانح لکھ رہا ہوں، حضرت والا کا تعزیتی مضمون جو معارف (اگست ۱۹۹۷ء) میں چھپا تھا، مطالعہ کر لیا، اس کے علاوہ کوئی اور خاص بات جو مرحوم کے کسی پہلو پر روشنی ڈالتی ہو اگر حضرت والا کے علم میں ہو تو تحریر فرمائیں

لے کا یسعی ارضی ولا سمائی ولكن یسعی قلب عبدی مومن۔

بہت ممنون ہوں گا۔

س۔ اس مسئلہ کو ان کے تحقیقی جاننے والوں سے پوچھیے، وہ بہتر رائے دیں گے۔

غ۔ اصلاح حال کے لئے حضرت والا دعا فرمائیں۔ فقط

دعا کا طالب، احقر غلام محمد

س۔ دلی دُعا ہے۔

بیچمداں سلیمان

مکتوب (۱۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

۵ جولائی ۱۹۲۵ء

حضرت مرشدنا و مولانا دامت برکاتہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ حضرت والا کی دعا سے ہر ایات گرامی پر عمل جاری ہے، استقامت کے لئے دُعا

کی درخواست پیش ہے!

س۔ اعظم گڑھ

اٹلی فی اللہ ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احباب کے اصرار سے میں تین ہفتوں کے لئے رات دیر چلا گیا تھا، آج شب کو واپس آیا ہوں

الحمد للہ خبریت ہو! (یعنی سفر سے لوٹتے ہی بلا ستائے ایک طالب حقیقہ کے عزیزہ کا جواب لکھنے

بیٹھ گئے، اس سے اعزاء ہوتا ہے کہ حضرت والا اللہ کی خاطر تعلق رکھنے والوں کی کتنی قدر

فرماتے تھے!)

مُبیاک۔ دلی دُعا ہے! (یہ احقر کی درخواست دعا کا جوابی ارشاد ہے)۔

غ۔ بعض ایسے بڑی جو مسجد سے بہت قریب رہتے ہوئے بھی اپنے ہی گھر پر طہیرہ جماعت سے نماز پڑھتے ہیں، ان سے طبیعت گزرتی ہے، بعض دفعہ ان میں کا کوئی سلام کرتا ہے تو جواب تو دے دیتا ہوں مگر خیال یہ آتا ہے کہ اپنی طرف سے سلام میں پہل نہ کرنے کی وجہ سے کہیں اپنے نفس میں رعونت نہ پیدا ہوتی ہو، اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے لوگوں کے ساتھ بھی سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کی جائے؟

س۔ نفس کو دبا کر، یعنی اون کے فعل کو بُرا سمجھتے ہوئے سلام کر لیں۔

ا) اس جامع تجویز سے اپنے نفس کی حفاظت بھی ہو گئی اور دوسرے مسلمان کی، خواہ وہ گمراہ ہی ہو، خیر طلبی بھی! اور غور کیجئے تو سلامتی کی دُعا کا محتاج بھی زیادہ وہی ہے جو سلامتی کی راہ سے بٹا ہوا ہے!

غ۔ ذکر کے وقت اکثر حضورِ ماحصل نہیں ہوتا، اس سے بعض مرتبہ گمان ہوتا ہے کہ اس طرح زبان سے اللہ اللہ کہے جانے سے کیا حاصل ہے، لیکن جب کبھی صبح کسی وجہ سے ذکر ناغہ ہو جاتا ہے تو دن تمام ایک طرح کی بے چینی رہتی ہے اور اس وقت تک دور نہیں ہوتی جب تک ذکر کو پورا نہ کر لیا جائے۔ پھر بھی اس کا رنج ضرور ہے کہ ذکر میں جو استغراق پیدا ہونا چاہیے بالکل حاصل نہیں ہے، حضرت والا دُعا فرمائیں!

ای شکوہ و شکایت سالکین کے ساتھ عام رہتی ہے اس لئے اس کا جواب بالثواب جو عطا فرمایا گیا ہے وہ پورے غور کا طالب ہے،

س۔ ابھی تک آپ کی سمجھ میں ذکر کی حقیقت نہیں آئی، اس سے مقصود محبت الہی کی ترقی ہے۔ "استغراق" اور "حضور" دو (الگ الگ) چیزیں ہیں "استغراق" تو اس کا نام ہے کہ انسان کا شعور باطل ہو جائے بوجہ شدت انہماک کے تو یہ مطلوب و مدد روح نہیں، البتہ "حضور" مطلوب و مدد روح ہے، وہ اس کا نام ہے کہ فی الجملہ ذکر میں مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کا احتضار ہو یا قلب کی طرف توجہ یا خود ذکر کی طرف دھیان ہو، ان میں

سے جو بات جس وقت اور جتنی بھی حاصل ہو جائے وہ شکر کے قابل ہے کیونکہ وہ عطا
الہی ہے، اختیار ہی نہیں!!

غ۔ حضور، یہ کیا بات ہے کہ دینی گفتگو گھٹنوں ہوتی رہے تو طبیعت اُکٹاتی نہیں بلکہ ایسا
محسوس ہوتا ہے شغف بڑھتا جا رہا ہے لیکن جہاں عمل کا موقع آتا ہے تو سوائے معینہ
نمازوں اور فراغِ نفس کے یہ نہیں ہوتا کہ مسلسل نظیں پڑھنے میں متواتر تلاوتِ قرآن میں
دل لگا رہے اور لطف بھی کم نہ ہونے پائے!

س۔ لطف مطلوب نہیں، اگر دل نہ چاہے اور پھر عبادت کی جائے تو مجاہدہ کا مزید ثواب ہے
لطف اختیار کی چیز نہیں اور غیر اختیار کی چیزیں عطیہ الہی ہیں، دعا کیجئے۔

گفتگو میں چونکہ نفس کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے اس لئے اس میں حظِ نفس بھی
شامل ہوتا ہے اور عملِ خالص عبادت ہے اس لئے وہ حظِ نفس سے خالی ہوتا ہے!
(حظِ نفسانی اور ارتقاے روحانی کے فرق سے بے خبری نے کتنوں کو گمراہ کر رکھا
ہے، خصوصاً یہ اہلِ سماع حضرات تو نماز آرا س گر دایب میں پھنسے ہوئے ہیں کہ حظِ نفسانی
کو ترقی دے روحانی سمجھتے ہیں اور شرع و سنت کے بالکل خلافِ رقص و سرود کو حصولِ قرب
الہی کا ذریعہ جتلاتے ہیں، العیاذ باللہ)

بہ مصطفیٰ ہر ماں خویش را کہ دیں ہمراہ دست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست)
غ۔ کبھی کبھی اس تصور کی بنا پر کہ سجدہ میں بندہ کا سر گویا اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہوتا
ہے، طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اک دم گر پڑوں اور اس کیفیت میں ایک طرح
کا لطف بھی محسوس ہوتا ہے جو بیان میں نہیں آسکتا۔

س۔ یہ کیفیت محمود ہے مگر اس میں کوئی قرب نہیں، قرب اطاعتِ محض میں ہے!!

غ۔ جہاں تک احقر کو علم ہے حدیث شریف میں غیبت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے پیٹھ
پیچھے ایسی بات کہنا جو اگر اس کے سامنے کہی جائے تو اس کو ناگوار گذرے اور اگر کوئی

جھوٹی بات کسی کے غیاب میں کہہ دی گئی ہو تو وہ اتہام ہے! اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ جنگ کے سلسلہ میں یا ہندوستانی سیاست کے مسائل پر جو دن رات گفتگو ہوتی ہے اور مختلف اشخاص پر جو تنقیدیں ہوتی رہتی ہیں، کیا یہ سب غیبت میں داخل ہیں؟

س۔ ایسی سیاسی گفتگوئیں بیکار بلکہ مضر ہیں! ان سے پرہیز چاہیئے، ان میں سے اکثر باتیں عموماً نطق اور قیاسی کہی جاتی ہیں، غیبت اور اتہام کے تحت میں آجاتی ہیں اور ان سے قلب میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے!!

اچنانچہ یلگ اور کانگریس کی آویزش کے زمانے میں مسلمان ایک دوسرے کے رہنماؤں اور بزرگوں پر جس فراخ دلی سے (اتہام تراشی کرتے رہے اور محض سیاسی اختلاف کی بناء پر اپنی عاقبت خراب کرتے رہے وہ کچھ کم عبرتناک سانحہ ہے؟)

غ۔ اگر کسی محفل میں یا کسی مشورہ کے موقع پر کوئی بات زبان سے ایسی نکل جائے جس کو سب پسند کرنے لگیں تو نفس میں ایک طرح کا غرور پیدا ہوتا ہے، اس کا ازالہ کیونکر کیا جائے؟

س۔ فوراً اپنے محبوب اور گناہوں پر نظر رکھ کر اپنی اصلاح کی جائے اور سمجھا جائے کہ جو خوبی بھی ہوئی وہ از طرف حق تعالیٰ ہے، اوس میں بندہ کو کیا دخل ہے، پھر غیر کے عطیہ میں نفس کے لئے غرور کا کیا موقع ہے، پھر زبان سے استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ بار بار کہئے تاکہ وہ حالت دور ہو جائے۔

غ۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ احقر تمام خصائلِ رذیلیہ سے پاک ہو جائے۔ فقط

احقر

غلام محمد

س۔ دلی دعا ہے۔

ہیچمراں سلیمان

مکتوب (۱۲)

غ۔ حیدر آباد دکن

شعبان ۱۳۶۳ھ

حضرت محمد و مولانا مہ فلک العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تقریباً ایک ماہ قبل ایک احوال نامہ خدمت اقدس میں گذرانا تھا، لیکن نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ جواب سے محروم رہا۔ (یہ وہی عریضہ ہے جو اوپر نقل ہو چکا، اس کا جواب دیر سے ملا اور تانیہ کی وجہ خود حضرت والدہ کے قلم سے آپ پڑھ چکے، بہر حال کیونکہ اپنا گمان عریضہ کے کم ہو جانے کا تھا اس لئے زیر نظر عریضہ میں دو ایک پگھلی معروضات کا بھی اعادہ ہو گیا ہے، مگر سبحان اللہ کہ جواب میں مزید و نادرا فادات آگئے ہیں)

س۔ اعظم گڑھ

۳ شعبان ۱۳۶۳ھ، ۱۰ اگست ۱۹۴۵ء

الحی فی اللہ تعالیٰ رزقکم اللہ المتعاقدة فی الدارین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ شعبان کے آغاز سے ۲۰ تک بمبئی و سورت و راندر میں گزرا، اگر خط آیا ہوگا تو تانیہ سے جواب کیا ہوگا۔

غ۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ و رسول کی باتیں کرنے اور سننے میں جو لطف آتا ہے وہ نماز و دیگر اعمال میں باقی نہیں رہتا؟

س۔ جی ہاں، اس گفتگو میں تھوڑا سا حظِ نفس بھی شامل ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے دوسرا سنتا ہے اور نماز و عبادات میں یہ صورت نہیں ہوتی، مگر اہل دل جن کو نماز گویا عبادتِ محبوب میں رکنا ملے محسوس ہوتا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "وجعلت قرۃ عینی فی الصلوۃ" میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہے!

غ۔ ذکر میں اکثر خیالات منتشر رہتے ہیں جس کی وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ ایسے ذکر سے کیا حاصل ہوگا۔ اس کے ازالہ کی کوئی صورت براہ کرم تجویز فرمائی جائے۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی دن وقت مقررہ پر ذکر کا موقع نہ ملے تو طبیعت اس وقت تک مضطرب رہتی ہے جب تک اس کی تعمیل نہ کر لی جائے کیا اس اضطراب کی کچھ اصلیت ہے؟ یعنی کیا عدم ذکر عدم سکون کا موجب بن جاتا ہے؟ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی نفل خواہ اچھا ہو یا بُرا، عادت بن جاتا ہے تو اس کے کبھی کبھار نافرمان ہو جانے سے بے چین مزدومسوس ہوتی ہے (یہ بات کتنے ذہنوں میں جن میں عقلیت کا غلبہ ہے کھٹک جاتی ہوگی!)

انہی وسوسوں و خطرات سے بچا کر نکالنے کے لئے پیر کی رفاقت ضروری ہوتی ہے ورنہ اپنے آپ تو انسان گمراہ ہو کر بھی گمراہی سے بے خبر رہتا ہے۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

س۔ ذکر ہر حال میں کرنا چاہیئے، اگر لذت ملے تو نعمت ورنہ ادائے فرض کی نعمت تو ہر حال میں ہے۔

بہر حال بندہ یہ ہے بندگی کرم ہے جو ذوقِ عبادت ملے
 ذکر کا خاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ”اذکرو فی اذکرکم“ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس سے بڑھ کر نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ اذکر کو بوقت ذکر خود حق تعالیٰ یاد کرتے ہیں، ذرا اس کا تصور تو کیجئے اور جب اللہ کہئے تو تصور کے کان سے سنئے کہ ”عبدی“ کی آواز آتی ہے انجب سمجھ لیجئے کہ تصور ایک مفہوم حقیقت کو مستحضر کرنے کے لئے باندھا جا رہا ہے، یہ کوئی بُرا تصور نہیں!)

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لئے انعام ہے

آپ خود سنتے ہیں آکر جو میرا پیغام ہے

کیا دوا کے استعمال سے غرض طلب محنت ہے یا لذتِ کام و دہن؟ اگر یہ میسر آ جائے تو فہما
ور نہ دوا سے انکار تو نہیں کیا جائے گا۔

ذکر میں انتشارِ خیال سے پریشان نہ ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے قلب و دماغ کو ایسا ہی
بنایا ہے کہ اوس میں حرکتِ فطری ہوتی رہے، یہ شاہی شاہراہ ہے، آپ کون اس کا پہرہ
بٹھانے والے کہ اس شاہی شاہراہ پر چوڑے چار نہ چٹنے پائیں، آپ اپنی راہ چلیے وہ اپنی راہ
چلیں، حسبِ محبوبِ اعلیٰ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ آپ یہ خیال کیا
کھینچے کہ اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کی بھی قدرت ہے کہ دل کے ایک قطرہ میں خیالات کا سمندر
بھر دیا ہے اللہ رہے اوس کی عظمت و کبریائی "اس تصور سے یہ خیالات پریشان معرفت
کے آیات بن جائیں گے۔۔۔۔۔ ایسے وقت یہ شعر پڑھ لیا کھینچے۔

دورِ باشِ افکارِ باطل، دورِ باشِ اغیارِ دل

سج رہا ہے شاہِ خواباں کے لئے دورِ بارِ دل

(افکارِ باطل "کو" اغیارِ دل" سے کیا خوب تعبیر فرمایا ہے اور کیسے عارفانہ پیر (یہ میں!)
بہر حال آپ مضطر نہ ہوں، کام میں لگے رہیں، اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں گے، انکا وعدہ ہے!
وسط شعبان ۱۴۱۸ھ میں حضرت دالارہ کی خدمت میں حاضری کا قصد تھا اور تیاری بھی
مکمل کر لی تھی، اب اجازت طلب کرنے والا ہی تھا کہ حالات مخالف ہو گئے وہ یوں کہ معذرت
تعبیرات میں (۱۰ تا ۱۶) کا گریڈ مل رہا ہے اور اس کو قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں۔

حضرت دالارہ دعا فرمائیں کہ یہ معاشی صورت مفید ثابت ہو، محکمہ امدادِ باہمی سے نفرت ہے
اس لئے باوجود طلب کئے جانے اور ترقی کے زیادہ امکانات کے احقر نے انکا کر دیا۔

س۔ کچھ خرچ نہیں، آپ کو نیت کا ثواب مل گیا،

اچھا کیا جو اوس ملازمت سے آپ نے قطع نظر کر لیا، اب جو صورت پیش نظر ہے شاید

ملہ حضرت دالارہ ہی کا شعر ہے اور انتشار کے رفع کرنے میں احقر نے اسیر پایا ہے!

اللہ تعالیٰ اس میں بھلائی رکھیں!

غ۔ پرسوں رات ایک خواب دیکھا کہ حضرت والارہ مکہ مسجد میں پہلی صف میں تشریف فرما ہیں، احقر بھی قریب ہی بیٹھا ہے، کچھ فاصلہ پر ایک کہنہ سال سفید ریش بزرگ بیٹھے ہیں جن کو چہرے سے تقدس کے آثار نمایاں ہیں، احقر نے دیکھا کہ وہ الحاح کے ساتھ دُعا میں مصروف ہیں اور بار بار یہ فرماتے ہیں کہ "لے اللہ! تیرے نیک بندے سید سلیمان کا واسطہ" ایسا ایسا کر دے

احقر کے دل میں تعجب و خوشی کے جذبات یک وقت پیدا ہوئے، تعجب اس وجہ سے کہ ان بزرگ کا حضرت والارہ سے کوئی تعلق نہیں پھر حضرت والارہ ہی کے واسطہ سے دعا کر رہے ہیں اور خوشی اس لئے کہ ایسے بڑے بڑے بزرگ بھی حضرت والارہ کے قائل ہیں جس سے حضرت والارہ کے مقام کی رفعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غرض پھر حضرت والارہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اتنے میں کاغذ کا ایک پُرزہ تھا، مؤذن نے اذان کہی، یاد نہیں رہا کہ حضرت والارہ نے کیا خطبہ ارشاد فرمایا اور نماز کیونکر ہوئی، لیکن جب لوگ منتشر ہونے لگے تو احقر کو مختلف لوگوں سے یہ خبر ملی کہ حضرت والارہ کو درجہ اول کا گریڈ مل گیا ہے، اسی کیفیت میں آٹھ گھنٹہ گئی، تہجد کا وقت تھا،

س۔ آپ کا یہ خواب آپ کے لئے اور اس پیچ میرزے کے لئے بشارت ہے، اللہ تعالیٰ اس شخص کے مطابق بنائے یہ اوس کی ستاری ہے!

مگر خوابوں کو اہمیت نہ دی جائے، اس سے درجہ قرب نہیں بڑھتا، صرف عمل سے بڑھتا ہے اس کے درپے رہنا چاہیے!

غ۔ کیا دعا واسطہ سے کی جائے تو زیادہ موثر ہوتی ہے؟

س۔ جی نہیں، ادعیہ ماثورہ بکثرت مروی ہیں مگر ان میں کہیں واسطہ اور توسل ہے؟ شاید

لے کیا عیب کہ تہذیب صدیقیت پر قائم ہو گئے ہوں کیونکہ ادروئے قرآن غیر نبی کے لئے درجہ اول کا گریڈ "صدیقیت"

ہی ہے، الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین!

ایک آدھ مقام پر پہنچا، اس لئے اگر تو ٹٹل بالعلیٰ ہو تو جائز ہے اور اشخاص سے تو ٹٹل بھی ان کے اعمال ہی سے ہوتا ہے، — جب حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں اذعونی استجب لکم مجھ سے مانگو میں دوں گا مجھے پکارو میں جواب دوں گا، تو پھر واسطہ کی کیا ضرورت رہی؟

(یہ ہے ط "یکے بین ویکے جوئے ویکے باش" پر عمل اور اس کی تلقین!)
غ۔ حضرت والا کی ہدایت پر عمل جاری ہے لیکن دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اطمینان و سکون عطا فرمائے۔ فقط

احقر غلام محمد

س۔ الحمد للہ، شکر کیجئے، دلی دُعا ہے۔

پہچاں سلیمان

مکتوب (۱۳)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۹ شعبان ۱۳۶۳ھ

حضرت محمد و منا و مولانا دامت برکاتہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
کچھ ہی روز قبل ایک عربیہ خدمت اقدس میں گزران چکا ہوں جس میں ایک کرم نامہ کی عدم وصولی کا ذکر تھا، الحمد للہ پرسوں وہ شفقت نامہ شرف صدور لایا اور وجہ تاخیر بھی معلوم ہوئی جس کے لئے احقر سراپا سپاس ہے! (مراد مکتوب ہے)

س۔ اعظم گٹھ

۳ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ

اخی فی اللہ تعالیٰ، ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دوسرا خط بھی ملا ہوگا۔ (یعنی مکتوبتاً جواب بھی نقل ہو چکا)۔

غ۔ ذکر سے متعلق عرض ہے کہ اگر بالجہر نہیں کرتا ہوں تو کم وقت لگتا ہے لیکن اللہ اللہ کے لفظ صاف ادا نہیں ہوتے اور اگر کسی قدر جہر سے صاف ادائی کی کوشش کی جاتی ہے تو کافی وقت صرف ہونے کے باوجود صرف چند مرتبہ کہنے کے بعد اللہ اللہ کے الف کی آواز نہیں نکلتی اور بڑی وقت محسوس ہوتی ہے، اب تک اس طرف توجہ نہیں ہوتی تھی حضرت والا کے ارشاد کا طالب ہوں، نیز یہ بھی بتایا جائے کہ ذکر میں نشست کس طرح کی ہو؟

س۔ آپ ان مشکلات اور وقتوں کی پرواہ نہ کیجئے، نہ ذکر کے اندر ان لفظوں پر دھیان دیجئے آپ مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور کریں، شکل نور، خواہ قلب میں لفظ "اللہ" کا نورانی تصور، املفظ اپنی کوشش بھر صحیح ہو پھر جو کچھ ادا ہوتا ہے وہ صحیح ہے۔

غ۔ کل سے رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو رہا ہے چند مزید ہدایات سے سرفراز فرمایا جائے تو موجب تشکر ہوگا، نیز حضرت والا دعا فرمائیں کہ احقر اس مہینہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا سکے۔
س۔ رمضان المبارک قرآن پاک کا مہینہ ہے، پس تلاوت اور تراویح اور نوافل کی شکل میں قرآن پاک بکثرت پڑھا جائے۔

غ۔ بعض دفعہ یہ گمان ہوتا ہے (اپنے احوال پر نظر رکھتے ہوئے) کہ نہ معلوم حضرت والا کی توجہ اس گنہگار کے حال پر پوری طرح ہے بھی یا نہیں، کیونکہ جس مکتب سے علماء و صلحا درس لیتے ہوں وہاں اس بے علم و عمل کا کیا گذر۔ _____ احقر تو حضور کا ہو چکا اب جو چاہے کیجئے، لیکن۔

از بندہ پروردی و نوازش بعید نیست

شاہا اگر نگاہ بہ حالِ گدا کنند

منہ اس بحث کے لئے ملاحظہ ہو "انتالیسواں عزیز" در تحقیق تکرار اسم ملائہ منفرد "بجواب النواذر"

مولانا محمد تھانوی قدس سرہ۔

س۔ استغفر اللہ، میں خود قاصر اعلیٰ ہوں اور سب سے کم درجہ،

اپنے احباب اور دوستوں میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق خاطر رکھتا ہوں اور آپ تو خاص تعلق و وابستگی رکھتے ہیں، عاتق انسوز شمع کئے پروانہ شیدا می شود، اللہ اللہ، کیا ٹھکانا ہے شفقت و محبت کا آج بھی بھر دوسرے تو صرف اسی نظرِ کرم کا، ع سلیمان
بچپنِ حشمت نظرِ باورِ مورش (۱)۔

غ۔ گستاخی ہوتی ہے لیکن جذباتِ شوق چونکہ بلا تکلف اشعار کی شکل میں ڈھل گئے، اسلئے خدمتِ اقدس میں پیش ہیں، زبانِ ٹوٹی پھوٹی شاعرانہ ہے لیکن معنی و مفہم بالکل واقعی و اور شاعرانہ مبالغہ سے پاک ہے۔

بفرما نظرِ بر من خستہ حالے	بدہ بادہ پُر زکیف جمالے
منم عاصی و غرق در بحرِ عصیاں	توئی صوفی و صافی و غرقِ عرفاں
یکے درِ خودم سیرِ بنمودہ دیدم	ہمہ غفلت فسق اندرِ وجودم
نہ بازوئے عزم و نہ نیروئے ہمت	بجو چوں شنا کردنِ ایں بحرِ رحمت
شرابِ زنتِ ثقلِ گفتارِ خواہم	چونادیدہ ام، روئے دلدارِ خواہم
دعا ئے بفرما کہ خاتمِ برید	گلے، لالہ، یاسینے برید

ببار و سحابِ کرم لعل و گوہر

شود و دامنِ عاصیاں پُر ز جوہر

دعا کا طالب، احقر غلام محمد

(یہ اشعار زبانِ دفن کے اعتبار سے جس قدر بھی پر عیب ہوں لیکن زبان سے نکل گئے تھے دفعۃً اور میں منت میں جذباتِ قلبی کے ورنہ شعر گوئی سے بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ اُس دور کے اپنے جیسے ایسے اشعار پر بھی اب حیرت ہی ہوتی ہے کیسے موزوں ہو گئے!)

س۔ ان خیالات کا شکریہ جو آپ کی محبت کا تقاضا ہیں ورنہ ”من آنم کہ من دانم“ فقہ میں مجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ حضرت والا رحمہ اللہ کا دست گرفتہ ہوں، اب جو کچھ ہے، یہی نسبت ہے اور اسی کا بغضل خدا بھر وسہ ہے، آپ بھی میرے لئے دعا کریں، میں آپ کے لئے کرتا ہوں، ہر مسلمان بھائی کی دعا دوسرے مسلمان بھائی کے حق میں قبول کی استعداد تمام بدرگاہ باری تعالیٰ رکھتی ہے!

پچھان سلیمان

(کیا ٹھکانا ہے فمائیت و عبدیت کا اور عبدیت سے بالا تر بندہ کے لئے کوئی اور مقام ہو بھی سکتا ہے؟)

غ۔ پس تحریر:-

احقر کے ایک دوست عزیز حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی سے تعلق خاطر رکھتے اور اس بنا پر ان سے اصلاح کا تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں، گمان یہ ہے کہ مولانا بھی حضرت تھانویؒ سے مجاز بیعت ہیں (صدق میں گزارشیں اور مشورے جو چھتے رہتے ہیں ان سے یہ گمان ہوتا ہے) لیکن مجازین کی فہرست میں مولانا کا اسم گرامی موجود نہیں ہے ازراہ عنایت حقیقت حال سے مطلع فرمایا جائے، نیز اس کی بھی وضاحت فرمائی جائے کہ آیا مولانا نے موصوف سے اس قسم کا تعلق مفید ثابت ہو گا اور سلسلہ عالیہ مدادیہ کی برکات حاصل ہوں گی؟ فقط

احقر غلام محمد

س۔ معنی مولوی عبدالماجد صاحب کو بیعت تو حضرت مولانا حسین احمد صاحب دام فیوضہ سے ہے مگر اون کو عقیدت اور آمدورفت اور مکاتبت کا تعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ سے رہا، مگر حضرت والا سے نہ اون کو بیعت ہے اور نہ اجازت حاصل ہے اجازت کسی سے بھی نہیں، ابھی صدق میں خود بھی ظاہر کر دیا ہے تاہم وہ تعلیم یافتہ اصحاب کے نباض ہیں

س۔ بحمد اللہ۔

غ۔ گذشتہ رمضان سے نماز تہجد کی ادائیگی توفیق ہوئی تھی، الحمد للہ اس رمضان میں ڈاڑھی منہ مٹھوانے کے گناہ کا حقیقی احساس عطا ہوا، اس عمل سے نفرت پیدا ہوئی اور اس کے ترک پر قدرت بھی عطا ہوئی، یہ سب حضرت والا کی دعاؤں کے برکات ہیں ورنہ احقر میں نہ ہمت نہ عزیمت!

س۔ بَارَكَ اللهُ لَكُمْ۔ شَبَابُش!

غ۔ کیا یہ صحیح ہے کہ عالم رویا میں جس طرح شیطان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیس اختیار کر نہیں سکتا اسی طرح شیخ چونکہ ہادی ہوتا ہے اس لئے اس کا روپ بھی اختیار نہیں کر سکتا اور جب شیخ کی زیارت رویا میں نصیب ہو تو واقعی ایک اشارت ہوتی ہے!

س۔ اس کی کوئی تفسیر شریعت میں نہیں۔

غ۔ قَلْبُ الْعَبْدِ بَيْنَ اَصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الْوَحْيِ۔ اس حدیث شریف سے بظاہر احوال قلبیہ کا غیر اختیاری ہونا معلوم ہوتا ہے، اگر ایسا ہو تو پھر اعمال بھی غیر اختیاری ہو جائیں گے، نیک و بد بننا بندے کی اختیار کی بات نہ ہوگی، براہ کرم توضیح فرما کر نقشب فرمائی جائے۔

س۔ جی ہاں، ایسا ہی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے بھی قواعد مبنی بر حکمت بنا رکھے ہیں، اس لئے یہ شبہ غلط ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا ذَدْ اَدْهَدْ هَدِيْ

غ۔ بعض دفع خوب غور کرتا ہوں کہ قلب کا کیا حال ہے مگر کچھ پتہ نہیں چلتا بجز اس کے

لے نیز مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ سے پتہ چلا کہ اس حدیث میں مام قلب کا ذکر نہیں بلکہ قلب

عارف کا ذکر ہے جو مرتبہ عبودیت پر فائز اور تصرف الہی کے تابع ہوتا ہے۔

کی دعائیں کیں اور کر رہے ہیں۔

الرحم الرحیمین کی بے پناہ رحمت سے امید ہے کہ حضرت والا اب بہ صحت و عافیت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حضور کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے اور جس طرح بغیر مانگے اس نے بلا طلب ہماری اصلاح کا ذریعہ فراہم کیا اب ہماری التجا اور گزارش ہے کہ اس واسطے اقدس کو ہماری منزل مقصود تک رہبری کا ذریعہ بنائے رکھے اور صحت و عافیت کے ساتھ عرطویل عطا فرمائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم
وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔ خستہ جگر،
احقر غلام محمد

س۔ اعظم گڑھ

اخی فی اللہ تعالیٰ رزقکم اللہ رزقا حسنا فی الدنیا والآخرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فقیہ محمد اللہ برکت دُعائے بزرگاں علالت کے اس حملہ سے بہ سلامت نکلا، ابضعف کے آثار ہیں، اب راتوں کی نیند کچھ کچھ آرہی ہے، اب لیٹتا ہوں اور سوتا ہوں، مولانا محمود الغنی صاحب اور دوسرے بزرگوں اور عزیزوں کی دُعاؤں کا محتاج ہوں۔

اب آپ مطہین رہیں، انشاء اللہ مولیٰ کا کرم ہوگا، والسلام

بچہ جہاں سید سلیمان

۲ شوال ۱۳۶۳ھ

لے یہ دہی مرض تھا جس میں قلب پھیل گیا تھا جس کی تفصیل باب پنجم میں گذر چکی !!

مکتوب (۱۶)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۱ شوال ۱۳۶۳ھ

حضرت مولانا و محمد و منانہ ظلمکم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
گرامی نامہ پڑھ کر ایک گونہ سکون حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ حضرت والدہ کے سایہ کرم عاصیوں
کے سروں پر تادیر قائم رکھے اور فیوض سے بہرہ ور فرماتے یہاں سب خدام حضرت والدہ
کی کامل صحت کے لئے دست بہ دعا ہیں۔

س۔ اعظم گڑھ

۱۵ شوال ۱۳۶۳ھ

عزیزی و حبیبی ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
الحمد للہ اچھا ہوں، ضعف باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس مزید مہلت کو اپنے مرضیات میں
صرف فرمائیں۔

غ۔ گرامی طبع کا باعث نہ ہو تو حضرت والدہ پورا اعلیٰ پڑھیں ورنہ صرف اپنی صحت و عافیت
سے مطلع فرمائیں کیونکہ جو باتیں آئندہ عرض کی جا رہی ہیں کچھ زیادہ اہم نہیں۔

س۔ بھد اللہ میں نے پڑھ لیا اور آپ کے لئے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت
عطا فرمائیں۔

غ۔ میرے کم فرما افسر بالادست نے جو میری پوری زندگی سے واقف ہیں میرے چہرے پر
ڈاڑھی دیکھ کر سخت ناراضی ظاہر کی اور کہنے لگے کہ جتنی نمازیں چاہے پڑھئے، روزے لکھئے
لیکن اپنے ظاہر کو آپ کیوں بدلتے ہیں پھر متعدد مثالیں پیش کیں جن میں محض ڈاڑھی کی
وجہ سے افراد کی ترقیاں رک گئیں، جب احقر نے کہا کہ آپ کام دیکھئے ان ذاتی امور سے

دفتر کو کیا تعلق تو فرمانے لگے کہ یہ دورِ خلافت نہیں بلکہ انگریزوں کا دور ہے اور ریاست حیدر آباد بھی انہی کے زیرِ اثر ہے۔۔۔۔۔ میں نے جب ان کی باتیں اُن سنی کرنی شروع کر دیں اور کچھ جواب نہ دیا تو کہنے لگے کہ آپ کی یہ تبدیلیِ منوہیت کی دلیل ہے، سب کچھ سُن کر میں مسکراتا ہوا ان سے رخصت ہو گیا، رافسوس کہ یہی غلامانہ ذہنیت پاکستانی اعلیٰ حکام میں بھی سرایت کئے ہوئے ہے، اللہ ماشاء اللہ)۔

س۔ آپ استقامت کے ساتھ قائم رہیے، خط دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر است، اگر سرحدِ گندہ شگھ، سکھ، بڑی ڈاڑھی اور بڑے بال اور بگڑی لے کر دیسرائے کا ہوم ممبر ہو سکتا ہے تو کیا عام مسلمان معمولی سرکاری ملازم بھی نہیں ہو سکتے؟ استغفر اللہ کیا مسلمانوں میں سکھوں جیسی استقامت بھی نہیں؟۔۔۔۔۔ آپ ان باتوں سے ملول نہ ہوں، ایسے ایسے مواقعِ شیطانی تو خدا جانے کتنے پیش آئیں گے، ہمارے خواجہ عزیز الحسن بمذہب رحمۃ اللہ علیہ بڑی لمبی ڈاڑھی کے ساتھ انسپکٹر آف اسکولس تھے، میرے داماد سید حسین ڈاڑھی کے ساتھ ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی مجسٹریٹ میں واللہ!

ع۔ جب سے ڈاڑھی رکھی ہے کوئی کہتا ہے ایسی بھی کیا عجلت تھی، کچھ ترقی ہو جاتی، شادی ہو جاتی تو پھر رکھ لیتے، اور اس سلسلہ میں عجیب دلائل خود اپنا نفس بھی پیش کرتا ہے، حضرت والا اس ضعیف اہمیت کے لئے استقامت کی دعا فرمائیں اور یہ بھی کہ سائے خدشات غلط ثابت ہوں تاکہ معترضین کی نظریں بھی جھک جائیں اور اپنے نفس کی بھی تذلیل ہو کر قلبی اطمینان حاصل ہو۔

س۔ مخالفین کے اقوال پر لاجول پڑھئے، آپ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ اپنے پیش نظر رکھئے اور اس کے عشق میں اتباع کا مل پر قائم رہیے (کیا حکیمانہ پیرایہ تلقین ہے کہ جذبہٴ عشق کو ہوا دے دی جس کے بعد ہر ناممکن بھی ممکن بن جاتا ہے۔ ہر کہ عشق مصطفیٰ سامانِ اوست بحر و بر در گوشہٴ دامنِ اوست)

دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ استقامت بخشیں، انشاء اللہ یہ سب فرضی حدیثے حباب و
سراپ ثابت ہوں گے، (شیخ کا تئیں مرید ناقص کے اندر بے پناہ قوت یقین پیدا کرتا ہے)
غ۔ حضرت والا احقر کی ہر جہتی فلاح کے لئے دُعا فرمائیں۔ فقط
احقر غلام محمد

س۔ دلی دُعا ہے۔ والسلام۔

یہ چھ ماہ سلیمان

مکتوب (۱۷)

غ۔ چیدر آباد دکن

۲۲ شوال ۱۳۳۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مد فیہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
حضرت مولانا محمود الغنی صاحب کے ایما و اصرار پر احقر حضورِ والا کی توجہ ایک علمی مسئلہ
کی طرف رجوع کرانے کی جرات کر رہا ہے :-

تفہیمات (از مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) کا مضمون ”مسلك اعتدال“ ملاحظہ
ہو، خصوصاً صفحہ ۳۱۸ سے ۳۲۵ تک کا حصہ۔ اس حصہ میں ”فن رجال“
پر بحث کرتے ہوئے اس فن کی کافی اہمیت گھٹائی گئی ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں ”یہ
مواد اس حد تک قابلِ اعتماد و ضرور ہے کہ سنت نبویؐ اور آئین صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے
مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں کہ بالکل اسی پر اعتماد
کیا جائے“ (صفحہ ۳۲۲)۔ اسی طرح رد و قدح کرتے ہوئے صحیح و غلط
احادیث کو پرکھنے کی کسوٹی ”ذوق“ کو قرار دیتے ہیں اور یہاں سے انتہائی گمراہ کن
مضمون شروع ہوتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

”اسلام کا مزاج عین ذات نبوی کا مزاج ہے..... (۵۰ سطریں
 چھوڑ کر)..... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج
 نہیں رہتا، وہ اسناد سے ضرور مدد لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس
 پر نہیں ہوتا، وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون
 فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس اُفتادہ پتھر کے اندر
 ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معطل، غیر شاذ
 متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لئے کہ اس
 جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور
 مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی..... وغیرہ۔“

حضرت مولانا محمود افغانی صاحب فرماتے ہیں کہ جس کسی نے اس مضمون کو پڑھا
 وہ الفاظ کے سحر سے مسحور اور معنی کی سمیت سے مسموم ہوا، اس لئے حضور والا اس پر تنقید
 تحریر فرمائیں تاکہ لوگ اس گمراہی سے محفوظ رہیں کیونکہ ہر شخص نہ فن کی گہرائیوں سے واقف
 ہے اور نہ اُردو میں اس قسم کا مواد عوام کے سامنے موجود ہے۔ فقط
 خادم غلام محمد

س۔ اعظم گڑھ

اِنْحِیْ فِی اللّٰہِ تَعَالٰی رَاہِ تَوْفِیْقِکُمْ، اِسْلَامٌ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ
 حضرت مولانا محمود روح سے میرا سلام کہہ دیجئے اور عرض کر دیجئے کہ اس وقت میں اس قدر
 ضعیف ہوں کہ کوئی دماغی کام مدت تک نہیں کر سکتا۔

مولوی مودودی صاحب کا جواب مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری ایڈیٹر اہل
 حدیث دے رہے ہیں، میں رسالہ خطبہ باندرج بھیجتا ہوں، مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں
 اور اپنے غفور و عافیت کے لئے ان سے دعا کا طالب ہوں۔ ”پچھلا میلان“

مکتوب (۱۸)

(اوپر کا مریضہ مولانا محمود الحسنی صاحب کی طرف سے لکھا گیا تھا اور اب اُسی تاریخ کا اپنا

احوال نامہ آرہا ہے)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۴ شوال ۱۳۹۵ھ

اقدس واعلیٰ حضرت مولانا مفتی محمد، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
حضرت والا کے رو بہ صحت ہونے کی کیفیت معلوم کر کے بڑی مسرت حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ
حضور کو بہت جلد صحت کملی عطا فرمائے۔

س۔ اعظم گڑھ

اُفی فی اللہ تعالیٰ ادا م اللہ توفیقکم و زادکم مرضیاً علی الدین
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، الحمد للہ اچھا ہوں مگر ضعف ابھی تک ہے،
غ۔ نہ یہ عارف میں "الجہد والجماد لعلمی المعاش والمعاد" کے مطالعہ کی سعادت
حاصل ہوئی، احقر کی کیا بساط کہ اس کی تعریف و توصیف کرے، لیکن ایسا معلوم ہو رہا ہے
گویا یہ تقریر اس کم کردہ راہ کے لئے لکھی گئی ہے، بار بار پڑھا اور بڑی تقویت حاصل ہوتی
رہی، اللہ تعالیٰ حضور والا کے فیوض کو تادیر جاری رکھے۔

س۔ الحمد للہ، یہ میری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوا جو کچھ ہوا۔

حق تعالیٰ اس سے بہتر کی توفیق بخشیں،

غ۔ کیا حضرت والا کے بعض عام ارشادات یہ کہہ کر کہ "میں نے یہ عرض کی تو حضور نے یہ ارشاد

فرمایا "نفع عام کی خاطر دوستوں کو سنائے جاسکتے ہیں؟

س۔ بغرض افادہ نقل کئے جاسکتے ہیں نہ کہ دیا اور استنباط کی راہ سے۔

غ۔ احقر بہت تباہ حال ہے، رشک و حسد کا بابا نہ حملہ ہوتا رہتا ہے، جب کسی کی تقریر تحریر یا قابلیت کی تعریف سننے میں آتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے اور خیال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے میں یہ جوہر کیوں نہیں ہے، گو یہ جذبہ کوئی عملی بد اعمالی اختیار کرنے نہیں پاتا مگر قلب و دماغ میں یہ جان ضرور پیدا کر دیتا ہے!

س۔ حسد اور رشک (غبطہ) دو چیزیں ہیں، حسد یہ ہے کہ جس پر حسد ہو (محمود) اس سے اس کی نعمت کے زوال کی تمنا ہو، یہ مذموم ہے اور رشک اور غبطہ یہ ہے کہ اس نعمت کی اس سے زوال کی تمنا کے بغیر اپنے لئے اس کے حصول کی تمنا ہو، یہ بُرا نہیں تو آپ کو بحمد اللہ مرضِ حسد نہیں بلکہ رشک آتا ہے کہ آپ بھی ایسے ہوتے تو ایسی تمنا اور مسابقت کا جذبہ تو رمضانِ الہی کا باعث ہے وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون، اور دوسری جگہ فاستبقوا الخیرات۔

غ۔ کیا عرض کروں آج کل یہ حالت ہے کہ بعض رتبہ عبادات اور مذہب کی بنیادی باتوں کے متعلق تک و سادوس پیدا ہوتے ہیں کہ اس سے کیا حاصل ہے اور اگر کچھ فائدہ ہوتا بھی ہے تو محض اس اعتبار سے کہ یہ چند نفسانی اعمال ہیں اخذ باللہ من ذلک! یہ و سادوس کبھی کبھی آتے ہیں اور اسی امر سے کہ آپ اس کو بُرا سمجھتے ہیں اور ان کے پیش آنے سے شوش ہیں، یہ ثابت ہوتا ہے کہ بحمد اللہ ایمان محفوظ ہے، ایسے موقع پر استغفار اور کاحول و لا قوۃ الا باللہ کی کثرت کیجئے اور اودھر سے دل کو پھیر کر دوسرے کام میں لگ جائیے، التفات بھی نہ کیجئے اور دعا کیجئے۔

يَا مُقَلِّبُ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلٰى دِينِكَ

غ۔ حافظہ کمزور ہے اور لسیان بڑھ رہا ہے، کوئی روحانی علاج تجویز فرمایا جائے۔

س۔ یہ تو کوئی مادی مرض ہے، دوا کیجئے اور دعا بھی کیجئے۔

غ۔ احقر کے والد ماجد تقریباً سات برس سے مفلوج ہیں اس کی وجہ سے متفکر رہتے ہیں، اُن کی

پریشانی سے احقر کو پریشانی رہتی ہے، حضرت والا کوئی وظیفہ، دعایا تہذیب بتائیں تو بڑی عنایت ہوگی!

س۔ فیقر نے دعا کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں، گو خود جیسا ہوں ظاہر ہے گردوسرے مسلمان بھائی کے حق میں اللہ تعالیٰ قبول فرمایا کرتے ہیں یا اس سے بہتر چیز عطا کرتے ہیں۔
غ۔ حضرت والا احقر اور اس کے خاندان کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے دعا فرمائیں۔

احقر غلام محمد

س۔ ولی دعا ہے۔

پچھلاں سلیمان

مکتوب (۱۹)

غ۔ حیدر آباد دکن

۵ نومبر ۱۹۳۵ء

حضرت اقدس واعلیٰ دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
پندرہ روز سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہوگا کہ ایک عریضہ خدمت والا میں گذرانا تھا لیکن جواب سے محرومی ہے۔

س۔ میرٹھ، مکان سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

عزیز مخلص زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے گذشتہ خط کا جواب دیا گیا تھا، اب آپ کو مل گیا ہوگا۔

(جوا و پر نقل ہو چکا)

غ۔ چند روز پہلے ”صدق“ میں حضرت والا کا ایک مکتوب نظر سے گذرا، طبیعت متفکر ہوئی،

لے غالباً مولانا دیبا بادی مغلطہ کا موسومہ تھا اور اس میں ملائت کی خیر رکھی تھی۔

حضرت والا اپنی صحت سے مطلع فرما کر مطمئن فرمائیں۔

س۔ الحمد للہ اچھا ہوں اوس وقت وہی صورت حال تھی، اب صحت ترقی کر رہی ہے۔

غ۔ ویسے توجب سے حضور کی علامت کی خبر ملی ہے براہ صحت کی دعا کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا لیکن کل مات نماز تہجد کے بعد جو دعا کی توجہ سے قلب میں ایک طرح کا اطمینان محسوس ہونے لگا ہے جو اس سے پیشتر نہ ہوا تھا، یقین ہے کہ دعا کو قبولیت کا شرف نصیب ہوا ہوگا، اللہ تعالیٰ حضرت والا کو تادیر بہ عافیت و صحت رکھے، آمین، جواب کا منتظر،
احقر العباد و غلام محمد

س۔ جی ہاں، ہر بھائی کی دعا دوسرے بھائی کے حق میں غائبانہ قبول ہوتی ہے، قلب میں دعا کے بعد سکون کا احساس ازباید ایمان کی نشانی ہے، اس دولت پر مبارک باد قبول کیجئے۔ والسلام،

پہچماں سلیمان، ۶، ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

مکتوب (۲۰)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۴ ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مد فیہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

س۔ میرٹھ، کوٹھی سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

اخی فی اللہ تعالیٰ ادا اللہ تعالیٰ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ بخیر ہوں۔

غ۔ حضرت والا کا مرحلہ و عظم (خطبہ رائیہ) اور پیام (مندرجہ مکتوب ۱۷) مولانا محمود الغنی

صاحب کو کسی روز پہنچا دیا، حضرت موصوف نے بھی جواباً سلام لکھنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے اور فرماتے تھے کہ حضرت کے لئے پہلے بھی دعا کی تھی اور اب پھر کروں گا اور کیسے دعا نہ کریں کہ حضرت کا فیض جاری ہے۔

س۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے اس کام کو انجام دے کر مجھے بھی اطلاع کرنا مناسب سمجھا، یہ حسنِ اہل ہے، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے خیر دیں کہ ایک ناچیز کے ساتھ یہ حسنِ سلوک فرماتے ہیں۔

غ۔ احقر کا حال یہ ہے کہ ہر طرف سے طبیعت روکھی ہے، نہ دنیوی امور کی طرف رغبت ہے نہ

دینی معاملات سے شغف، بس نام کی عبادتیں ہو رہی ہیں۔
کچھ سمجھ میں نہیں آتا، حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم نہ رکھے۔
فقط دعا کا طالب،

احقر غلام محمد

س۔ یہ احوال پیش آتے رہتے ہیں، کیفیات مگر قائم نہیں رہتیں، جیسے کوئی ہر وقت ہنستا۔
روتیا یا غصہ میں نہیں رہ سکتا، مگر طاعت میں علیٰ کل حال لگا رہنا چاہیے اس سے کبھی غفلت نہ ہو، بلکہ لطف و کیفیت کے نہونے پر بھی جو عبادت کی جاتی ہے اس میں مجاہدہ کا ثواب زیادہ ہے کہ بندہ باوجود حظ اور لذت سے محرومی کے کام میں لگا ہے،
غلام کو خواہ آقا کی خدمت میں لذت آئے یا نہ آئے خدمت میں لگا رہنا ہی ہے ورنہ وہ آقا کی راحت کا نہیں بلکہ اپنی لذت کا طالب ہے جو شرطِ وفا کے خلاف ہے۔
غرض اس ماہ میں قبض یا بسط جو کچھ پیش آئے اس پر راضی رہنا چاہیے، آقا کی مرضی وہ جس حال میں رکھیں!

لے اس ارشاد پر خود حضرت کی ایک ربانی یاد آئی جو خان بہادر محمد مظہر صاحب مرحوم کو لکھ بھیجی تھی۔

انسان وہ ہے جو سب کو انساں سمجھے ہو کوئی گدا اسے بھی سلطان سمجھے

احباب کے حسن ظن کا ممنون ہوں میں جو مورِ ضعیف کو ستیلیاں سمجھے

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار ہے
 پرتھ کو چاہیے کہ تنکا پونگی رہے
 یہ چھراں سلیمان ۳۰ مجہ ۱۳۶۴

مکتوب (۲۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۵ فرجیہ ۱۳۶۴ھ

حضرت اقدس واعلیٰ دام فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
 حضرت والا کی ترقی صحت کا حال سن کر اطمینان نصیب ہوا، امید ہے کہ اب مزاج والا دور
 بہتر ہوگا۔

س۔ میرٹھ، بذریعہ سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

برادر عزیز رفیع اللہ شانکم ووسع رزقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
 الحمد للہ بخیریت ہوں، شفا وداؤں اور تندرستیوں سے زیادہ بزرگوں دوستوں اور عزیزوں
 کی دعاؤں کی برکتوں سے اللہ تعالیٰ کے محض فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔
 غ۔ الحمد للہ کہ حضرت والا کی ہدایتوں پر عمل جاری ہے، استقامت و دوام کے لئے حضور دُعا
 فرمائیں۔

س۔ اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ استقامت کی دولت نصیب فرمائیں۔

غ۔ احقر نے منت مانی تھی کہ حضور کی ترقی صحت کی اطلاع پر ایک روزہ بطور شکرانہ رکھے گا،
 انشاء اللہ کل ہی اس کا ارادہ ہے۔ عجیب تذبذب میں تھا کہ اپنے اس
 حقیر عمل کی اطلاع کرنی چاہیے یا نہیں؛ کیونکہ دو متضاد خیال پیدا ہو رہے تھے، ایک یہ کہ
 اظہار میں دیا ہے، دوسرے یہ کہ اظہار سے محبت و عقیدت کا اظہار ہوگا اور ایسے اظہار

یہ شعر شیخ الشیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے!

کا حدیث شریف سے اشارہ ملتا ہے، اس کشمکش میں یہ بات ظاہر کر دی، صحیح طریق کی رہبری فرمائی جاتے۔

س۔ آپ کا خطرہ صحیح تھا، لیکن جب قلب ریا سے خالی ہو تو اس کا اظہار ریا نہیں بے شبہ یہ مسنون ہے کہ جس سے محبت ہو اس کو اپنی محبت سے آگاہ کر دے، اللہ تعالیٰ اس مخلصانہ محبت کی جزائے خیر دے!

غ۔ چند دنوں پہلے بعد نماز احقر نے اپنی ہمشیرہ کے لئے ترقی ایمان و عمل صالح کی دعا کی تو یوں محسوس ہوا گویا اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں اور ایک اطمینان و امید کا احساس تھا لیکن ساتھ ہی جب اپنی صحت کے لئے دعا شروع کی تو وہ کیفیت جاتی رہی اور یوں محسوس ہوا گویا اللہ تعالیٰ ابھی اس درخواست کو سننا نہیں چاہتے، جبراً دعا کر لی، یہ کہیں اس تغیر حال پر حیرت ہے، اس کی کیا توضیح ہو سکتی ہے؟

س۔ یہ کیفیات ہیں، کیفیت کے تغیر کو دعا کے قبول و عدم قبول سے تعلق نہیں بندہ دعا پر مامور ہے جی لگے یا نہ لگے دعائیں لگا رہے، آپ نے اپنی بہن کے لئے پہلے پہل دعائیں ہو گئی اس لئے اس میں اخلاص کی وہ کیفیت نمودار ہوئی اور اپنے لئے آپ ہمیشہ ہی دعا کرتے ہوں گے، اس لئے اس میں وہ کیفیت نہیں رہی۔ (حرف حرف حق و صداقت کا آئینہ ہے!)

غ۔ خیال آیا تھا کہ اپنے رزق کی کشادگی کے لئے محلہ کی مسجد کے امام صاحب سے بھی دعا کرا لی جائے کیونکہ موصوف بڑے متقی اور حضرت تھانویؒ سے بیعت بھی ہیں لیکن فوراً ایک خیال اس پر غالب آیا کہ تو نے کشادگی رزق کے لئے بار بار دعائیں کی ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ نے سن لی ہیں اور جب وہ مصلحتاً اسی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں تو کیوں دوسروں سے کہتا پھرتا ہے، یہ تو عبدیت کے خلاف ہے! ————— چنانچہ اُن بزرگ سے دعا نہ کرو اسکا البتہ خود کرتا رہتا ہوں، یہ رکاوٹ عموماً پیش آتی ہے البتہ

صرف حضرت والا کی خدمت میں عرض کرتے ہوئے یہ بات پیش نہیں آتی۔ عرض
یہ ہے کہ کیا یہ محض دوسوسہ ہے یا ایک صحیح خیال؟

س۔ ضرور دعا کریں، حاجت اور تکلیف کا ذکر کریں بلکہ صرف یہ کہیں کہ میری فلاح دین و دنیا
کے لئے دعا کریں۔

غ۔ من ذا الذي يقرض الله قرضاً حسناً فيضاعفه اضعافاً كثيرة۔ (قرآن)
کی تفسیر میں حضرت مولانا تھانویؒ نے یہ فرماتے ہوئے کہ تفسیر چرائے نہیں کرتا بلکہ صرف
احتمالاً بیان کرتا ہوں۔ یہ بیان فرمایا ہے کہ "قرض کو بزلِ نفس کے لئے بھی عام رکھا جاسکتا
ہے، ایسی صورت میں ایک جان کی ہزار جانیں ہو جائیں گی یہ قدرتِ حق سے بعید نہیں
اور اگر اس تضاعف کو مان لیا جائے تو وہ حدیث بہت صاف ہو جاتی ہے جس میں
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ جنت کے مختلف دروازے ہوں گے جس شخص میں جو علم
غالب ہو گا وہ اسی دروازے سے بلایا جائے گا۔ اس پر جب حضرت صدیقِ ثلثیؓ نے سوال
کیا تو ارشاد ہوا "وامر جوان تكون منهم" اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ بعض بندوں
کو جسم و روح متعدد عطا فرمائیں گے، حقیقت میں وہ ایک شخص ہو گا لیکن تعددِ جسد
سے وہ متعدد ہو گا اس لئے وہ ہر دروازہ سے الگ الگ جائیگا بھی۔"

پھر فرمایا، صاحبو! جب حق تعالیٰ کے ہاں بزلِ مال میں تضاعف ہوتا ہے جو نفس کے
اعتبار سے اخس و ازل ہے تو بزلِ نفس میں تضاعف کیوں نہ ہو جو اشرف و اعلیٰ ہے
اسی سے یہ مضمون بھی سہل ہو جاتا ہے کہ ایک ایک جنتی کے پاس حق بصر سے بھی زیادہ حوریں
ہوں گی تو ایک ہی وقت میں ہر نعمت و لذت سے منتفع ہونا سہل ہو جائے گا۔ (وعظ
خیر الحیات و خیر المات)۔ حضرت والا مدظلہ کا اس آیت سے متعلق کیا
ذوق ہے؟

س۔ حضرت والا مدظلہ کا یہ استنباط صحیح ہے اور اس پر تعددِ اجسام کا جو خیال ذوقاً ظاہر فرمایا ہے

وہ بھی صحیح ہو سکتا ہے تاہم کسی پر اس کا مان لینا ضروری نہیں !!
 غ۔ حضرت والا! احقر کی دنیوی و آخری صلاح و فلاح کے لئے دعا فرمائیں،
 احقر غلام محمد
 س۔ دل سے دعا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہاں کی نعمتیں عطا فرمائیں!
 بیچمیاں سلیمان

مکتوب (۲۲)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۲ محرم ۱۳۵۵ھ

حضرت مولانا محمد و منامہ فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

س۔ میرٹھ

۱۹ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ

اخی فی اللہ تعالیٰ دام توفیقکم و زاد سعدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ بخیر ہوں۔

غ۔ بھولند حضرت والا! کی ہدایات پر ایک حد تک عمل ہو رہا ہے، سڑکی کی شدت کی وجہ سے
 نماز تہجد کے لئے کچھ نہیں کھلتی، اس لئے اکثر بعد نماز عشاء آٹھ رکعت پڑھ لیتا ہوں اور
 کبھی رات میں بیداری کا قصد کر کے سو رہا اور اپنے امادہ میں ناکام رہا تو آفتاب نکلنے
 پر ۱۲ رکعت نفل یاد کر لیتا ہوں حضرت والا! اس کم ہمت کے لئے قوت مجاہدہ کی دعا
 فرمائیں۔
 س۔ کچھ حرج نہیں،

غ۔ احقر نے بعض مرتبہ اچھی طرح غور کیا تو پتہ چلا کہ دراصل توحید کا اقرار صرف زبانی ہے ،
 قلب میں اس کے اثرات پائے نہیں جاتے حضرت والا میرے قلب کو مسلمان کر دیں
 تاکہ توحید کے جتنے مفہیم عقل سمجھتی ہے اور زبان ادا کرتی ہے ، دل اس کی تصدیق کرنے
 لگے اور عمل سے اس کا اظہار ممکن ہو۔

س۔ توحید کا بڑا مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام اور ہر معاملہ میں ہمارا الہ ہو اور اس کے
 سوا کسی میں نفع و ضرر اور عطا و عدم عطا کی قوت نہیں ، سب اس کے اذن و مشیت
 سے ہوتا ہے ، وہی جو چاہتا ہے سو ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا سو نہیں ہوتا ، سارا عالم
 اس کے زیر فرمان ہے اس کے سوا کسی دوسرے پر حقیقی نافع و ضار اور معطی و مانع
 ہونے کا گمان بھی نہ ہو۔

غ۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ یہ نام کا غلام محمدؐ عمل کا غلام محمدؐ بن جائے اور اس کو
 ذات اقدس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نسبت باطنی کا شرف بھی حاصل ہو جائے
 فقط

تنگ اسلام ، احقر غلام محمدؐ

س۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی بندگی اور عبودیت اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کی محبت و تعظیم و اتباع کی دولت عطا فرمائیں۔

بہچراں سلیمان

ایک عاجز بیانی ہے کہ جملہ کے آئینہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سرگاہ حقوق ہو
 بھی آگاہ فرمادیا تاکہ حق الامکان ان کی پابجائی کی کوشش ہو سکے

مکتوب (۲۳)

غ۔ حیدر آباد دکن ۱۰ صفر ۱۳۶۵ھ

حضرت والادامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

س۔ دارالعلوم ندوہ لکھنؤ

اخی فی اللہ تعالیٰ اسعدکم اللہ تعالیٰ فی الدارین۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! الحمد للہ مع الخیر ہوں!

غ۔ ارادہ ہے کہ اس سال ال، ال، بی (ابتدائی) کے امتحان میں شریک ہو جاؤں، بشرطیکہ حضرت واللہ مناسب تصور فرمائیں۔

س۔ اگر طبیعت قانون سے مناسبت رکھتی ہو تو بدرجہ مجبوری اس کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔
(اپنی طبیعت کو قانون اور ریاضی سے کبھی کوئی مناسبت ہی نہیں رہی، اس لئے ان امتحانوں کا ارادہ بھی پورا نہ ہو سکا)

غ۔ مجلس اتحاد المسلمین کے بعض معاملات میں پچیدگی پیدا ہو گئی ہے اور انتشار کے آثار نمایاں ہیں، موقع کی نزاکت کا اعتبار کرتے احقر نے بعض احباب کے ساتھ مل کر ان کاموں میں کچھ عملی دلچسپی لی لیکن اس کی وجہ سے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تعلق مع اللہ نسبتاً کم ہو رہا ہے، حالانکہ کوئی بات خلاف شرع کی گئی نہ نیت فاسد تھی اس کی وجہ کچھ میں نہیں آئی؟

س۔ اختلاط مع الانام بے شبہ تعلق باللہ میں خارج ہے گو اپنی نیت صحیح ہو جس کا ثواب ملے گا مگر نجاستوں کی پبیدی سے توجارہ نہیں، اگر کوئی کونلمہ کے گرد و غبار کو حسن نیت سے صاف کرے تو ثواب تو ملے گا مگر ہاتھوں اور کپڑوں میں سیاہی لگنا بھی ممکن ہے!

غ۔ احقر عجیب متضاد کیفیات میں مبتلا ہے، شہر کی زندگی سے دل رکھا ہو چکا ہے اور جی چاہتا ہے کہ کسی دیہات ہی میں رہ پڑوں تو شاید صحت اچھی ہو جائے لیکن ساتھ ہی بعض رکاوٹیں ہیں جو اس راہ میں حائل اور اشد ہیں، مثلاً علم دین سیکھنے کی تڑپ، طب یونانی جس کا مطالعہ جاری ہے، ایسے ہی بعض اور فوائد جو صرف یہیں حاصل ہیں، غرض

س۔ چونکہ ہم اپنے ذہن میں پہلے اپنی خواہش سے کچھ آرزوئیں مقرر کر لیتے ہیں اس لئے اون کے نہ ملنے سے ہم ملول خاطر ہوتے ہیں، اگر رضا بالقضا پر عمل کیا جائے کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مشیت و مصلحت سے ہے اور اسی میں حکمت ہے تو غم اور ملال نہ ہو، جو افسردگی کا باعث ہے۔

(حصولِ راحت کا گڑاُس کے سوا کوئی اور ہو بھی سکتا ہے؟)

غ۔ حضرت والارہ کا قرب نصیب ہوتا تو بہت سی غلط باتیں اندر خود رخ ہو جاتیں مگر اس کا موقع بھی حاصل نہیں۔

س۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ موقع ممکن ہے کہ آئے۔

غ۔ حضرت والارہ کی خاص دعاؤں کا محتاج ہوں۔

احقر العباد غلام محمد

س۔ آپ کے لئے ہمیشہ دعا کرتا ہوں، والسلام

یہ چال سلیمان، ۱۴ صفر ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۲۴)

اس وقت احقر کی کتاب "قائد ملت" سوانح بہادر یار جنگ مرحوم چھپ کر نکل آئی تھی اب کی مرتبہ جو احوال نامہ خدمتِ سلیمانی میں پیش کیا گیا تو اس کے ساتھ اپنی تالیفِ حقیر کا ایک نسخہ بھی ہدیہ کر دیا گیا تھا، اس ہدیہ سے متعلق حضرت والارہ نے ایک لک کاغذ پر جواب عطا فرمایا، پہلے یہ حکمت نامہ ملاحظہ کیجئے اور پھر احوال نامہ !!

س۔ اعظم گدھ

برادر عزیز القدر اشدکم اللہ تعالیٰ، السلام علیکم

اٹھارہ روز کے لئے وطن گیا ہوا تھا، واپسی پر کتاب ملی، جا بجا سے پڑھی، آپ نے جس

مذہب سے کتاب لکھی ہے صحیح ہے۔ معارف میں ریویو ہوگا،
 قلمیں استیاض معلوم ہوتی ہے، غلو اور عدم اعتدال سے بات غلط بھی ہو جاتی ہے اور تکثیر
 سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

علا ہے کہ آپ کو مزید توفیقات خیر حاصل ہوں۔ والسلام

سیّد سلیمان، ۲۰ ربیع ۱۳۶۵ھ

’احوال نامہ‘

غ۔ حیدر آباد دکن

۶ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مدظلہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

س۔ اعظم گڑھ

اَنِّیْ فِی اللّٰہِ تَعَالٰی اِذَا تَلَمَّ اللّٰہُ تَعَالٰی عِرْفَانِہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! الحمد للہ کہ فقیر خیریت ہے، سفر کے باعث حجاب میں
 تاخیر ہوئی، انتظار کی معافی چاہتا ہوں، (اللہ سے تواضع، اپنے خدام کے ساتھ یہ معاملہ ہے)

لہ وہ جذبہ یہ تھا کہ لوگوں نے بہادر یار جنگ مرحوم کو محض ایک قوی لیڈر سمجھا حالانکہ وہ ایک سچے اور سچے مسلمان
 اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین تھے، ان کی خاموش تبلیغی مساعی جس کی وجہ سے (۲۰) ہزار ہندو
 مسلمان ہو گئے، اُن کی راتوں کی گریہ و زاری، اور اُمتِ محمدیہ سے سچی محبت اور اس کی بے ثلوث خدمت گدازی
 وہ اوصاف تھے جو عوام کی نگاہ سے محض تھے، میرا مدعا یہی رہا کہ اُن کی ظاہرہ فتح مندوں کے پیچھے جو باطنی
 موثرات کا فسر مانتے، اُن کو اُجھڑا کر دوں، بھرا اللہ کہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس جذبہ کی
 توثیق فرمادی!

غ۔ آج سے ایک سال قبل "الشرف السواح" پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور اب پھر اس کی سعادت ملی ہے، لیکن تاثرات جدایں، گذشتہ مرتبہ بار بار یہی حسرت پیدا ہوتی تھی کہ کاش مولانا تھانویؒ کی صحبت میسر آتی، لیکن اب کی بار یہ خیال راسخ ہوتا جا تا ہے کہ "مرد کامل" میسر ہے اپنے آپ کو اس کے آگے "پامال" کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ اس بے بہمت کی مدد فرمائیں۔

س۔ آپ کا پہلا جذبہ تحسُّر کا تھا جو مدوح ہونے کے باوجود مفید عمل نہ تھا، موجودہ جذبہ قناعت کا اور موجود کی قدر پر ہے، اگر اس سے بھی استفادہ نہ کیا گیا تو صاحبِ سواح کے برکات سے محرومی کی رہے گی، یہ جذبہ محرک عمل اور مفید عمل ہے اور اسی کی ضرورت تھی سو بحمد اللہ پیدا ہو گیا، کیا جوابِ لا جواب ہے، سبحان اللہ،

غ۔ حضرت والا! دے عقلی و طبعی عشق بڑھتا جا رہا ہے، البتہ اس میں دو متضاد کیفیتیں محسوس ہوتی ہیں، کبھی جی چاہتا ہے کہ ہر ایک کو حضرت والا کا خادم بنا دیا جائے اور کبھی جی چاہتا ہے کہ بس ایک اتھرو کی حضرت والا کا خادم ہوا اور حضرت والا کی تمام تر توجہات اسی ایک پر ہوں۔

س۔ یہ دونوں جذبے درست ہیں اور دونوں کیفیتیں محبت پر وال ہیں، محبت کے یہ دونوں رنگ ہیں۔

پہلا۔۔۔۔۔۔ یار کا کلمہ پڑھیں ہندو مسلمان تو سہی

دوسرا۔۔۔۔۔۔ یا سایہ ترا نمی پسندم

آہ! اب ایسے پُر شفقت و دلدل باجوابات کون لے گا،

غ۔ حسبِ ہدایت خالی اوقات میں استغفار یا درود شریف پڑھا کرتا ہوں مگر بعض دفعہ

صرف زبان ہی مشغول رہتی ہے، ذہن کہیں اور ہی ہوتا ہے!

س۔ کوئی حرج نہیں، یہ بات بھی انشاء اللہ جاتی رہے گی۔

غ۔ چند دنوں سے اپنے سوا کسی اور کے لئے دعا کرنا مشکل ہو گیا ہے، بجز یہی کسی اور کے لئے ایک لکھ کلمہ زبان سے نکلتا ہے تو یہ خیال آجاتا ہے کہ تیری سستی ہی کیلئے جو تو دوسرے کی سفارش بارگاہ رب العزت میں کر رہا ہے، اور تو جس کی سفارش کر رہا ہے وہ تو تجھ سے بہر حال بہتر ہے، بس غ۔ تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی نمیز تو

س۔ جی ہاں، یہ کیفیت ہے، بات تو یہی ہے مگر ہم اس پر مامور ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں دلعنڈے خیر کریں، میں تو ہم ایسے ہی ناقابلِ مکررب العالمین نے اپنی غایتِ کم سے ہم کو یہی حکم دیا ہے کہ تم بہر حال میں جیسے بھی ہو، دعا کرو اور مانگو، اس لئے یہ حکم بجالانا ہے وہ اپنی ربوبیت اور رحمت سے قبول فرمائیں گے۔

(یعنی نقطہ نظر کو بدل دیا گیا کہ محرک دعا تعیل حکم الہی ہے اور بس)

غ۔ بعض دفعہ تنہائی میں اشعار گنگناتا ہوں تو ایک خاص کیف محسوس ہوتا ہے، اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

س۔ تنہائی میں کوئی حرج نہیں!

غ۔ پہلے طبیعت تقریر کی طرف مائل تھی اور خیالات کی فراوانی محسوس ہوتی تھی، اب حالت برعکس ہے حتیٰ کہ بعض دفعہ کسی معمولی سوال کا جواب بھی بن نہیں پڑتا، البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیچیدہ اور مشکل سوال کا نہایت آسان اور تسفی بخش جواب ذہن میں ایسا آجاتا ہے کہ خود کو بھی حیرت ہوتی ہے۔

س۔ یہ حالت حسبِ توقع ہے، پہلے معرفت حاصل نہ تھی، اب ہو رہی ہے من عرف ربہ فقد کلی لسانہ اور دوسری چیز نعمت ہے جو اس معرفت کا نتیجہ ہے،

غ۔ بعض مرتبہ قرآن مجید پڑھنے کی رغبت نہیں ہوتی لیکن جب طبیعت پر جبر کر کے کلامِ پاک کھولتا ہوں اور چارچھ آیات تلاوت کر لیتا ہوں تو فوراً دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

س۔ سب کیفیات مستحسنہ ہیں، یہی اس ہدایت کا مصداق ہے، الدین جاهد و افینا

لنهدینہم سبیلنا — پہلے مجاہدہ کرتا ہے پھر ہدایت ہوتی ہے۔

غ۔ حضرت واللہ کا خیال تھا کہ حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح مرتب فرمائیں، امید ہے کہ یہ کام انجام پا رہا ہوگا اگر حضرت واللہ کے ہاتھوں یہ کام ہو گیا تو اس کی نوعیت بہت اعلیٰ و نفع ہوگی۔

س۔ انشاء اللہ دعا کیجئے کہ اتمام کی مہلت ملے۔

غ۔ آج کل اپنی کوتاہیوں اور بُرائیوں کا احساس قوالحمد للہ بہت ہے لیکن قوت مجاہدہ کم ہے۔

س۔ مجاہدہ یہی ہے کہ بہت و عزیمت کو کام میں لایا جائے، یہی کئی قوت کا علاج ہے۔

غ۔ حضرت واللہ سے درخواست ہے کہ اس بے عمل کے لئے استقامت دین کی دعا فرمائیں

فقط خادم غلام محمد

س۔ دلی دعا ہے، والسلام بیچراں سلیمان ۲۷ ریح الاول ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۲۵)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۲ ریح ۲ ۱۳۵۵ھ

حضرت اقدس و اعلیٰ مد فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ حضرت واللہ کی ہدایات پر عمل جاری ہے، استحکام و دوام کے لئے دعا کی درخواست

پیش ہے۔

س۔ آعظم کڈھ

انحی العزیز زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بڑی بات ہے، ہوقین حقیقی تعالیٰ العجۃ کا شکر ادا کیجئے کہ وہ آپکو استقامت کے ساتھ لے چل رہا ہو

لے گویا پتہ کی بات یہ بتلا دی ہے کہ نعمت حاصلہ کے دوام و ترقی کا مازیہ ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے کیونکہ
دسہ سہانی ہے لأن شکرہ لا یزید نیکہ۔

دعا ہے کہ مزید ثبات اور استقامت نصیب فرمائے۔

غ۔ کل رات بعد نماز تہجد ایک عجیب خواب دیکھا، اطلاعاً درج ذیل ہے۔

احقر اور مولانا عبدالجبار صاحب راستہ سے چلے جا رہے ہیں کہ ایک کافر مصیبت سے تڑپتا ہوا لب سڑک دکھائی دیا، میرے دل میں ہمدردی کا خیال پیدا ہوا، ایسے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک لکڑی کے تختہ پر ہوا میں معلق اس سے قریب ہونا چاہتا ہے لیکن ہونا نہیں سکتا، میں نے مولانا عبدالجبار صاحب سے کہا کہ دیکھئے میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر کر نہیں سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے گوشت اور پوست کا پورا جسم اپنے کندھے پر ڈالے ہوئے مولانا کے ساتھ چل رہا ہوں (جیسے کوئی کندھے پر دو مال ڈال لیتا ہے) غرض ہم چلتے رہے یہاں تک کہ آبادی سے باہر ایک قبرستان میں پہنچے جہاں ایک قبر قد آدم سے بھی زیادہ گہری کھدی ہوئی تھی، میں نے اپنے گوشت پوست کے جسم کو اس کے اندر ڈال دیا اور ہم دونوں کچھ دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے، ایسے میں ایک آواز آئی اور ہم دونوں نے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے بھر دیا اور واپس ہو گئے اس کے بعد آنکھ کھلی طبیعت پر ایک سکون تھا۔

س۔ یہ کافر نفسِ امارہ ہے، آپ کی اپنی لاش آپ کا مرتبہ فنا کے قریب ہونے پر دال ہے حدیث میں ہے عَدَّ نَفْسَكَ مِنَ الْأَمْوَاتِ (اپنے کو مَرُودوں میں سے گنو)، یہ کیفیت اسی مرتبہ فنا کی طرف اشارہ کرتی ہے! ایک مشہور عام حدیث صوفیہ میں مروج ہے، یہ ہے مَوْتُوا قَبْلَ أَنْ تَمُوتُوا (مرنے سے پہلے مر جاؤ) یعنی جسمانی موت آنے سے پہلے اپنی نفسانی خواہشوں اور اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بھی تم کچھ وجود رکھتے ہو موت طاری کر لو! (تعبیر کو کسی آیت یا حدیث سے مؤید کر دکھانا یہ خاص مذاقِ سلطانی تھا) غ۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بزرگ سنی کا جس کو محبت ہو ذکر ہو رہا ہو تو غیر اختیاری طور پر دل بھر آتا ہے، حالانکہ جو واقعات زیر بیان ہوتے

میں وہ غمگین نہیں ہوتے !

س۔ یہ دل بھر آنا محبت کے اقتضاء سے ہوتا ہے ، اور یہاں کسی محبوب کی بات نہیں ، یہ تو اور ہی کیفیت ہے !

غ۔ ”بلاغ البین“ کے نام سے ایک کتاب ”اہل حدیث“ حضرات کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اس کو مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بتایا گیا ہے ، کیا یہ کتاب واقعتاً شاہ صاحب کی ہے ، اگر ہے تو اس میں بعض مسائل ایسے ملتے ہیں جن میں شدتِ حادثہ سے نام نہ ہے اور خود حضرت شاہ صاحب کے عمل سے اس کی تردید ہوتی ہے مثلاً پیری مریدی کا رد ، استغفارِ قبور کی سرے سے تردید وغیرہ ۔۔۔۔۔۔ حضرت والا حقیقت سے آگاہ فرمائیں ۔

س۔ میں نے شاہ صاحب کا یہ رسالہ نہیں دیکھا ۔

اوس پیری مریدی کا رد ہو گا جو دوکانِ دالِ صوفیہ میں مروج ہے ، اسی طرح اوس استغفارِ قبور کا رد ہو گا جس سے شرک لازم آتا ہے ۔

(بعد میں تحقیق سے پتہ چلا اور خود حضرت والاؒ نے بھی تصدیق فرمائی کہ یہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف ہے ہی نہیں بلکہ کسی نے لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے ، تاکہ شاہ صاحب کو ماننے والے ان عقائد کو مان لیں ۔۔۔۔۔۔ انا للہ المصلحین دین کی یہ بددیانتی !!)

غ۔ حضرت والاؒ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ احقر کو ایمان و عمل صالح کی دولت سے سرفراز فرمائے ۔ احقر غلامِ محمد

س۔ آپ کے لئے اور اپنے لئے بھی دلی دعا ہے کہ ایمانِ کامل اور عمل صالح کی بیش از بیش توفیق ارزانی ہو ۔

امید ہے کہ آپ تعمیرات میں کام کر رہے ہوں گے ، آئندہ اس سے مطلع کریں کہ دل

لگا رہتا ہے،

بہارِ مسلمان ۱۸، دیکھ ۲، ۱۳۶۵ م

(اللہ اللہ، کیا شفقت و توجہ تھی، مجھے تو حضرت والارہ کی ارادت میں اگر سیرۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض پہلو ایسے سمجھ میں آئے کہ گویا عین الیقین پیدا ہو گیا، منجملہ ان کے حضور اکرم کی مومنین پر "رحمت و رافت" کی کیفیت کا اندازہ اور اس کا یقین کامل اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے حضرت سیدی قدس سرہ کو خود میرے اپنے معاملات میں اور دوسرے بلادِ انِ طریقت اور اس سے بھی بڑھ کر عامۃ المسلمین کی عام تکالیف میں انتہائی مضطرب و پریشان ہوتے، اور ان کے درد کی حتی الامکان درمانی فرماتے اور ان کے لئے چل چل کر دُعا کرتے ہوئے دیکھا، اور اسی طرح مسلمانوں کی راحت و ترقی سے حضرت کو ایسا مسرور ہوتے دیکھا گویا خود ان کو کوئی بڑی نعمت مل گئی ہے۔۔۔۔۔ یہ اسوہ نبویؐ کا پر تو نہیں تو اور کیلئے؟ اور اس پر تو کئے مشاہدہ سے اصل کا یقین کامل پیدا ہو جانے تو حیرت کی کون سی بات ہے !!)

مکتوب (۲۶)

خ۔ حیدر آباد دکن

دیکھ الثانی ۱۳۶۵

حضرت اقدس واعلیٰ مد فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

س۔ پٹنہ، بھنور پور کھر بدریہ سید ابو عاصم صاحب وکیل

صدیقی الحیم زاد کم اللہ تعالیٰ عرفاناً

الحمد للہ مع الخیر ہوں۔

غ۔ محکمہ معتمدی تعمیرات میں کام کر رہا ہوں، حضرت والدہ کی دعاؤں کی برکت سے کام کرنے میں پہلی سی الجھن بھی نہیں رہی، استقلال ملازمت کی دعا فرمائیں۔

س۔ بحوالہ تعالیٰ کہ آپ کو اس طرف سے گونہ طمانیت نصیب ہوئی۔ دعا ہے کہ آپ اس میں مستقل کر دیئے جائیں، آپ کے افسر اعلیٰ کون ہیں؟

غ۔ گذشتہ عرصہ میں احقر کے ایک خواب کی جو تعبیر حضرت والدہ نے عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ اس کو احقر کے حق میں سچا کر دے لیکن فی الوقت تو احقر نفسانیت اور خباثت میں گھرا ہوا ہے، اپنی طاقت کے مطابق ان سے خلاصی کی کوشش کر رہا ہے حضرت والدہ کی توجہات درکار ہیں۔

دو ہفتہ مراد من افتاد صد گرہ

باناخن مڑہ مگر اس عقدہ داکنند

س۔ اپنے میں نقائص کا نظر آنا مبارک ہے۔ جب تک مرض کی تشخیص نہ ہو علاج کیسے ہو، اب آپ کو اپنے اندر جو عیوب معلوم ہوتے ہیں، دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے ادن کے ازالہ کی درخواست کیجئے اور پھر کوشش کر کے ادن کے مقتضات پر عمل سے احتراز کیجئے، یہی مجاہدہ ہے **كَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ لَهِیَ لَمَّا وَاوَىٰ**۔

غ۔ ۱۔ خلاف طبیعت اور پر غصہ بہت ہے،

ب۔ حرص دنیا کا فی ہے گو اس کو دبانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ج۔ نفس کو اپنی برتری کی خواہش رہتی ہے۔

د۔ حضوری قلب حاصل نہیں۔

س۔ ۱۔ غصہ کو دبا دینے والا **كَالْظُلُمِ الْغَیْظِ** میں بیٹے اور جس وقت غصہ آئے تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ہم پر بہت زیادہ اختیار ہے پھر بھی وہ معاف فرماتا ہے تو ہم کو بھی ایسا بنی چاہیئے۔

ب۔ حرص دنیا میں یہ غور کیجئے کہ جس کی حرص ہے وہ کہاں تک ضروری ہے،

ع۔ انچہ مادرو کار دایم اکثر شش درکار نیست

پھر اس کی جواب دی گئی ہے جس قدر زیادہ ہے اس کا قدر مواخذہ ہے تَرْتَسُّسُنَّ
يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيَةِ ہر نعمت کی باز پرس ہوگی _____ حرص دنیا میں نہیں دین
میں ہونی چاہیے کہ قرب الہی علم حقیقی اور نعیم جنت کی حرص میں ترقی ہو۔

ج۔ نفس کی برتری کی خواہش پر عمل نہ کیجئے اور تواضع اختیار کیجئے، اسی سے برتری ملتی ہے
مَنْ تَوَاضَعَ لِلَّهِ سَاقَعَهُ اللَّهُ،

د۔ حضور قلب کا حصول ذکر و شغل کی ترقی کے ساتھ ہوتا چلائے گا، انشاء اللہ۔ قلب بحر
افکار سے خالی رکھنا چاہیئے تاکہ اس میں نور الہی بھر سکے،

(سبحان اللہ کیا اکسیر معالجات تجویز فرماتے ہیں!)

غ۔ البتہ یہ حضرت والا ہی کی دعاؤں کی برکت ہے کہ مذکورہ رذائل کلیۃً غالب نہیں ہوتے
اور دین کی فکر غالب رہتی ہے اور بعض دفعہ جو سکون حالت نماز، دعایا و ذکر میں حاصل
ہوتا ہے وہ اور کسی صورت میں میسر نہیں آتا۔

س۔ ایسا تفاوت ہوتا رہتا ہے، اگر دوام ہو تو لطف و لذت نہ ہوگا، جس کو ہر روز پلاؤٹے
گا وہ پلاؤ کے لطف سے محروم ہو جائے گا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اگر میرا پیار
اور بھوک اور میری بچے بعد دیگرے صورت بدل کر پیش نہ آتی رہے تو کیا لذت طعام اور
لذت آب حاصل ہوگی؟

غ۔ مولانا عبد الجبار صاحب کے مشورہ اور اصرار پر بعد نماز فجر قریب کی ایک مسجد میں سیرت
طیبہ بیان کر رہا ہوں، ہفتہ میں دو دن خود مولانا تفسیر و حدیث کا درس دیتے ہیں اور دو
دن ایک اور صاحب تاریخ اسلام سناتے ہیں اور دو دن احقر کے ذمہ سیرت کا بیان
کر دیا گیا ہے، احقر نے صرف دو وجوہ سے یہ خدمت قبول کی ہے (۱) اس سے مطالعہ

شیخ کا کمال کہ وہ اپنی نسبت یوں ہی سمجھتا رہے باقی مرید کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا نفع
شیخ کی توجہ پر منحصر ہے،

غ۔ حضرت والا! احقر کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے دعا فرمائیں۔ احقر غلام محمد
س۔ دلی دماغ ہے۔

اپنے نام کے ساتھ بنی، لے عثمانیہ آپ کب تک لکھیں گے، کیا اس سے خط کی حفاظت
مطلوب ہے یا کچھ اور؟

یہ جہاں سلیمان ۱۱ ج ۱ ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۲۷)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۱ ج ۱ ۱۳۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ وامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک!

س۔ دینہ۔ ضلع پٹنہ

برادر محبوب زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

الحمد للہ مع الخیر ہوں، وطن میں ہوں اور جون کے آخر تک یہیں رہوں گا۔

غ۔ احقر کو اب تک مغالطہ رہا کہ ذکر کی اقل مقدار تین ہزار ہے، اب جو حقیقت کا علم ہوا تو
احقر نے اس کی مقدار بڑھا کر باہ ہزار کر دی ہے اور چار روز سے اس پر عمل پیرا ہے، صحت
جسمانی ساتھ دے تو انشاء اللہ محنت سے کبھی دریغ نہ ہوگا۔ حضرت والا! رح کی

توجہات عالیہ کے ہوتے ایمد ہے کہ اللہ تعالیٰ افضل فرمائیں گے اور بہت وعایت و سر فرازی ہوگی، حضور احقر کی صحت جسمانی و روحانی کے لئے دُعا فرمائیں۔

س۔ رفتہ رفتہ بڑھاتے جیسے ۴ ہزار سے ۶ ہزار پھر ۸ ہزار پھر ۱۰ ہزار پھر ۱۲ ہزار تاکہ طبیعت پر گرائی نہ ہو، (اس نصیحت کی قدر بعد کو ہوئی) اور تب ہی سمجھیں آیا کہ ۳ ہزار سے ۴ ہزار کرنے پر تو مبارک باذلی اور اب بارہ ہزار کرنے پر کوئی شاباشی کیوں نہیں ملی،

غ۔ احقر کے افسر اعلیٰ ہوش یا درجنگل انظر الحسن ہوش بلکامی مرحوم) ہیں جو زائد متعدد تعمیرات ہیں! س۔ یہ معلوم ہو کر اطمینان ہوا، وہ میرے دوست ہیں۔

غ۔ مولانا محمد علی صاحب لکچرار دینیات جامعہ عثمانیہ سے حضرت والارہ واقف یوں گے ان کی صاحبزادی سے احقر کی نسبت قرار پائی ہے۔ بعض دفع اس کے تصور کو قلب میں انتشار و اضطراب محسوس ہوتا ہے کہ کہیں شادی کے بعد جو کچھ بھی معمولات ہیں ان میں حرج یا ضعف واقع نہ ہو جائے، حضرت والارہ دُعا فرمائیں!

س۔ بہت مناسب ہے، انشاء اللہ تعالیٰ توفیق مزاج حاصل ہوگا، مولوی صاحب موصوف کو اب حضرت والارہ اللہ کے سلسلہ سے تعلق ہے، یعنی خود حضرت سیدگی ہی کے دست گرفتہ ہو گئے تھے

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس تعلق کو بابرکت بنائیں۔

غ۔ ”بن ملے“ کے حروف اپنے نام کے ساتھ محض حفاظت خط کے لئے لکھا ہوں ورنہ اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، خصوصاً حضرت والارہ کی خدمت میں تو لکھتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے،

س۔ کچھ حرج نہیں۔

لے ہوش کی شنوی ”طوفانِ محبت“ پاکیزہ اودا اصلاحی ادب کا مرقع ہے، اور شیعہ ہونے کے باوجود رتقہ دانی

میں ان کے پرورد مضامین، عجب نہیں کہ سرمایہ نجات بن جائیں!

غ۔ ہر سلسلہ دعا لئے ملازمت حضرت والدہ نے ”یادِ کباب“ پانچ سو مرتبہ پڑھتے رہنے کی ہدایت فرمائی تھی، کیا اس کو اب بھی جاری رکھا جائے؟

س۔ چھوڑ سکتے ہیں،

غ۔ ”حجۃ اللہ الباقیہ“ کا ترجمہ شائع کردہ کرم بخش صاحب مالک مطبع اسلامی لاہور، احقر کے پاس ہے، اس ترجمہ کے متعلق حضرت والدہ کی کیا رائے گرامی ہے؟

س۔ یہ ترجمہ جا بجا غلط بھی ہے اور اکثر ناقابلِ فہم، بہر حال آپ کو اگر کہیں مفادِ عام پیش آئے تو پوچھ لیں،

غ۔ حضرت والدہ احقر کے لئے فلاح دارین کی دعا فرمائیں، احقر العباد غلام محمد

س۔ دلی دعا ہے کہ آپ کو دین و دنیا کی فلاح و سعادت اور استقامت نصیب ہو۔ والسلام
بیمہدائیں سلیمان، ۲۷ ج ۲، ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۲۸)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۶ ج ۲، ۱۳۶۵ھ

حضرت اقدس دام علی مد فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزارِ اقدس!

گذشتہ شفقت نامہ میں حضرت والدہ نے احقر کو نصیحت فرمائی ہے کہ ذکر کی مقدار بتدریج بڑھانی چاہیے تھی، لیکن احقر تو اس شفقت نامہ کے صادر ہونے کے قبل ہی باہر ہزار پر عامل ہو چکا ہے، اب اگر گھٹا کر اضافہ تدریجی کروں تو ڈر ہے کہ حیلہ جو طبیعت کو آئندہ اور امور میں بھی جیل بازی کی خونہ پڑ جائے اس لئے باہر ہزار کی مقدار کو اس حدِ بیضہ کا جواب ملنے تک جاری رکھوں گا، آگے جیسا ارشاد ہو، حضرت والدہ دوام کے لئے دعا فرمائیں،

س۔ دینہ، ضلع پٹنہ

اٰخِی فی اللہ تعالیٰ دَامَ تَوْفِیْقُکُمُ لِلْخَیْرِ وَالسَّعَادَةِ۔ اِسْلَامٌ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُہٗ

الحمد للہ مع الخیر ہوں،

اللہ تعالیٰ دوام واستقامت بخشیں،

غ۔ دو مقامات پر غیبت زیادہ ہوتی ہے، ایک دفتر، دوسرے گھر۔ ابتدا غیبت سننے سے ہوتی ہے اور بسا اوقات انتہا غیبت کرنے پر!! حضرت واللہ اس سے حفاظت کی کوئی تدبیر بتائیں۔

س۔ تدبیر اس کے سوا اور کیلے کہ آپ دشمنین یا احباب کو منع کریں، اس مقام سے اڑھ جائیں یا اس کی (جس کی غیبت ہو رہی ہو) تعریف کرنے لگیں،

غ۔ "اِنَّا عَمَّاۤ اِلَہٰۤ اَلَاۤ اَعْلَمُوۡۤا" والی آیت پاک میں "امانت" کا معین مفہوم کیلے؟

س۔ امانت، اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کے وہ عکوس و ظلال ہیں جو بندہ کو بطور خلافت ملے ہیں پوری توضیح رائدیر والے خطبہ الجہد والجہاد علی المعاش والمعاد میں کی جا چکی ہے اور آپ پڑھ چکے ہیں،

غ۔ احقر کی فلاح دین کے لئے حضرت واللہ دعا فرمائیں، احقر غلام محمد عفی عنہ

س۔ دل سے دعا بدرگاہ حق تعالیٰ ہے۔ یہ چھ ماہ سید سلیمان ۲۶ مئی ۱۹۴۶ء

مکتوب (۲۹)

غ۔ حیدر آباد رکن

۶ رجب ۱۳۶۵ھ

حضرت مولانا محمد و مناد ام الطافم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک!

حضرت دالارہ کی احقر کے حال پر چوہر بانیاں ہیں اور حضرت کو احقر کی دینی و دنیوی فلاح کی جو فکر رہتی ہے (دنیوی فلاح کی فکر کا یہ واقعہ ہوا تھا کہ حضرت دالارہ نے بلا میرے عرض کے ہونے از خود ہوش یا درجنگ مرحوم معتمد وزارت تعمیرات کو ایک پر زور سفارشی خط تحریر فرمادیا تھا کہ وہ میری ترقی کا خاص طور پر خیال رکھیں) اس سے ایک اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین کی ہر جہتی فلاح کی کتنی فکر رہتی ہوگی۔
یہ باتیں اب محسوس ہو رہی ہیں!

س۔ اعظم گڈھ

اثنی فی اللہ تعالیٰ ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

الحمد للہ من الخیر ہوں،

اللہ تعالیٰ سچی پیروی کی توفیق بخشیں۔

غ۔ چند روز سے طبیعت میں اک طرح کا انقباض تھا، الحمد للہ کل شام سے حالت اعتدال

پر ہے،

س۔ بحمد اللہ،

غ۔ مسجد کے پہلو یا صحن مسجد میں قبر بنانا یا جہاں کسی بزرگ کا مزار ہو اس کے قریب مسجد تعمیر

کرنا درست ہے یا نہیں؟

س۔ درست ہے۔

غ۔ خاتمہ السوانح ”مولانا تھانوی قدس سرہ کی سوانح کا آخری حصہ، پڑھنے کی سعادت

حاصل ہوئی، جیسے ہی کتاب ختم ہوئی قلب میں ایک اضطراب پایا ہوا اور ہیبت طاری

ہوئی کہ اپنی اس موجودہ حالت میں موت آگئی تو کیا حشر ہوگا؟

س۔ بہت اچھا احساس ہے، مبارک!

غ۔ شبہ یہ ہے کہ اصطلاح صوفیہ میں جسے ”طے سلوک“ کہا جاتا ہے کیا یہ شرعاً ضروری ہے؟

اگر ہے تو اس کی اہمیت کس قدر ہے؟ فرائض کے برابر یا نفل کے درجہ میں؟

(یہ سوال کئے ذہنوں کی غلطی کی نمائندگی کر رہا ہے اس لئے جواب بھی ذرا غور کر سنیے)

س۔ اوس کے مقاصد جو ہیں وہ حسب درجات فرض یا سنت یا مستحب ہیں مگر اوس کے ذرائع
جوابی سلوک نے لکھے ہیں وہ اکثر اجتہادی ہیں اور بعض منصوص بھی ہیں، اس لئے اجتہادی
کا درجہ کمتر اور منصوص کا درجہ ضروری کا ہے، غرض سب کا یکساں حال نہیں اجتہادی
امور کا قبول ضروری نہیں، اگر ان اجتہادی ذرائع سے بہتر ذرائع ہوں تو ان کو اختیار
کیا جائے۔

(کیا ایجا زہ ہے کہ دنیا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور کیا عدل ہے کہ کوئی بات اپنی
حد سے تجاوز نہ کر سکی،)

مغ۔ کیا صحابائے کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے زمانہ میں تربیت نفس کے ایسے ہی یا
اس کے مماثل طریقے ملتے ہیں جو آج مائج ہیں؟

س۔ بعض تھے، بعض نہ تھے، مثلاً کثرت نوافل، کثرت ادعیہ، اتباع سنن، کثرت
تلاوت وغیرہ امور موجود تھے البتہ ذکر و فکر کے رائج الوقت طریق نہ تھے اور نہ اون
کو ان کی ضرورت تھی (کیونکہ وہ سرچشمہ فیض سے راست فیضیاب تھے)،

مغ۔ ڈرتے ہوئے اپنی اس کیفیت کا اظہار کر رہا ہوں کہ گو عقلاً چاروں خلفائے کرام کا احترام
ملفوظ رہتا ہے لیکن حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی سے زیادہ عشق محسوس ہوتا ہے۔

حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ سے نہیں۔ یہ بات اس وجہ سے بھی ظاہر کی ہے کہ اکثر کہا
جاتا ہے کہ بیشتر سلسلے حضرت علیؓ سے ملتے ہیں اور احقر کو حضرت علیؓ سے عشق کی لگاؤ
نہیں، کہیں یہ حالت احقر کے لئے مضر اور اس راہ میں حائل تو نہیں؟

والسلام احقر غلام محمد

س۔ یہ اعتقاد کہ یہ چاروں خلفاء اللہ تعالیٰ کے مقبول اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے محبوب تھے ضروری ہے لیکن دل کا رجحان ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، مگر کسی کی بھی تنقیص نہ ہو۔ ————— مناسبت الگ چیز ہے وہ ہر ایک کو ہر ایک سے یکساں نہیں ہوتی اصحابی کا لہجہ، باہمہم اقتدا یتیم اہتدایتم
بچہاں سلیمان ۲۰ جون ۱۹۳۶ء

مکتوب (۳۰)

افسوس کہ گم ہو گیا، مگر اس کا مضمون عام اہمیت کا نہ تھا، ————— خیر تھی کہ قریب میں حضرت علامہ قدس سرہ حیدر آباد دکن تشریف لائیں گے، اس کی توثیق مانگی گئی تھی اور جواب امید افزا نہیں بلکہ حسرت خیز ملا تھا۔

مکتوب (۳۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲ رمضان ۱۳۶۵ھ

حضرت مولانا دُخدومنا مدظلہم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بُرا رک!

والا نامہ پڑھ کر رنج ہوا کہ حضرت والا کی تشریف آوری کی حوا میدہی وہ ٹوٹ گئی
احقر تو اپنی حد تک یہ محسوس کرتا ہے کہ بلا صحبت شیخ اصلاح جیسی ہونی چاہیے نہیں ہو
سکتی (اور اب تو یہ احساس احساس نہیں رہا بلکہ ایقان کا درجہ حاصل کر چکا ہے) اور
افسوس کہ نہ حاضری کی سہولت فراہم نہ جملانے کی سکت موجود!

س۔ بھوپال، عقب موتی مسجد

۹ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

اُحیٰ وحبیبی فی اللہ تعالیٰ زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے۔

یہ شبہ آپ کو تکلیف ہوئی ہوگی جو نتیجہ ہے آپ کی اوس محبت کا جو آپ کو اس بچہاں کے ساتھ ہے، آپ کو جب فرصت یا دھست مل سکے یہاں آسکتے ہیں، ممکن ہے کہ کبھی میرا آنا ہو، وہاں مولوی محمود الغنی صاحب دَام فیضہ کی صحبت نعمت سمجھیں۔

غ۔ ذکر جہادی ہے، اس سلسلہ میں ایک بات قابلِ عرض ہے، پہلے پہل تو نفس کا کینہ سمجھتا رہا لیکن اب اس میں کچھ حقیقت محسوس ہوتی ہے، ذکر کی وجہ سے سیدہ اور دماغ پر بڑا بار محسوس ہو رہا ہے، ڈاکٹر اور طبیب سے مشورہ کیا تو کوئی مرض نہیں بتاتے، معلوم نہیں شیطانی دھوکا ہے کیا؟ ————— اطلاع عرض کر دیا۔

س۔ یہی بات تھی جو میں نے آپ سے کہی تھی جب آپ نے دفترؔ یادہ ہزار کی تعداد بڑھائی، اب آپ کم کر دیں مثلاً۔ ہزار یا اس سے بھی کم، اس کے بعد دیکھیں کہ شکایت مذکور میں کچھ کمی ہوئی ————— بادم کا استعمال کریں۔

غ۔ رمضان المبارک کی وجہ سے تلاوت قرآن شریف کی مقدار بڑھا دی ہے۔

س۔ اچھا کیا، ان ایام مبارکہ کو اسی عبادت سے مناسبت ہے!

غ۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بہانے قربِ شہج کی دولت سے سرفراز فرمائے بعض مرتبہ چل کے رہ جاتا ہوں مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی،

س۔ اللہ تعالیٰ صحبتِ خیر کی صورتیں فرمائے، (مطلق "صحبتِ خیر" کے الفاظ وجد آفریں ہیں)

غ۔ اپنی خستہ حالی پر غور کر کے پریشانی ہوتی ہے کہ گناہ تو بے حد و حساب لیکن نیکیوں میں اضافہ کی ہمت و طاقت مفقود!

س۔ یہی کیفیت موجبِ ترقی ہے، یہی خیال چلے، انشاء اللہ اس سے اعمال صالحہ میں ترقی ہوگی،

غ۔ حضرت والا اس گنہگار کے لئے دعا فرمائیں اور گو اس لائق نہیں لیکن اپنی جوتیوں سے قریب تر رکھیں تو احقر کے لئے باعث سعادت و فلاح دارین ہوگا۔

فقط توجہ کا طالب احقر غلام محمد

س۔ اللہ تعالیٰ میری اور آپ کی تفصیلات کو معاف کریں اور توفیقات خیر سے اس عاجز بچہ کو اور آپ کو بہرہ ور فرمائیں،

بچہ جلال سلیمان ۹ رمضان ۱۳۶۵ھ

بھوپال کی پہلی حاضری

(۲۰، رمضان المبارک تا ۲۱ شوال ۱۳۶۵ھ)

۲۔ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ کا مکتوب ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، راقم کے عریضہ و استنباط زیارت اور حالات کی نامساعدت دونوں ہی کا اندازہ ہو گیا تھا، مگر یہ حضرت شیخ قدس سرہ کی دعا کا اثر تھا کہ اسی ماہ مبارک میں دفعۃً حالات موافق ہو گئے دفتر سے رخصت بھی مل گئی اور سفر کا سارا بندوبست بھی ہو گیا، خوشی خوشی عزم کر لیا کہ ماہ صیام کا آخری دہا حضرت شیخ کی صحبت فیضہ رحمت میں گزاروں گا، جب اپنے اس عزم کی اطلاع مولانا محمود الغنی صاحب مدظلہ کی خدمت میں کی تو موصوف نے اذراہ کرم یہ فرمایا کہ بھوپال پہنچ کر بیعت کی درخواست ضرور کر دینا، میں نے اس کی تعمیل میں کچھ تامل ظاہر کیا اور اس درخواست کی جرأت سربے بستی ظاہر کی تو ارشاد فرمایا کہ اگر آپ کی ہمت نہیں ہوتی تو میری طرف سے عرض کر دیجئے، باقی اس معاملہ میں متکلف نہ کیجئے۔ عرض اس ارشاد کو ذہن میں محفوظ کر کے، اور مولانا نے موصوف اور والدین کی پاک دعاؤں کو لے کر پہلی مرتبہ اللہ کی محبت و رضا کے حصول کے لئے ایک اللہ والے کی زیارت کو چلا،

اب جہاں تک یاد پڑتا ہے انیسویں شب کو ۸ بجے حیدرآباد سے روانہ ہوئی، اور بیسویں شب کو بعد مغرب بھوپال اسٹیشن پر جا پہنچی،

حضرت اقدسؒ کی طرف سے چونکہ حاضری کی اجازت مل ہی چکی تھی، اس لئے اپنی حاضری کی تاریخ کا محض اطلاعی عریضہ خدمت والا میں گزارا چکا تھا، اسٹیشن پر پہنچ کر ابھی سامان اٹھوا

رہا تھا کہ کانوں میں ایک پکارنے والے کی آواز پڑی کہ غلام محمد صاحب! غلام محمد صاحب! کی صدا لگا رہا ہے، میں نے بڑھ کر اس کو سلام کیا، یہ تھا امداد علی حضرت والدہ کا موٹر ڈرائیور اور اسی کے ساتھ تھے فرزند و بلند سید سلمان صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ دوفقہ، اس وقت صاحبزادہ کلمہ کی میس بھی نہ بھیگی تھیں، سر پر مدنی رومال باندھے، شيروانی میں ملبوس ایک ادنیٰ خادم بارگاہِ سلیمان کو لینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس کرم فرمائی سے دل مجھوب ہو گیا،

حضرت والدہ کی قیام گاہ پر ہم لوگ پہنچے، حضرت اقدس عشا کی نماز کے لئے مقصد ایک چھوٹی قدیم مسجد میں تشریف لے جا چکے تھے، میں نے بھی فوراً وضو کیا اور کھانا کھا کر مسجد پہنچ گیا، غالباً ۹، ۹ بجے ہوں گے، تراویح کے لئے جماعت کھڑی ہو چکی تھی، میں فرض پڑھ کر تراویح میں شریک ہو گیا اور جب نماز ختم ہو چکی تو مسجد ہی میں حضرت شیخ کی زیارت سے مشرف اور سرور ہوا یہ ۹۵ء کے ماہ صیام کی بیسویں شب تھی،

یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت والدہ کو قاضی القضاۃ کی حیثیت سے بھوپال تشریف لائے ابھی ڈیڑھ دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ ہوا تھا، بھوپال کی عالی شان "مولیٰ مسجد" (غالباً) دو مغلیہ کی یادگار سے قریب و فتر قضاۃ اور اسی عمارت کے ایک حصہ میں حضرت والدہ کی قیام گاہ تھی، حضرت والدہ کے ساتھ اس وقت صرف صاحبزادہ سلمان میاں تھے، محل میں سے ابھی تشریف نہیں لائی تھیں، شیخ قدس سرہ نے اس ناکارہ پر یہ کرم فرمایا کہ اپنے کمرہ سے متصل کمرہ میں قیام کا حکم فرمایا، جہاں ہر طرح کا آرام تھا،

رقم خور کی پیش کرنے پر منشاۓ ثروت کی تفہیم | چونکہ بھوپال کے لئے میں بالکل اجنبی تھا اس لئے پہلے ہی حضرت والدہ کی

خدمت میں مکھ چکا تھا کہ قیام کے انتظام کا حضرت کے توسط سے امیدوار ہوں باقی کھانے کا انتظام ہوٹل میں بہ آسانی ہو جائے گا، صبح تفسیر کلام پاک کے بعد جب حضرت کی خدمت میں حاضر تھا تو عرض کیا کہ شام سے کھانے کا انتظام ہوٹل میں کر لوں گا، ارشاد فرمایا نہیں، میرے ہی ساتھ کھالیے۔

_____ میں یہ سوچ کھاموش ہو رہا کہ حضرت کی خدمت میں کچھ رقم بطور خوراک گزاران
 دوں گا۔ _____ مگر رقم کے تعین میں بڑی ذہنی گفتگو رہی، بالآخر کسی تصفیہ سے عاجز آکر پچاس
 روپے حضرت والا کی خدمت میں پیش کر دیئے کہ جو مناسب تصور فرمائیں قبول کر کے ممتون فرمائیں
 حضرت والا نے فوراً پچیس روپیہ اس میں سے نکال لئے اور کچھ دیر تک حیدر آباد کے حالات
 دریافت فرماتے رہے، روپیہ ہاتھ ہی میں تھا، جب گفتگو ختم ہوئی تو فرمایا کہ اب یہ روپیہ
 آپ میری طرف سے قبول فرمائیں، حضرت والا کے اس معاملہ سے میں لاجواب اور شرمسار
 ہو گیا، پھر اس کے بعد جوابات فرمائی اگر وہ ہر مسلمان صاحب ثروت کے پیش نظر ہے، تو
 کم از کم مسلم معاشرہ سے معاشی اونچ نیچ کا یہ موجودہ حبیب فرق آنا فانا ختم ہو جائے۔
 ارشاد فرمایا کہ:۔

”اللہ تعالیٰ جب کسی کو دولت و ثروت سے نوازتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں
 ہوتے کہ وہ اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کو
 تقسیم دولت کا ذریعہ بنائے اور اس کے ہاتھ سے بانٹے، یہ انسان کے لئے کچھ کم
 شرف نہیں ہے۔ _____ اس وقت میری مالی حالت بھرا اللہ اچھی
 ہے، آپ اطمینان سے رہئے اور کچھ خیال نہ فرمائیے۔“

اب بتائیے کہ کسی کی صحبت اختیار کئے بغیر حسن معاشرت کی باتیں علی طور پر اس موثر انداز
 میں سیکھی بھی جاسکتی ہیں؟ سچ یہ ہے کہ عابد و زاہد خواہ کوئی بھی بن جائے لیکن اگر انسان بننا ہے تو
 کسی انسان کا مل ہی کی صحبت اختیار کرنی پڑے گی ورنہ درس انسانیت محض کتابوں سے حاصل
 نہیں ہو سکتا، اسی لئے عارفِ رومی نے فرمایا ہے

لے حضرت کا یہ ارشاد ٹھیک اُس قدر آلی ہدایت کا آئینہ دار ہے جو قادرِ حق کے قہقہے میں اہل علم و معرفت
 کی زبان سے نقل فرمائی گئی ہے کہ انھوں نے قادرِ حق سے کہا،

وَلَا تُنْسِنُ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَآخِرِنِ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۝۱ (قصص)

درپے خوابش باغوش خوشیوں خود پزیرے گل از روغن بیس

اسی سلسلہ کی ایک اور بات یاد آگئی جس سے یہ علمی سبق بھی ملتا تھا کہ ہر جہ یہ جو اخلاص کے ہاتھوں سے ملے تمام تر حکیم ہی کا مستحق ہے! جب میں گھر سے چلا تھا تو حضرت اقدس کے لئے میں نے تھوڑا سا چنے کا حلوا ساتھ رکھ لیا تھا، یہ حقیقہ یہ جب خدمت میلانی میں پیش کیا گیا تو اس کی ایسی قدر فرمائی گئی کہ پورے دس دن تک روزانہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا تناول فرماتے رہے اور پھر عید کے دن اس کو تحسین و آفرین کے ساتھ سب میں تقسیم فرمایا کہ آج اس کو ختم کر دینا چاہیے، اسی طرح کسی اور صاحب نے آب زم زم بھجوا یا تھا، روزانہ افطار اسی طاہر و مطہر گھونٹ سے فرمایا کرتے تھے اور ازراہ عنایت اس حقیر کو بھی اس سعادت میں شریک فرماتے تھے!

ایک شدید و سوسہ اور اس کا شفیعی علاج | حضرت والاہ کی ان ساری عنایات اور اس کیسوں کے باوجود جو خدمت گرامی میں حاصل

تھی دو ہی تین دن بعد ذہن میں ایک و سوسہ پیدا ہوا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا؟ یہ نماز روزہ تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اس و سوسہ سے بچنے کی وہ تمام تدبیریں اختیار کر لیں جو حضرت حکیم الامت نے تجویز فرمائی ہیں، لیکن و سوسہ تھا کہ شدت ہی کپڑا چا رہا تھا، حتیٰ کہ مسلسل ۲۴ گھنٹہ اسی حالت پر گزر گئے اور حضرت والاہ سے اس سلسلہ میں میں نے نہ کچھ عرض کیا نہ اس کی جرات کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔ دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرت والاہ مسجد جا رہے تھے اور یہ خادم بھی ساتھ تھا، چلتے چلتے حضرت والاہ دفعۃً رُکے جس جہیں ہو کر احتقری طرف دیکھا اور ذرا ترش لہجہ میں فرمایا "تو آپ نے مجھ پر کوئی احسان کیا" بس یہ فرما کر پھر آگے چلے، احتقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر کچلا کر خوب اچھی طرح تھپھوڑ دیا، اور وہ و سوسہ کافور تھا۔۔۔۔۔۔ بعد افطار جب ماجرنے اپنی اس حالت کا ذکر کیا تو منبسم ہو کر فرمانے لگے:-

ہمارے حضرت والاہ فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، چور وہیں نقب لگتا ہے!

”انشاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا“۔ اب سمجھ میں آ گیا کہ تمام کتب تصوف ایک طرف اور شیخ کا مل کی نگاہ یکساں اثر ایک طرف۔۔۔۔۔۔ ایسی ہی شکلات سے گزرنے کے بعد یہ یقین پختہ ہوتا ہے کہ تصوف کا بیش بہا کتابی ذخیرہ قیامت تک کسی سالک کو شیخ کا مل کے تعلق سے مستغنی نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ آخر امام السالکین حضرت رومی رحمہ اللہ نے یوں ہی متنبہ تو نہیں فرمایا۔۔۔

بار بایر داہ را تنہا مسرد بے قلاوز اندریں صحرا مورا

اپنے محسن حضرت مولانا محمود الغنی صاحب مظللہ
کی تائیدی نصیحت برابر یاد تھی کہ بیعت کی درخواست
درو خواست بیعت اور منظوری ضرور کر دینا، لیکن بار بار خیال ہی آتا تھا کہ آخر کس صورت سے یہ درخواست پیش کی جائے؟ اور اپنی ان آلائشوں کے ساتھ نسبت سلیمانی کو باضابطہ کر کے کیوں اس کی تائید کی جائے، مگر مولانا نے محرم کی تائید ایسی شدید تھی کہ بالآخر یہ درخواست ایک عریضہ کی شکل میں پیش ہی کر دی جو درج ذیل ہے۔۔۔

مکتوب (۳۲)

غ۔ حضرت والا مد فیضہم ودام الطافہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
حیدر آباد سے تو بڑے اشتیاق سے چلا تھا لیکن یہاں پہنچ کر شرم و حجاب سے عجیب عالم
ہے کہ کیوں آگیا؟ کیا صورت لے کر آیا؟
س۔ بھوپال

۲۳، رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

عزیز دلی زادکم اللہ تعالیٰ علما وعلما، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،
یہ عین فطرت ہے کہ جب تک انسان کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، بڑی ٹوٹ پھوٹتی ہے

لیکن جب مل جاتی ہے طبیعت پر سکون طاری ہو جاتا ہے، یہ سکون عین مطلوب ہے، یہ
محبت کی کمی پر نہیں بلکہ کمال پر دال ہے!

غ۔ ایسا معلوم و محسوس ہوتا ہے کہ نہ کچھ ہوں نہ کچھ ہو سکتا ہوں، مایوسی کے قریب حالت ہے
س۔ یہ دوسری کیفیت بھی محمود ہے اور مقصود بھی، مایوسی کی بات نہیں، ہمت کی بات ہے
کمال مطلوب نہ حاصل ہو سکتا ہے نہ کسی کو مل سکتا ہے، جتنا یہاں اونچا اڑیے گا اتنا
ہی آپ اپنے کو پست دیکھئے گا،

(سبحان اللہ کیا عرفانی جوابات ہیں، شیخ کامل کے اسی کمال کی عارف روحی گئے
یوں مدح سرائی کی ہے۔)

زاں کہ اوہر خار را گلشن کند دیدہ ہر کور را روشن کند

غ۔ باطن کا جو حال ہے وہ مخفی نہیں، ظاہر اتباع شریعت بھی پوری نہیں، پھر بھی دل
چاہتا ہے کہ حضرت سے بیعت کی درخواست کی جائے، شاید اس کے برکات سے جو حالت
کچھ سُرہر کے۔

س۔ ظاہر و باطن میں اپنے نقص کا احساس ہی اصلاح کی بنیاد ہے، آپ نے بیعت کی
خواہش کی ہے، اس فقیر بے نوا کو اگر آپ اس قابل سمجھتے ہیں تو اس لحاظ سے خدمتِ سر
دریغ نہیں کہ مرشدِ اقدس رحمہ اللہ کا نام لیوا ہوں، جو کچھ انہوں نے بتایا اس کو دوسروں کو
بتانے کی اجازت بھی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے اس سفر میں یہ خدمت انجام پائے گی۔
غ۔ بالمشافہ عرض کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اس لئے تحریراً عرض کر دیا۔

دعا کا طالب، احقر غلام محمد

س۔ بالکل مناسب تھا اور عین اقتضائے ادب،

یحیٰی

سلیمان

شبِ قدر میں شرفِ بیعت | بس اب اس جواب سے تسلی ہو گئی کہ انشاء اللہ بیعت تو ضرور فرما لیں گے، مگر کب اور کس وقت؟

کے سوال نے اشتیاقِ بیعت کو تیز کر دیا، کیا عجب کہ اس اجمالی جواب میں مصلحت ہی یہ رکھی گئی ہو کہ شنگی بڑھا کر آبِ حیات سے سیراب فرمایا جائے تاکہ نعمت کی قدر اس کے شایانِ شان ہو سکے! — بہر کیف دن آتے رہے اور راتیں گزرتی رہیں، یہاں تک کہ قدر والی رات یعنی ستائیسویں شبِ رمضان (۱۳۶۵ھ) اپنی ساری برکات و انوار کے ساتھ آ پہنچی، اسکی جہانی کی کوشش جیسی کچھ اپنے سے بن پڑی کر لی گئی، تقصیرات کے اعتراف اور عفو و مغفرت کی نماؤں التجاؤں کے ساتھ!

نماز تہجد سے فارغ ہو کر حسبِ معمول حضرت والدہ کے ساتھ سحری کھانے کا شرف حاصل رہا، پھر یہ سراپا تقصیر اپنے کمرہ میں آکر مصطلے پر بیٹھ گیا کہ ابھی طلوع فجر میں کچھ دیر باقی تھی اور قدر کے لمحات ابھی حاصل تھے، تلاوت کے لئے کلامِ پاک کھولا ہی تھا کہ دروازہ کھلنے کی آہٹ کان میں پڑی، آنکھ اٹھا کو دیکھا تو حضرت اقدس تھے، ابھی ابھی تو ان کے دیدار سے آنکھیں مشرف ہو چکی تھیں مگر اس وقت وہ سرتاپا نور ہی نور نظر آ رہے تھے،

وَ اِذَا رَاٰ اٰیٰتِ جَمَالِہٖ طَلَعَ الصُّبْحُ کَاثِمًا

میں شدتِ حیرانی سے اپنی جگہ مبہوت ہو رہا، اٹھ کھڑی نہ سکا، حضرت والدہ عودِ قریب تر آئے اور ارشاد فرمایا :-

”کیوں، ارادہ ہے؟“

غلبۂ شوق میں زبان کھل نہ سکی مگر اپنا بال بال ”لبیک“ کہہ رہا تھا اور مرشدِ عارف اس دمِ ربّی زبانی کو سمجھ رہے تھے۔ قریب تر تشریف لائے، مصطلے پر بالکل میرے روبرو جلوہ فرما ہو گئے، میں قبلہ رخ بیٹھا تھا، قبلہ نما اب میرے سامنے تھا،

لے جب میں نے اس کے جمال کو دیکھا تو گویا صبح صادق کا طلوع تھا!

حضرت اقدس نے اپنا دست مبارک بٹھا دیا، میں اپنی آلودگیوں سے شرمسار حضرت شیخ کی عظمت و مرتبت کے تصور سے دبا جا رہا تھا، ڈرتے بھجکتے بڑی ہمت سے اپنی ارادت کا ہاتھ بٹھا کر حضرت کے دست حق پرست میں دے دیا اور جھک پڑا، پیر دست گیر نے اس طفل سلوک کی دست گیری فرما کر ارشاد فرمایا کہ ————— ”آپ اس ہاتھ کو میرے مرشد اقدس کا دست مبارک سمجھیے!“ ————— پھر قرآن پاک کی چند سورتیں اور آیات تلاوت فرمائیں پھر استغفار کروایا، تلفین کلمہ توحید ہوئی، ایمان مفصل کے اجزاء کا اقرار کروایا گیا اور عہد واثق لیا گیا کہ اب مرے دم تک فراموشی و واجبات کی پابندی کی جائے گی اور اتباع سنت کی تکمیل کی کوشش اور بدعات و معاصی سے اجتناب قائم رہے گا، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ —————

”میں نے آپ کو چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ سلسلوں میں داخل

کر لیا، اللہ تعالیٰ مجھ کو ادھ آپ کو ہر سلسلہ کے فیوض و برکات سے مالا مال فرمائے“

اب حضرت سیدی قدس سرہ نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا، دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے احرار نے بھی اس کے اتباع کا شرف پایا، حضرت مرشدی بہت دیر تک خاموشی سے دعا فرماتے رہے اور احرار بھی دل ہی دل میں ”آمین آمین“ کہتا رہا،

اس وقت جو کیفیت اس سراپا عیب پر طاری رہی اس کا اظہار الفاظ میں پہلے تو محال ہے اور پھر جس درجہ میں ہو بھی جائے تو بجز اس کے کہ جس پر بھی ایسی ہی حالت گذری ہو کوئی اور کیا سمجھ سکتا ہے؟ بلکہ عجب نہیں کہ کم فہم کو گمان شاعری اور عبارت آرائی کا گذرے، ————— اس لئے بس اتنا سن لیجئے کہ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا مادیات کی ساری کثافتیں ہٹ گئی ہیں بندہ عاجز بارگاہ رب العزت میں دفعۃً پہنچ گیا ہے اور اپنی اس رسائی پر ششدر و حیران ہو نہ نالہ و دنیوں، نہ آہ و زاری نہ خوش و خوش، نہ اظہار مدعا کا ہوش، ایک حیرت ہے کہ دل و دماغ پر پھائی ہوئی ہے، طر حیرت آغاز و انتہا ہے!

لہ المعرفة فی ذات اللہ حیدرؑ (ذوالنون مصریؒ)

یہ اثر تھا ایک راسخ فی التوحید اور صاحب نسبت شیخ کی تلقین و توجہ کا! اس کے القائے نسبت کا!۔۔۔۔۔ نہ جانے میں اس عالم تحریر میں کب تک کھویا رہتا مگر خود حضرت شیخ ہی نے چونکا دیا کہ ”اٹھئے اب نماز فجر کی تیاری کیجئے!“

اس بیعت کے کچھ عرصہ بعد میرے خسر محترم (مولانا محمد علی مدظلہ) نے ایک خواب **بشارت** دیکھا جو اس بے استحقاق کے حق میں ایک بشارت عظمیٰ ہے خصوصاً جب کہ حضرت مرشدیہ کے تصدیقی کلمات نے اس کی ظنی حیثیت کو یقین کے درجہ تک پہنچا دیا ہے پہلے خواب اور پھر تعبیر ملاحظہ ہو۔

رات کی آخری ساعتوں میں دیکھا کہ ایک مکان کچا سرخ مٹی کا نہایت خوبصورت **خواب** بنا ہوا ہے، اس مکان میں جب داخل ہوا تو آپ کو سفید صاف لباس میں پایا اور یہ معلوم ہوا کہ یہ مکان آپ ہی کا ہے، آپ نے میرے لئے کھانا منگوایا، کھانا گرم گرم پڑھکتے سینے میں آیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت پہلے ان کو کھلا دیں جو میرے ہمراہ آپ سے ملنے آئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ ان کے لئے بھی آجائے گا میں نے عرض کیا کہ میرے کھالینے پر یہ کہیں گے مولوی بہت حریف، خود عرض اور کھوکھے ہوتے ہیں، میں تو مولوی نہیں لیکن یہ مجھے یونہی سمجھتے ہیں، میری وجہ سے ناحق مولوی بدنام ہوں گے اس پر آپ بہت ہنسنے اور انھیں پہلے کھلا دینے کی اجازت عطا فرمائی۔

کچا مٹی کا مکان عین مذاق نبویؐ ہے، جیسا احادیث سے ثابت ہے سفید لباس **تعبیر** ”احسن الثياب للاموات“ ہے، کھانا جیسا کہ ترمذی کتاب الامثال میں ہے، دعوت خیر ہے جو شخص آپ کے ہمراہ، گو پہلے نہ ہو، مگر علم الہی میں مقدر تھا، وہ واقعی آپ سے پہلے اوس کو کھا چکا، وہ مولوی نہیں، مگر اللہ اوس کو دل کا درویش بنائے، آپ سمجھے ہوں گے کہ میرا اشارہ کدھر ہے؟ وہ آپ کا داماد ہے!!

انشاء اللہ یہ سند آخرت میں کام آئے گی اور شیخ کا یہ مہر و کرم یقین ہے کہ آخری رفاقت

کوئی اصرار کرتا تو فرمایا کرتے تھے کہ

”مجھے نماز پڑھنا تو آتا ہے، پڑھانا نہیں آتا“

اس کے ظاہری وجہ یہ تھے کہ حضرت کی آواز بلند نہ تھی اور تنفس کے عارضہ کی وجہ سے کوئی بڑی آیت ایک سانس میں پڑھ بھی نہ سکتے تھے چنانچہ اس عید کی نماز میں بھی یہی ہوا کہ سورۃ فاتحہ اس طرح تلاوت فرمائی کہ اس کی ساتوں آیتوں کو وقف کے ساتھ پڑھا، اس کے بعد سبح اسم کی سورۃ اس طرح رک رک کر تلاوت فرمائی کہ۔

سبح اسم ربك الاعلىٰ ————— الذی خلق فسویٰ ————— والذی قدر

فهدی ————— والذی اخرج الموعیٰ ————— الخ

نماز کے بعد خطبہ اولیٰ پہلے تو عربی میں پڑھا اور پھر اس کا حاصل اردو میں سمجھا کر میٹھ گئے اور پھر اٹھ کر خطبہ ثانیہ پڑھا اور دعا فرمائی۔

عید کا دن اور اس کا دوسرا دن بھی گزر گیا، ۲۰ شوال کو بعد مغرب زحمت سفر بازہ میری واپسی | یا محرم ذوق و شوق کے ساتھ نہیں بلکہ دل کو مجبور کر کے طع جو مزہ آنے میں ہے کیوں کر کہوں جانے میں ہے! ————— وقت قریب آ پہنچا، موٹر ڈرائیور شاید موجود نہ تھا، تانگہ آگیا، احقر نے حضرت اقدس سے رخصتی مصافحہ کیا اور اجازت چاہی، حضرت والا اٹھانک کے باہر تشریف لائے اور اپنے سامنے سامان رکھوایا اور سوار ہونے کا حکم دیا، پاس ادب سے قدم اٹھاتے تھا مگر الٹا ہر فوق الادب سوار ہو گیا، تانگہ چل پڑا، میں دیکھتا ہا کہ جب تک تانگہ حد نظر سے نکل نہیں گیا وہ ”ششم محبت“ برابر اس طرف نظر فرما رہی، رخصتی آداب کی یہ عملی تعلیم اب عمر بھر بھی کیسے بھلائی جاسکے گی!

مکتوب (۳۳)

(یہ عریفہ بھی دو ماں قیام بھوپال ہی میں لکھا گیا تھا، جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے مگر

بھوپال کے حالات کے درمیان اس کا نقل کرنا بے جوڑ ہو جاتا اس لئے اب پیش ہے، ویسے جواب بھی اس کا آخری دن ہی ملا تھا،

غ۔ بھوپال

۳۰ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

حضرت اقدس ادام اللہ الطافکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
قرآن مجید کی تلاوت کے وقت یا کسی وعظ و تقریر میں مضامین خشیت کا بہت اثر ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض مرتبہ اعصاب میں کمزوری محسوس ہوتی ہے، لیکن مضامین رحمت سے انشراح کا ایسا قوی اثر نہیں ہوتا، بس یہی خیال آتا ہے کہ اپنا حال تو اسکی رحمت کے لائق نہیں، البتہ عقلی طور پر تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا یہ کیفیات درست ہیں؟

س۔ بھوپال

۲۷ شوال المکرم ۱۳۶۵ھ

عزیز معید رفیع اللہ شاکم و رزقکم العرفان، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،
مبارک کہ یہ خشیت بنیاد ہے اوس خشیت کی جس کا اثر یہ ہے کہ بندہ گناہوں سے باز رہتا ہے اور جس کے لئے دعا مانگی جاتی ہے، اگر خشیت یہ اثر پیدا کرے تو وہ صرف کیفیت نفسی ہے جو مطلوب نہیں، ————— آثار رحمت کا یہ اثر جس کا نتیجہ رجا ہے یہ بھی مطلوب ہے کہ الایمان بین الخوف و الرجاء اور وہ آپ کو حاصل ہے گو احساس نہیں، مگر ایسا ہوتا تو خشیت سے افاقہ نہ ہوتا!

(سبحان اللہ کیا نازک تجزیہ فرمایا ہے! حقیقت یہ ہے کہ شیخ کامل ہی سب سے

بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے!)

غ۔ مضامین قہر و غضب سے اثر پذیری کا ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف عمل کا یہ حال ہے کہ اگر کچھ عرصہ غیر اسلامی ماحول میں رہنے یا دنیوی اعتبار سے بڑے طبقے میں رہنے

کا اتفاق ہوتا ہے تو دل دیوی و لفر بیوں کی طرف پوری قوت سے کھینچے لگتا ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عقل کو غالب رکھ کر ایسے موقعوں پر دینی احساس سے کیر خالی نہیں ہو جاتا مگر کشش تو بلائی ہوتی ہے، حضرت والارہ دعا فرمائیں کہ دُنیا نے دوں احقر کی نظروں میں سچ ہو جائے!
(جواب خوب غور سے پڑھنے اور برت کر دیکھنے کا ہے!!)

س۔ یہی مجاہدہ ہے کہ باوجود دلکشی و لفر بی کے پھر دل کو روکا جائے، اور دنیاوی جاہ و ثمت کو گو وہ ایک معنی میں اگر بلا سعی مل جائے نعمت ہے، مگر اوس میں دل نہ لگایا جائے، آپ ایسے موقع پر ان کے فانی و زائل ہونے کا تصور کر لیا کریں اور سمجھیں کہ ان سب کا جنازہ سامنے دکھا ہے اور ان کے نعیم کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور وہ لا جواب ہو رہے ہیں! احقر کی شادی کا مسئلہ درپیش ہے، اس خصوص میں حضرت والارہ کی نصائح موجب سکینت ہوں گی!

س۔ اللہ تعالیٰ مبارک کریں۔۔۔۔۔ دنیا میں کوئی پھول نہیں جس کے ساتھ کانٹے نہ ہوں، عاقل انسان پھول اس طرح چنتا ہے کہ کانٹوں سے اوس کے ہاتھ پر خراش نہ آئے، خوب دیکھا اور غور کیا کہ شادی کی تمام تکالیف کا ایک ہی حل ہے کہ تحمل و برداشت سے کام لیا جائے اور بیوی کو اپنے مذاق میں رنگ لیں، خدا کرے کہ آپ کی بیوی دیندار ہوں اور امید ایسی ہی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیوی اور والدین کے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے اور مرد دونوں کے بیچ میں پھنس جاتا ہے تو ایسی حالت میں اطاعت تو والدین کی کی جائے، مگر بیوی کے حقوق سے بھی چشم پوشی نہ کی جائے۔

(کیا پُر شفقت، جامع و مانع جواب ہے)

غ۔ بحمد اللہ کہ اب تک احقر کا جیسا کچھ بھی طرز عمل اپنے والدین کے ساتھ ہے، وہ اس کو بہت خوش ہیں، لیکن خود احقر کو اس سے اطمینان نہیں کیونکہ جس محبت و شفقت سے انہوں

نے تربیت فرمائی اس کے مقابل تو کچھ بھی نہیں ہو پاتا ہے، اللہ تعالیٰ مجھ کو بہت دے وسیلہ کی مدد فرمائیں، (ٹھیک یہی حسرت آج بارہ نیرہ برس بعد بھی موجود ہے، اللہ تعالیٰ پوری خدمت کی توفیق عطا فرمائے)

س۔ دل دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ توفیق بخشیں!

غ۔ حضرت والار کے جو عنایات و اکرام احقر کے حال پر ہیں اور خصوصاً اس قیام کے دوران میں رہے ہیں ان کے ادائی شکریہ سے زبان و قلم عاجز ہیں، اس عجیبی کو سب کچھ تصور فرمایا جائے۔ خدا نے تعالیٰ حضرت والار کو تادیر علوئے درجات کے ساتھ ہماری رہبری کے لئے بہ عافیت رکھے اور ہم کو استفادہ کی توفیق و بہت بخشے، آمین ثم آمین!

توجہ خاص اور دعا کا طالب

غلام محمد عفی عنہ

س۔ میرا کیا ہے، کرم اور حسن ظن تو آپ کا ہے کہ سینکڑوں میل کی مسافت اور مصارف کی ہر زحمت برداشت کر کے یہاں پہنچے اور مجھے مسرور کیا! — دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان امتحانات میں جو یہاں قدم قدم پر پیش ہیں سلامت رکھیں اور مجھے یہاں سے بچا کر لے چلیں (غالباً اس سے مراد امراء سے سرکاری وغیرہ سرکاری نوعیت کے تعلقات ہیں بجز اللہ کہ حضرت والار عالمانہ اور درویشانہ رنگ کو اس توازن سے ملا کر اپنی حیات مستعار بہر فرما گئے کہ اس کی نظیر ملنا دشوار ہے!) اور آپ کو اللہ تعالیٰ فلاح دارین بخشیں آمین —

بچہاں دیپج کار

سیلیمان

مکتوب (۳۴)

غ۔ حیدر آباد شوال ۹۵ھ

سیدی دمولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خیریت حاصل، عافیت مطلوب،

یہاں پہنچ کر ہجوم افکار میں اس سکون کی قدر محسوس ہوتی ہے جو حضرت والدہ کی خدمت میں حاصل تھا۔

س۔ ٹھہرو پال

۷ شوال ۱۳۶۵ھ

عزیزی و حبیبی زادکم اللہ توفیقاً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ مدح الخیر ہوں اور داعی خیر،

فقیر نے جو گزارش کی تھی کہ شیخ کے پاس جانے کا حاصل کیا ہے اس کا یقین آپ کو حاصل ہو گیا، واللہ الحمد

(دورانِ قیام جو سو سو لاحق ہوا تھا اس کے ازالہ کے بعد حضرت والدہ نے ارشاد

فرمایا تھا کہ شیخ کی خدمت میں حاضری سے کیسوی اور سکون حاصل رہتا ہے اور یہی بڑی

دولت ہے!)

غ۔ اپنے اندر تکبر پاتا ہوں اس لئے اذراہ کرم

۱۔ تکبر کے ازالہ کی تدابیر اور اس کا علاج تجویز فرمایا جائے۔

۲۔ تکبر و غرور اور عزت نفس و خودداری کا فرق تحریر فرمایا جائے تاکہ اس میں

احتیاط ملحوظ رہ سکے۔

س۔ تکبر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے کسی کمال کو اپنی نظر میں رکھ کر دوسرے کی تحقیر کی جائے، یا

اپنے کسی کمال کو اپنا ذاتی استحقاق سمجھیں اور اگر اپنے کسی کمال کو محض عطیہ الہی اور فضل الہی

سمجھیں جو بندہ کو اپنے لطف و کرم سے بلا استحقاق عنایت فرمایا گیا ہے تو یہ کبر نہیں!!

کبریٰ دو قسمیں ہیں، ایک اختیاری جو بالقصد جو یہ بھی بُرا ہے اور اس کے مقتضایہ

(ہلاکت ہے،)

غ۔ الحمد للہ کہ دعا کی تاثیر محسوس ہونے لگی ہے لیکن اس وقت تک کا احساس یہ ہے کہ جب کام مایوسی کی نوبت کو پہنچتا ہے تب دعا اثر دکھاتی ہے اور اسباب فلاح مہیا ہوتے ہیں۔

س۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کیجئے، بے شبہ اضطراب کی حالت کی دعا بھی اثر رکھتی ہے، —————
آمن یجیب المضطر اذا دعا اور دوسری جگہ من بعد ما قنطوا۔

غ۔ کسی روز نماز تہجد قضا ہو جاتی ہے یا ذکر چھوٹ جاتا ہے تو دن بھر طبیعت ادا اس رہتی ہے بلکہ اکثر دیکھا کہ بننا کام بگڑ جاتا ہے یا ناامیدی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں، ایسے اب پابندی کی طرف توجہ زیادہ رہتی ہے!

س۔ بارک اللہ، ایمان کی پہچان حدیث میں یہ بھی آئی ہے کہ جس کو اپنے گناہ و خطائے قلبی تکلیف محسوس رہے، قرآن پاک میں ہے وکنہ الیہم الکفر والفسوق والعصیان، کفر و فسق و عصیان سے کراہت ہوتی ہے!

غ۔ کل سے قلب میں انتشار پیدا ہے، کسی کام میں دل نہیں لگتا، حضرت والار دعا فرمائیں کہ اتنا سکون خاطر میسر آجائے کہ امور دنیوی پورے ہو سکیں!

س۔ یہ کیفیات آتی جاتی رہتی ہیں، یہ کوئی بات نہیں۔

اگر درویش بر حالے بماندے سر و دست از دو عالم بر فشانے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو اداشا فرمایا کہ حالت ایمانی کی شدید کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی!

غ۔ حضرت والار احقر کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے اور ازالہ مصلحتیں و زیلہ کے لئے دعا فرمائیں، فقط، احقر غلام محمد

س۔ دل سے دعا بردگاہ الہی ہے، والسلام

پہچاں سلیمان

مکتوب (۳۵)

غ۔ حیدر آباد دکن

ذیقعد ۱۳۶۵ھ

سیدی و مولائی مد فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

اب کی مرتبہ معروضہ پیش کرنے میں بڑی تاخیر ہو گئی حالانکہ تقریباً ایک ہفتہ سے اس کا شدید تقاضا ہے مگر کوئی بات قابلِ عرض نہ ہونے سے اس تقاضا کو دیا تا رہا، اب خدمتِ والا میں بجز اس کے کچھ عرض نہیں کہ معمولات پر بحمد اللہ پابندی ہے لیکن بعض وجوہ سے قلب و دماغ میں انتشار ہے، احقر کے لئے حضرت والاؒ بطور خاص دُعا فرمائیں۔

توجہ کا طالب احقر غلام محمد

س۔ عزیز و حبیبی رضی اللہ تعالیٰ عنہما، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کے انتشار کو جمعیت سے بدل دیں۔

خط لکھنے کے لئے مطلب کی ضرورت نہیں، ایک شعر سنئے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم کو مطلب ہے تمہارے نام سے

الحمد للہ مع الخیر ہوں، تین ہفتوں کے لئے لکھنؤ اور اعظم گڑھ گیا ہوا تھا، اب آیا ہوں،

تھانہ بھون بھی گیا تھا، حضرت والاؒ کی مرقہ پڑاؤ پر بھی حاضر ہوا، والسلام

یہ چچاں سید سلیمان ۲۶ ذیقعد ۱۳۶۵ھ

لے نائب کے شعر میں تھوڑا سا تصرف اندازہ تواضع کیا گیا ہے ورنہ معروضہ ثانی ہوتا،

ظہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے!

(مکتوب کے لفظ لفظ سے کیسی شفقت و عنایت ٹپک رہی ہے اور کس قدر
تعلق خاطر!)

مکتوب (۳۶)

(اب تک جتنے عزیزے گزرے ان سب میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہوگی کہ اس
بے علم کو انقلاب کھنکھنے کے لئے کبھی الفاظ ہی نہیں ملے، خود مجھ کو بار بار اس کی کوفت ہوئی کہ
اپنے تعلق قلبی کا اظہار تو کبھی ہونے ہی نہیں پاتا، آج یہ ٹھکان لی کہ چلے گستاخی کیوں نہ پھیرے
ایک شعر ہی کو بطور انقلاب کے لکھ دوں تاکہ کچھ تو اپنی محبت کا اظہار ہو،)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۴ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ

سیدی آنت جیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو عاصی پئے درماں طلبی

مزاج اقدس!

گذشتہ چھ سات ماہ سے مسلسل مالی نقصان اٹھا رہا ہوں، شاید اس کا باعث سودی
قرض ہے جو بعض شدید ضروریات کے تحت لینا پڑا، مگر پہلے اگر سودی قرض لیا بھی گیا
تو اس کا یہ اثر محسوس نہیں ہوا تھا، (یہ قرض میں نے راست تو نہیں لیا مگر محض میری
خاطر والد صاحب کو لینا پڑا تھا)

س۔ (فی وجیبی و فقہم اللہ تعالیٰ لما یحب و یرضی)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گھبرا ئیں نہیں، بے شبہ بندہ کو ہر حال میں اسی پر نظر
رکھنی چاہیے کہ اس کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ اسی کے عمل کی پاداش ہے مگر اس پر بھی

لے یہاں شکر کا تخلص قدر ہے، تصرف اپنی ذات کے لئے کیا گیا ہے!

نظر ہے کہ وہ حکیم علی الاطلاق جو کچھ کرتا ہے وہ بندہ ہی کے فائدہ اور منفعت کے لئے ہے اس لحاظ سے یہ مصائب بھی نعمت ہیں کہ ان سے توجہ الی الحق کی توفیق ملتی ہے اور یہ کتنی بڑی دولت ہے۔

سو دی قرض بھی باعثِ زوال ہے، مصائب پہلے بھی آتے ہوں گے مگر اس وقت آپ کو بصیرت نہ تھی اس لئے ان کو اور باتوں کی طرف منسوب کرتے ہوں گے اب بصیرت ہونے کے باعث اپنے اعمال پر نظر پڑ رہی ہے، استغفار کیجئے (بات اپنی جگہ پر ہے مگر تسکین کس کس انداز سے فرما دی اور استغفار پر کس خوبی سے مائل کر دیا)۔

غ۔ تقریباً تین مہینے سے احقر کی تنخواہ نہیں مل رہی ہے اور گو بعد میں پوری مل جائے گی لیکن فی الحال تو پریشانی ہے، (گریڈ کے تصفیہ میں تاخیر ہو گئی تھی)۔

س۔ بے شبہ اس سے پریشانی ہوگی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ، ان حالات میں اکثر پڑھا کیجئے، اس سے انشاء اللہ فکر دور ہوگی، (بھرا اللہ کہ فکر تو محض عرضِ حال ہی سے کافور ہو جاتی تھی جو حضرت شیخ کی مقبولیت کا کھلا اثر تھا)۔

غ۔ یہ سب الجھنیں شروع و ختم ہوں گے، تقریباً ہر وقت قلب و دماغ پر یہی افکار مسلط رہتے ہیں!

س۔ اس میں کوئی حرج نہیں، الجھنیں ہوں تو ہونے دیجئے مگر معمولات میں فرق نہ آنے دیجئے!

غ۔ حضرت واللہ اس احقر پر بطورِ خاص توجہ فرمائیں اور اصلاحِ حال کے لئے دُعا فرمائیں!

س۔ بوقتِ خاص میں نے دعا کی۔ وہ عجیب الدعوات قبول فرمائے اور آپ کو طمانیت نصیب فرمائے۔

غ۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان بکھڑوں سے آزاد ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کی جائے چاہے لوگ متروک دنیا ہی کیوں نہ کہیں مگر حالت یہ ہے کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن!

ہدایات کا مشنظر اور دُعا کا طالب احقر

غلام محمد

س۔ فقیروں کی زندگی بھی بکھڑوں سے اور آفاتِ دینی سے خالی نہیں۔ ہمارے بزرگوں کے مسلک کے خلاف ہے، جب تک پھل پکتے نہیں، کھانے کے قابل نہیں، اسی طرح جب تک توکل پختہ نہیں ہوتا ترکِ اسبابِ رزق درست نہیں!

(یہ ارشادات کسی سالک کے لوحِ دماغ سے کبھی بھی محو نہ ہونے چاہئیں!)

والسلام! پچھاں سید سلیمان

۲۷ ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۳۷)

غ۔ جسدر آباد دکن

۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ

سیدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاجِ اقدس!

الحمد للہ حضرت والدہ کی خاص توجہات کی وجہ سے احقر کی تنخواہ کا مسئلہ حل ہو گیا (درحکمہ جاری ہو چکا، عید الاضحیٰ کی تعطیلات کے بعد انشاء اللہ کل تنخواہ مل جائے گی!

س۔ بھوپال

۱۱ ذیحجہ ۱۳۶۵ھ

عزیز و جیمی و فکرم اللہ تعالیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ مع الخیر ہوں،

الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے آپ کی یکسوئی کا سامان کر دیا، مجھے بڑی خوشی ہوئی (واقعی حضرت والدہ اس خادم کی ہر خوشی سے بے حد مسرور ہوتے تھے)

غ۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر حال میں معمولات پر پابند ہوں اور مزید استقامت کے لئے

س۔ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو میرے اور آپ کے دونوں کے لئے مفید کریں۔ میرا ایک شعر ہے

احباب کے حسن ظن کا ممنون ہوں میں

جو مہور ضعیف کو سلیمان سمجھے

غ۔ حدیث شریف لایومن احداکم حتی اکون احب الیہ الخ سے متعلق اعتباری طور پر

کیا یہ خیال صحیح ہے کہ چونکہ شیخ بحیثیت رہبر کے بجائے رسول ہے اس لئے اس کے ساتھ یقینی

زیادہ محبت بڑھے گی اتنی ہی زیادہ یقینی امور دینی میں پیدا ہو گئی؟

س۔ قیاس صحیح ہے، یہ ظن محبت رسول، شیخ سے بھی ویسی ہی محبت رکھنی چاہیے کہ وہ رہنمائے

محبت رسول و احکام رسول ہے، (درہائے معانی کی لڑی صفحہ کاغذ پرتا رہ کر رکھ دی ہے،

سبحان اللہ)

غ۔ قرآن مجید میں جہاں مظاہر قدرت میں تدبیر و تفکر کی دعوت دی گئی ہے وہاں کہیں آفاق

اور کہیں "انفس" کا ذکر ہے، کیا اس میں کوئی خاص بات پوشیدہ ہے۔ دونوں قسم کی چند

آیات کو پیش نظر رکھ کر احقر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اقراء الوہیت کے لئے آفاق

کو پیش فرمایا گیا ہے اور مشاہدہ حق کے لئے انفس میں فکر کی دعوت دی گئی ہے مثلاً

(۱) افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔

(۲) وفی انفسکم افلا تہتصرون۔ (معا کا طالب، احقر غلام محمد)

س۔ یہ تفسیر میرے دل کو نہیں لگتی، سنریمہ آیا تنافی الافاق وفی انفسہم حتی

یتبین لہم انہ الحق اولہم یکف بربک انہ علی کل شئ شہید ط

(حم السجدہ - آخر) اس میں دونوں یکجا ہیں!

دل دعا ہے۔ یہ محمد اس سلیمان

ملہ خود حضرت والا کا یہی خیال جب پڑھنے میں آیا (جو آپ کی نظر سے گزشتہ باب میں گزر چکا) تو اس

توافق مذاق پر دل سے شکر ادا ہوا،

مکتوب (۳۸)

(احقر نے اپنی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ حضرت دالار کی خدمت میں ارسال کیا تھا جو بچہ شنبہ ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ کو منعقد ہونے والی تھی، حضرت دالار نے اس کا جواب ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ عطا فرمایا جو درج کیا جاتا ہے)

س۔ بھوپال

عزیزی و حبیبی باریک اللہ فی کمالات و جمع بینکم بالخیر
السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ دہلی اور سہانپور کے سفر سے کل واپس آیا، صوبہ بہار کے مسلمانوں پر جو فساد پڑی اس کا حال آپ کو اخبارات سے معلوم ہوا ہوگا، میرا گاؤں بھدر اللہ محفوظ ہے، مگر ۲۰ گاؤں کے مسلمان پناہ گزیں وہاں جمع ہیں، بھوکے اور تنگے ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے!

(اس سے حضرت دالار کے درد دل کا اندازہ ہوتا ہے، مسلمان کی ہر مصیبت پر وہ ایسے ہی مضطرب ہو جاتے تھے خواہ وہ مسلمان دنیا کے کسی خطے میں ہو) —————
اہلیہ اور بچے سہانپور سے کل ہی ساتھ آئے!

آپ کے لئے دلی دعا ہے، خصوصاً اس حالت میں جب کہ آپ ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ مبارک فرمائیں اور امن و سکون و مودت و سکینت عطا کریں۔ اس زندگی کی خوشی صرف تحمل و برداشت کی راہ سے ملتی ہے، میں اس تقریب میں شریک نہ ہو سکا مگر نیک دعاؤں کے لئے قرب و بعد کیساں ہیں۔

لے صوبہ بہار کا پہلا درناک ہندو مسلم فساد جس میں مسلمان بُری طرح تباہ ہوئے!
لے الحمد للہ کہ اس وقت کے حیدر آباد نے ان مظلوموں کے ساتھ درد مندی کا پورا پورا لفظی نہیں بلکہ عملی ثبوت دیا تھا۔

والسلام

سید سلیمان، ۲۹، ذیحجہ ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۳۹)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۰ محرم ۱۳۶۶ھ

سیدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

حضرت والدہ کے کرم نامہ سے سب کی عافیت معلوم کر کے بڑا اطمینان حاصل ہوا۔

س۔ ٹھوپال

جیسی و مخلصی و تفکھ اللہ تعالیٰ لما یحب و یبغض

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، ایک دو روز سے طبیعت طویل تھی، آج اچھا ہوں، بہار کے دردا نیگز اور جان گداز حالات برابر پہنچ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر رحم فرمائے!

غ۔ اس امر کے اظہار سے سخت ندامت ہے کہ شادی کے بعد سے اس وقت تک (کوئی ہینہ سوا ہینہ کی مدت ہوگی) معمولات میں متعدد مرتبہ ہرج واقع ہوتا رہا، کئی مرتبہ نماز تہجد بھی قضا ہو گئی، آئندہ کے لئے احتیاط معمولات کا عزم کرتا ہے حضرت والدہ بھی دعا فرمائیں۔

س۔ زندگی کے کسی اہم تغیر کے بعد تعطل ہو جایا کرتا ہے، آپ پر تو کجا اللہ بہت کم اثر پڑا، ورنہ اس سے بھی زیادہ حالات خراب ہو جاتے ہیں۔ دل دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ استقامت بخشیں، —
دراہ سلوک میں شیخ کامل اپنے مرید کو کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہونے دیتا، عارف و سخی کا ارشاد ہے —

کوئے نو میدی مرو امید ہاست کوئے تاریکی مرو خود شید ہاست

غ۔ مذکورہ کیفیت سے احقر کو اپنی بہ ہمتی کا پورا احساس ہے، اب احقر کا یہ خیال ہے کہ جو کچھ نیکی کا عمل بن پڑتا ہے وہ سب اللہ ہی کا کرم ہے، وہی بہت بھی عطا فرماتے ہیں اور عمل بھی کروادیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم نہ فرمائیں۔

س۔ جس نتیجہ پر آپ پہنچے وہ بالکل صحیح ہے، سب اس کی کا کرم ہے۔
جان دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غ۔ باقی حالات لائق شکر ہیں، حضرت والا اثر وی اور نبوی فلاح کے لئے دعا فرمائیں۔

احقر غلام احمد

س۔ الحمد للہ، دلی و دعا ہے۔ بیچھاں

سیلماں ۱۲، محرم ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۴۰)

غ۔ حیدر آباد دکن

حضرت مرشدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج اقدس!

میری۔۔۔۔۔ بہت سخت علیل میں اور ایک ضلع میں رہتی ہیں، اُن کی نازک حالت کی اطلاع پہنچی تو والد صاحب ایسے پریشان ہو گئے کہ دوسرے ہی روز یہاں سے چلے گئے (الہم لہ) کہ میرے والد ماجد مدظلہ العالی جس سلوک (اور بیکی کے اوصاف سے خوب مالا مال ہیں) والد صاحب کی یہ حالت۔۔۔۔۔ انتہائی بدسلوکی کے باوجود ہے، اور احقر کا یہ حال ہے کہ ان کے لئے دعا کرنے کو تک جی نہیں چاہتا تھا، جبراً اُن کی صحت اور خاتمہ خیر کی دعا کی، اپنی اس حالت پر ندامت بھی ہے اور افسوس بھی کہ دوسرے بھی اگر اپنی مصیبت پر اسی طرح دعا نہ کر لیں تو اپنا کیا حشر ہوگا۔

س۔ بھوپال

محبتِ صمیم زادکم اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بھمد اللہ بخیر دعا فیت ہوں اور آپ کی خیر دعا فیت کو
لئے دعا گو ہوں۔

یہ کیفیات ہیں، ان کا کوئی اعتناء نہیں، باوجود اس کیفیت کے اگر اس کیفیت کے
مقتضی کو دریا کر اس کے خلاف پر عمل کیا جائے تو بڑا ثواب ہے جیسا کہ آپ نے کیا اور آپ
خلاف اقتضائے نفس کرنے پر ثواب کے مستحق ہوئے کیونکہ آپ نے قرابت کا حق ادا کیا۔
غ۔ نماز و ذکر میں جہیتِ خاطر نہیں!

س۔ مشغولیتِ بغیر کی وجہ سے یہ حال ہے۔

غ۔ بعض دینی عزائم پر با بر قائم ہیں لیکن پست تہمتی پایہ زنجیری ہوتی ہے۔

س۔ آپ سنی متواتر کرتے رہیں، بفضلہ تعالیٰ انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

غ۔ احقر کی اہلیہ کا رعبہ بھی ملغوف ہے۔

حضرت والدہ احقر کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے بطور خاص دعا فرمائیں،

احقر غلام محمد

س۔ جواب الگ جلتا ہے، اون کو اپنا ذاتی نام نہ لکھنا چاہیے تھا، اہلیہ فلاں لکھنا کافی ہے، (کہاں

یہ اہتمام پردہ دار کی کا اور کہاں دوکاندار مشائخوں کی بے عیابانہ عورتوں سے بے پردگی، اور

حدود و شریعت کی پامالی، العیاذ باللہ آپ کے فلاح دارین کے لئے دل سے دعا ہے۔

بچہ ہاں سید سلیمان ۲۷ محرم ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۴۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

سیدی و مولائی دام بركاتہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
حضرت والار کے شفقت آمیز کرم نامہ سے احقر نے اپنی اہلیہ میں عجیب دینی تغیر محسوس کیا
اللہ تعالیٰ اس فیض جاریہ سے ہم دونوں کو مستفیض ہونے کی پوری توفیق عطا فرمائے۔
س۔ بھوپال

سزیزی وجیبی وفقلم اللہ تعالیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
الحمد للہ خیریت ہے،
یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، دلی دعا ہے کہ پاک پروردگار اس عزیزہ کو استقامت بخشیں۔
غ۔ گذشتہ ہفتہ بھر سے حضرت والار کی طرف خاص کشش محسوس ہو رہی ہے اور زیارت کو
دل تڑپ رہا ہے۔

س۔ یہ آپ کا جذبہ محبت ہے، ابھی تامل فرمائیں۔
غ۔ ”مرتبہ احسان“ کی اصطلاح ”ارواحِ ثلاثہ“ (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ اور
اس مسلک کے اکابر کے اقوال و احوال پر مشتمل ایک کتاب ہے اور اس پر حضرت
حکیم الامت کے حواشی بھی ہیں) میں کئی جگہ آئی ہے، احقر نے مولانا محمود الغنی صاحب
مظلہ سے اس کی وضاحت چاہی تو فرمایا کہ ”یہ مرتبہ مولانا تھا نووی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا
یا اب۔۔۔۔۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب جیسے بزرگوں کو حاصل ہو
مجھے یہ مرتبہ حاصل نہیں۔ یہ تقویٰ کے بعد کا مقام ہے“۔۔۔۔۔ حضرت والاؒ
سے درخواست ہے کہ اس کی وضاحت فرمائیں!

س۔ ”مرتبہ احسان“ اصطلاح حدیث نبویؐ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت اس طور سے ہو
کہ اللہ تعالیٰ کا دل میں پورا استغفار رہے کہ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں یا یہ کہ میں انہیں دیکھ
رہا ہوں۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ یہ مرتبہ عنایت فرمائے!
غ۔ پہلے عقائد کچھ مبند مانے تھے، حضرت والار کے تعلق سے ٹھیک ہو گئے، مگر کبھی یہ خیال آتا ہو

کہ ممکن ہے اب بھی سیدھا راستہ نہ ملے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے بھی غلوں تھا اور اب بھی ہے۔ اس ڈر سے مخالف مکتب خیالی کی کتابیں بھی لکھا دیکھ لیتا ہوں اور ان کا اپنے مسلک سے موازنہ کرتا ہوں، الحمد للہ کہ اپنا ہی مسلک مضحکہ اور دوسروں کا بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔
 _____ صراطِ مستقیم کی دعا بھی ہر وقت کرتا ہوں، کیا یہ ٹھیک ہے؟

س۔ آپ مطمئن رہیں کہ جس راہ پر آپ میں محمد اللہیہ سنت کی راہ ہے، قرآن پاک اور تراجم حدیث شریف پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ کون سنت پر ہے، یہ تذبذب کی راہ ہے اس کو دور کیجیے۔

غ۔ چونکہ ہر عبقی غلوں اور دیانت سے عاری نہیں ہوتا، اس لئے خیال یہ ہوتا ہے کہ نادانی سے صدق نیت کے ساتھ جو بدعات میں مبتلا ہو، اس کو حق تعالیٰ اپنے لطف سے عفو نہ فرمائیں گے البتہ اس کو اس راہ پر ڈالنے والے عالم یا شارح پر گرفت اور سخت گرفت ہوگی، کیا یہ احتقر کا خیال درست ہے؟

س۔ اگر کوئی شخص اپنے دہم میں غلوں کے ساتھ کسی کو قتل کر دے یا گناہ کر بیٹھے کہ کسی بیوہ کو رزق اس طرح ملے گا تو کیا جائز ہے؟ (یعنی نیت بھی اسی وقت موثر ہے جب کہ اس سے پہلے عمل کی صحت متحقق ہو جائے، اسی لئے حدیث شریف انما الاعمال بنية کی تشریح میں فی الخیرات کی قید سب محدثین نے تسلیم کی ہے!) ہادی اور مقتدی دونوں گرفتار ہوں گے۔

غ۔ حضرت والا! احتقر کے لئے فلاجِ داین کی دعا فرمائیے

لے یہی حق کا معیار ہے، درنہ مبتدع لوگوں کی سند کا مدار زیادہ سے زیادہ بزرگوں کی طرف منسوب روایات ہیں جو اصلاً کوئی وزن نہیں رکھتیں، اگر قرآن و حدیث سے مؤید ہیں تو حق ہیں ورنہ غیر اہم اور بعض صورتوں میں قابلِ تحقیر۔

نہ بنی اسرائیل کے واقعات میں یہی فیصلہ قرآن نے بار بار سنایا ہے!

تو دستگیر شوالے خضر پے نختہ کہ من
پنیا دہ می روم دہسہ ہاں سوارا سند
توجہ کا طالب، احقر غلام محمد

س۔ دل سے دُعا ہے،

یہ "خضر پے نختہ" توفیق الہی ہے، جس کی دُعا مانگنی چاہیے۔

یہ چچاں سلیمان ۹ صفر ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۴۲)

خ۔ حیدر آباد دکن -

حضرت سیدی و مولائی رفیعہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گامی!

گذشتہ کرم نامہ سے سرفرازی کے بعد سے احقر بخار میں مبتلا تھا اور پھر خارش نے ستانا
شروع کیا، چنانچہ اس وقت شدید تکلیف میں یہ عریضہ گزاراں رہا ہوں، ان بیماریوں کے
سبب سے غمزدہ و تہجد اکثر قضا ہو جاتی ہے دوسرے معمولات جاری ہیں،

س۔ بھوپال

جیسی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہ

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ الحمد للہ مع الخیر ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو شفاء عطا فرمائیں۔

کوئی ہرج نہیں، وہ معمول جس کو آپ غیر ارادی مانع کے سبب سے ادا نہ کر سکیں اللہ تعالیٰ
انشاء اللہ آپ کو اس کے ثواب سے محروم نہ رکھیں گے، بشرطیکہ دل میں یہ غم ہو کہ اگر مانع
نہو تو انشاء اللہ ضرور ادا کر تا، کیسی اس کی رحمت ہے!

غ۔ حضرت والادہ کی تشریف آوری کا بے حد انتظار ہے، حضور کرم فرمائی کا قصد رکھتے ہیں۔

_____ ایک خبر یوٹی ٹیم ثقہ ذرائع سے ملی تھی کہ حضرت والادہ حیدر آباد تشریف لارہے

ہیں اور بہت جلد!

س۔ کیا کہوں کہ کن متضادات میں گرفتار ہوں، بس اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں!

غ۔ احقر کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے حضرت والادہ فرمائیں۔

احقر غلام محمد

س۔ دلی دُعا ہے۔ والسلام

یچمراں سلیمان ۲۰ ریح الاول ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۴۳)

غ۔ حیدر آباد دکن

میدی و مولائی مد ظلم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

احقر اب تقریباً روبہ صحت ہے اور معمولات پر پابند، حضرت واللہ سے درخواست ہے کہ

استقامت فی الدین اور صحت کلی کے لئے دعا فرمائیں!

س۔ بھوپال

محب میم نادر اللہ تعالیٰ حباً فیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ فقیر کا مزاج مجد اللہ مع الخیر ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب آپ اچھے ہیں، معمولات پر پابند رہنے پر مبارک باد قبول کیجئے،

بارک اللہ فیکم، صحت کُلّی کی دل سے دُعا ہے۔

غ۔ احقر خود کو مرض دنیا کا شکار پاتا ہے، خیال ہوا کہ مراقبہ موت و ما بعد الموت کروں اب

حضرت والا کا اذن مطلوب ہے۔

س۔ طلب وسعت رزق کا نام دنیا نہیں ہے بلکہ اس کا نام ہے کہ دوسروں کی ملکیت پر قابض ہو جائے اور مایحتاج مل جانے کے بعد بھی نظر دوسروں پر ہو۔

اجواب ختم ہو گیا، مراقبہ موت سے متعلق حضرت مرشدی رحمہ کا سکوت اب سمجھ میں آتا ہے کہ کس قدر عارفانہ تھا اور اپنی تجویز و تشخیص کس قدر طفلانہ تھی کیونکہ اس سے مجھ میں قنوطیت پیدا ہو جاتی جو مہلک ہے، اکیس سالک کو کوئی عمل مباح بلکہ مستحب بھی بلا اجازت شیخ اختیار نہ کرنا چاہیے۔

غ۔ اپنی خستہ حالی سے پریشان ہو کر جی پاتا ہے کہ کچھ دنوں الگ تنہا رہوں، حضرت والا مدظلہ کی آمد کی خبر سن کر اس کو اپنے لئے باعث رحمت سمجھا تھا لیکن حضرت اقدس کے گذشتہ مکتوب سے یہ امید بھی ٹوٹ گئی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت والا کو کسی حیلہ بہانہ ہم خادموں کی جمعیت خاطر اور دینی ترقی کے لئے یہاں بھیج دے۔

س۔ گھبرائیں نہیں، حضرت والا رحمہ اللہ کے مواعظ و تصانیف کو اپنا رفیق بنائیں۔ بالفعل اوائل تاریخ تک کے لئے لکھنؤ اور اعظم گڑھ کا قصد ہے!

غ۔ احقر کی اہلیہ حضرت والا کے ارشادات پر کاربند ہیں اور بعد سلام دعا کی درخواست گزاریں، کوئی قابل عرض بات نہ ہونے کی وجہ سے خود عرض نہ نہیں گزارنا ہے۔ حضرت والا احقر کی فلاح دارین کے لئے دعا فرمائیں۔ فقط

غلام محمد معنی عنہ

س۔ عزیزہ و فقہاء اللہ تعالیٰ کی پابندی کی خبر سے مسرت ہوتی ہے، اس سے استعداد طبعی کا اندازہ ہوتا ہے، اللھم زد فزد۔
دل سے فقیر دعا کرتا ہے۔

پہچاں سلیمان

مکتوب (۴۴)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۲ جمادی الاول ۱۳۳۶ھ

سیدی و مولائی دام نطفکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ مزاج مبارک !

۲۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہو رہی ہے لیکن حضرت والار سے نیاز حاصل کرنے کو جی بہت تڑپتا ہے، اللہ تعالیٰ کوئی صورت پیدا فرمائیں۔

س۔ بھوپال

۲۶ ج ۱ ۱۳۳۶ھ

محب مخلص و صمیم زاد تو فیہمکم

۱۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ، الحمد للہ شیریت ہے،

۲۔ اللہ تعالیٰ کوئی موقع عطا فرمائیں۔

غ۔ حضرت مولانا محمود الغنی صاحب احقر کے حال پر پہلے سے زیادہ کرم فرمائیں اور اکثر کتابیں (خصوصاً حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی) از خود عنایت فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ ”حسن العریز“ (ملفوظات حکیم الامت جمع فرمودہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مخدوم) کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہو رہی ہے اور ایک کتاب کسی قدیم بزرگ کی ”عجاس الاولاد“ نامی بھی مولانا نے عنایت فرمائی ہے، (عجاس الاولاد ایک سو عجاس پر مشتمل ہے اصل کتاب زبان عربی میں ہے اور اس کا صاف و سلیس ترجمہ مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب داندیری نے کیا ہے، کتاب کے مصنف شافعی مسلک کے کوئی عالم ربانی ہیں، اپنا نام اظہار

نہیں فرمایا ہے، تصحیح عقائد اور رد بدعات میں نہایت مدلل و مؤثر تالیف ہے،

س۔ بزرگوں کی توجہ کو فال نیک سمجھیں، اللہ تعالیٰ فائدہ بخشیں،

غ۔ اپنے معمولات پر قائم ہوں مگر حالت میں کوئی ترقی نہیں پاتا بلکہ اکثر پستی ہی محسوس ہوتی ہے،

حضرت والارہ دعا فرمائیں کہ اللہ اپنے کرم سے احقر کو محروم نہ فرمائے!

س۔ وہ کسی کو محروم نہیں کرتا (کس قدر ہمت افزا یقین ہے) آپ اپنے عمل کو جاری رکھیں، اور

مداومت کریں، پھر اس قسم کے وساوس کی پروا نہ کریں۔

غ۔ آج کل وساوس بہت آتے ہیں اور بعض دفعہ غیر شعوری طور پر ان میں مشغولیت ہو جاتی

ہے، البتہ چونکہ پڑنے پر خیال کو کسی اور جانب لگا دیتا ہوں،

س۔ ایسا ہی کیا کیجئے!

غ۔ لوگوں سے ہم کلامی سے خواہ وہ اپنے ہم رتبہ ہوں یا علماء جی یہ چاہتا ہے کہ کوئی بات زبان

سے ایسی نکلے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اکثر ہو بھی جاتا ہے تو کیا ایسے مواقع پر سکوت اختیار

کر لینا چاہیئے۔ دُعا خواہ

احقر غلام محمد

س۔ یہ تو ریا ہے، لوگوں کی تعریف پر نظر رکھنے سے کیا حاصل؟ کیا اس سے قرب الہی اور دخول

جنت میں کچھ بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ پھر بے حاصل ہے اور اس کی طرف نظر رکھنا اللہ تعالیٰ

کی جلالتِ شان سے بے خبری ہے، اب جب ایسا خیال آئے تو خاموش رہیئے، اور

استغفار کیجئے۔

دل سے دعا ہے، سید محمد اسلم

مکتوب (۴۵)

غ۔ حیدر آباد دکن، ۷ اپریل ۱۹۴۷ء

سیدی دسندی و مولائی دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک!

گزشتہ دو مہینوں سے پھر شدید غارش میں مبتلا ہوں چونکہ بیماریوں میں معمولات کا نقصان ہوتا ہے اس لئے بیماری سے ہمیشہ پناہ چاہتا ہوں۔

س۔ ازجہوپال

محب صمیم و مخلص قدیم زادکم اللہ تعالیٰ عرفانا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ خیریت ہے۔

بیماری پر صبر ہو تو اس سے تکفیر سیئات اور رفع درجات حاصل ہوتا ہے اس لئے اس کو پناہ تو نہ مانگئے البتہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ سے عاقبت طلب کیجئے! (کیا بصیرت افزا جواب ہے)

غ۔ نقشبندیہ سلسلہ میں لطائف سنیہ کا جو ذکر آتا ہے، کیا یہ سب حدیث و قرآن و ثوابت میں؟ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا ایک ملفوظ نظر سے گذرا جس سے معلوم ہوا کہ ہمارے طریق میں صرف لطیفہ قلبی پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ یہی حدیث و ثوابت ہوا۔ حدیث و قرآن سے ثابت نہیں، حدیث و قرآن سے صرف لطیفہ قلب ثابت ہے۔ قرآن پاک میں "قلب منیب" اور "قلب سلیم" کا ذکر آتا ہے، حدیث میں ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹوٹھرا ہے وہ ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا، "الادھی القلب"، اس لئے حاجی صاحب رحمۃ اللہ کے سلسلہ میں سارا زور قلب کے تزکیہ پر ہے!

غ۔ لطائف جاری ہونے کا منشا بھی سمجھ میں نہ آیا!

س۔ منشا یہی ہے کہ اللہ اللہ کی آواز ہر جگہ سے موبہوم ہوتی ہے،

غ۔ احقر کے لئے استحکام فی الدین اور ترقی ایمان کی دعا فرمائیں۔ فقط

(احقر غلام محمد عفی عنہ)

لہذا اس لفظ کے استعمال کو حضرت والدہ دُست نہ سمجھتے تھے، بالمشافہ احقر کو اس سے سن فرمادیا تھا۔

س۔ سوخ و کمال ایمان کی دعا ہے۔

پچھراں سلیمان ۱۳ ج ۱ ص ۳۶۶

مکتوب (۳۶)

غ۔ حیدر آباد دکن

جمادی الاول

سیدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج افدس!

احقر بفضلہ تعالیٰ شیریت سے ہے اور معمولات پر پابند!

س۔ از بھوپال

حبیبی و عزیزِ اہم اللہ توفیقاً تم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، بحمد اللہ کہ فقیر مع الخیر ہے!

مبارک کہ استقامت اس راہ میں سب سے بڑی چیز ہے:

غ۔ احقر کو اس وقت رخصت کا حق بھی حاصل ہے اور اخراجات سفر بھی موجود ہیں، اجازت ہو

تو احقر یہ مدشوق حاضر ہوگا، اور یہی اشتیاق اور اصرار میری اہلیہ کا بھی ہے، لیکن اس سلسلہ میں

ایک عرض کی بہ صد ادب جسارت کر رہا ہوں، چونکہ احقر کا وہاں کوئی دوست یا شناسا نہیں

نیز حضرت پیرانی صاحبہ اب وہاں تشریف رکھتی ہیں، اس لئے حضرت والاہ کے توسط سے

کوئی مکان یا کمرہ پر مل جائے تو کرم بالائے کرم ہوگا۔ اگر یہ انتظام

بہ سہولت ممکن ہے تو احقر آئندہ ماہ حاضری کا قصد رکھتا ہے۔

حضرت والاہ سے دینی و دنیوی فلاح کے لئے دعا کی درخواست ہے، فقط

جو یائے کرم، احقر غلام محمد

س۔ آنے کا شوق مہارک مگر صورت حال یہ ہے کہ جس مکان میں میں ہوں اس میں گنجائش مطلق نہیں اس لئے بالفعل بھر کیجئے اور عزم منسوخ کیجئے پاس میں کوئی دوسرا مکان بھی نہیں مل سکتا، یہاں غلہ کی بھی وقت ہے، اور موسم گرم ہے شاید کہ آئندہ کوئی مناسب صورت نکل سکے۔

آپ کے شدتِ شوق کو دیکھتے ہوئے ہر چند کہ یہ التوا آپ پر شاق ہو گا تاہم بالفعل اسی میں مصلحت سمجھیں، (اللہ اللہ! اپنے خادموں کی یہ دلدادگی!)
دلی دعا ہے۔
شیخ محمد اسلمان

مکتوب (۴۷)

غ۔ حیدر آباد دکن

۳ شوال ۱۳۶۰ھ

حضرت سیدی و مولانی ادام اللہ فیہ السلام، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
الحمد للہ حضرت والا کے جواب سے سرفرازی ہوئی اور بصیرت حاصل ہوئی، امید ہے کہ
حضرت والا مزید محالگیر ہوں گے!

س۔ جھوپال

۳ شوال ۱۳۶۰ھ

عزیز صمیم روزگم اللہ تعالیٰ شایہ معرفتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! الحمد للہ خیریت ہے!

غ۔ آج دفتر جاری تھا کہ اپنی نظر خلق پر ہونے کا تصور پیدا ہوا اور یہ خیال کافی قوت سے ابھر
آیا کہ اگر تیری نظر خلق پر نہیں تو آج جو ماہاتھ میں لئے ننگے پیر حیل

عمل میں کچھ ابھی تذبذب تھا کہ معادوسر خیال یہ آیا کہ شرعاً اس کا مامور نہیں کیا گیا، اس

لئے یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا!

لئے کیوں اس خیال پر عمل کروں، بہر حال خیال اول پر عمل نہ ہو سکا، معائنہ عرض یہ ہو
ان دونوں خیالات میں سے کون رحمانی ہے اور کون نفسانی؟ تاکہ آئندہ ایسی حالت میں
نفس کو ذلیل کیا جاسکے،

س۔ بے شبہ یہ ایک مرض ہے جس کا نام عجب ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور اس کا علاج بھی ہی
ہے جو آپ کے ذہن میں آیا، مگر یہ مرض کے آخری درجہ کا علاج ہے، ابھی تو یہ خطرہ کی حد میں ہے
اس کا علاج یہ ہے کہ مخلوق اگر مجھے اچھا سمجھے یا بُرا سمجھے آخرت کا معاملہ تو مخلوق کے سمجھنے پر نہیں
خالق کے سمجھنے پر ہے، معلوم نہیں وہاں کیا حال ہوگا، پھر عجب کا ہے پر!

اس کے ساتھ اپنے گناہوں اور عیوب کا استحصار کیا جائے کہ مخلوق تو علم غیب سے
محروم ہے وہ ہمارے اچھے یا بُرے ہونے کا کیا فیصلہ کر سکتی ہے، اوس کو خبر ہی کیا ہے
(تفصیل کی نزاکت، تجویز کی صداقت اور قوتِ اظہار، ہر بات سے حضرت والا
کی تحقیقہ شان عیاں ہے!)

غ۔ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ کی کتاب "امیر" مطالعہ میں ہے، چند ہی اوراق پڑھنے پر
قلب میں آخرت اور عالم روحانی کی طرف میلان محسوس ہوا اور اس عالم فانی سے بے رغبتی
محسوس ہونے لگی، احقر کے لئے اس قسم کی کشفی اور ذوقی کتابیں دیکھنا مناسب ہے
یا نہیں؟

س۔ کتاب اچھی اور موثر ہے، پڑھئے!
غ۔ "تفسیر حقانی" سے متعلق حضرت والا کی رائے معلوم ہو تو احقر کے لئے موجبِ طمانیت
ہوگی، نیز اور مستند اردو، تفاسیر کی طرف بہری فرمائی جائے تو ہدایت کا باعث ہوگا۔
س۔ اس تفسیر میں ذرا عقلیت کا میلان ہے۔ آپ حضرت والا کی تفسیر (بیان القرآن) کیا
نہیں دیکھتے؟

(بیان القرآن دیکھتا تو تھا مگر تفسیر حقانی کو اس سے بہتر سمجھتا تھا لیکن جب قرآن فرمیں

- کا کچھ ذوق پیدا ہو گیا تو اپنے خیال کی غلطی معلوم ہوئی اور بیان القرآن کی عظمت کا اندازہ ہوا)۔
- غ۔ بحمد اللہ رمضان کے روزے پورے ہوئے، قبولیت کے لئے دعا فرمائیں،
- س۔ اللہ تعالیٰ میرے اور آپ کے روزے قبول فرمائیں!
- غ۔ گذشتہ کچھ عرصہ میں متعدد مرتبہ احقر نے یہ خواب دیکھا کہ قبضی سے اپنے مونچھ اور ناک کے بال تلاش رہا ہے، ایک مرتبہ تو بہت بڑی قبضی ہاتھ میں تھی
- س۔ اس سے اشارہ اصلاح کی طرف ہے، اصلاح ہو رہی ہے۔
- غ۔ عید کی رات کو بعد تہجد خواب دیکھا کہ میری شیروانی جو حسب معمول گھٹنوں تک ہوتی ہے ٹخنہ کے قریب تک لائی ہے۔ اس پر میں خود متحجب تھا، اطلاع عرض کر دیا۔
- س۔ لباس کا بڑا ہونا علم دین کی طرف اشارہ ہے، بشارت ہو، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں،
- غ۔ ذکر خفی کے بجائے پھر چہری کی طرف طبیعت کا میلان ہے مگر اس میں ضعف دماغی کا قوی امکان ہے!
- س۔ ذکر چہری میں سستی ہے اس لئے جی چاہتا ہوگا، اپنی طبیعت کا اندازہ کر لیں پھر فیصلہ کریں،
- غ۔ احقر کی اخروی دینی صلاح و فلاح کے لئے حضرت واللہ دعا فرمائیں،
- وابستہ دامن احقر غلام محمد
- س۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں،
- فقیر و پیر محمد اسلمیان ۱۳ شوال ۱۳۶۷ھ

مکتوب (۴۸)

غ۔ جسدر آباد دکن

۹ مئی ۱۹۳۷ء

حضرت اقدس واعلیٰ علیہ السلام العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک!

تین چار روز سے احقر کو ڈاؤن نے خواب دکھائی دے رہے ہیں، کبھی زبردست سانپ دکھائی دیتے ہیں اور کبھی شیر وغیرہ اکثر وہ حملہ کرنا چاہتے ہیں اور احقر کو ڈر بھی ہوتا ہے مگر وہ قریب آکر رہ جاتے ہیں، حملہ نہیں کر پاتے!

س۔ بھوپال

حبیبی و صدیقی رفع اللہ شانکم

الحمد للہ خیریت ہے۔

اگر معدہ کی خرابی سے یہ نہیں تو نفسِ امارہ شیر اور شیطان، سانپ ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں،

غ۔ تقریباً ایک ہفتہ قبل خواب دیکھا کہ احقر کو معلوم ہو گیا ہے کہ اب موت آنے والی ہے اس کا اظہار احقر نے اپنے والدین وغیرہ سے بھی کر دیا اور نہایت خوش تھا کہ اب اس دنیا سے کوچ کر نہیے، یہاں تک کہ بعض وصیتیں وغیرہ بھی لکھ کر حوالے کر دیں اور بالکل تیار ہو کر انتظار میں بیٹھا تھا اور فرط مسرت سے ایک مرتبہ یہ مصرع بھی زبان سے نکلا کہ

ظ۔ قلنہ جزو روح لا کچھ بھی نہیں دکھتا

اس کے بعد کچھ سوس دردمند شروع ہوا گویا شرابان پھٹنے والی ہے مگر یہ صرف طبعی تکلیف تھی اور دل برابر اس کوچ سے مسرور تھا، ایسے میں آنکھ کھل گئی اور ایک ذہن میں جو بات آئی وہ یہ تھی کہ موت کے وقت اور اس کے بعد اگر کوئی چیز باعث تسکین و مسرت ہو سکتی ہو تو صرف وہی عمل ہے جو شریعت کے مطابق اور سنت کے ماتحت ہو، باقی سچ۔

اس خواب کے بعد ہم گھنٹہ تک دل پر عجیب ہی حسرت طاری رہی کہ اگر ایسی موت نصیب نہ ہوتی تو کیا ہو گا؟ کیونکہ اپنی بد اعمالیوں کے پیش نظر تو اس کی کوئی امید نہیں۔

حضرت والاہ احقر کے لئے فلاح دارین کی دعا فرمائیں، فقط احقر غلام محمد

س مبارک کیفیت ہے! عہ خرم آں روزگزی منزل ویراں بروم
موت کی تیاری یہی ہے کہ اعمال طاعت میں اضافہ ہو ورنہ (محض ڈرتو) طبیعی کمزوری ہے،
دلی دُعا ہے!

پچھماں سلیمان ۱۵ مئی ۱۹۳۷ء

مکتوب (۳۹)

غ۔ حیدر آباد دکن

یکم رجب ۱۳۶۶ھ

سیدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

بھلا اللہ معمولات پر کار بند ہوں لیکن خیال میں یکسوئی نہیں رہتی بلکہ سخت انتشار رہتا ہے

س۔ بھوپال

۶ رجب ۱۳۶۶ھ

براہِ عزیز و مخلص نادکم اللہ تعالیٰ حرصاً علی الدین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ مع الخیر ہوں۔

یہ شکر کا تقاضا ہے، یکسوئی عقیدہ کی مطلوب ہے اور وہ آپ کو حاصل ہے یعنی یہ کہ

صرف خدائے تعالیٰ کی رضا کے لئے آپ کام کر رہے ہیں، یہی مقصود ہے، باقی یکسوئی

خیال جس کا دوسرا نام نحو ہونا یا انہماک ہے نہ مقصود ہے اور نہ ہر ایک کیلئے محمود

(کیا قیمتی ارشادات ہیں، اس کی قدر یا تو مالک مبتلا جان سکتا ہے یا مالک عارف)

غ۔ مناجات مقبول کے آخر میں جو شجرہ درج ہے، کیا احقر اس کی بھی تلاوت کر لیا کرے؟

س۔ شجرہ کا مطالعہ کر لیا کریں، اوس کو بطور در دروزانہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، (حرف حرف سے اعتدال مسلک نمایاں ہے)!

غ۔ حضرت تھانویؒ کے مواعظ بہ اعتبار زبان ایسے ہیں کہ غیر فارسی و عربی داں افراد ان سے پورا استفادہ نہیں کر سکتے، ایسی صورت میں اگر ان کی زبان سلیس کر دی جائے تو شاید نفع زیادہ عام ہو، واللہ اعلم، اگر حضرت والاؒ مناسب تصور فرمائیں تو احقر کس وعظ کی تسہیل کر کے خدمت والاؒ میں پیش کرے گا۔

س۔ کسی وعظ کو عام فہم کر کے مجھے دکھائیں،

غ۔ سنا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے حضرت والاؒ کو دعوت پہنچی ہے (تو سیمی خطبات کے سلسلہ میں) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سے قبل بھی ایک ایسا موقع فراہم کیا گیا تھا مگر حضرت والاؒ تشریف نہ لاسکے، اس کے وجہ کچھ بھی رہے ہوں، احقر تو اپنی حد تک یہی سمجھتا ہے کہ

گر کشش میں اثرے داشتے یا رسمیم گندے داشتے

س۔ ابھی وقت کی تعیین نہیں معلوم نہیں ہوئی،

یہ سب آپ کی محبت ہے!

غ۔ احقر کے مزاج میں غصہ زیادہ ہے، اس کے انزالہ کی تدبیر تجویز فرمادیں!

س۔ یہ تصور کریں کہ اللہ تعالیٰ کو ہم پر اس سے زیادہ قدرت ہے پھر بھی وہ علم و درگزر فرماتا ہے تو ہم کو اس سے زیادہ علم چاہیے۔

غ۔ ”الفتح الربانی“ (مواعظ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، اس کا اثر یہ ہے اپنا عمل سچ، علم ہوتا ہے، منافقت اور دیا تقریباً ہر عمل میں محسوس ہوتی ہے اور اسی وجہ سے انجام کا بڑا خوف ہے، حضرت والاؒ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاص عمل عطا فرمائے، فقط

توجہ کا طالب، احقر غلام محمد

س۔ یہ کیفیت بھی اچھی ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے نیازی کے استحضار سے یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے مایوسی نہ پیدا ہو کہ وہ کُفر ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رحمت و مغفرت کا نیک گمان رکھ جائے، (کس قدر جہل مرکب میں مبتلا ہیں وہ لوگ جو اس مذہب کو جس میں مایوسی کُفر ہے تنوہیت افزا سمجھتے ہیں) دل سے دُعا کرتا ہوں،
پچھڑا سلیمان

مکتوب (۵۰)

ع۔ خیر آباد دکن

۱۶ رجب ۱۳۶۶ھ

ستیدی و مہندی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاج اقدس!

مواظعت کی تسہیل کی اجازت پا کر بڑی مسرت ہوئی۔ احقر نے "سلسلۃ الاحیاء" کا ایک وعظ "الدنیا والآخرۃ" منتخب کر لیا ہے، جب اس کا مسودہ حضرت والارہ کی خدمت میں پیش کروں تو کیا اصل وعظ بھی ساتھ رہے؟

س۔ بھوپال

حبیبی و صدیقی و مخلصی زاد عرفانکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ خیریت ہے،

خدا کرے کہ یہ کام بہ احسن وجہ انجام پائے۔ ————— یہ آپ کے لئے زادِ آخرت ہو

جی ہاں، اصل اور تسہیل دونوں بھیجیں!

ع۔ زومان قیام بھوپال حضرت والارہ نے غالباً فرمایا تھا کہ کتابوں کی چھپائی پر ناشکر کتب سے

کوئی رقم لینا (بطور معاوضہ حق اشاعت) درست و جائز نہیں، اس مسئلہ کی توضیح چاہتا ہوں

س۔ قلمی مسودہ کو اگر ناشر کے ہاتھ پہنچا جائے تو درست ہے، البتہ حق تصنیف فروخت کرنا حضرت والارحمۃ اللہ تعالیٰ (یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) کے نزدیک درست نہیں مجھے گواہ میں کچھ شبہ ہے مگر عمل اس پر ہے، مسئلہ اب تک مجھ پر محقق ہوا نہیں (کیا حزم و احتیاط ہے)

ع۔ اور کوئی بات قابل عرض نہیں بجز اس کے کہ حضرت والارحمۃ اللہ تعالیٰ کی دنیوی و اخروی صلاح و فلاح کے لئے دُعا فرمائیں۔ فقط

احقر غلام محمد

س۔ میری تمام نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، والسلام بیچراں سلیمان (بس انہی دُعاؤں کے سہارے مغفرت کی امید قائم ہے)

مکتوب (۵۱)

ع۔ حیدر آباد دکن

۳۰، رجب ۱۳۶۶ھ

سیدی و مولانی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۱، مزاج اقدس!

۱۲) بھلا اللہ مولات پر پابند ہوں اور وعظ کی تسہیل کا کام بھی حسبِ فرصت انجام دے رہا ہوں، اللہ تعالیٰ انھیں بے طاقت کی مدد فرمائیں!

س۔ بھوپال

۱۸، شعبان ۱۳۶۶ھ

عزیز گرامی اذاکم اللہ تعالیٰ عرفانہ

۱۱) الحمد للہ خیریت ہے، ایک ماہ سے جوشِ چشم ہے، ایک آنکھ ابھی ہو گئی ہے، دوسری

ابھی تک اپنی حالت پر ہے لوشٹ و خواند سے مزدوری ہے، اسی لئے خواب میں تاخیر ہوئی، دُعا کیجئے۔

(۲) بحوالہ

غ۔ چند روز قبل تقریباً بجے صات کے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی کو خواب میں ایک مسجد کے اندر دیکھا پھر وہاں سے ایک اور جگہ جہاں حضرت کی دعوت تھی، احقر بھی وہاں پہنچ گیا، حضرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے مجھے کھانا کھلا دیا گیا اس کے بعد آکھ کھلی۔ مگر پھر خواب کھ لگی تو دوبارہ حضرت حاجی صاحب قس سے فرما کر مسجد ہی میں گیا، ہم نے نماز یا جماعت ادا کی، اس کے بعد حضرت حاجی صاحب تقریر کے لئے استاد ہوئے اور خطاب شروع فرمایا، مضمون اس وقت یاد نہیں۔ لوگ بہت کم تھے، دو ماں و عطا ہی مٹھائی تقسیم ہوئی، احقر کو بھی ایک پیڑا ملا، اس کے بعد ایک جوان نے جو خطاب علم معلوم ہوتا تھا سبز رنگ کی صابو میں تقسیم کیں لیکن بعض بعض کو دیں اور کسی کو ایک اور کسی کو دو، احقر کو تین صابوئیں دیں جو احقر نے جیب میں رکھ لیں، ایسے میں آکھ پھر کھل گئی اور میں نماز تہجد کے لئے اُٹھ گیا،

حضرت حاجی صاحب کا صحیح حلیہ معلوم نہیں لیکن خواب میں حضرت کو گورا، دُبلّا، بلند قامت اور سفید ریش دیکھا، واللہ اعلم، صابن کا منشا ٹھیک طور پر سمجھ میں نہیں آیا،

س۔ شکر کیجئے کہ آپ نے اپنے سلسلہ کے موت اعلیٰ کی زیارت کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس سلسلہ سے مناسبت ہو گئی، رحمہ اللہ تعالیٰ کھانا یعنی رزق اس سلسلہ کے فیوض و برکات ہیں، صابون تزکیہ و تصفیہ کے سامان و آلات ہیں، (اس تبصر کو پا کر یہ بات ذہن میں جم گئی ہے کہ اپنے رنگ آلود قلب کو بہت گھسنا اور صاف کرنا ہے بس اللہ تعالیٰ ہی ہمت و توفیق عطا فرمائے، ناظرین کرام

بھی اس سراپا عیب کے صفائے باطن کے لئے دعا فرمائیں
 غ: جی چاہتا ہے کہ جب اس دنیا سے جانا ہو تو کوئی دنیوی آرزو دل میں موجود نہ رہے
 اعمال کی تقصیر عیاں مگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو کیا بعید ہے
 مجھے مشکل سے مشکل ہے انھیں آساں سے آساں ہے
 حضرت والا اس ناکارہ کے حسن خاتمہ کے لئے دعا فرمائیں۔

س۔ بالکل صحیح ہے دعا کیلئے: فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا
 والاخرہ توفی مسلماً والحقنی بالصالحین
 غ۔ ایک کیفیت ابتدا سے آج تک محسوس ہوتی رہی ہے، مگر عرض کی جسارت آج کر رہا
 ہوں، وہ یہ کہ بعضے بزرگ کے پاس بیٹھا تو اولیاء اللہ اور ان کے قصص سے دلچسپی پیرا
 ہوئی، بعضے بزرگ کی صحبت سے دل کا میلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و
 واقعات سننے کی طرف زیادہ ہوا، لیکن حضرت والاہ کی صحبت میں خواہ وہ جسمانی
 حاضری کے ذریعہ ہو یا بذریعہ خط و کتابت، ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے راست کشش محسوس
 ہوتی ہے اور اب احقر کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ بدعتی اور قبر پرست کو توحید
 کا کچھ مزہ ملتا بھی ہوگا، والسلام، تو توجہ خاص کا طالب
 احقر غلام محمد

س۔ یہ احوال و کیفیات ہیں اور ان میں سے ہر ایک صحیح اور درست ہے، رسول کریم
 علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت بھی اللہ ہی کی خاطر ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
 وسیلہ میں مقصود نہیں ہیں:

ملہ اس کی وجہ اب یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت مرشدی قدس سرہ پر توحید ہی کا خاص غلبہ تھا اور
 کمال یہ کہ تنزیہ کے ساتھ تھا، اسی وجہ سے زبان پر کبھی "وحسدة الوجود" یا "وحدۃ الشہود وغیرہ کے مسائل نہیں۔

انی وجہت و جہی للذی فطر السموات والارض حنیفاً وانا من المشرکین، حضورؐ کی محبت بھی واجب بلکہ فرض ہے لیکن اس کی حیثیت وضو کی فرضیت کی نسبت جس کے بغیر نماز درست نہیں، لیکن وضو مقصود نہیں، مقصود نماز ہے۔

اس بات کو زبان سے ظاہر کرنے میں اکثر غلطی کا اندیشہ ہے اس لئے اسکا تذکرہ نہ کیا جائے۔ یہ سچا سیدمان (تحقیق و احتیاط اور آداب کا یہ لحاظ کلک سلیمانی کا خاص و نادر وصف ہے!)

مکتوب (۵۲)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۲ رمضان ۱۳۶۶ھ

حضرت سیدی دہلوی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج اقدس!

حضرت واللہ آج کل سخت اضطراب مبتلا ہے، جو گذر رہی ہے اس کو اپنی عدم استعداد اور حضرتؒ کے پاس آداب کے نظر صحیح طور پر پیش بھی نہیں کر سکتا، بجز خدمت اقدس میں حاضری کے علاج کی کوئی اور صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ حضرت واللہ کے دولت کدہ سے متصل مسجد کے کمرہ میں امام صاحب کی اجازت سے ٹھہر جاؤں گا، غور و نوش کا انتظام ہوٹل میں ہو جائے گا، یہ اس لئے عرض کیا کہ حضرت کے دولت کدہ میں گنجائش نہ ہوگی اور اگر اب سفر نہ کر سکا تو پھر حضرت واللہ کا سفر شروع ہوگا اس کے بعد تہجلی کب زیارت نصیب ہوگی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اگر حالات زیادہ خطرناک ہو گئے تو الگ مشکل ہے۔

س۔ بھوپال۔ ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

محبوب و عزیز قلبی شفاکم اللہ تعالیٰ وعظا عظم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ الخیریت ہے۔

مید کے بعد رنی کی کیٹی دہلی میں ہے اوس میں جا رہا ہوں، انشاء اللہ اخیراً ست تک واپسی ہوگی اور ماہ ستمبر تک روانگی ج کانیال ہے،

طالب علمانہ زندگی مسجد کے حجرہ کی اختیار کر سکتے ہوں تو شروع ستمبر میں آجائیں، (یہ بات بھی بس استعنائاً ہی تحریر فرمائی گئی ورنہ جب حاضر ہوا تو انہی پچھلے الطاف سے بہرہ مند رہا)

۱۔ اوپر جو کچھ عرض کیا وہ محض اظہار حال ہے، حضرت والا در کو مجبور کر کے اجازت حاصل کرنا مقصود نہیں، ہزار بار بھی جواب اگر نفی میں ملتا ہے تو احقر اسی کو جتنی برصحت یقین کرے گا۔ البتہ یہ عاصی بہر صورت خصوصی دُعا و توجہات کا محتاج ہے۔ فقط احقر غلام محمد

۲۔ یہ آپ کی سلامت رومی کی دلیل ہے جس سے جی خوش ہوا،

ہمیشہ دعا ہے۔ — پیچداں

سید سلیمان ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

(اس گرامی نامہ کو پا کر سارا کرب و اضطراب ختم ہو گیا، اب اگر بے چینی تھی تو ماہ ستمبر کے آمد آمد کی — جیسے ہی ستمبر کی پہلی تاریخ آئی ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ ۳ ستمبر کو اپنی حاضری کی اطلاع بارگاہ سیلانی میں کر دی اور دختِ سفر باندھ لیا)

بھوپال کی دوسری حاضری

(۳ تا ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء)

بازہوائے چنم آرزو دست جلوہ سرو سمنم آرزو دست

امتحان شوق شوق کو عجیب امتحان دہش تھا ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کا جو کشت و خون شروع ہوا تو بھارتی علاقوں

میں مسلمان کی نقل و حرکت مشکل ہو گئی اور جو بے غلوں دن گزرتے جاتے تھے ظلم و ستم بڑھتا ہی جا رہا تھا، ان واقعات کو سن سن کر احباب و اعزہ التوائے سفر کا مشورہ دے رہے تھے امدان ہی مشوروں کو سن کر طبعی خوف کچھ خود پر بھی طاری ہو ہو جاتا تھا مگر شوق زیارت اپنی جگہ برابر قائم تھا اور کب سفر کو جی مانتا ہی نہ تھا، آخر اس کشمکش کا ذکر اپنے مخدوم و کرم فرما مولانا محمود الغنی صاحب مدظلہ کی خدمت میں کر دیا، مولانا برہم ہو گئے، فرمایا: لگے کہ آپ حضرت سید صاحب کی ذات کو مقصود بنا کر جا رہے ہیں یا حق تعالیٰ کی ذات آپ کا مقصود ہے؟ اگر اللہ کے لئے یہ سفر ہے تو پھر دوس بات کا، اگر مارے جائیں گے تو شہادت نصیب ہوگی۔ ان کلمات میں کچھ ایسی قوت تھی کہ دل بالکل یکسو ہو گیا اور حق تعالیٰ کی نگہبانی کا استحضار قوی تر ہو گیا

ع دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

اسٹیشن پیر ستمبر کی تاریخ آپہنچی، شام کے وقت ضروری اسباب سفر کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچا، کہاں وہ پھلی گھاگھی کہ کھوے کھو اچھلدا اور شور و غل سے کان پٹھے جاتے تھے اور کہاں آئے کا بھیانک سناٹا، اسٹیشن پر مسافروں کی تعداد پہلے تو بہت ہی کم تھی۔

کوئی پچیس تیس برس گئے اردان میں کچھ صرف دو مسلمان، اور لطف کی بات یہ کہ دونوں علانیہ مسلمان، صورتِ شکی اور وضع و قطع تک میں تلبس کا ہر نشان مٹائے ہوئے اس منظر سے دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی ہی تھی کہ معاہدت و عزیمت اس پر غالب آگئی اور اللہ کا نام لے کر میں ٹرین پر سوار ہو گیا اور کچھ زیر میں وہ براہِ روی بھی میرے ہی ڈبے میں آ گئے۔

ٹرین چلی، اسٹیشن گذرتے چلے گئے، رات کے ۹، ۱۰ بجے ہوں گے جی چاہا کہ ٹرین کے ڈانگ کا ریس جا کر چائے پی لوں کیوں کہ رات آنکھوں میں کٹنی تھی وہاں جو پہنچا

تو دودھ اسی ہندو بیٹھے چائے پی رہے تھے بڑے ہی متعصب اور سنگدل، مجھے آتا دیکھ کر ان میں سے ایک نے طنز آمیز ہنسی کے ساتھ خواہ مخواہ مخاطب کر لیا، "تشریف لائیے مولیٰ صاحب" (تشریف لائیے مولوی صاحب) میں نے اس کی بات اُن سنی کر دی اور الگ ایک میز پر چائے منگوائی، اُن دونوں نے یہ سمجھ کر میں کوئی "ملانا" ہوں انگریزی میں خوب دل کھول کر باتیں شروع کر دیں کہ کل گراڈ ٹرنک میں اتنے مسلمان مار ڈالے گئے، فلاں گاڑی میں اتنے مسلم بچوں کا سر قلم کر دیا گیا اور درمیان درمیان میں اپنے جذبات کا بھی اظہار میری طرف چشمِ داہرو کے اشارہ سے کرتے جا رہے تھے کہ ان کج فتنوں کو تو اس طرح تلوار کے گھاٹ اتارنا چاہیے۔ میں دل ہی دل میں نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین فرمودہ دُعا پڑھتا رہا کہ اللھم اِنی اِجعلک فی خور ھم و اعدو ذلک من شر و در ھم اور الحمد للہ کہ دل میں اس دُعا کی برکت سے ایسی قوت محسوس ہو رہی تھی کہ اگر سو ہندو بھی مل کر حملہ کریں گے تو مجھے ذرہ برابر نقصان نہ پہنچا سکیں گے کیونکہ میری طرف سے تو اللہ تعالیٰ کی قوت و طاقت مقابل ہو جائے گی۔ میں نے اطمینان سے چائے پی لی اور مسلمانوں کی خونی داستانِ قتلیٰ مجبوراً سُسنی پڑی مَن کر اپنے ڈبے میں آ بیٹھا۔ تاریخِ انسانیت میں آزادی کی خوشی میں خون کی ہولی ایسی کم ہی کھیلی گئی ہوگی،

رات کا تین چوتھائی حصہ آنکھوں آنکھوں میں گٹ گیا لیکن پھر نیند غالب آگئی اور قریب تھا کہ سویرے نکل آتا، حیرت ہوئی کہ ایک ہندو نے مجھ کو جگایا اور نہایت ترش لہجے میں کہنے لگا کہ

گھنٹہ، ایک گھنٹہ جیسی فرصت ہو۔

غ۔ سلف صالحین کے واقعات شاہد ہیں کہ ایک دفع انہوں نے دین کا رخ کیا تو پھر ساری عمر کے لئے دنیوی رغبتیں چھ ہو گئیں، آج ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ کیا یہ درست ہے کہ سر اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دُوری کے متناسب اثرات بھی گھٹتے جا رہے ہیں۔
 س۔ ایسے واقعات ممکن ہیں اور ہوتے ہیں مگر ان کا شمار معجزات اور کرامات میں ہے درز کا مباحی تو کام ہی سے ہو سکتی ہے، اکثریت کے لحاظ سے تو یہ خیال صحیح ہے کہ عہد نبوی سے بعد کا وقت ہو گیا، مگر ممکن ہے کہ پچھلے افراد میں پہلے افراد کے سے یا بہتر لوگ ہوں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ میری امت کی مثال بارش کی ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا اول زیادہ مفید ہے یا اس کا آخر، واللہ تعالیٰ بڑی امید کی یہ خوش خبری ہے!
 غ۔ احقر کے لئے حضرت والارہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ فقط
 احقر غلام محمد

س۔ دلی دعا کرتا ہوں۔ والسلام

یچمداں سلیمان ۲۰ شوال ۱۳۹۹ھ

اس سفر میں پہلی بار جناب عاقم سے ملنے اومان کی شرافت و محبت سے مسرور ہونے کا موقع ملا، حضرت والارہ نے ازراہ تعارف مسکراتے ہوئے فرمایا کہ عام میاں سخت مُسلم بیگی ہیں ادب یہاں دہنا پسند نہیں کرتے بلکہ پاکستان ہجرت کر رہے ہیں۔
 چنانچہ یہی ہوا کہ وہ ۱۹۴۷ء ہی کے ادھر میں کراچی پہنچ گئے!

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللہ علیہ قطب وقت حضرت شاہ ابوالفتح چوہالی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک ممتاز بزرگ

گز رہے ہیں اور خود حکیم الامت بھی آپ کے کمالات باطنی کے معترف رہے ہیں شہر میں آپ کی خاندانہ جمعہ خاص و عام رہی ہے، ہمارے حضرت والارہ کو بھی اس سے خصوصی تعلق

اس بنا پر رہا کہ حضرت کے برادر بزرگ شاہ ابو حسیب صاحبؒ اسی خانقاہ کے تربیت یافتہ اور حضرت شاہ ابوالاحمد قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔۔۔۔۔ اس خانقاہ کی رونق اکمل حضرت شاہ ابوالاحمدؒ کے چھوٹے فرزند حضرت شاہ یعقوب مدظلہ کی ذات باجمال ہے جو پیر نفعی میاں صاحبؒ کے نام سے معروف ہیں، حضرت والاؒ کبھی کبھی پیر صاحب کے پاس بھی چلے جاتے تھے اور خود پیر صاحب کبھی کبھی حضرت والاؒ کے دولنگہ پر تشریف لاتے تھے۔

احقر کو اب تک ان بزرگ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی تھی، ایک شام حضرت والاؒ نے خود ہی فرمایا کہ ”چلئے آپ کو شاہ ابوالاحمد صاحبؒ کی خانقاہ دکھاؤں“

ہم نماز عصر پڑھ کر چلے مگر جب خانقاہ پہنچے تو ابھی پیر صاحب مسجد سے واپس تشریف نہیں لائے تھے، حضرت والاؒ نے فرمایا کہ یہ حضرات نماز عصر بہت تاخیر کر کے پڑھتے ہیں، چنانچہ مغرب میں شاید آدھ گھنٹہ باقی ہوگا کہ پیر صاحب نماز عصر سے فارغ ہو کر تشریف لائے، ان کی سکینت قلبی اور نور باطنی کا اثر ان کے چہرہ بشرہ سے نمایاں تھا۔ عمر اس وقت پچاس کچھن کے لگ بھگ ہوئی، حضرت والاؒ کو دیکھ کر لپکے اور ادب و احترام سے بٹھایا، احقر کی بابت پوچھا تو حضرت والاؒ نے حسب عادت فرمایا کہ ”یہ میرے دوست میں حیدر آباد دکن سے ملے آئے ہیں!“

اس کے بعد کچھ دیر دونوں بزرگوں میں قرآن پاک کی آیت

”وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظَلَمُہُمْ بِالْغَدُوِّ وَالْاَصَالِ“ (رعد) سے متعلق گفتگو رہی اور خود پیر صاحب ہی نے استفسار اُپہ ذکر چھیڑا تھا۔ پیر صاحب کا کلام تمام تر ذوق رنگ کا تھا اور ہمارے حضرت والاؒ کی تشریحات سراسر مالائے نوح کی تھیں جن سے غالباً ان کے ذوق کی تشفی نہ ہو سکی کیونکہ ”ظلال“ کا مسئلہ حضرات مجددیہ کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسکی توجیہ بھی ان کے ہاں خاص ہے جس پر وعدۃ الشہود کا داد و مدد ہے۔

لے اس عبارت کو پڑھ کر حضرت پیر صاحب نے احقر کو دکھا کہ ان کے ہاں تو نمازیں اول وقت ہی ہوتی ہیں مگر عصر کے بعد چونکہ کچھ دیر درس رہا اس لئے واپس میں اتنی تاخیر ہو گئی تھی۔

غرض مغرب کی نماز کا وقت قریب آیا تو یہ مجلس خیر برخواست ہو گئی!

سیاسی حالات کی ابتری
اور واپسی کی اجازت

حضرت والارہ کی خدمت میں احقر کو ہر طرح آماد سکون حاصل تھا اور حیدر آباد کی طرح ریاست بھوپال بھی پراسن و عافیت تھی مگر ان دور ریاستوں سے باہر ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ انتہائی درد انگیز اور وحشت انگیز تھا، اور ہر نئے دن کی اطلاع پچھلے دن کی اطلاع سے المناک مل رہی تھی، بھوپال پہنچ کر شاید دو تین ہی روزہ ہوئے تھے کہ گرینڈ ٹرنک اکسپرس کے بند ہونے کی اطلاع ملی، اس اطلاع پر دو دن بھی نہ گزرے ہوں گے کہ دہلی اور بعض دوسرے شہروں کے فسادات نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ ”دکن ایویز“ کی ہوائی سروس بھی بند ہو گئی! ڈاک کے سارے معاملات قدرتاً مطلق ہو گئے، اس صورت حال سے مجھ کو کبھی بڑی تشویش ہوئی، حالانکہ ادھر

میں ایک محفوظ جگہ پر تھا اور اُدھر متعلقین بھی ایک مامون مقام پر! مگر پریشانی اس بات کی تھی کہ ان حالات میں جب کہ کوئی خط آجا نہیں رہا تھا اور خود میری واپسی کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں نہ جانے والدین کس قدر پریشان ہوں گے اور اس پریشانی میں نہ معلوم کیا اقدام کر بیٹھیں، کہیں ان مزدوش حالات میں ٹرین جادی ہوتے ہی میرے لئے گھر سے نکل نہ پڑیں راستہ تو ہر حالت میں غیر محفوظ رہے گا۔ اسی ذہنی انتشار میں معلوم ہوا کہ ”گرینڈ ٹرنک“ گاڑی پھر چلنے لگی ہے، مگر مسلمان کے لئے سفر نہایت خطرناک ہے، میں نے سوچا کہ بھوپال اسٹیشن پر چل کر دیکھا جائے۔ انواہوں میں مبالغہ بھی ہوتا ہے، اسٹیشن پر پہنچا تو ہوٹو کا عالم تھا، کچھ دیر میں ٹرین آکر رکی، یہ ”آپ“ ٹرین تھی ہر ڈبہ میں دو چار مسلح سکی بیٹھے ہوئے جن کی آنکھوں سے معصوموں کا خون ٹپک رہا تھا مسلمان کا اس ٹرین میں کیا پتہ چلتا، کوئی شریف ہندو بھی جہاں تک نظر دوڑ سکی دکھائی نہ دیا، اس منظر کو دیکھ کر میں نے یہ تو قطعی فیصلہ کر لیا کہ واپسی کا سفر ٹرین سے نہ ہو گا۔

گھر آ کر حضرت والارہ سے سارے مشاہدات بیان کئے اور عرض کیا کہ حضرت اب جب

ہوائی سروس شروع ہو جائے تو پہلے جہاز سے واپسی کی اجازت مرحمت ہو، حضرت دالدار نے ازراہ شفقت فرمایا کہ آپ بھی محفوظ رہیں اور آپ کے متعلقین بھی، تو جلدی کرنے کے بجائے قیام اور طویل کر لیجئے تو کوئی ہرج نہیں جب راستہ پر امن ہو جائے تو پہلے جانا، ابھی تو مجھ کو بھی کہیں جانا نہیں ہے۔ _____ مگر جب احقر نے والدین کی طرف سے تشویش ظاہر کی تو مسکراتے ہوئے سعدی کا یہ شعر پڑھ دیا۔

چنانچہ سالے شد اندر دشت کہ یاراں فراموش کردند عشق

احقر خاموش ہو رہا تو پھر فرمایا کہ ہوائی اڈے سے معلوم کر لیجئے کہ فضائی سروس کب جاری ہوگی؟ دوسرے دن مگر جناب ابونا صم صاحب کی کوشش سے اتنا تو ہوا کہ مشروط کنگس - (Provisinal Booking) کا یقین حاصل ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ۱۲ ستمبر کو دہلی مسجد آباد فضائی سروس کھل جائے گی۔

یہ تو ہوا سرب مسئلہ رقم کی فراہمی کا تھا اس لئے کہ میرے پاس تو ٹرین کے سفر کے لانٹن ہیں نہ پیسہ تھا، ہوائی جہاز کے اخراجات تو کئی گنا زیادہ تھے۔ آخر حضرت دالدار ہی سے مجبوراً اس کی درخواست کی گئی، چنانچہ فوراً قبول فرمایا گئے، اور اسی طرح پہلے جہاز کے امیدواران پر وائس مجھ کو بھی داخلہ مل گیا۔

۱۱ ستمبر کی صبح کو ہوائی جہاز کے دفتر سے اطلاع مل گئی کہ ۱۲ کی صبح کو بجے ہوائی اڈے پر تیار رہنا چاہیے کیونکہ ابجے جہاز بھوپال ایر وڈروم پر اتار دیا ہے، البتہ اگر جگہ نہ ملے تو لوٹ جانا ہوگا۔ چنانچہ ۱۲ کی صبح ایر پورٹ کی بس گھر پر آ پہنچی، حضرت اقدس سے بادل غواستہ رخصتی مصافحہ کر لیا گیا، حضرت دالدار نے دعاؤں سے سرفراز کرتے ہوئے اپنے خادم کو رخصت فرمایا۔ _____ کوئی آدھ گھنٹہ میں بس نے ایر پورٹ پر پہنچا دیا۔

چونکہ پانچ چھ دن کے بعد آج فضائی سروس جاری ہو رہی تھی اس لئے مجھ جیسے کئی میڈار ہتھے اور سب جانے کے لئے مضطرب و پریشان، کوئی دہلی کی سمت اور کوئی دکن کی جانب، مگر

ان سب میں بہت باختر خاطر نواب صاحب بھوپال کے ایک لے۔ ڈی سی تھے جن کے بچے اور ہشیرہ دلی میں تھیں اور ان کی غیر خیریت سے یہ ہفتہ بھر سے لاعلم تھے، وہ اپنی پریشانی کے عالم میں جناح صاحب کو بھی بُرا بھلا کہہ رہے تھے کہ ایسے بڑے سیاست کو اپنی ہمسایہ قوم کی نفسیات کا اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ وہ اقلیت پر کیا ظلم ڈھائے گی، آخر اس کے تحفظ کی کچھ تو فکر کی ہوتی، یوں ہی ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا، ————— موت ایسا تھا کہ اور کسی لوگ بڑھ چڑھ کر ان کی تائید کر رہے تھے، میں چپ کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا ————— آخر خود اسی دل جلے نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا آپ کہاں جائیں گے، آپ کو سیٹ مل گئی؟ میں نے جو صورت تھی بتادی، تو انھوں نے کہا کہ آپ کا جہاز ہم سے پہلے آئے گا، میں آپ کے لئے کوشش کرتا ہوں، بس یہ کہتے ہوئے وہ دفتر میں گئے، عہدہ دار سے بھگڑنے لگے کہ ان مولانا صاحب کو تو سیٹ دینی ہی ہوگی، یہ وقت مضابطہ کا نہیں، ہر چند وہ عہدہ دار کہہ رہا تھا کہ جب تک جہاز یہاں پہنچ نہ لے ہم وعدہ نہیں کر سکتے، مگر یہ اس سے قطعی وعدہ لینے پر مُصر ہو گئے، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ گفتگو ایک فوجی سپاہی نے سن لی جو وہاں تعینات تھا، اُس نے مداخلت کی اور کہا کہ میں دیکھ لوں گا کہ مولانا کو سیٹ کیسے نہیں ملتی، آپ مطمئن رہیے، میں الطاف خداوندی پر حیران کہ میں تو خاموش مگر غیب سے ایسے ایسے مومنین کھڑے کر دیے گئے ہیں —————

بالآخر جہاز آگیا اور متعلقہ عہدہ دار نے سُنا دیا کہ جہاز پورا بھرا ہوا ہے کوئی سیٹ خالی نہیں، فوجی پٹھان کو یہ سُن کر غصہ آیا، اُس نے کہا سیٹ کیسے خالی نہیں، میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں، چنانچہ اس نے جا کر دیکھا تو ہم بچے تھے جو چار نشستوں پر قابض تھے، اس نے عہدہ دار سے کہا کہ ان کا نصف ٹکٹ ہوتا ہے، ان چار کو دو سیٹ پر بٹھا کر دو مسافر اور دو روزہ آج جہاز یہاں سے نہیں اُڑے گا، عہدہ دار اس منطق اور دھمکی سے متاثر ہوا، اس نے ایک سیٹ خالی کرادی اور مجھ کو بٹھلادیا، فوجی صاحب نے شکریہ ادا کرنے سے پیشتر خود ہی مجھ کو داس سلام کیا اور تسلی دلائی کہ اب آپ آرام سے تشریف لے جائیں ————— دل نے کہا کہ وہ لے۔ ڈی سی ہو یا

نوحی سپاہی یہ سب حضرت شیخؒ کی دُعا سے مقبول کی صورتیں ہیں !
یہ میرا پہلا انصافی سفر تھا جو تین گھنٹہ میں ختم ہو گیا اور شام کی چائے پر تو میں گھر میں موجود
تھا اور سب کے لئے مسرت و استعجاب کا موجب بنا ہوا۔

مکتوب (۵۴)

غ۔ جسدِ آہاد کن

حضرت مرشدی و مولائی مدظلہ العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
بمدا اللہ کل دُعا مجھے بھوپال سے روانہ ہو کر تقریباً ۵ بجے بحیریت گھر پہنچ گیا، تفصیلات سفر
علیحدہ کاغذ پر پیش ہیں (حضرت والاہ نے فرمایا تھا کہ ہوائی جہاز کے سفر کی تفصیل لکھیں)
س۔ بھوپال

مرزبانی و محبتی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ لحرصاً علی الدین
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کے بحیریت پہنچنے کی خبر سے خوشی ہوئی، تفصیلات
سفر دلچسپ اور حجرات آموز تھیں (اب تک حضرت اقدسؒ نے بھی ہوائی جہاز پر سفر نہیں
فرمایا تھا، البتہ اب اس کی ضرورت درپیش تھی)

غ۔ دورانِ قیام حضرت والاہ کے جو عنایات و لطافتِ احقر کے حال پر رہے اس پر حق تعالیٰ
کا شکر ادا کرنے اور حضرت والاہ کی عمر و درجات اور فیوضِ برکات میں ترقی کی دُعا کرنے
کے سوا احقر کے بس میں اور کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں،

س۔ یہ سب آپ کی محبت کے کرشمے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم دونوں (یہ ہم دونوں کا لفظ میرے لئے
طغرائے سعادت ہے!) کو اخلاص کے ساتھ الحب فی اللہ تعالیٰ کا مرتبہ عنایت فرمائیں،
(دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا ہی ہو گا کیونکہ خدا کے فضل و کرم سے حضرت والاہ کے اخراجات
تک اخلاص و محبت کی افرونی ہی متیقن رہی، واللہ اعلم بالصواب)

غ۔ جناب سید ابوعاصم صاحب کی ہمدردیوں کا بے حد شکور ہوں اور مسلمان میاں سلفہ کی محبت و عنایت کا ممنون! سب کی خدمت میں سلام عرض ہے،

س۔ یہ دونوں عزیز بھی آپ کے عزیز ہیں اس مستحکم رشتہ میں حضرت والا رحمہم کو بانڈھ گئے، دعا بھی رہے گی اور کوشش بھی کہ یہ جیل متین ثابت رہے (ان دونوں کی طرف سے سلام قبول کیجئے،

غ۔ ترمسٹھ روپیہ ذریعہ منی آرڈینیشن میں تین روپیہ نامہ ہیں، دو سلیم صاحب (حضرت والا کے خادم خاص) کے لئے ہیں اور ایک علی حسن صاحب (حضرت والا کے دینار باورقی کے لئے)۔ یہ حقیر تو بارگاہِ سلیمانی کے ہر فرد کا بے حد شکور ہے۔

س۔ روپے نکل گئے اور حسبِ ہدایت (اذا شانِ تواضع ملاحظہ ہو، اس فنائیت کا پر تو بھی ہم ناکاروں پر پڑ جائے تو بڑی کامرانی ہے) تقسیم کر دیے گئے باقی قرض میں مجرا کئے گئے۔ استطاعت کی حالت میں قرض کا جلد ادا کر دینا بھی ثواب کی بات ہے اگر اس نیت سے کریں (جملہ کا آخر جزو نہایت قیمتی ہے، ہم شب و روز اکثر اچھے کام کر کے بھی ثواب سو حصص اس لئے محروم رہتے ہیں کہ رضائے حق یا اتباعِ حکم الہی کی نیت اس سے متعلق نہیں ہوتی، حالانکہ نیت ہی پر اجر کا مدار ہے)

غ۔ منی آرڈر وصول ہونے پر اس عریضہ کا جواب مرحمت فرمایا جائے تو بہتر ہے، احقر اور اس کی اہلیہ کے لئے توفیقِ عمل صالح اور اذیادِ ایمان کی دعا کی درخواست ہے۔

کترین غلام محمد فی عنہ

س۔ اس لئے انتظار کیا،

دلی دعا ہے ————— پیچھاں سلیمان ۴ ذیقعدہ ۱۳۶۰ھ

ایک صاحب امداد اللہ ہیں جو مجھے کبھی خط لکھتے ہیں اون کا پتہ میرے پاس نہیں، اگر آپ ان کو جلتے ہوں اور یہ کر سکتے ہوں تو یا تو ان کے پتہ سے مطلع کر دیں، کسی دفتر

میں دو نوکر ہوئے ہیں۔ یا ان کو یہ خبر کر دیں کہ جو مسئلہ انہوں نے پوچھا تھا وہ دوبارہ مجھے
 لکھ کر بھیجیں، مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میں نے اول کے جواب میں غلطی کی ہے، والسلام
 یچھاں سلیمان

ایک فتویٰ مسئلہ تھا اور جواب حضرت نے عطا تو صحیح فرمایا تھا مگر اشتباہ کی بنا پر
 اتنی احتیاط فرمائی، اہل تقویٰ و خشیت ایسے ہوتے ہیں! حکیم امداد اللہ صاحب (حال
 مقیم کراچی) میرے لڑکپن کے ہم جماعت اور دوست عزیز ہیں، اس لئے حضرت کے
 ارشاد کی تعمیل میں کوئی وقت نہ ہوئی!

مکتوب (۵۵)

”نامہ عاصم بن ام آثم“

ذیل کا مکتوب جناب سید ابو عاصم صاحب کا تحریر فرمودہ ہے، اس سے اس وقت
 کے حالات کی دراندیشی اور حضرت والا رحمہ کے سفر حرمین سے مجبوری کا حال معلوم ہوگا۔ اس
 خط کے لئے خود حضرت رحمۃ اللہ کے قلم سے بھی ایک نوٹ ہے!

دار الفضا، بمبئی

۱۹۴۷ء

معظمیٰ ذکریٰ زاد الطائفکم

سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کل غنایت نامہ نے عزت بخشی، محبت اور لطف
 صحبت کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس کترین کی ذات کے ساتھ جس محبت کا اظہار آپ نے فرمایا ہے
 اس کو اپنی خوش بختی، سب کا کرم اور اللہ کی عنایت سمجھتا ہوں، نیکوں کی محبت شاید نجات
 کا ذریعہ بن جائے۔

(اب حضرت اقدس کی ذیلی تحریر ملاحظہ ہو، کس قدر حسرت اثر ہے)
 عزیز محترم دام توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
 افسوس کہ بالآخر سفر حج سے محرومی رہی، سہارن پور کی آمد و رفت قطعاً ممکن نہیں، اور
 کراچی تک سفر محال، والسلام

یہ چچا مال سید سلیمان ۲۳ ذیقعد ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۵۶)

شاہ: حیدر آباد دکن

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء

حضرت سیدی و مولائی مدظلہم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج اقدس!

نہر می مولوی ابو عاصم صاحب کا جوابی خط جس پر حضرت والدہ نے بھی اندازہ شفقت
 خطاب فرمایا ہے صادر ہوا، یہاں ہزاروں کی تعداد میں باہر سے مسلمان چلے آ رہے ہیں،
 پردوں سے شہر سبارن پور کے فسادات اور صوبہ بہار کی دہشت ناک صورت حال کی
 اطلاعات مل رہی ہیں، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور حضرت والدہ کو سکون خاطر حاصل ہو۔

س۔ بھوپال

۵ دسمبر ۱۳۶۶ھ

محبتی و مختصی حبیبی اذاکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، الحمد للہ تعالیٰ مع الخیر ہوں، آنکھوں میں آفتاب نہ آئے آنکھوں

لے حیدر آباد کے محاررہ میں "مولوی" کا لفظ محض محبت احتساب کے طور پر استعمال ہوتا تھا، مولویت
 سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

میں پالی آ رہا تھا)

جی ہاں! سہانپور سے خطوط کبھی کبھی آ جاتے ہیں، ورنہ ڈاک اور تار سب بند ہیں، اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں۔

غ۔ انکشف (مُصَنَّف حضرت مولانا تھانویؒ) میں ”تنزیلاتِ ستہ“ سے متعلق جو بحث ہے اس کو یہاں ایک عالم سے (مُراد استادِ مکرم مولانا محمد صابر صاحب مدظلہ سابق پروفیسر دینیات اورنگ آباد کالج) جو حضرت مولانا حافظ بشارت کریم صاحب مجاہدِ حق اللہ علیہ سے بیعت و خلافت رکھتے ہیں، احقر نے سمجھا، اور اس خیال سے کہ حضرت والاؒ عازم حج ہو چکے ہیں اس سلسلہ میں مشورہ حضرت مولانا محمود الغنی صاحب سے کر لیا تھا۔ ان عالم کا مشورہ ہے کہ احقر ان سے ”لوائح جامی“ پڑھو اور سمجھ لے، حضرت والاؒ کے حکم کا منتظر ہوں،

س۔ تنزیلاتِ ستہ وغیرہ کے مسائل علم کے لئے آپ سمجھ لیں تو اچھا ہے ورنہ درحقیقت وہ فلسفہ یا علم کلام کے مسائل ہیں، سلوک کے لئے وہ ضروری نہیں۔
لوائح جامی بھی پڑھ لیں اور سمجھ لیں۔

غ۔ حضرت تھانویؒ نے مذکورہ صدر مسئلہ کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے،

”وهذه المسئلة مسئلة واحدة من الفن في بادي النظر. لكن بعد المعان جميع الفن فيه مستتر“ بنا بریں کیا صحیح ہے کہ اس مسئلہ کو محض عقلاً بھی سمجھ لینے سے عبادات میں خشوع و خضوع اور حضورِ نبی قلب میسر آتا ہے کیونکہ اس میں عباد و معبود کا تعلق معلوم ہو جاتا ہے۔

س۔ ممکن ہے کسی کو اس راہ سے بھی مل جائے ورنہ ہمارے سلسلہ میں دلائل اور لطائف اور تنزیلات وغیرہ کے مسائل معمول بہا نہیں ہیں۔

غ۔ بحمد اللہ معمولات پر پابندی ہے، ذکر تہری کر رہا ہوں، قیامِ توجہ کے لئے تسبیح بھی سیکھ لیتا

ہوں اس میں حرج تو نہیں!

س۔ الحمد للہ وبارک اللہ

ذکر تہری میں زبان کو حرکت نہیں ہوتی صرف قلب سے تصور میں ذکر ہوتا ہے ایسے
اوس کے لئے قلب کی توجہ اور بیداری کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، تسبیح سے اس
توجہ میں کمی آجاتی ہے (بلاشبہ یہی بات صحیح ہے) کیونکہ توجہ تسبیح کے دانوں اور مقدار
پر ہو جاتی ہے مگر آپ کو اگر اس میں آسانی ہے تو کیجئے، مقصود ذکر سے ہے!

غ۔ ذکر تہری کی وجہ سے دماغ پر بار نہیں ہوتا اس کے باوجود اضافہ مقدار کی طرف قلبی

میلان نہ ہونے سے بہت رنج ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم نہ فرمائے!

س۔ کچھ حرج نہیں، مقصود کیفیت نہیں، کیفیت ہے (یہ تنبیہ بڑی اہم، اکثر محض کمیّت

ہی پر نظر جاتی ہے اور بعض مرتبہ اس سے یا تو عجب پیدا ہوتا ہے یا اس کے ثمرات نہ

پاکر مایوسی یا لگہ شکوہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر کیفیت پر نظر ہو تو ہمیشہ اپنی کوتاہی کا احسان

بیدار رہے اور نفع بڑھتا چلا جائے)

غ۔ احقر کی اہلیہ کا حافظہ کمزور ہے، رد اجاری ہے، کوئی دعایا اور بھی اس سلسلہ میں ہدایت

فرمایا جانے تو زیادہ تقویت ہو۔

س۔ حافظہ کی قوت کے لئے دو کیجئے اور یہ تسبیح بھی پڑھ لیں **فَاَللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا**

وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ

غ۔ احقر اور اس کی اہلیہ کے لئے ایمان ماسخ اور استحکام عمل صراح کی دعا کی درخواست ہے

فقط احقر غلام محمد

س۔ دل سے دعا کرتا ہوں،

آپ کی ایک سادہ کاپی یہاں چھوٹ گئی تھی، اس سے پہلے خط میں جو ضائع گیا اوس کی

نسبت ہدایت پوچھی تھی جواب کا انتظار کر کے مسلمان میاں نے اوس پر تصرف کر لیا

اب آپ انہیں معاف کر دیں اور ہدیہ کر دیں یا اون سے قیمت قبول کر لیں۔ والسلام

پچھڑا سلیمان

(معاملات میں یہ حزم و احتیاط مسلک اشرفیہ کا طفرائے امتیاز ہے، اور لوگ اس کو داخل تصوف ہی نہیں سمجھتے، الا ماشاء اللہ)

مکتوب (۵۷)

غ۔ یس۔ آبد، مکن

۹ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ

سیندی دلولائی مد ظلم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
ذکرِ تیری میں تسبیح رکھنے سے متعلق حضرت اقدس نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل
بجائے ہے، واقعی توجہ تسبیح کی طرف ہی رہتی ہے مگر حضرت دالارہ کی تنبیہ سے پہلے اس کا
احساس نہ تھا، ایسی ہی صورتوں میں شیخ کامل سے تعلق کی ضرورت کا احساس قوی ہوتا
ہے۔ ————— رسوخ ایمان کے لئے دعا کی درخواست ہے،

س۔ از بھوپال

محبتی و عزیز میری و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ عرفانا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ تعالیٰ مزید ترقی بخشیں ————— دل سے دعا ہے۔

غ۔ میری کاپی سلمان میاں سلمہ نے استعمال فرمائی، انھیں اس کا اختیار حاصل تھا، تکمیل
ضابطہ کے لئے احقر اب اس کو ان کے حق میں ہبہ کر چکا،
س۔ انہوں نے دینے سے پہلے قبول کر لی۔

غ۔ دورانِ قیام احقر نے دیکھا تھا کہ حضرت دالارہ کی آنکھوں میں بار بار رطوبت آجاتی ہے،

یہ اطر بیفل کشیزی سے نائل نہ ہوگی احقر ایک دوا ارسال خدمت کر رہا ہے ناشتہ سر گھنٹہ بھر قبل نیم گرم دودھ کے ساتھ استعمال فرمائیں۔ (مقدار خوراک ۶ تا ۹ ماشہ ہے) پھر سوتے وقت اطر بیفل اسطو خود دوس، ماشہ ایک گھونٹ ٹھنڈے پانی کے ساتھ استعمال فرمائیں، انشاء اللہ سب شکایات رفع ہوں گی۔ _____ مصلہ خدمت دوا کا نسخہ یہ ہے۔

پوست بلیلہ زرد، پوست بلیلہ، آملہ منقی، خشخاش ہر ایک تین تولہ، اسطو خود دوس ایک تولہ، کشیز مقشر د تولہ، مغز بادام پانچ تولہ، مغز کدو، مغز تخم تر جود، مغز تخم خرپرہ، مغز تخم خیاریں، مغز نازیل ہر ایک چھ تولہ، دوق نقرہ پچاس سد، شہد خالص ایک سیر، مقدار خوراک ۶ تا ۹ ماشہ، اطر بیفل اسطو خود دوس دین آسانی سے مل جائے گی اس لئے پیش نہیں کی گئی،

حضرت والار سے فلاح دارین کے دُعا کی درخواست ہے۔

س۔ دوا مل گئی اور استعمال بھی شروع کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نافع کریں اور آپ کو رحمت کی جزائے خیر دیں، عکیم ضیاء الحسن صاحب نے نسخہ کو دیکھ کر پسند کیا۔ دُعا کرتا ہوں، سب کی طرف سے سلام قبول کریں۔

پچواں سلیمان ۲۰ ذیحجہ ۱۳۷۷ھ

مکتوب (۵۸)

ع۔ حیدر آباد دکن

۵ نومبر ۱۹۵۷ء

حضرت اقدس واعلیٰ مدنیوہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ مزاج اقدس!

۲۔ چند دنوں سے احقر کا تجیب حال ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ راستہ چلتے چلتے گڑھے میں گر پڑا، شب و روز دماغ میں ایسے بُرے خیالات کی یورش رہتی ہے کہ ان کے اظہار کو بھی شرم گھولنا نہیں کرتی، اس کی وجہ کچھ معلوم نہیں!

س۔ اندھکوپال

۹ نومبر ۱۹۷۷ء

عزیز دینی و صدیقی زادکم اللہ تعالیٰ عرفانا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ تعالیٰ تیریت ہے، آنکھوں کی سُرخی میں کمی ہے، ملاج جاری ہے، آپ کا جوں بھی کھا رہا ہوں،

۲۔ یا تو آپ کے معدہ کا فعل خراب ہے یا دماغی ضعف ہے، خورکینے کہ کوئی خاص ایسی بے اعتدالی تو نہیں ہو رہی ہے جس سے ضعف پیدا ہو، اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو محض دہم ہے،

رغ۔ گو حضرت والدہ کے ارشاد کے مطابق اپنے نقائص پر نظر کھنے کی سعی کرتا ہوں لیکن بھر بھی دوسریں کے دینی نقائص پر نظر بہت جاتی ہے اور بالخصوص اہل علم حضرات کی بے غلیوں پر کہ علم کے باوجود یہ علماء دین کی جانب متوجہ نہیں ہوتے، ہر چیز پر خیال کرتا ہوں کہ نہ میں محتسب نہ اس فکر سے کچھ حاصل بھر بھی یہ بد نظری نہیں جاتی، اس سے نجات کی کوئی صورت تجویز فرمائی جائے تو بڑا کرم ہو۔

دُعا کا طالب، احقر غلام محمد

س۔ خیر اگر بطور خطرہ کے ذہن میں خود بخود آجائے تو حرج نہیں، مگر اوس کے مطابق مسئلہ کریں، تیر کا ایک مصرعہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی موقع پر لکھا ہے،

ع۔ تجھ کو پرانی کیا پڑی اپنی بیڑ تو

قرآن پ۔ میں ہے علیکم بانفسکم لا یضی کم من ضل اذا اھتدیتم اللہ تعالیٰ ہدایا ہے،

پہچان سلیمان

یہ امتیاز خاص حضرت والدہ کا تھا کہ وہ حکماء و صوفیاء کے اقوال کی جگہ قرآن پاک ہی سے استناد فرماتے تھے،

مکتوب (۵۹)

اب جو مکتوب درج ہو رہا ہے وہ حضرت علامہ کی سیاسی و ایمانی بصیرت کا یکساں آئینہ دار ہے اور اس میں درس یہ ملتا ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھتے ہوئے پرکارِ فکر کو اصولِ دین کے مرکز سے کبھی ہٹنے نہ دینا چاہیے ورنہ عمل کا جو دائرہ بھی بنے گا غلط ہو گا جب جب اصول کو نظر انداز کیا گیا خواہ قصداً یا سہواً، تو پھر حرمانی و پیشمانی ہی کا منہ دیکھنا پڑا، —
نظامِ حیدر آباد کوں میر عثمان علی خاں کا مسلکِ اہل سنت والجماعت سے شیعیت کی طرف گریز دراصل وہ نقطہ تھا جہاں سے حیدر آباد کی نکبت شروع ہوئی مگر لیڈروں کی نظریں (بجز ایک دیدہ ورقایدِ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے جو کبھی ادھر سے ناقل نہ رہے) یہ بات محض انفرادی حیثیت کی تھی اور ناقابلِ التفات بھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظامِ دکن کی دو طرفہ روش سے بالکل بے خبر رہے اور ان کا خلوص اور ان کی حرمت و طاقت ان کے کچھ کام آئے آسکی، خود ناکام ہوئے، مسلمانوں کو خوار کر دیا، اور کافروں کے حوصلے بڑھا دیئے، (واللہ)

غ۔ حیدر آباد کوں

۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء

سیدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ مزاجِ اقدس!

۲۔ حیدر آباد کا مستقبل قریب نازک تر دکھائی دے رہا ہے، اس لئے اس سلسلہ میں

حسب ذیل امور میں ہماری مطلوب ہے۔

۱۔ مجلس اتحاد المسلمین (جس کا موقف حضرت والا پر آشکار ہے) کے حکم پر جنگ کرنا جہاد کی تعریف میں داخل ہو گیا نہیں؟

ب۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ صورت دیگر جان اور عزت و مال کی حفاظت کی خاطر مجبوراً مقابلہ کرنا ہی پڑے اور اس میں کوئی مارا جائے تو کیا اس کو شہادت کا مرتبہ ملے گا؟

س۔ تجویز پال

۲۳ نومبر ۱۹۴۶ء

اعزى واجتنب اعزک اللہ تعالیٰ واجتنبک

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمد للہ خیریت ہے!

۲۔ اس نزاکت احوال کا دفعیہ اور علاج کیا آپ کے اختیار میں ہے، اگر نہیں تو پھر یہ اضطراب قلبی و ایمانی کیوں؟ اضطراب طبعی میں حرج نہیں، اس کا علاج داستعین و بالصبر والصلوۃ ہے، حیدر آباد کو اپنے دور برس کی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہے، رسی دینداری اور اشاعت رسوم و بدعات اور پھر تشیع کے ساتھ تو معمولی ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ استغفار کی توفیق دیں (مرا دوائی ریاست کو) و مجلس کا حال معلوم ہے،

ب۔ اپنے جان و مال کی حفاظت میں مارا جانا بے شہر شہادت ہے۔

ع۔ احقر فی نفسہ حضرت اسماعیل شہیدؒ کی زندگی ہی کو ٹھیک ٹھیک اتباع سنت کی حامل سمجھتا ہے کیونکہ یہاں تسبیح و سجادہ اور شیر و سنبل کی جامعیت پائی جاتی ہے اور خود احقر کی تشابہی یہی جامعیت پیدا کرنے کی ہے لیکن فن سپہ گری سے اس وقت تک قطعاً دُری اور طبعاً اجرات جہاد کی محسوس کرتا ہوں، حضرت والا دعا فرمائیں،

لے آئے کہ عقد صاف و مروج اور نہایت کا۔ اگر توفیق ہو یہ ایسی ہو پڑے گا جس کسی نے کہا بڑھ تلندہ ہر چہ گوید وید: نور!

س۔ صحیح ہے مگر حضرت اسماعیل کہاں ہیں؟ بہر حال کوشش ہر ایک کو چاہیے!
 غ۔ موجودہ صورت میں اگر کافروں اور مسلمانوں میں جنگ چھڑ جائے اور کوئی مسلمان اس
 سے کنارہ کشی کرے پھر رہے تو کیا وہ عند اللہ مسئول ہوگا؟
 ا جواب خوب غور سے سنئے اور پھر اس پر غور و فکر کرنے سے تعلق رکھتا ہے خصوصاً

ان موصوفے کے لئے جو دین سیاست کے نام پر جلد مغالطہ میں آجاتے ہیں)
 س۔ اگر آپ کے خیال میں یہ جنگ ایمان اور کفر کی ہو! مگر موجودہ سیاست میں اہواء و اغراض
 نے دین کا با معین لیا ہے۔ ڈوب کر دیکھئے، لیکن بہر حال مسلمانوں کے فوڑ و فلاح
 کی کوشش ہاتھ پاؤں اور قلب کی ہمت اور دُعا سے کیجئے۔ (سبحان اللہ عدل کے
 رشتہ میں حقائق کے بڑی کس خوبی سے پروردے ہیں)

غ۔ گذشتہ مکتوب میں حضرت والدہ نے بڑے حالات سے متعلق اصلاح معودہ کی طرف
 متوجہ فرمایا تھا، یہ باتیں بائبل صائب مکتبی، اب کمال اللہ وہ کیفیت نہیں ہے،
 س۔ الحمد للہ۔۔۔ گاہ باشند کہ کو دک ناداں

رفنائیت کا عالم دیکھ لیا کہ ادنیٰ کمال کی نسبت بھی اپنی طرف گوارا نہ ہو سکی، بلکہ
 اس کا شبہ تک کس خوبی سے مٹا دیا۔

غ۔ حضرت والدہ احقر او اس کی اہلیہ کے لئے سلاخی ایمان اور حسن انجام کے لئے دُعا
 فرمائیں، فقط احقر غلام محمد
 س۔ دونوں کے لئے دعائے خیر ہے۔ والسلام سید سلیمان

مکتوب (۶۰)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۰ دسمبر ۱۹۴۴ء

حضرت سیدی و مولائی دام فیوضکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ مزاج اقدس!

۲۔ بحمد اللہ احقر معمولات پر پابند اور استقامت مزید کے لئے حضرت سے دُعا کا جویاں ہے۔

س۔ بھوپال

۱۳ دسمبر ۱۹۴۴ء

محبت مخلص رفع اللہ احسانکم۔ سلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمد للہ اچھا ہوں۔ آنکھ کی سُرخی اب برائے نام ہے۔ آپ کی مُرسد دوا کھا کر ختم کر دی ہے۔

۲۔ جبارک، اللہ تعالیٰ استقامت مزید بخشیں،

غ۔ حضرت والار کے سابقہ کرم نامہ نے کامل تشفی بخشی، حضرت اقدس کے بتائے ہوئے

علاج "قیام صلوٰۃ و زکوٰۃ" کے تحت احقر نے بعض اہل محلہ بزرگوں کو لے کر مولانا الیاس

رحمہ اللہ کے طرز پر محلہ میں تبلیغی کام کا آغاز کیا ہے، بحمد اللہ مصلیوں کی تعداد کافی بڑھ رہی ہے

حضرت والار استقامت کی دعا فرمائیں۔ اس کام میں میں بزرگ

بطور خاص ہاتھ بٹا رہے ہیں، دو حضرت تھانویؒ سے تعلق بیعت رکھتے ہیں اور ایک

صاحب گو کسی کے مُرید نہیں لیکن بڑے متقی ہیں۔

س۔ ضرورت اسی کی ہے کہ سیاست سے بے پروا ہو کر دین کی خدمت میں مصروف ہوا

جلے، اخلاص کے ساتھ اس کام کو جاری رکھیں اور کبھی اس میں اپنے اندر استکبار

اور دوسروں کے باب میں استحقار نہ آئے دیں، اگر ایسا احساس ہونے لگے تو چھین

کام چھوڑ دیا جائے حضرت والار کے منتسبین کے لئے یہ ارشاد ایک مشعل ہدایت ہے

لہذا وہ اسی روشنی میں چلیں

غ۔ مندرکہ کام میں تفہیم و تقریر کے لئے احقر ہی کو مجبور کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں عرض یہ کر کہ احقر کا رجحان تو بشیر سے زیادہ تنذیر کی طرف مائل ہے مگر فی زمانہ کس پہلو کو غالب رکھنا اولیٰ ہے؟

س۔ کچھ حرج نہیں، مگر ان اجیری اَلَا عَسَىٰ اللہ کے سوا کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہ ہو، تصحیح نیت ہر کارِ خیر کی جہاں ہے اور حضرات صرفیہ سے زیادہ اس کی فراغت کو پہچاننے والا کوئی نہیں)

تبشیر اور انداز کا کلیہ قاعدہ کوئی نہیں، اشخاص زیر دعوت کے حالات پر منحصر ہے، بہر حال تبشیر ”کو توجیح“ ہے، (ایہ ایجازِ سلیمانی کا عبارت ہے کہ ایک دفتر تو تین جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا اور کس حسن اعتدال سے!)۔

غ۔ حضرت والارہ کی نصیحت کے بموجب احقر نے ”طب یونانی“ کی طرف توجہ کی لیکن اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا، (طبیہ کالج کے اوقات ایسے نہ تھے کہ دفتر کی مصروفیت کے باوجود اس میں شرکت کی جاسکتی) اور اب امتحان دینے کی صورت نہ مل سکی، اس لئے اب ”ہومیوپیتھی“ کی طرف توجہ کی گئی ہے، اس کی تعلیم اور جبریشن کی صورت نکل آئی ہے اور یہ جدید جہد جاری ہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد بڑی و دینی تعلیم کا آغاز ہوگا، حصولِ علم دین کی بڑی تمنا ہے، حضرت والارہ دعا فرمائیں۔

س۔ اصول پہلے کسی فن کے سیکھ لئے جائیں پھر طریقہ علاج جو چاہے اختیار کیا جائے۔
انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کی یہ تمنا پوری کریں،

غ۔ اپنی حد تک اصلاحِ عمل کی کوشش کرتا ہوں لیکن اپنے اندر دنیوی امور مثلاً

لے حضرت علامہ کا رسالہ ”بشری“ اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بشیری پہلو پر قابلِ دید ہے! لے حضرت والارہ نے احقر کا ذوق و رجحان دیکھ کر کئی برس پہلے فرمایا تھا کہ پہلے علم طب باضابطہ سیکھ لیا جائے اور اس کے بعد علم دین کی طرف مستقل توجہ کی جائے!

۲۔ مبارک کراستقامت بڑی نعمت ہے، فَبِئْسَ اللَّهُ تَمَّ اسْتَقِيمَ (مورفیا،
کے مقولہ "الاستقامت فوق الکرامۃ" کی قرآنی اصل بتا دی ہے)

غ۔ کسی کی مدد کرتے وقت ذہن میں یہی خیال رہتا ہے کہ آج ہم کسی کی مدد کریں گے تو کل
ہمارے آڑے وقت بھی کوئی کام آئے گا، اس خیال سے اجر میں کمی ہوتی ہوگی، اس کا کیا
علاج ہے؟

س۔ جی ہاں، یہ تصور صحیح نہیں، سوائے رضائے الہی کے کوئی دوسرا اعتقادی تصور نہیں، اس
کے حصول کی صورت یہ ہے کہ پہلے زبان سے اس عمل کے کرتے وقت اس نیت کو
دہرائیں، چند بار کے بعد محض نیت (قلبی) کر لیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ
تصور ہی مشق سے یہ بات پیدا ہو جائے گی۔

غ۔ احقر نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر سی سوانح (معنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم) لکھنے کی سعادت پائی ہے، ایک نسخہ حضرت والارہ کی تدریس ہے، اللہ تعالیٰ اس
سعی حقیر کو مشکور فرمائیں۔ حضرت والارہ سے فلاح داریں کے لئے دُعا کی
درخواست ہے، فقط احقر غلام محمد

س۔ کتاب ملی، سرسری طور سے دیکھیں، اللہ تعالیٰ برکت دیں، بچوں کی دلچسپی اسی سے ظاہر
ہے کہ میری بچیوں نے بڑے تعلق سے اس کو مجھے واپس کیا، والسلام
پچھڑا سید سلیمان

(کیا امداد دل فوازی ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً)

مکتوب (۶۳)

(یہ مکتوب انشاء اللہ ان حضرات کی کامل تشفی کا باعث ہو گا جن کے ذہن میں یہ مشبہ

لے مشائخ کردہ نفیس ایکٹری جید آباد دکن (حال بلاسب اسٹریٹ کراچی)

ہے کہ طریق تصوف اور صوفیائے کرام میں جو دو قہطل ہے حرکت و گرمی نہیں)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۷ جنوری ۱۹۲۸ء

حضرت سیدی و مولائی ادا م اللہ ظلال برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ مزاج اقدس!

۲۔ ایک شب بڑی قوت سے ذہن میں یہ آ رہا ہے کہ گذشتہ صدی میں اگر ہندوستانیوں پر (بوجہ عدم تکمیل شرائط) جہاد فرض نہ تھا تو کم از کم اس کے اسباب کی فراہمی تو بہ حالِ اجب تھی، لیکن ہندوستان کے اکابر صوفیاء میں سے کسی نے اس جانب توجہ نہیں فرمائی اور نہ اپنے متنبسین میں یہ جذبہ پیدا کیا، کیا قیامت میں مثل اور واجبات کے اس ترک کی باز پرس نہ ہوگی؟ اگر ہوگی تو ایک ایسا گروہ جو "از بلائے خویش رستہ و از بند خویش جستہ" ہوتا ہے، اس سے کیوں منحرف رہا؟ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس گروہ کو انفرادی اصلاح میں غلو رہا ہے واللہ اعلم۔۔۔۔۔ حضرات اسماعیل شہید، مجدد الف ثانی۔۔۔ اور نظام الدین اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی زندگیوں میں تو اپنے اپنے وقت و حالات کے لحاظ سے یہ جدوجہد ملتی ہے پھر گذشتہ صدی کے صوفیائے کرام کیوں اس سے دور رہے؟ اور صحیح ماہ کون سی ہے؟

س۔ بھوپال

حبیبی و حبیبی ادا م اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمد للہ خیریت ہے۔

لے۔ "صوفی" کی تعریف میں یہ جلد شاہ شرف الدین بکینی منیری نے لکھا ہے،

ملاحظہ ہو، "مکتوبات سی حدی"

۲۔ پہلے تو یہ سمجھیں کہ جہاد اعلا کلمۃ اللہ کے لئے مسی و کوشش بالنفس والمال کا نام ہے، وہ کسی بادشاہ کی سلطنت کے قیام کے لئے نہیں، جس کو آج کل سمجھا جاتا ہے قومی حکومت و سلطنت جس کا تصور آج کل ہے وہ بھی اعلا کلمۃ اللہ سے دُور ہے، پھر اکابر صوفیہ جس وقت ہوئے ہیں اس زمانہ میں کسی نہ کسی معنی میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم تھیں، اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو خدا کی حکومت کے مطابق بنانے میں کوششیں کیں،

ہندوستان کی گذشتہ صدی کے کاناموں کے لئے آپ "علماء کا شاندار ماضی" کتاب محمد میاں مراد آبادی کی پڑھیں، یہ سب حضرات مجاہد تھے، خود حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب مجاہدین میں تھے اور خلفائے مولانا اسماعیل شہید کے کانامے بھی پڑھیں جن کو مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے،

۳۔ صبح ناہ یہ ہے کہ دل میں جہاد کی تمنا ذاتی چاہیئے اور وقت پر اس کا ظہور ہوا عذاب قبر و بعد از حشر سے بہت ہیبت ہوتی ہے کیونکہ اپنی زندگی پر جب نظر پڑتی ہے تو ذریعہ معاش کلیئہ جائز و حلال ہے، نہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک کا کوئی عمل ٹھیک ٹھیک مطابق سنت و خالص ہے، پھر بچاؤ کی کیا صورت ہوگی؟

۴۔ بے شبہ ہیبت کی چیز ہے، اس لئے عذاب قبر سے نجات کی دعا مانگنی چاہیئے لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ رحمت الہی سے مایوسی کفر ہے، بچاؤ رحمت الہی سے اور اعمال بد سے پرہیز سے ہوگا،

(آخری جملہ تو دریا یہ کوزہ کا مصداق اور جواب کی جان ہے، اس میں یہ بھی تنبیہ ہو گیا کہ بچاؤ کو محض اعمال پر منحصر سمجھنا غلط اور صریحاً غلط ہے کیونکہ عصمت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں بھی محض اللہ کی رحمت سے بخشا جاؤں گا، سنا تھا ہی یہ بھی جتنا دیا گیا کہ بد عملی سے پرہیز کے بغیر رحمت الہی پر بھروسہ دراصل خود فریبی بلکہ حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہے اس لئے اپنے امکان بھر اصلاح عمل سے غفلت بھی ہرگز نہ ہونی

چاہیے یا اِنھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَقَوْا اللّٰهَ حَقَّ تَقَاتِیْہِ وَلَا مَمْنُوْنَ اِلَّا اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ،
اور پچھلے جملہ کا حاصل یہ بھی نکل آیا کہ مسلمان کو ”جامع اضداد“ ہونا چاہیے کہ امید و خوف
کو ملا کر لے چلے، اسی کو زبانِ ہوت نے فرمایا ”الایمان بین الخوف والمرحۃ“
غ۔ احقر تو جہاں کا دیس ہے بلکہ ترقی معکوس ہی کا گمان ہوتا ہے،

س۔ ترقی ہر وقت ہوتی ہے، بشرطیکہ کام میں مصروف رہا جائے لیکن اس ترقی کا احساس نہیں
ہوتا جیسے پچہ ہر وقت بڑھتا رہتا ہے مگر خود پچہ کو اس کا احساس نہیں ہوتا،

غ۔ احقر کی اہلیہ عرض پر دراز ہے کہ کوئی بات قابلِ عرض معلوم نہیں ہوتی اس لئے عریضہ نہیں
گزدانا، دُعا کی درخواست ہے، احقر کے لئے بھی حضرت والارہ فلاح دارین کی دعا فرمائیں
فقط احقر غلام محمد

س۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہر حال کوئی امر باعثِ شکایت نہیں، اسی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا
چاہیے (جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حسبِ وعدہ ”لَنْ تَشْكُرُنَّمْ لَا زَيْدٌ نَّكُمْ“ حالت میں
ترقی ہوگی)

دُعا کرتا ہوں، والسلام سید سلیمان ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء

مکتوب (۶۳)

غ۔ جیکر آباد دکن

۱۵ فروری ۱۹۴۸ء

حضرت سیدی و مولائی ادم اللہ فیہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ مزاجِ اقدس!

علمہ صوفیائے کرام کا قول ہے کہ محقق جامع اضداد ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اضداد صوری کو جمع کر دیتا ہے

اضداد حقیقہ مراد نہیں! (مولانا تھانوی)

۲۔ ایک عرصہ ہوا کہ حضرت نے حیدر آباد کا رخ نہیں فرمایا، حضرت والادہ اب تک کسی نہ کسی کام ہی کے سلسلہ میں تشریف لاتے رہے اور اب غالباً کوئی ایسی صورت پائی نہیں جاتی لیکن یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کبھی خدام کے خیال سے بھی تشریف ارذانی ہو تو ہم سب کی بڑی سرفرازی ہوگی، حضرت والادہ کے سوا کوئی اور بزرگ نظر نہیں آتے جن کی خدمت میں پہنچ کر دل کو تسکین میسر آئے۔ حضرت والادہ کی یاد ستاتی ہے اور ایک بے چینی رہتی ہے،

۳۔ احقر اور اس کی اہلیہ کے لئے فلاح دادرین کی دعا فرمائیں، فقط
احقر غلام محمد

س۔ بھوپال

۲۱ فروری ۱۹۴۸ء

محبت و مخلصی رفع اللہ درجہ حکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمد للہ بعافیت ہوں،

۲۔ ہاں بھائی، حیدر آباد نہ آسکا، بات یہ ہے کہ حیدر آباد "مرکز آماں" ہے اوس کے ہر وارڈ پر "طبع" کا گمان ہوتا ہے اس لئے کسی یہاں کے بغیر جانے پر دل کو آمادگی نہیں، پھر کبھی سفر کی جو صورت سقر ہے وہ بھی مانع ہے اور یہاں کا تعلق بھی، یہاں کی رخصت وغیرہ کے قواعد کے سبب مانع بنا، جی چاہتا ہے کہ جو رخصت بچائی جاسکے اوس کو سفر حج کے لئے جمع کیا جائے،

میں کہاں سے بزرگ آیا، یہ حسن ملی نہیں چشم محنوں کا کرشمہ ہے،

۳۔ آپ دونوں کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں، والسلام

یہ محمد اں

سید سلیمان

(اللہ اللہ، قلبِ سلیمانی کس شفقت سے معمور تھا اور فنا بیت واستغناء اس میں کس خوبی سے جمع تھی۔ میرے لئے یہی کیا کم خوش بختی ہے کہ میں نے ایسی ہستی کو دیکھا اور اس کا دامن تھام لیا۔ ورنہ کہاں وہ سلیمان و نیشان اور کہاں یہ مورِ ناتواں)

مکتوب (۶۴)

غ۔ حیدر آباد دکن

حضرت میدی و مولائی دام فیضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ مزاجِ اقدس!

۲۔ گذشتہ کرم نامہ سے حضرت والا کی اس احقرِ ناکارہ پر شفقت و توجہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کرم اذنانوں کو دیکھ کر خیال یہی ہوتا ہے کہ دریائے فیضِ رواں ہے لیکن یہ اپنے دل کی زمین کی خرابی ہے کہ سرسبز و شادابی نمایاں نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ اس دریائے فیض سے سیراب فرمائے،

س۔ بھوپال

عزیزی و محبتی و مخلصی روح اللہ احواکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمد للہ تعالیٰ مع الخیر ہوں،

۲۔ آپ کے اندر یہ سعادتِ خندی اور سلامتِ طبعی اس قابل ہے کہ آپ اس عطیہ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

غ۔ ویسے تو حضرت والا سے خط و کتابت کی برکت کے آثار اپنی اہلیہ میں پہلے بھی دیکھے ہیں لیکن برسوں اس کا ایک اور مشاہدہ ہوا، اہلیہ کو دیکھا کہ دور ہی میں اور ضبط کرنے پر قابو نہیں ہے و جب پوچھی تو کچھ نہ بتایا، گمان یہی ہوا کہ شاید والدہ مرحومہ کی یاد آگئی ہے مگر جب آنسو ذرا

ہے، مگر اختلاف سیاسی کے جذبہ میں اس محققانہ رائے کی قدر نہ ہو سکی، اور پورے آداب کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو بے زعم خود نہایت ”مدلل“ انداز میں حضرت شیخ رحمہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ————— یہ عند اللہ شیخ رحمہ اللہ کی مقبولیت کا کرشمہ تھا کہ

وہ عریضہ ابھی خدمت اقدس میں پہنچا بھی نہ ہو گا کہ خود اپنے ہی ذہن نے اپنے دلائل کے جال کو تار تار کر دیا اور اپنی بد مذہباتی پر خود اپنا ہی دل نفیر کرنے لگا، خدمت شیخ میں گستاخی کا احساس لازمی طور پر ابھر آیا، اسی عالم میں غلبہ نوم سے آنکھیں جو بند ہوئیں تو کھنچا جاتے کہ آنکھیں اور بھی کھل گئیں ————— ایک بزرگ کو

خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ کی کامل حمایت میں اشتر کی تفہیم فرما رہے ہیں — ان سارے واقعات سے سخت ندامت ہوئی، فوراً مجرمانہ اتراف کے ساتھ ایک طویل معافی نامہ بارگاہ سلیمانی میں ارسال کر دیا، اس کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا گیا ہے وہ دورِ حاضر کے ہر غیر معتدل دماغ کے لئے نسخہ اکسیر ہے، ساری غییر ضروری مراسلت کو حذف کر کے اس کو اسی افادہ کی غرض سے یہاں درج کیا جا رہا ہے،

اس والا نامہ کے ہر لفظ سے حضرت اقدس کی وسیع النظری اور فراخ دلی محبت اور درگزر اپنے چھوٹوں کی دلدادگی اور اُن سے حسن ظن بالکل نمایاں ہے، ملاحظہ ہو:

بھوپال

۱۳ شعبان ۱۳۳۷ھ

عربی وحیبی نادکم اللہ تعالیٰ غیرۃ فی الایمان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ جس کو گستاخی سمجھے وہ میرے خیال میں سیاسی بحران ہے، جس ماحول میں آپ ہیں اوس میں اس قسم کے بحران جذبات و خیالات کا پیدا ہونا عین مقضائے طبع ہے، اس لئے آپ کے وسوسوں کا خیال مجھے ذرا بھی نہیں ہوا، سمجھتا ہوں کہ آپ کی طبیعت

زود اثر ہے، کبھی سیاسیات کا جوش طبیعت پر غالب آجاتا ہے، موجودہ سیاسیات کا اثر نازک طبائع پر ایسا ہی پڑتا ہے، ان تمام ذہنی شور و غل کا علاج یہ ہے کہ پیش آمدہ امور غیر اعتیاد کی ہوں، پھر ہماری فکر اور غم کا حاصل؟ — جس اُمت کی تاریخ میں وفات رسولؐ، شہادت فاروقؓ و عثمانؓ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، فتنہ حجاج، فتنہ یزید اور شہادت حسینؑ جیسے واقعات پیدا ہوئے ہوں اوس کے ہاتھ سے موجودہ سیاسیات کا یہ جان صبر کا دامن کیوں چھڑا دے اور اللہ تعالیٰ کے حاکم و حکیم ہیکے وقت ہونے کے اعتقاد سے کیوں تغافل ہو؟

اس تفصیل کا منشاء یہ ہے کہ ہنگامی جوش و خروش یا سردی و مایوسی سے مومن نہ گرم ہو اور نہ نرم ہو، اپنے کام میں یکساں لگا رہے۔

خطرات کے علاج دو ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکیم اور حاکم ہونے کا استحضار اور دوسرے، ہنگامی اور دوامی امور میں فرق کا احساس،

میں نبیؐ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے جلسہ میں گیا تھا، اتفاق سے انھیں دنوں جمعیتہ العلماء کا جلسہ بھی تھا اور مولانا مناظر صاحب وغیرہ سے ملاقات ہوئی تھی میں نے اون کی رفاقت میں کچھ کام بھی کیا،
آپ کے لئے دل سے دعا ہے، والسلام

فقیر پیمپڑاں سلیمان
۲۷ شعبان ۱۳۶۷ھ

مکتوب (۶۶)

(گذشتہ مکتوب تو معذرت نامہ کے جواب میں آیا تھا، اس سے پہلے والے حلیفہ کے جواب میں والا نامہ سے سرفرازی ہوئی جس سے اجتماعیات میں حضرت والاؒ کا

مسلمک واضح ہو جاتا ہے،

۴۷-۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ بعض رسائل میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ علامہ ندوی کا انگریز کی تائید میں ہیں یا لیگ کی؟ اور ہر ایک اپنی تائید میں کچھ نہ کچھ لکھ رہا تھا، بالآخر حضرت واللہ نے اس سلسلہ میں دو چار سطریں نہایت جامع و مانع معارف میں تحریر فرمائیں جن کو محترم مدیر صدق مدظلہ نے صدق میں نقل کرتے ہوئے یہ آیت شہادت بھی خوب ہی تحریر فرمادی تھی کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا مگر ذیل میں جو مکتوب درج کیا جا رہا ہے اس سے حضرت واللہ کے اجتماعی مسلمک کی وسعت اور مشرب کی پاکیزگی بالکل ہی بے غبار نظر آتی ہے، پرچ یہ ہے کہ ایسی عظیم شخصیتیں کبھی جماعتی قیود کو گواہی نہیں کر سکتیں!

بھوپال

محنتی و عزیز بنی رفکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ، الحمد للہ خیریت ہے،

آپ جس مقام پر ہیں وہ اوس مقام سے جہاں عام مسلمان ہیں سراسر مختلف ہے، تو لے کبوتر بام حرم جہ می دانی طہیدن دل مرغان رشتہ پر پارا میں نے سیاسیات کے خازن سے مدد ہوئی کہ اپنا دامن چھڑا لیا، اب جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کی دینی و علمی و تعلیمی خدمات کی بجا آوری کا شوق ہے، ان کے علاوہ دیگر امور سے قطعاً غور و غفلت نہیں اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کی دُعاؤں سے کرتا ہوں، اس سے زیادہ کیا لکھوں، جذبات کے جوش میں پہنے سے کام نہ چلے گا،

میں ان تمام نزاعات (اختلافات لیگ و کانگریس وغیرہ) سے عللاً کنارہ کش

لہ اس جملہ کو وہ حضرات ذرا غور سے پڑھیں جن کا خیال یہ ہے کہ تصوف کے تعلق نے حضرت علامہؒ

کی علمی سرگرمیوں کو سرد کر دیا تھا!

ہوں اور دل میں مسلمانوں کی خیر و فلاح کے خیال کے سوا کچھ اور نہیں رکھتا اور اسی کا داعی ہوں اور اپنے اختیار کی حد تک اسی کا سائی، مجھے سیاسیات کا بہرہ نہ سمجھنے اور حضرت رحمہ اللہ تولا کے مسلک کو اس مضمون سے سمجھنے جو مولوی عبدالباری صاحب (ندوی مدظلہ) کا معارف میں شائع ہوا ہے،

خدا کرے کہ آپ دین کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر موجودہ شورشوں کی طرف اتنی نہ کریں جو او دھر سے تغافل ہو جائے۔ دین ثابت و قائم چیز ہے اور سیاست متبذل و متغیر،

ہنگامی چیزوں کو اجمیت نہ دیں اور امور دوا می میں مصروف ہیں، آپ کے لئے صدق دل سے دعا کرتا ہوں، والسلام
یہ چھاں سلیمان

مکتوب (۶۷)

غ۔ حیدر آباد دکن

۳۰ شعبان ۱۳۶۷ھ

حضرت سیدی و مرشدی و مولائی ادام اللہ فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ مزاج والا

۲۔ کل سے رمضان المبارک شروع ہیں، حضرت والا رحمہ کی صحبت فیضِ درجہ کی کمال

لے اب تو مولانا مدظلہ کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں "جامع المجددین" "تجدید تعلیم و تبلیغ" "تجدید تصوف و سلوک" اور "تجدید معاشیات" جن سے ہر مسئلہ میں مسلک اشرافیہ کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے!

ستارے لگا ہے، پرسوں، بہجت النفوس، (مولفہ محدث کبیر حافظ ابو محمد عبداللہ بن ابی حمزۃ الازدی، اُنہ لسی) کا مطالعہ کر رہا تھا، بیٹھے بیٹھے غودگئی محسوس ہوئی اور آہ نکھجھکی ہی تھی کہ خود کو بھوپال میں حضرت دالارہ کی خدمت اقدس میں حاضر پایا۔
اس سے تشنگی اور بھی بڑھ گئی۔

عید گاہ ماغزیہاں کوئے تو انسا با عید دیدن روئے تو
حضرت دالارہ دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کوتاہ عمل کو حضرت اقدس سے واپس
محبت عطا فرما کر حصول مرضیات الہیہ کا جذبہ وافر عطا فرمائیں۔
یہ درخواست اس تجربہ کی بنا پر کی گئی ہے کہ جن دنوں حضرت دالارہ کی محبت کا غلبہ
رہتا ہے، اُن دنوں دنیا سے استغنیٰ اور عبادت و اطاعت الہی کا شوق بھی غائب
رہتا ہے اور جہاں اُس میں کمی ہوتی، یہ کیفیت بھی جاتی رہتی ہے!
س۔ بھوپال

۱۳ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ

عزیزی و محبتی زادکم اللہ تعالیٰ علما و عملاً
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے،
یہ رویا، محبت کے آثار ہیں، دُعا ہے کہ اس محبت فی اللہ سے فریقین کو فائدہ
پہنچے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائیں، اکثر آپ کے لئے دُعا کرتا ہوں لاس
بلے مایہ کا سارا سرمایہ یہی بے لوث دُعا میں ہیں جن کی قبولیت کے یقین سے دل سرشار
ہے والحمد للہ ذلک

غ۔ موجودہ غیر یقینی حالات نظم و نسق کے پیش نظر معلوم کس وقت ذرائع رسل
در مسائل منقطع ہو جائیں، اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا کہ حضرت دالارہ سے درخواست ہے

لسہ ترجمہ از مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہ

کہ اس خادم خفیہ کو نہ بھول جائیں اور ہمیشہ دعا سے سرفراز فرماتے رہیں خصوصاً حسین شریفین کی حاضری میں اس نامہ سیاہ کے لئے ضرور دعا فرمائیں،

ننگ بارگاہ ، احقر غلام محمد

س۔ انشاء اللہ دعا کروں گا، فقیر بیچداں سلیمان

مکتوب (۶۸)

غ۔ جید آباد دکن

۲۳ اپریل ۱۹۳۵ء

حضرت مرشدنا و مولانا دامت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۔ مزاج اقدس!

۲۔ جن لوگوں سے طبیعت ملتی نہیں، ان کی طرف رغبت بھی نہیں ہوتی اور ان سے

اس طرح کھل کر ملا نہیں جاسکتا جیسے ہم مذاق لوگوں سے اس کی وجہ سے بعض لوگ

احقر کو مغرور سمجھتے۔۔۔۔۔۔ کہیں واقعی یہ غرور تو نہیں؟ حضرت والادھر

رہبری فرمائیں۔

س۔ بھوپال

۲۴ اپریل ۱۹۳۵ء

محبت صمیم زادکم اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمد للہ بخیر ہوں،

اگر دینی مصلحت ہو یا مداراة (مقصود ہو) تو دل پر جبر کر کے ملے!

غ۔ احقر کو گستاخ اور بوستاں سے خاص دلچسپی ہے، آج کل اہلیہ کو پڑھا رہا ہوں اور دینی

ذوق میں اس سے کافی تقویت پاتا ہوں،
 س۔ بڑے تجربہ کی کتابیں ہیں اور بابرکت ہیں،
 غ۔ پرسوں اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے سر کے بال سب سفید ہو گئے ہیں،
 س۔ شاید کہ اولاد کی بشارت ہو، *وَاشْتَغَلَ الرَّاسُ شَيْبًا*،
 غ۔ روزمرہ کے چھوٹے بڑے، غنی اور عیاں گناہوں سے بچنے کی کوئی تدبیر تحریر فرمائیں تو
 بڑا کم ہوگا،

س۔ مزہ داما دہ کر کے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر بچے اور استغفار کیجئے،
 غ۔ اب یہ عالم ہے کہ کسی بزرگ سے ملاقات ہوتی ہے تو توجہ تمام تر حضرت والاہ ہی کی
 طرف رہتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ فوراً حضرت والاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں،
 حضرت والاہ میری دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے دعا فرمائیں، فقط
 نیاز کیش غلام محمد

س۔ آپ کی محبت و حسن ظن کے سبب سے ہے، اللہ تعالیٰ اس سے مفید نتیجہ بخشیں، دلی
 دعا ہے

بہجداں سلیمان
 مکتوب (۶۹)

غ۔ حیدر آباد دکن

حضرت سیدی دہلوی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
 مزاج اقدس!

عرض خدمت یہ ہے کہ موت کے تصور سے بعض دفعہ تو بڑی ہیست طاری
 ہوتی ہے کہ یہ بڑا سخت مرحلہ ہے اور بعض مرتبہ اپنی ساری کوتاہ علیوں کے باوجود ایسا
 محسوس ہوتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ نہ صرف باسانی بلکہ خوشی خوشی جانا نصیب ہوگا،

لہ دریافت کرنے پر استقرار محل کا علم ہوا، اہل فن کو اس حسن تعبیر پر دہد آکر رہے گا کہ
 علامہ محمد ابن سیرینؒ کے ذوق و کمال کی تجدید ہو گئی!

حضرت والدہ سے دُعا کی درخواست ہے کہ خاتمہ آخر الزکرات پر نصیب ہو جائے،

س۔ بھوپال

عزیز قلبی و فکرم اللہ تعالیٰ

الحمد للہ خیریت ہے،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دونوں کیفیتیں درست ہیں، ایک خوف ہے اور دوسری رجاء اور ایمان دونوں کے

بیچ میں ہے، عین خوف کی حالت میں رجاء ہوا اور رجاء کی حالت میں خوف ہو،

غ۔ تقریر کرنے کے بعد بہت دیر تک اُسی مضمون سے متعلق ذہن میں خیالات آتے رہتے ہیں

اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ یہ بات بھی بیان کر دینی چاہیے تھی اور اس انداز سے اس کا ذکر

ہونا چاہیے تھا۔ اس کا علاج تجویز فرمادیں،

س۔ اُس کا علاج تو ایک قبل از وقت کا ہے اور ایک بعد از وقت کا۔

قبل از وقت تو یہ ہے کہ آپ عنوانات کا غر پر لکھ لیں ادن کو دیکھ دیکھ کر تقریر کریں، اور

بعد از وقت یہ ہے کہ یہ تصور کریں کہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ظاہر کرایا وہی موافق حکمت

تھا، افسوس بیکار ہے،

غ۔ حضرت والدہ احقر کے لئے حفظ دین کے ساتھ وسعت رزق کی بھی دُعا فرمائیں، کیونکہ

احقر کو خرچ پر قابو نہیں اور غیر آمدنی بڑھے سکون نہ مل سکے گا بشرطیکہ ضروریات یہی ہیں

واللہ اعلم، احقر غلام محمد

س۔ آپ کے لئے حفظ دین کے ساتھ وسعت رزق کی دُعا ہے لیکن آمدنی بڑھ جانے سے

خرچ بھی باطن بڑھے گا یہ روزانہ کا مشاہدہ ہے، اس لئے طمانیت قناعت میں ہے۔

پچھلاں

سلیمان

۵ ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ

مکتوب (۷۰)

(ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد کی دو سو سالہ سلطنت جو دراصل دورِ مغلیہ کی آخری نشانی تھی وہ بھی سیاسی نقطہ نظر سے قاعدین مجلس اتحاد المسلمین کی غیر مختلط روش اور نظامِ دکن کی خفیہ سازش کی وجہ سے بھارتی آئین شکن اور استبداد پسند ہاتھوں کے ذریعہ مٹ گئی، فراست سلیمانی اس انجام اور اس کی اصل علت کو آفاقی میں دیکھ چکی تھی (جیسا کہ مکتوب نمبر (۵۹) مورخہ نومبر ۱۹۴۷ء سے ظاہر ہے) اور اس پر خود راقم کو بھی یقین پیدا ہو چلا تھا پھر بھی جو المیہ آنکھوں نے دیکھا اس سے کائنات دل نہ وبالا ہو گئی، نہ معلوم غلبہ رنج و الم میں اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ہوئے خدمتِ شیخ میں کیا یا س ایگز باتیں لکھ دی تھیں، بہر حال اس کا جواب جو کارڈ کی صورت میں آیا اس سے یاس دور ہو گئی اور یہ بات گویا مشاہد ہو گئی کہ ایک مسلمان کا مشن اور مقصد حیات ان تکوینی حوادث سے مجروح نہیں ہو سکتا!! عظمیٰ شہداء کو تعلق نہیں پیمانہ سے!

آپ بھی اس درس سے مستفید ہوئیے، یہ ہر جگہ ملنے والا درس نہیں کیونکہ ایسی گہری نظر اور سنجیدہ فکر کبھی بھی مام نہیں رہی ہے)

س۔ بھوپال، یکم ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ

۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء

عزیز محرم حیاتکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا کارڈ عین حالت انتظار میں ملا جس سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی، اس وقت آپ میرے پچھلے خطوں کو جو آپ کے پاس ہوں تو دوبارہ پڑھیں، مکی زندگی سے پہلے مدنی زندگی بہ شکل کامیاب ہو سکتی ہے اور پچھلے فرسودہ نظامِ زندگی کی بنیاد پر تجدید کی دیواریں کھڑی نہیں ہو سکتی ہیں،

خود مسلمان بننا، دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی اہم پکار ہے اور اس فرض کو نفرت کے بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے، جس کے سامنے آپ دعوت پیش کرتے ہیں اس پر شفقت اور اس سے محبت دعوت کا محرک ہو تب ہی وہ کامیاب ہو سکتی ہیں، جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی شہادت ہے، لا تحزن اور لا یحزنک قولہم اور ولا تلک فی ضیق مما یمکرون اور عزیز علیہ ما عنثہ وغیرہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ منشاء دعوت شفقت بر کفار تھی کہ دائمی اور مدعوہ ملیں گے اور ایک کو دوسرے سے دل لگا پیدا نہ ہوگا تو ایک دل سے دوسرے دل کی طرف تاثیر منتقل نہیں ہو سکتی،

الحمد للہ اچھا ہوں، والسلام سید سلیمان

مکتوب (۷۱)

اعزت و شکوت کو کھو کر جو آزادی کا لازمہ ہیں، دفعۃً رسوائی اور ذلت کو انگیختہ کر لینا خواہ اس کے اسباب کچھ ہی ہوں، کس قدر دشوار ہے اس کا احساس ٹٹی ہوئی قوم کے حساس افراد ہی کر سکتے ہیں، حضرت والار کے ارشادات سے یہ تو ہوا کہ مایوسی رفع ہو گئی مگر بدلے ہوئے ماحول پر طبیعت نہ راضی ہو سکتی تھی نہ اس کو ہونا چاہیے تھا، ترک حیدر آباد کا خیال زور پکڑتا چلا گیا اور مناسب یہی معلوم ہوا کہ جب وطن چھوڑنا ہی ہے تو پھر کسوں نہ زمین شریفین کو اپنا مستقر بنایا جائے، اسی خیال کے ماتحت ذیل کی مراسلت کی گئی تھی

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء

حضرت سیدی و مطاعی دامت فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج مبارک !

والانا مہرایت و رہبری کا موجب بنا، ریاست حیدرآباد میں جو کچھ ہوا ہوا ہے یا آئندہ امکانات میں اس کی تفصیل غیر ضروری ہے، اس کو اور مقامات کے حالات پر قیاس فرمایا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں احقر کے ذہن میں ایک خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے — والد صاحب کی مدت ملازمت ختم ہو چکی، اب ایک سالہ توسیع میں ہیں جو نہ معلوم کب ختم کر دی جائے گی خود احقر کی ملازمت بھی باوجود مستقل ہونے کے غیر یقینی ہے، ان حالات میں یہاں معاشی تنگی اٹھانا اور ہر اکن خطروں میں رہنا بے کار معلوم ہوتا ہے، خیال یہ ہے کہ والد صاحب پنشن لے لیں اور ہم سب مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کر لیں، وہاں اگر کچھ معاشی تنگی ہوگی بھی تو اس کی تشفی کے لئے خود اس مقام کی برکت کافی ہے، والد صاحب بھی اس خیال کے مخالف نہیں، احقر کو بار بار خیال آتا ہے کہ شاید اسی بہانہ ہماری قسمت جاگ جائے اور اس ارض پاک کا قیام میسر آجائے۔ حضرت دالہ کی رہبری مطلوب ہے کہ یہی میرے لئے سب کچھ ہے!

س۔ بھوپال

۹ محرم ۱۳۹۵ھ

عزیزی و حبیبی ادام اللہ توفیقکم و حفظکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ . الحمد للہ خیریت ہے،

ایک بات آپ سمجھ لیں، پہلی ہفتی روزی کو بلا عذر شرعی کسی حال میں اس وقت

لے اور اب اس خیال کی گستاخی سے تو بہ کرنا ہوں کہ جس مقام مقدس کی عظمت اور اس سے محبت

کا تقاضا یہ ہے کہ آرام و سکون کو غیر یاد کہہ کر اس کے قرب کو مطلوب بنایا جائے اور اس کو محض جہلانہ

منقلی کے لئے پسند کر لیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے یہ تمنائے خام پوری نہ ہو سکی اللہ

تعالیٰ بھی ہجرت کی توفیق عطا فرمائے!

تک چھوڑنا نہ چاہیے جب تک دوسری صورت متعین نہ ہو جائے، ممکن ہے آپ کا موجودہ
اضطراب آپ کے گذشتہ نظریہ کی ناکامی کے باعث ہو، ہر جگہ یہی حال ہے،
طر زمین سخت ہے آسمان دور ہے

زمین کی ہجرت بے شبہ موجب برکات ہے، اگر تکالیف سفر اور روزی کی تنگی اور
توکل کی وجہ سے دل تنگی کا اندیشہ نہ ہو تو مبارک ہے، مگر وہاں کا ماحول بھی قلب کے
اطمینان کا باعث نہ ہوگا اگر قلب کا لگاؤ ماحول سے خواہ وہ سیاسی ہو یا کسی اور نوع
کا ہو، قائم رہا۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں!

اب اپنے نفس کے حالات پر غور کیجئے،

رخ۔ ذرائع معیشت کی غیر یقینی کے مد نظر گھری پر ہو یہ بیکھک دو خانہ کا بورڈ لگا دیا، برکت
کے لئے حضرت دعا فرمائیں!

س۔ اچھا ہے، اللہ تعالیٰ برکت دیں۔

شا۔ بھوپال کی حاضری کو جی چاہتا ہے، ہجرت کی اجازت مل جائے تو پہلے بھوپال حاضری مدت
ہوں گا۔

س۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

رخ۔ حضرت والدہ کی ہدایات پر کار بند ہوں اور دُعا ئے خیر کا طالب،

احقر غلام محمد

س۔ بارک اللہ فی ائمانکم، فقیر بیچمدان سلیمان

مکتوب (۷۲)

رخ۔ حیدر آباد

ذوالہجہ والحرم حضرت مرشدنا و مولانا دام فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

ہجرت سے متعلق مکروہ و مکراہیز اس حقیر کے دوسروں کے عزائم مستحکم نظر نہیں آتے،
اشتیاق ہجرت اور ماحول کی ناسازگاری کے باعث ذہنی کشمکش ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل
سے محروم نہ فرمائیں،

س۔ بھوپال

محبت صمیمہ ذاکم اللہ تعالیٰ معرفتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمد للہ خیریت ہے،

ہجرت وہ شخص کرے جو سفر کی ہر تکلیف کو آسانی انگیز کر سکے اور اسی میں راحت
سمجھے جو باطنی بہ رضا ہو اور اپنی تجویز کو دخل نہ دے وہ انشاء اللہ پریشان خاطر نہ ہوگا،
غ۔ ذکر مری روزانہ۔۔۔ گھنٹہ کا معمول ہے،

س۔ بہت بہتر

غ۔ حق تعالیٰ کی ذات تو درالہو اسے پھر ذکر کے وقت ذات کا تصور کس طرح کیا جائے
یہ دقت آج ہی محسوس ہوئی،

س۔ تصور ذات کا نہیں ہوتا، اوس کی صفات کا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا
تصور کیجئے، نورانیت کا تصور بھی اوس کی صفت ہی کا تصور ہے،

غ۔ مسئلہ سماع پر گفتگو کرتے ہوئے شاہ شرف الدین عیسیٰ میری رونے اپنے ایک مکتوب
میں تحریر فرمایا ہے۔

"رہایت کردہ شدہ امت از انس کہ گفت نزدیک رسول بودم کہ بہتر جبریل دور

لے یہ مقام تغویض ہے، اسی مقام پر پہنچ کر انسان "لا خوف علیہم ولا هم یحزنون" کا جامِ حیات
نوش کرتا ہے! ہمارے حضرت دالامہ الحمد للہ اس نشہ بے شمار سے سرشار تھے!

رسید پس گفت یا رسول اللہ بشارت مرقا کہ درویشان اُمت تو در آئیند در بہشت پیش از
اغنیاء پانصد سال و اس نیز و زلود، پس حضرت رسالت بریں بشارت خوش گشت و گفت
در میان کسے ہست کہ شعرے بخواند مردے بروی گفت، ہست یا رسول اللہ، گفت
ہات ہات، آنکھ وے این بیت بخواند سہ قد لست حیۃ الہوی کبدی الہ
پس رسول اللہ تواجد کرد و مجملہ صحابہ رضوان اللہ تواجد کردند تار دایے مبارک از دوش
مبارک بیفتاد پس چون فارغ شدند دہر کے بجائے خویش قرار گرفتند معاویہ بن ابی سفیان
گفت چہ نیکی بازی شماسیت یا رسول اللہ؟ فرمودند یا معاویہ لیس بکرم من
لم یحیت عند سماء ذکر الحبیب! پس ردائے اذ علیہ الصلوٰۃ والسلام قسمت کردند وہ حاضران بہ
چہار صد پر کالہ (مکتوب ۹۷) "مکتوبات سی صدی" از راہ کرم بہمیری فرمائی جائے کہ کیا یہ
روایت صحیح ہے؟

س۔ مسئلہ سماع بلا مزامیر اپنی جگہ پر ہے مگر اس پر اس روایت سے استدلال صحیح نہیں،
اس روایت پر اول جزیر یعنی اغنیاء سے فقرار کا پانچ سو برس پہلے بہشت میں داخل ہونا،
احادیث میں مذکور ہے، مگر اس کے بعد کا حصہ کسی حدیث میں نہیں ہے، یہ صوفیہ کی
تصنیف میں ہوگا مگر وہ سند اثبات نہیں،

غ۔ احقر کا احساس یہ ہے کہ اس کا قلب حجابات سے ڈھکا ہوا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ
کیونکر اٹھیں!

س۔ یہ سمجھنا کہ قلب حجابات سے ڈھکا ہوا ہے خود معرفت ہے، بہر حال اس وسوسہ کا ازالہ (کہ یہ
حجابات کس طرح اٹھیں گے) کثرت ذکر مع الحضور سے ہوگا۔

غ۔ یہاں سندھ کے ایک بزرگ حضرت حسن شاہ صاحب آئے ہوئے ہیں، شیخ الہند
رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور نسباً و مسلکاً مجددی ہیں، (۸۰ سال سے اونچی عمر ہوگی، دو تین
بار ان سے نیاز حاصل ہوا، بدعات سے سخت نفور ہیں، احقر سے فرمایا کہ الحمد للہ آپ

مولانا اشرف علی صاحب کے سلسلے سے متعلق ہیں،

س۔ میں واقف نہیں تاہم طے متنع نہ ہو گوشہ یافتہ، پر عمل کیجئے، مگر تعلیم کا تعلق صرف شیخ سے رکھنا چاہیئے،

غ۔ حضرت والدہ احقر اور اس کی اہلیہ کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے دُعا فرمائیں،
والسلام احقر غلام محمد

س۔ دونوں کے لئے دُعا خیر ہے فقیر، بچہاں سید سلیمان

مکتوب (۷۳)

غ۔ جسدر آپلود کن

۱۴ دسمبر ۱۹۹۳ء

حضرت سیدی و مولانی عم فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج اقدس!

والانامہ شرف صدور لایا جس میں حضرت والدہ نے ہدایت فرمائی ہے کہ اصلاح کا تعلق صرف ایک سے ہونا چاہیئے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ احقر تو اس نقطہ نظر سے کسی اور بزرگ کی طرف نظری نہیں کر سکتا بلکہ حکم ہو تو کسی اور سے ملاقات بھی ترک کر دوں
س۔ محبت عزیز حفظکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمد للہ تعالیٰ مع الخیر ہوں،

میں نے تنبیہاں لکھ دیا تھا، کچھ اور مقصد نہ تھا،

غ۔ ذکر ستری کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ محض اس

مصلحت سے کہ ذکر چہری میں کم از کم زبان مشغول رہتی ہے، چہری ذکر کو کیوں ترجیح

دیتے ہیں؟

اگر مسلمانوں نے دین کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا تو رحمت الہی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں) غ۔
احقر ہر جہم اپنی مسجد میں (۲۰) منٹ کی جو تقریر کیا کرتا ہے اور جس کا نقطہ مرکزی صرف
دین ہے کیا اس پر فتنہ زدوں میں بھی جاری رکھے یا یہ وہ وقت ہے جب تلواروں کو کند
کر کے گوشہ میں بیٹھ رہنا افضل ہے؟

س۔ ۲۰ منٹ والی خالص دینی تقریر جاری رکھئے، سیاسیات سے کامل پرہیز، (بجاء اللہ
ہجرت پاکستان تک یہ سلسلہ بلا مزاحمت جاری رہا، یہ سب برکت تھی تو جہات شیخ
قدس سرہ کی)

غ۔ بحمد اللہ معمولات پر پابند اور دُعا و توجہ کا محتاج ہوں، والسلام،

خادم غلام محمد

س۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ مزید استقامت بخشیں، فقیر پھچراں
سید سلیمان

مکتوب (۷۴)

غ۔ حیدر آباد دکن

۳۰ دسمبر ۱۹۵۵ء

سیدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج اقدس!

واللہ نامہ پاک ترک وطن کا ارادہ ختم کر دیا اور اب ایک ہمت پیدا ہو گئی ہے،

س۔ بھوپال

محبت صمیم و عزیز مجسم دادکم اللہ تعالیٰ عرفانا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ الحمد للہ تعالیٰ مع الخیر ہوں

بہت اچھا کیا، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے؟

غ۔ گرامی نامہ سے سرفرازی کے بعد والی رات احقر نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑا حوض ہے ، جس کا پانی غیر شفاف ہے اور اُس کے اندر ستوروں کی طرح بڑے بڑے دریائی جانور بکثرت ہیں ، احقر کے جی میں آئی کہ اس میں تیرے لیکن درندوں کے گزند سے پہلے تو ہمت نہ ہوئی لیکن بعد میں جب حوض کے اندر پھانڈ پڑا تو بڑی تیزی سے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تیرنے لگا اور جس طرف نکل جاتا درندے بھاگ جاتے تھے ، اس کے بعد احقر نے اپنے والد ماجد اور بعض اور رشتہ داروں کو بھی اسی طرح بلا تکلف تیرتے دیکھا ، تب میری ذہن میں یہ آئی کہ شاید اس کفرستان میں دشمنوں کے گزند سے جانی حفاظت رہے گی ، واللہ اعلم ،

س۔ یہ تعبیر مناسب معلوم ہوتی ہے ، (چنانچہ بحمد اللہ حفاظت ہی رہی)

غ۔ مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی کتاب ”محمد بن عبدالوہاب نجدی“ مطالعہ میں آئی ، اثر یہ مرتب ہوا کہ گو محمد بن عبدالوہاب مرحوم سے قدرے غلو ہوا ہے لیکن جیسا مرحوم کو مٹھون کیا جاتا ہے ، وہ شاید غلط اور عند اللہ قابل مواخذہ ہے ، رہبری کا طالب

س۔ آپ صحیح سمجھے ،

غ۔ ہم سب کی حفاظت دینی و دنیوی کے لئے حضرت والدہ دعا فرمائیں ، والسلام

احقر غلام محمد

فیقہ پچھڑاں و بیچ کار

س۔ بہ دل دعا کرتا ہوں

سیمان ۳، ریح ۱۳۶۸ھ

مکتوب (۷۵)

غ۔ جسکد آباد دکن

۱۷ جنوری ۱۹۴۹ء

سیدی و مطاعی دامت فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
مزاج اقدس!

اس گنہگار کا حال بُرا ہے، مارے ہی رذائل میں غلطیدہ ہوں اور پریشان حال۔
ماہِ حسد گھر کر گیا ہے، مگر جب کسی پر حسد محسوس ہوتا ہے تو اس کی عزت و ثروت میں مزید ترقی
کے لئے دُعا کرتا ہوں، حضرت والدہ کوئی اور بہتر علاج تجویز فرمائیں،
(۲) اپنی بڑائی کی تمنا بھی رہتی ہے،

(۳) لذیذ غذاؤں کی طرف رغبت بہت زیادہ ہے اور نہ ملنے پر تکلیف ہوتی ہے گو ضبط
کر لیتا ہوں، حضرت والدہ کے خدام میں ایک ایسا کینہ و بد حال بھی ہے، حضرت والدہ اس
کے اصلاح کی تدبیر بھی فرمائیں اور دُعا ئے شیر سے بھی سرفراز فرمائیں،
(۴) ویسے معمولات پر کچھ اللہ پابندی ہے، بندہ عاصی
غلام محمد عفی عنہ

س۔ بھوپال

۱۸ ربیع الاول ۱۳۶۹ھ

محبت عزیز حسن اللہ تعالیٰ اخلا فکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمد للہ خیریت ہے،

(۱) حضرت والدہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا اس باب میں ایک قول ہے اوس کو نقل کرتا ہوں:-

”حسد کی ایک تو کیفیت نفسانیہ ہے جس میں انسان معذور ہے، ایک
اوس کے مقصدی پر عمل ہے اس میں انسان مازور (گنہگار) ہے، اور ایک مخالفت
ہے اوس مقصدی کی، اس میں انسان ماحجور ہے۔۔۔۔۔ یعنی حسد کے غلبہ
سے کسی کی مذمت کا تقاضا ہو تو اوس کی مدح کرو، اوس سے اعراض کو دل چاہیے

تو اس سے ملو، اس کی تعظیم کرو، اجتدا، یا سلام کرو۔

غرض نفس کیفیتِ حسد پر مواخذہ نہیں، اس کے متقاضی پر عمل کرنے پر مواخذہ ہے، حدیث میں ہے کہ حسد بیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو، حسد سے غیبت، عداوت کذب گوئی، افترا پردازی، بہت سی برائیاں پیدا ہوتی ہیں، آپ یہ تصور کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عظیم و حکیم ہیں، اگر عجیب کم او سے زیادہ ملا تو اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی، (۲) اس کا علاج اپنی برائیوں پر نظر ہے،

(۳) اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ انہماک نہ چاہیئے،

مکان میں صفائی کے لئے جب جھاڑو دی جاتی ہے تو ہر قسم کا گرد و غبار اور میل کچیل سامنے آتا ہے، اس سے مایوس نہ ہوں، (کس قدر عارفانہ اور امید پرور، یہ آخری جملہ ہے، شیخ کامل کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ سالک کو کسی مرحلہ پر مایوس ہونے نہیں دیتا اور جہاں یاس چھا جاتی ہے وہیں سے امید کی شعاع چمکا دیتا ہے،)

(۴) بارک اللہ تعالیٰ، والسلام سید سلیمان

مکتوب (۷۶)

(حضرت واللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے دو برس ہو چلے تھے، دل بے چین رہتا تھا
حاضری کے لئے اجازت چاہی تھی، اس کے جواب میں ذیل کا والامامہ آیا:)

س۔ جھوپال

۲۱ فروری ۱۹۳۹ء

عزیزم محترم ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

لے عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

أَلْحَسَنُ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ

چند روز کی ریر ہوجہ مشاغل ہوئی، معاف کیجئے،
 آپ بشوق آسکتے ہیں، مگر جلد آئیں، ایک ہفتہ عشرہ کی نیت کریں، آپ کی اہلیہ عزیزہ
 کے لئے دل تو کبھی چاہتا ہے کہ اجازت دے دوں مگر اس وقت حالات اس کے سازگار
 نہیں اس لئے وہ ابھی قصد نہ کریں، آنے کی تاریخ لکھ دیں، والسلام
 سید سلیمان

بھوپال کی آخری حاضری

(۳ مارچ تا ۶ مارچ ۱۹۴۹ء)

عید گاہ ماغسریاں کوئے تو انبساطِ عید دیدن روئے تو
اجازت کا پروانہ تو مل ہی چکا تھا، حسب ارشاد خدمتِ سلیمانی میں اپنی حاضری کی تیج
لکھ کر ۳ مارچ ۱۹۴۹ء کو شائقانہ بھوپال پہنچ گیا، ہمیشہ کی طرح اب بھی قیام و طعام کی ساری
آسائشوں کے لئے حضرت شیخ ہی کا منت پذیر رہا بلکہ اس مرتبہ الطاف اور بھی زیادہ رہے،
جب حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پہنچا تو حضرت والاؒ نے لکھ لکھ کر
کو دو کب ناداں میں مبتلا تھے، یونانی علاج جاری تھا، احقر کو بیماری کی تفصیل سنائی اور
نسخہ بھی دکھلایا، احقر نے عرض کیا کہ حضرت اس نوبت پر جوارش جالینوس مناسب نہیں، ابھی تو
نزلہ کو بہانے کی ضرورت ہے، اس جوارش سے احتباس ہوگا اور تکلیف بڑھ جائے گی، حضرت والاؒ
نے سکراتے ہوئے ازراہِ محبت و شفقت فرمایا "یہ نسخہ ایک طبیب حاذق کا تجویز کردہ ہے، اور
اعتماد ہمیشہ طبیب حاذق کی رائے پر کرنا چاہیے اس لئے ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے"
میں خاموش ہو رہا۔

دوا جاری رہی دور و در بعد سر کا درد ناقابلِ برداشت ہو گیا، مجھے ساتھ لے کر ایک طبیب
کے پاس تشریف لے گئے، اُن سے کیفیت بھی بیان کی اور نسخہ بھی دکھلایا، انھوں نے فرمایا کہ
جوارش جالینوس سے احتباس پیدا ہو گیا ہے چنانچہ ایک خوشامد تجویز کر دیا، جس کے پینے سے
نزلہ کھل گیا اور سکون میسر آیا۔ حضرت والاؒ نے احقر کے ابتدائی مشورے کا
ذکر کرتے ہوئے ازراہِ لطف فرمایا۔

”گاہ باشد کہ کو دگر نادان“ حضرت والدہ کے یہ محبت افزا کلمات۔ آہ کہ اب ایک یادگار ہی بن کر رہ گئے!

ذدہ نوازی | اس سترہ کی حاضری میں حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا بھی بھوپال میں تشریف فرما تھیں، پھر حیرت کی کیا بات ہے اگر اس خادمِ حقیر پر کرم بھی دو چند ہو گئے ہوں چنانچہ دورانِ قیام برابر اس دورہ لطف کا احساس قلب کو ہوتا رہا مگر ایک روز تو اس احساس پر مہرِ تصدیق لگ گئی اور حسن ظن یقین بن کر شرمندہ احسان کر گیا۔

ایک روز حضرت سیدی ”سکراتے ہوئے فرمانے لگے :

”گھر میں سے کہہ رہی تھیں کہ یوں تو محمد اللہ ہمارے ہاں مہمانوں کا سلسلہ رہتا ہی ہے مگر غلامِ خدمت صاحب کے آنے سے اور ہی سترت محسوس ہوتی ہے تو میں نے کہا بھئی اور لوگ تو اپنی غرض سے آتے ہیں یا ہماری خاطر سے اور یہ تو اللہ کے لئے آئے ہیں!“

کیا پاس و لحاظ ہے ایک سراپا عیب کی نیت و خلوص کا۔۔۔۔۔ حضرت والدہ کا طریق تربیت ہمیشہ یہی دیکھا کہ شاہا شیاں دے دے کر ہمت بڑھاتے رہتے تھے، اور بقول ایک دستِ گرفتہ کے یہی طریقہ دورِ حاضر میں موثر و مفید بھی ہے!

حضرت حاجی محمد شفیع بجنوریؒ سے | یہ حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ کی بے نفسی اور احقر کے حال پر شفقت کا نتیجہ تھا کہ خود ہی مختلف بزرگوں کی خدمت میں حجہ کو لے جاتے اور میرے

شرفِ نیاز | لے لے دے کر داتے تھے، ایک روز شام کے وقت باہر جانے کی تیاری فرما رہے تھے، مجھ سے فرمایا کہ ایک جگہ شادی کی دعوت ہے مگر نکاحِ مسجد میں ہے اس لئے اگر آپ بھی ساتھ چلے تو کچھ ہرج

لے گاہ باشد کہ کو دے کے نادان

گہر بود کہ حکیم روشن دانے

(سعدی)

نہیں، وہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہو جائے گی، میں فوراً تیار ہو گیا اور حضرت والدہ کے ساتھ چلا۔ پیدل تشریف لے چلے فرمایا کہ ”اسی موتی مسجد میں تقریب نکاح ہے اور یہ لوگ حضرت حاجی محمد شفیع بجنوری کے معتقد ہیں، حاجی صاحب بھی تشریف لائیں گے۔“ میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا یہ وہی بزرگ ہیں جو شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی رح کے مرید اور مولانا تھانویؒ کے شاگرد ہیں اور جن کے متعلق حضرت تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ بڑے صاحب کشف اور مستجاب الدعوات ہیں، حضرت والدہ نے فرمایا کہ ”جی ہاں وہی“۔ دل باغ باغ ہو گیا کہ ایک ایسے بزرگ کی بھی زیارت نصیب ہوگی، چارپانچ منٹ میں ہم مسجد پہنچ گئے، صحن مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے، کمان کی دیوار سے ٹیک لگائے حضرت حاجی محمد شفیع صاحب بجنوریؒ تشریف فرما تھے، مفید ریش، ضعیف العمر مگر جسم کے گداز، چہرہ کشادہ پُر نور، ہنستا کھکھلاتا ہوا، حضرت والدہ پر جو نظر پڑی تو ہنستے ہوئے اٹھنے کی کوشش فرما رہے تھے کہ حضرت والدہ کے اصرار پر بیٹھ گئے، ضعف اور موٹاپے کی وجہ سے دو آدمیوں کے مہارے سے کھڑے ہو سکتے تھے، مگر سنا ہے کہ نمازیں جب ایک بار حضرت کو کھڑا کر دیا جاتا تو پھر سارے ارکان بلا تکلف ادا فرماتے تھے، یہ انکی کرامت تھی۔ حضرت والدہ کے سچپتے ہی حاجی صاحبؒ نے حضرت میدی سے خطبہ نکاح پڑھنے کی فرمائش کی، حضرت والدہ نے نکاح پڑھا دیا چھوڑے تقسیم کر دیے گئے اور محفل نکاح نہایت سادگی سے برخواست ہو گئی، اپنی آنکھوں نے پہلی مرتبہ ایک دینی تقریب میں اس اسلامی سادگی کا یہ نظارہ دیکھا،

محفل برخواست ہوتی تو حضرت والدہ نے حضرت حاجی صاحب سے فرمایا کہ گھر قریب ہی ہے حضرت تشریف لے ملیں تو مسرت ہوگی یا یہ فرمایا کہ برکت ہوگی، عرض حضرت حاجی صاحب نے دعوت قبول فرمائی اور پیدل ہی گھر تک تشریف لے آئے۔ حضرت والدہ نے خود اپنے لئے اپنے اہل و عیال اور اس ننگ خدا کے لئے حاجی صاحبؒ سے دُعا کی درخواست کی اور حضرت موصوف نے ہاتھ اٹھا کر سب کے لئے دیر تک دُعا فرمائی، پھر اپنے شیخ قدس سرہ

(شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ) کے بھولے پن کے واقعات اور اُن کی بعض کرامات سناتے رہے، یہ بھی فرمایا کہ جب مولانا تھا تو کئی شاہ مراد آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان میں لڑکا تھا، حضرت شاہ صاحب نے مجھ کو مولانا کے حوالے فرمایا کہ یہ نالائق ہے اس کو پڑھاؤ لکھاؤ چنانچہ میں نے کانپور میں مولانا سے تعلیم حاصل کی

دیکھنے کی چیز یہ تھی کہ جب جب حضرت حاجی صاحب اپنے شیخ عالی مقام کا ذکر فرماتے تھے تو مسرت و انبساط سے اُن کے چہرہ پر بخون دوڑ جاتا تھا اور کر سیدھی ہو جاتی تھی، جوش محبت کے اثر سے شیخ شاب نظر آنے لگتے تھے، غرض جب ۲۰، ۱۵ منٹ بیٹھ کر حاجی صاحب رخصت ہو گئے تو حضرت والدہ لے احقر سے مخاطب ہو کر فرمایا کیوں ہے نہ وہی بات سے

چڑھسی ہو کچھ ایسی کہ تیمود تو دیکھو
جواں آج پیر مغاں ہو رہا ہے
دکھتا ہے چہرہ، چمکتی ہیں آنکھیں
بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہونا ہے

حضرت حاجی صاحب زیارتِ حرمین کے بڑے دلدادہ تھے، والدہ انہ شوق کے ساتھ ۲۲، ۲۳ مرتبہ حج سے مشرف رہے اور بالآخر ۱۹۵۱ء میں بعد فراغ حج مکہ معظمہ ہی میں اپنی جانِ مشتاق محبوب ازل کے نذر کر دی،

خدا رحمت کنڈائیں عاشقانِ پاک طینت را

تیرہ دن حضرت شیخ رحمہ اللہ کے الطاف و عنایات اور علمی و روحانی فیوض و برکات سے **واپسی** مالا مال ہو کر آخر خواہی واپسی پر طبیعت کو مجبور کرنا پڑا،

اس مرتبہ کی حاضری اور واپسی دونوں ہی گزشتہ حاضر یوں سے الگ نوعیت کی تھیں حاضر ہونے کا ضمنی مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت والدہ کو اپنے تفصیلی احوال سنا کر ترکِ وطن اور ہجرت پاکستان کی اجازت حاصل کی جائے، چنانچہ جب یہ تفصیلی معروضات گوش گزار کر دیے گئے تو...
لے حالانکہ خود ان سے بھی زیادہ بھولے تھے بعض بھولے پن کے لطائف تو خود مولانا تھا تو ہی؟
نے بھی بیان فرمائے ہیں!

حضرت والا نے چند ہاپات کے ساتھ ترک وطن کی اجازت مرحمت فرمادی مگر اس انداز شفقانہ سے کہ اس مفارقت کو محبوبا گوارا فرمائیے تھے۔۔۔۔۔ اس اجازت سے دل پر ایک حسرت کمیز سکوت طاری ہو گیا، ذہنی شوژن تو مٹ گئی کہ اب دارالحجر سے نجات حاصل ہوگی مگر حضرت شیخ کی مستقل مفارقت کے تصور نے دل کو بچھا دیا اور اس مرتبہ رخصت ہوتے ہوئے آئندہ ملاقات کی کوئی اُمید دل میں موجود نہ تھی، حضرت والا خود بھی کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔

بہر کیف محبت شیخ کی دولت لئے حضرت والا سے ۱۶ مارچ ۱۹۵۷ء کو رخصت ہو کر دوسرے دن اپنے وطن میں بیگانہ وار آپہنچا،

مکتوب (۷۷)

خ۔ حیدر آباد دکن

بیتدی و مرشدی و مولائی ادام اللہ فیمنکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

کل ایک عریضہ محرمی مسلمان میاں سلمہ کی خدمت میں گزراں چکا ہوں، پہنچا ہوگا، خطا تھنے میں تاخیر نسخہ کی وجہ سے ہوئی، ابھی حکیم صاحب (مخدومی حکیم مقصود جنگ بہادر) نے ایک نسخہ لکھ دیا ہے جو معہذا مرسل ہے، دو نسخے اور میں دونوں کو تیار کروانا ہوگا، اگر وہاں ان کا اہتمام ممکن نہ ہو تو حکم ملنے پر احقر ان کو تیار کروانے کے خدمت والا میں پیش کر دے گا۔

(بعض مقبوضی دماغ و اعصاب نسخے حضرت والا کے لئے لکھ بھیجے تھے)

س۔ بھوپال

جیسی الاعتراف صلح اللہ احوالکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کل کا خط ابھی آج ہی ساتھ پہنچا۔ آپ کے بخیریت پہنچنے کا انتظار تھا، الحمد للہ بخیریت معلوم ہوئی، نسخے پہنچے، یہاں عطاریوں سے دریافت کروں گا مگر پہلے یہ تو معلوم ہو کر مرض کیا ہو؟ اور ان نسخوں میں کیا کیا ماییتیں ہیں؟

غ۔ حضرت والدہ اپنی صحت سے متعلق قدرے تفصیل سے مطلع فرمائیں تو باعثِ تسکین ہوگا،
 س۔ الحمد للہ اچھا ہوں، زکام ختم ہو چکا، صرف گلے کی کھانسی قدرے ہے، حرارت نہیں ہے، بھوک
 لگتی ہے، جوشاندہ بعدِ تیراب بھی استعمال میں ہے،

غ۔ اس مرتبہ تو حضرت والدہ کی شفقتوں نے عجیب ہی کیفیت پیدا کر دی، نمازیں، ذکر میں،
 چلتے پھرتے ہر وقت دھیان اُدھر ہی رہتا ہے اور تصورِ شُرع بندھا رہتا ہے، جی چاہتا ہے کہ
 پھر خدمتِ فیض میں جا پہنچوں،

س۔ جو کچھ ہوا اور ہوتا ہے وہ سب حق تعالیٰ کا فیض ہے، بندہ مامور ہے، یہ اقصائے محبت
 ہے، وہ محبت جس کی تعلیل کی شکایت آپ کو پیدا ہو گئی تھی، (جیسا کہ گذشتہ کسی عزیز
 میں لکھا تھا)

غ۔ حضرت والدہ دُعا کے خیرے سرفراز فرمائیں، والسلام، احقر غلامِ محمد
 س۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اہلیہ کو فلاح و اربابِ بخششیں، والدہ سلمان دُعا کے خیر کہتی ہیں
 والسلام، فقیر و بچہ داراں سید سُلیمان
 (اس جملہ نے غرقِ ندامت کر دیا کہ میں تو خدمتِ علیہ منظرِ ہا میں سلام عرض کرنا بھول
 ہی گیا تھا)،

مکتوب (۷۸)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء

حضرت سیدی و مرشدی و مولائی دام فیوضکم

مزاجِ اقدس!

السلام علیکم ورحمۃ

والانعام باعثِ تسکین ہوا، اللہ تعالیٰ حضرت والدہ کو تادیر بہ از دیا و فیوضِ سلامت لکھے!

س۔ اگر دن کا والانا مر آیا تو مناسب جواب عرض کیا جائے گا، چنانچہ عرض بھی کیا اور اس کا جواب ایسا آیا کہ پھر حضرت والدہ کی رحلت تک عرض دشورہ کا یہ تعلق مستحکم رہا،

بزرگوں کا حسن ظن اس بے استحقاق کے ساتھ میرے لئے نعمت بھی ہے اور ابتلا بھی اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں، (یہ ہے عملی تفسیر اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ کی) احقر کی اہلیہ حضرت والدہ اور علیہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہیں اور دعا کی خواستگار ہیں،
احقر غلام محمد

س۔ عزیزہ موصوفہ کے لئے دُعا ئے خیر ہے، والدہ سلمان کی طرف سے بھی دعاء و سلام،
فقیر پچھاں سلیمان

مکتوب (۷۹)

ع۔ جید رآباد وکن

۲۲ اپریل ۱۳۹۶

حضرت سیدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج اقدس!

عرض یہ ہے کہ آج سے دو ڈھائی برس پہلے جب احقر بزرگانِ دین کی مزاحمت پر بغرض زیارت حاضر ہوتا تو ایک خاص کشش و جاذبیت اور کبھی کیف و سرور محسوس کرتا تھا،

لہٰذا یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت سواتہائی تعلق کے زمانہ میں جبکہ ابھی ٹوٹی پھوٹی ابتداء سنت کا کوئی اہتمام بھی نہ تھا ایک بزرگ کی ہزار پر تجلی میں آنکھیں بند کئے قوتِ فاتحہ کہہ رہا تھا جب "ابہنا الصراط المستقیم" پہنچنا تو زار و آواز کو ساتھ دُعا ئے کلمات کان میں پڑے چونکہ بات نئی تھی، گھر آ کر انکھیں کھولیں تو مکرر وہی کلمات تزار کے ٹھیک سرانے کی طرف سے نکلتے ہوئے سنائی دیے، میں جیسے تیسے سو دن فاتحہ پڑھ گھر آ کر وہاں ہو کر آیا چند ہی روز بعد پھر حالِ معاشی ہوئی تو حضرت سیدی سے یہ واقعہ بالمشافہ عرض کیا، مسکراتے ہوئے فرماتے تھے کہ اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی "ناقص العقیدہ لوگ انہی واقعات سے گراہ ہو جاتے ہیں۔ سلاقی کی راہ میں یہی ہے کہ نگاہِ قرآن و سنت کی، ہماری سے ہٹنے نہ پائے!

لیکن اب یہ بات جاتی رہی اور تکلف سے بھی لگاؤ محسوس نہیں ہوتا، اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید قلب کی حالت اب اور تادیک ہو گئی ہے، حالانکہ بزرگانِ سلف سے حسنِ عقیدت میں کوئی فرق نہیں ہے، معلوم نہیں میرا گمان درست بھی ہے یا اس کی وجہ کچھ اور ہے!

س۔ بھوپال

صدیق صمیم زادکم اللہ تعالیٰ حباً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے،

قبور و مزاراتِ صالحین سے استفادہ فیض گو منوع نہیں لیکن ماثور و مسنون بھی نہیں، تاہم یہ استفادہ و استفادہ بھی مفید و مستفید کی مناسبت پر موقوف ہے، معلوم ہوتا ہے کہ محمد اللہ تعالیٰ آپ سُنّت سے اب قریب ہو گئے ہیں، یہ خوشی کا مقام ہے نہ کہ رنج کا۔

غ۔ احترامِ بابا اس قسم کے خواب دیکھتا ہے کہ کبھی موچھیں اور کبھی سر کے بال موافقِ شرع کٹوا رہا ہے، تبیر سمجھ میں نہیں آتی،

س۔ تبیرِ سُنّت کی موافقت کی طرف ترغیب و بشارت ہے، یہ اصلاح کی تمثیل ہے،

غ۔ احقر پاکستان کی تیار کی میں ہے، حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ خیر فرمائے!

س۔ دعا تو بے شبہ ہے مگر مکی ہوئی روزی سے اعراض کے خیال سے ڈر لگتا ہے اللہ تعالیٰ وہی کریں جس میں آپ کے لئے خیر ہو،

غ۔ بعض دفعہ جائز امور میں بھی جب نفس کو زیادہ لذت ملتی ہے تو مواعظ کا ڈر ہوتا ہے یہ دوسرے یا حقیقت؟

س۔ مباحات میں غلو سے بھی فیوض کم ہو جاتے ہیں!

غ۔ احقر کو جب کسی وقت دنیا میں زیادہ انہماک محسوس ہوتا ہے تو مراقبہ موت و بعد الموت کے ذریعہ اصلاح کر لیتا ہے، اس سے خشیت اور دنیا سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے —

کیا یہ طریقہ احقر کے مناسب حال اور درست ہے؟ فقط

خادمِ غلام محمد

س۔ ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی چاہیے،

بندہ محمد اسلمان

مکتوب (۸۰)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۳ مئی ۱۹۴۹ء

حضرت سیدی درمشی و مولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج اقدس!

گزشتہ دنوں ترک وطن کی مصروفیات کے باعث کوئی عریفہ نہ گذران سکا، ۲۲ مئی کو روانگی کا قصد ہے، حضرت والا سے درخواست ہے اس آشفتمند حال کیلئے دعا فرمائیں!

س۔ دینہ ضلع پٹنہ

عزیزی و حبیبی حقیق اللہ آمالکم واصلح اعمالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمد للہ خیریت ہے،

ایک ماہ ۱۸ یوم کی رخصت پر وطن آیا ہوں، آپ اس اثنا میں پاکستان کو روانہ ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے!

غ۔ وہاں پہنچ کر ذریعہ معاش کیا ہوگا اس کا قطعی تصفیہ یہاں نہیں کر سکتا، خیال یہ ہے کہ جب وطن چھوڑیں، رہے تو جہاں بھی معاش فراخی اور صحبت حاصل میسر آئے وہیں قیام کیا جائے، حضرت والا سے میری کا طالب ہوں،

س۔ مجھے بھی آپ کے ترک وطن بلا اسباب سے تردد ہے، میری مخلصانہ دعا آپ کی رفیق ہے وہاں پہنچ کر حقیقت حال کا انکشاف ہوگا، بے کانٹے کا پھول کہاں ملے گا، بُرائیاں ہر جگہ ہیں، اچھی صحبت ہر جگہ عنقا ہے،

غ۔ بھوپال کے بدلے ہوئے حالات (یعنی انضمام ریاست) کے تحت حضرت والادہ کا وہاں قیام کب تک رہے گا۔

س۔ ابھی تک فیصلہ نہیں،

غ۔ اشتر کی ذیوی و دینی صلاح و ترقی کے لئے حضرت والادہ دعا فرمائیں، والسلام خادم غلام محمد

س۔ دل و جان سے دعا کرتا ہوں،

خدا جانے آپ کو یہ خط کیوں کر ملے گا، والسلام

سید سلیمان، ۲۲ مئی ۱۹۴۹ء

(یہ والا نامہ حیدر آباد ہو کر کراچی پہنچا)

مکتوب (۸۱)

جون ۱۹۴۹ء کو راقم تنہا کراچی پہنچ گیا، دوسرے ہی دن خیریت کا ایک خط اپنے گھر اور ایک حضرت اقدس رحمہ کی خدمت میں اکھ دیا تھا، پھر اس کے چند روز بعد ذیل کا احوال نامہ ارسال کیا گیا تھا)

غ۔ کراچی

۳ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

میرے مرشد و رہبر و آقا ادام اللہ برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج اقدس!

کراچی آکر ایک کار و خدمت والادہ میں گزارنا تھا، جواب سے محرومی ہے، نہ معلوم حضرت بھوپال میں تشریف فرما ہیں یا کہیں اور؟

س۔ بھوپال، ۴ جولائی ۱۹۴۹ء

۴ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

محبت مخلص و عزیز مصیم مذقلم اللہ تعالیٰ السعاده فی الدنیا والاخرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کراچی کا کارڈ ملا، وطن میں ایک ماہ قیام کے بعد بھوپال واپس آیا، شوال کے آخر میں پھرج کا قصد کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ انجام فرمائیں۔

غ۔ معمولات پر بجز اللہ پابندی ہے، عبادات میں زیادہ کیف و سرور محسوس ہو رہا ہے، اکثر رجوع کی کیفیت رہتی ہے، غالباً تنہائی کی وجہ سے، واللہ اعلم،

س۔ مبارک کہ معمولات پر پابندی سفر میں نصیب ہو رہی ہے، سبب کچھ ہو، نتیجہ اچھا ہے!

غ۔ اب تک بعض مرتبہ تہذیب رہتا ہے کہ ترک وطن بہتر ہو یا قیام بہتر تھا، مگر جب بھی قیام وطن کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے خلاف عالم رویا میں اشادات پاتا ہوں مثلاً ایک مرتبہ دیکھا کہ کافر احقر کے والد ماجد مدظلہ کو رب کے سامنے ناریل چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہیں اور احقر بھی باوجود اندرونی کراہیت کے دست بستہ کھڑا ہے یا مثلاً ایک بار دیکھا کہ کافر میرے گھر میں گھس آئے اور درپے عصمت ہیں، اس طرح کاتین چار بار معاملہ ہوا،

س۔ اب تہذیب سے کوئی فائدہ نہیں اذاعزمت فتوٰی علی اللہ، رویا ہر قسم کے ہوتے ہیں بہر حال آپ جو کچھ فیصلہ کر چکے اوس پر جیسے دیکھتے اور تہذیب کو دل سے نکال دیکھتے۔

غ۔ احقر کے غیب میں حضرت اقدس کا کرم نامہ حیدر آباد پہنچا اور وہاں سے یہاں بھیجوا یا گیا، یہاں کے حالات سے متعلق حضرت والا کے ارشادات حرفاً حرفاً درست ہیں، بے پردگی اور اس سے متعلقہ خرابیاں عام ہیں، یہ چیز باعث افریت ہے!

س۔ سو اُدعا کے اور کیا کیا جاتے۔۔۔ اگر ایک جگہ ہندویت کا غلبہ ہے تو دوسری جگہ

افرنجیت کا، خالص اسلام کہاں ہے، بہر حال اپنے اپنے اہل و عیال کی حد تک کوشش اصلاح کی جاتے، جماعت کی اصلاح اختیار سے باہر ہے مگر اپنی اصلاح پر

تو اختیار ہے!

غ۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب و مولانا حاجی محمد عثمان خاں صاحب مدظلہم سے نیاز حاصل رہتا ہے، موخر الذکر بزرگ کے پاس دل زیادہ گہنا ہے۔ لیکن بہ صورت حضرت اقدس سے دوری کا خیال تڑپا دیتا ہے اور دل یہی کہتا ہے کہ

ع۔ بسیار خواباں دیدہ ام لیکن تو چیزے درگیری!

س۔ بزرگوں کی صحبت موجب برکت ہے، ع۔ تمتع زہر گوشہ یافتہ
غ۔ حضرت والاہ حق کے لئے بطور خاص دعا فرمائیں تو انشاء اللہ فلاح دارین حاصل ہے گی!
س۔ آپ کے لئے دل سے دُعا کرتا ہوں،

غ۔ گھر سے ہندوستانی ٹکٹ منگوائے تھے، اس لئے جوابی لفافہ رکھ دیا ہے، انشاء اللہ آئندہ بھی یہی صورت رہے گی،
دُعا خواہ

احقر غلام محمد

س۔ اس کی فکر نہ کریں، سید سلیمان

مکتوب (۸۲)

غ۔ کراچی

۱۸ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

سیدی و مرشدی و مولائی ادام اللہ فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج اقدس!

گرامی نامہ باعث تشفی کامل ہوا، اللہ تعالیٰ ہم گم کردہ راہوں کی ہدایت کے لئے حضرت والاہ کو تادیر یہ ازویاد فیوض و برکات سلامت رکھے،

س۔ بھوپال ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

عزیز مخلص میرا اللہ تعالیٰ عسکر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ الحمد للہ خیریت ہے،

الحمد للہ کہ عاجز قاصر کے مشورے آپ کے لئے مفید ہوئے،

غ۔ ملازمت کے اسلسلہ میں ایک رہبری یہ مطلوب ہے کہ کراچی کے قیام کو ضروری تصور کیا
جلے یا جہاں کہیں بھی جانا پڑے گوارا کر لیا جائے؟

س۔ کراچی کے قیام پر اصرار وغیر ضروری ہے، کیا عجب کہ آپ کے ذریعہ سے دوسرے مقامات
تک ہدایت خیر پہنچے اور اس کا نفع بھی کچھ کم نہیں، اللہ تعالیٰ احقر کو حضرت اقدس کے
اس حسن ظن کا اہل بنائے!

غ۔ احقر کو کشادگی رزق یا دفع بلا وغیرہ کے اوداد و وظائف سے کچھ بھی لگاؤ نہیں، البتہ دُعا
میں کم و بیش دل لگ جاتا ہے، یہ حالت خدا نخواستہ محرومی کی تو نہیں ہے؟

س۔ ان امور کے لئے عمل یعنی اوداد و وظائف سے دلچسپی نہ ہونا دل کی سلاحتی اور فہم کی
استقامت کی دلیل ہے، مگر دراصل ان کو عمل سمجھ کر کرنے سے یہ کیفیت ہوتی ہے اگر
ان کو بھی دعا ہی سمجھا جائے تو یہ کیفیت جاتی رہے گی مثلاً کوئی کشائش رزق کے لئے
یہ بتائے کہ یا رزاق، یا وھاب، یا تائب، یا بایسط، پڑھا کر تو یہ مینوں اللہ تعالیٰ کے
نام ہیں، ان ناموں کو نسبت رزق اور وسعت و کشائش سے ہے تو گویا یہ اپنے رزق
کی وسعت کی دُعا ہے اللہ تعالیٰ کو اس نام سے پکار کر جس نام کو ہماری دُعا سونا نسبت
ہے! جیسے کوئی فقیر کسی دروازہ پر کھڑا ہو کر یہ کہے ملے سنی داتا، ملے سنی داتا تو یہ بھی ایک
دُخواست ہے اور اس خاص نام سے پکارنا اس لئے ہے کہ اس نام کے آثار کا اس کے
فعل سے ظہور ہو،

(سبحان اللہ کیا حق تحقیق ادا فرمایا ہے اور کیسی عقدہ کشائی فرمائی ہے!)

غ۔ مسئلہ کشمیر کے خطرات کی وجہ سے جی یہ چاہتا ہے کہ والدین اور اہلیہ کو جلد یہاں بلوالوں

حضرت کی کیا رائے ہے ؟

س۔ جو پیشین آپ کے والد کو مل رہی ہے وہ تو بزدلہ ہوگی؛ تو بولوا لینا طریت قلب کے لئے شاید مفید ہو،

غ۔ اللہ تعالیٰ حضرت والدہ کے عزم حج کو پورا فرمائے، کیا حضرت والدہ کراچی ہو کر تشریف لے جائیں گے ؟

حضرت پیرانی صاحبہ کی خدمت میں مودبانہ سلام عرض ہے اور دعا کی درخواست ہے

محترم سلمان میاں سلمہ اللہ کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے، فقط

خادم حقیر غلام محمد

س۔ راستہ کی تعیین تو ہمارے ہاتھ میں نہیں، جہاز کا جو راستہ ہو، وسط سوال تک قصد ہے

مب کی طرف سے سلام قبول کیجئے، والدہ سلمان آپ کو خاص طور سے مدح کے ساتھ یاد کرتی ہیں، بندہ یسجدیں سلیمان

(حضرت پیرانی صاحبہ کے یہ الطاف اب تک اس خادم کے شامل حال ہیں، والحمد للہ علی ذلک)

مکتوب (۸۳)

غ۔ کراچی

۲۰ سوال ۱۳۶۸ھ

ذوالحجہ والاکرم حضرت مرشدنا و مولانا مظلکرم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج اقدس !

اب طبیعت کا میلان ذکر نفی اثبات کی طرف ہے، اس سلسلہ میں حکم درکار ہے،

س۔ بھوپال

حبیب صادق و فکرم اللہ تعالیٰ لما یحب و رضی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے،

ذکر نفس و اثبات کی اجازت میں کوئی حرج نہیں مگر جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ ذکر مفرد کس حد تک موثر ہوا، ایسا نہ ہو کہ ایک سبق چھوڑ کر دوسرا سبق پڑھنے میں پہلا بھول جائیں، اکثر ایسا ہوتا ہے اس لئے منتہی کرنا ضروری تھا،

(ہر سالک طریق اس انتباہ کو سن رکھے)۔

غ۔ احقر کی اہلیہ بچہ اللہ بنحو قوتہ نماز و تلاوت قرآن پاک کے علاوہ تہجد کی بھی پابند ہیں، اور مناجات مقبول کی ایک منزل بھی روزانہ پڑھ لیتی ہیں، ان کی بڑی تنہا ہے کہ حضرت اقدس داخل اداوت فرمائیں، انھوں نے حضرت والدہ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کر کے احقر سے بھی خواہش کی ہے کہ ان کی اس آرزو کو خدمت گرامی میں پیش کر دے، چنانچہ عرض کر دیا، آگے حضرت کی جو مرضی ہو،

ع۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند

س۔ آپ کی اہلیہ کا خط اس مطلب کا آیا تھا، میں نے انھیں دکھا تھا کہ پہلے آپ شیخ کے احکام کے مطابق شرع کی پابندی کا وعدہ کریں، چنانچہ اون کا وعدہ آگیا ہے، اب بیعت کے بعض شرائط سے اون کو مطلع کرتا ہوں۔

غ۔ حضرت والدہ کی توجہ شامل حال رہی تو وہ احقر کے لئے دینی لحاظ سے ایک بہتر رفیق حیات ثابت ہو سکیں گی،

س۔ انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا،

غ۔ مولانا احتشام الحق صاحب سے پتہ چلا کہ حضرت والدہ مدظلہ کی خدمت میں ہماری حکومت کی طرف سے مراسلہ بھیجا جا چکا ہے، (بورڈ تعلیمات اسلامی کی صدارت کے لئے) احقر کے گمان میں بعد فراغ حج ہی حضرت والدہ یہاں تشریف لائیں گے۔

لے خوشا وقت کہ آئی دہصد ناز آئی

س۔ آنا تو مشکل نہیں، نباہنا مشکل ہے، (فراست سلیمانی نے جن شکلات کا اندازہ لگایا تھا وہ سب تجربہ پس من و عن صحیح نکلیں)

غ۔ (۱) یہ بندہ محبت ہر چند عمل سے عاری ہے لیکن اُس والاہانہ تعلق کی بنا پر جو اس کو حضرت اقدس سے حاصل ہے، ملتی ہے کہ جب حضرت والا یہاں تشریف لاتیں تو اس ناکارہ کو خادم خاص بنائے رکھیں اور دینی و دنیوی ہر قسم کی خدمت کا موقع عطا فرمائیں، (۲) کیا عرض کروں، کبھی تو جی یہ چاہتا ہے کہ احقر ہوا و حضرت والا ہوں، خادم بھی ایک اور مخدوم بھی ایک !!

س۔ (۱) آپ کی یہ خواہش آپ کی سچی محبت کا نتیجہ ہے، (۲) جی ہاں یہ بھی محبت کا ایک اقصا ہے، خدا کرے اس محبت سے اس کے معائب جیسے حسد و رشک و بدگمانی سے دُوری رہے،

عشق است و ہزار بدگمانی

غ۔ غالباً حضرت والا کے دورانِ سفر حج احقر کو عرض معروض کا موقع نہ مل سکے اس لئے استعما ہے کہ اُس سرزمینِ پاک پر اس بندہ ناپاک کے لئے بطور خاص دُعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ "مترتباً احسان سے سرفراز فرمائیں!

س۔ سفر حج میں حجاز کا پتہ یہ ہو گا کہ مکہ معظمہ، محلہ شامیہ، بذریعہ ہتھم صاحب، رابطہ بھوپال، انشاء اللہ تعالیٰ اپنے سارے محبتین کے لئے دُعا کروں گا۔

غ۔ حضرت والا کے ارشاد کی بناء پر ایک ہنگامی ملازمت قبول کر لی ہے، شاید اس دوران میں کوئی منتقل صورت بھی نکل آئے، دعا کا طالب ہوں۔

ننگ بارگاہ احقر غلام محمد

س۔ اچھا کیا بے کاہی سے میگاری کھلی،

اللہ تعالیٰ آپ کے لئے مستقل روزگار جلد پیدا کرے، والسلام

بندۂ بچہ داں سلیمان

۱۱ شوال ۱۳۶۸ھ

مکتوب (۸۴)

(ذیل کا مکتوب حضرت والارحہ کی زیارتِ حرمین سے واپسی کے بعد لکھا ہے)

غ۔ کراچی

۳۱ دسمبر ۱۹۴۹ء

سیدی و مرشدی و مولائی دامت فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزارِ اقدس!

س۔ بھوپال

عزیزِ قلبی اداۃ اللہ سعدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ خیریت ہے،

میں جہاز پر واپسی میں غلیل ہو گیا، اسی حالت میں بمبئی پہنچا، احباب نے بعض علاج و

استراحت بمبئی میں روک لیا، جہاز ۲۸ دسمبر کو بمبئی پہنچا تھا، میں بخار اترنے پر ۸ جنوری کو

یہاں پہنچا، بخار نہیں ہے، کھانسی ہے، اور ضعف و نقاہت بہت ہے مگر آہستہ آہستہ

قوت عود کر رہی ہے، بحمد اللہ تعالیٰ،

غ۔ دوعریضہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے پتہ پر گزرنے تھے اور ان سے مقصود محض حصول

وُعَا تھا، امید کہ ضرور اس سے سرفرازی رہی ہوگی۔

س۔ آپ کے دونوں خط عرب میں ملے، مگر وہاں کچھ ایسی حالت رہی کہ قلم بچڑنے کو ہی نہیں

چاہتا تھا، اس لئے جواب نہ دے سکا، مگر بحمد اللہ آپ کے لئے خصوصاً اور مجملہ احباب

و مجبین کے لئے عموماً دعائیں کیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں،

غ۔ یہاں کی کل تو پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی، مولانا عثمانی رح کی رحلت سے حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہو گئی ہے، اور تو اور خود اپنے اکابر (مراد متنبین حضرت حکیم الامتؒ) میں عدم اتحاد اور اس کے نتائج کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور رنج بھی، سب کا یہی خیال ہے کہ یہ غفلت اگر مٹ سکتا ہے تو حضرت اقدس ہی کی موجودگی سے ورنہ صورت حال نہ جانے کس نوبت تک پہنچ جائے۔۔۔۔۔۔ نہ معلوم حضرت والا رح کی مصلحت کس پہلو میں ہے اس خدام اور دیگر عقیدت کیشوں کے ولی جذبات تو یہی ہیں کہ جس قدر جلد تشریف آوری ہو مناسب ہے۔۔۔۔۔۔ البتہ بعض مرتبہ احقر کو یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ کہیں ہماری دعوت حضرت والا کیلئے رحمت نہ بن جائے، چنانچہ یہی ہوا، کتنی عقیدتوں کی بنیاد محض ذاتی مفادات پر ٹکلی اور جب وہ پورے نہ ہو سکے تو وہی عقیدتیں مخالفتوں میں بدل گئیں کچھ کھلی کچھ خفیہ، (ان اللہ)

س۔ حالت یہ ہے کہ ہر دو جگہ میرے وجود کے لئے احبابِ مصر میں اپنی حالت یہ ہے کہ عدم صحت اور ضعفِ قوی سے بھی اور طبیعت کے اقتضاء سے بھی اختلافِ مناہت سے دل گھبراتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ آئندہ کیا ہوگا، سنا ہوگا کہ میرے گاؤں میں ۱۴ مکانات کی ضبطی کے احکام آئے ہیں جن میں ایک عاصم میاں بھی ہیں، خدا جانتا ہے کہ آگے کیا صورت حال ہو۔

غ۔ حضرت کیا عرض کروں حق تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کرنا محال ہے کہ اول تو اس نے سلسلہ اشرفیہ میں منسلک فرمایا اور پھر حضرت والا رح جیسی ہستی کی غلامی سے سرفراز کیا، جتنی حق اُنھیں کھلتی جاتی ہیں، یہی یقین بڑھتا جاتا ہے کہ

ع خوبی کہ تو داری صنادر دگرے نیست

س۔ میری نسبت جس حسنِ ظن کا آپ نے اظہار کیا ہے خدا کرے کہ وہ آپ کی کامیابی اور

ترقی کا ذریعہ ہو، (کیا عارفانہ بات فرمادی ہے)

غ۔ احقر کی اہلیہ یہاں آچکی ہیں، سلام عرض کرتی ہیں اور دعائے خیر کی طالب ہیں والدین ابھی وہیں ہیں اور آنے کی فکر میں ہیں حضرت والدہ دُعا فرمائیں کہ ان کی ماہ کی رکاوٹیں جلد ہٹ جائیں،

س۔ اپنی اہلیہ کو سلام کہیے، اون کی صحت و ترقی کے لئے دُعا کی گئی، آپ کے والدین کے لئے دُعا کی جاتی ہے، رب العزت قبول فرمائیں،

غ۔ محترمی جناب ابو عاصم صاحب کے گھر پر طرح خیریت ہے، احقر اور اس کی اہلیہ کی جانب سے مخدومہ و محترمہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض ہے اور دُعا کی درخواست پیش ہے، مخدومی و مولوی سلمان میاں سلمہ کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے، والسلام

ننگِ خدام

احقر غلام محمد

س۔ سنا ہے کہ اہلیہ ابو عاصم کا علاج آپ نے بھی کیا،

والدہ سلمان کی طرف سے دونوں صاحب سلام قبول کریں، والسلام

سید سلیمان ۱۸ جنوری ۱۹۵۷ء

مکتوب (۸۵)

غ۔ کراچی

۱۱ فروری ۱۹۵۷ء

بگرامی خدمت سیدی و مرشدی دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آجکل معمولات یہ ہیں: ذکر بارہ تسبیح، ذکر مفر و متری، تہجد، اشراق، ادابین، تلاوت قرآن

پاک اور مناجات مقبول،

- س۔ عزیزِ وحیبی و مخلصِ سیرِ اللہ کم العصر، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
یہ معمولات کافی ہیں، کسی معمول کو نہ کرنا یعنی اپنے معمول میں داخل نہ کرنا اتنا بڑا نہیں ہو
جتنا اس کو اپنا معمول مان کر اس سے غفلت کرنا،
غ۔ کبھی کبھی طبیعت گھبرا جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ کوئی ایک نگاہ پر فسون، ڈال کر رجوع
ال اللہ کی کیفیت کو دائم کر دے اور علائقِ نفس سے نجات ہو جائے،
س۔ آپ نے تو وہی بات کہہ دی ہے

صنما رہِ قلندر بہنا تو اور نہائی

کہ دراز دو دو نیم رہ درسم پارسائی

- یہ تو اللہ تعالیٰ کے جذب و فضل پر موقوف ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب دنیا
کے سارے کام آپ اسباب و علل کے تحت میں کرتے ہیں تو غریبِ دین ہی کو ان سے
خارج کیوں کیجئے، (کیسی حکیمانہ بات ہے اور نفس کا چور کس طرح پکڑ لیا ہے!)
غ۔ حضورِ مئی قلب سے اب تک محروم ہے؟

س۔ حضورِ مئی قلب کی حقیقت آپ کیا سمجھتے ہیں؟

- غ۔ آج کل احقر اپنی بساط سے زادِ ایک کام کر رہا ہے یعنی "اشرف السوانح" کی تلخیص ہو رہی ہو
اور جناب مفتی محمد شفیع صاحب قبلہ نے احقر کے خاکہ اور طرز کو پسند فرمایا ہے اور تکمیل
پر بھی نظر فرمائیں گے حضرت اقدس کی رائے اور حکم احقر کے لئے موجب طمانیت ہوگا،
ارشادِ عالی ہو تو یہ کام جاری رکھوں درہندہ کر دوں۔

س۔ کام اچھا ہے، حضرت مفتی صاحب کے زیرِ ہدایت انجام دیجئے!

- غ۔ بعض ترنہ عجیب حال رہتا ہے کہ نماز میں تو وہ بیکھوئی و رجوع کی کیفیت نہیں رہتی لیکن اس
کے بعد ذہن و قلب تمام تر متوجہ بحق محسوس ہوتا ہے، شاید یہ ایک دھوکا ہے کیونکہ اگر

یہ کیفیت واقعتاً رُجوع کی ہے تو نماز میں کیوں نہیں رہتی حالانکہ نماز میں تو زیادہ قسرب حاصل رہتا ہے،

س۔ نماز میں اعمال مختلف ہوتے ہیں جس سے وہ یکسوئی جس کو آپ یکسوئی سمجھتے ہیں نہیں ہوتی کیا خدمت گار خدمات کے انجام دینے میں مالک کی محبت کی یکسوئی کا تصور کرتا ہے؟ مگر یہ خدمت خود ہی محبت کی دلیل ہے اور اطاعت کی فافہم۔ نماز سے فراغت کی حالت میں یکسوئی مستر ہو کر محسوس ہوتی ہے، مگر یہ کوئی چیز نہیں، (کیا شان تحقیق ہے، شیخ محقق اس کو کہتے ہیں، ع۔ نہ ہر کہہ ستر بتر اشد قلندی داندا)

غ۔ مولوی احتشام الحق صاحب غالباً دوشنبہ تک عازم مشرقی پاکستان ہیں اور جاتے ہوئے یا واپسی میں حضرت والدہ سے نیاز حاصل کریں گے،

س۔ خدا کرے اون سے ملاقات ہو سکے،

غ۔ حضرت والدہ کی طرف سے افاضہ میں کوئی کمی نہیں مگر احقر میں قوتِ استفاضہ بھی تو ہو بس حضرت والدہ ہی سے درخواست ہے کہ یہ دُعا فرمائیں کہ صلاحیت استفاضہ بڑھے اور حضرت والدہ کا رنگ پیدا ہو جائے،

س۔ آپ کے لئے ہر وقت دُعا ہے،

خود بچہ کو یہ نظر نہیں آتا کہ وہ ہر روز کتنا بڑھا، تاہم یہ شوق ترقی مبارک ہو،

غ۔ محترم ماحم صاحب کے گھر غیریت ہے، خدومہ و محکمہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں سلام و درخواست دُعا پیش ہے، فقط ننگ خدام

احقر غلام محمد

س۔ اون کے لئے دل بے چین رہتا ہے کیوں کر اون کے پاس بچہ چوں، والدہ سلمان کی طرف سے

سلام و دعا قبول کیجئے، والسلام

یہ جہاں سلیمان

محمد پال

عزیزی دجیسی دوم نوشنگ

السلام عتیق درمن اب - ۵ رڈ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۵۷ء
آپ کے ذوق و شوق کے شعر پر حکم دل متاثر ہوا۔ میں چند روز
بجائے رہتا تھا۔ اب اچھا ہوں۔ درندہ سہاگمہ بلا روٹ گیا تھا۔ کچھ
اچھا ہوتا ہے۔ انتہائی قیمت سے یہی دھفت اور چارج ملے
۵ روپے اچھا ہوتا ہے۔ اس کے دھن کا ٹوٹ جائے ۵ موقع ہوتا ہے
اب نو آپ لوگوں سے ملنا بہتر تھا۔ ۵ مل مکن ہوتا ہے
اس کا کرشن کر رہا ہوں

شمس الدین سہیل کی فریت ملی۔ دعا و بجز عام سہیل
میں جد محنت نصیب ہو
پوچھ لپیہ سہیل و فقہا کو سہیل کیجیے۔ السلام

سہیل

۱۹۵۷ء
۱۰ مارچ



اس وقت سے لکھی گئی ہے
وزارت اطلاعات

Karachi

(Pakistan)

مکتوب (۸۷)

(جون ۱۹۵۰ء کو حضرت والاؒ کراچی تشریف لائے اور جس حیثیت سے تشریف لائے اس کا ذکر اس کتاب کے پہلے حصہ میں آچکا، غرض اب جتنے بھی مکتوبات آئیں گے وہ بالمشافہ پیش کردہ ہیں، کیونکہ احوال بہ طور تحریر ابی پیش کئے جاتے رہے!)

غ۔ کراچی

۱۵ جون ۱۹۵۰ء

بخدمت فیضد رحمت حضرت سیدی و مولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی زیارت کی تمنا ایک عرصہ سے تھی، اشرف السوانح کی تلخیص کے دوران میں یہ تمنا برآئی اور دوبار حضرت کی زیارت کا شرف ملا، تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلا خواب: —————

کھانے کی دعوت ہے، حضرت تھانویؒ تشریف لانے والے ہیں، دسترخوان چُٹنا ہوا ہے، پندرہ بیس مریدین و معتقدین حلقہ بیضوی میں بیٹھے ہوئے ہیں، درمیان میں ایک بڑی کرسی حکیم الامتؒ کے لئے ہے اور اسی سے متصل احقر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اس کی تلخیص کردہ سوانح ہے جو ابھی ناتما ہے، خیال یہ ہے کہ خود صاحب سوانحؒ کو دکھا دوں گا حضرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے کہ لوگ کھانے لگ گئے احقر نے بھی دو تین نوالے لئے پھر رفع حاجت کے لئے اٹھ گیا، اس میں دیر ہو گئی خیال آیا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے، تیز تیز مسجد آیا لیکن جماعت ہو چکی تھی، حکیم الامتؒ منتیں پڑھ رہے تھے، کچھ فاصلہ پر بائیں جانب..... صاحب (خلیفہ مولانا تھانویؒ) بھی

مُنٹیں پڑھ رہے تھے، احقر چونکہ سامنے سے آ رہا تھا اس لئے دونوں کے درمیان سے گذر کر مولانا تھانویؒ کے سیدھے ہاتھ کی طرف نماز میں مشغول ہو گیا۔۔۔ صاحب نے نماز ختم کر کے زور زور سے گفتگو شروع کی اور بار بار کہتے جاتے تھے ”میں نے کہا“ —
 حکیم الامت نے سلام پھیر کر فرمایا: ”یہ تو خلاف تحقیق ہے، سید صاحب نے اس کے (ایک عربی لفظ جس کے معنی زیر دہرہ کے فرق سے بدل جاتے ہیں) معنی یہ بتائے ہیں“
 — یہ فرما کر حکیم الامت تشریف لے گئے، احقر کی نماز ابھی ختم نہ ہوئی تھی، ذہنی کشمکش شروع ہوئی کہ نماز پوری کروں یا حضرت سے جا ملوں اور یہ شعر ذہن میں آ رہا تھا
 اے قوم بہ حج رقتہ کھائید کھائید معشوق من اینجا ست بیائید بیائید
 غرض نماز جلدی سے ختم کر کے پکا مگر حضرت کو پانہ سکا اور آنکھ کھل گئی۔

س۔ کراچی

یکم رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ

عزیزی و حبیبی زادکم اللہ تعالیٰ عرقاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ دونوں خواب مبارک ہیں، (دوسرا خواب ابھی نقل ہوگا)

کھانا خوانِ ہدایت ہے جس سے آپ بھی زلہ رہا ہوئے ————— پاخانہ
 دنیاوی کاروبار میں، اُنکا، کئی کھار سے کبر کا شائبہ ظاہر ہوتا ہے، اس کی طرف ایما ہوا

غ۔ خواب (۲)

یکم مئی ۱۳۵۷ء کی شب کو دوبارہ خواب دیکھا کہ میرے استاد مولانا محمد صابر صاحب میرے گھر پر تشریف لائے اور اطلاع دی کہ ”حضرت (مولانا تھانویؒ) تم کو یاد فرما رہے ہیں“ میں نے خوش خوش لباس بدل کر سفید کرتا وپا جامہ پہن لیا اور قریب ہی کوٹھے پر جہاں حضرت قیام فرما تھے جا پہنچا، حضرت کو دیکھا کہ سفید کرتے اور پا جلے اور بچ گوشہ

ٹوپی میں ملبوس ہیں، ضعیف العمر لیکن توانا و تندرست، طویل قامت اور مائل بہ قرہی
 سُرخ و سفید ریش مبارک سفید آنکھیں نشیلی یا عجب مگر جاذبِ قلب اور آنکھوں
 میں سُرخ ڈورے پڑے ہوئے۔ احقر کو دیکھ کر متبسم ہوئے اور اندر آنے کا
 اذن فرمایا، احقر جا کر پاس ہی بیٹھ گیا، حضرت بہت بشاش تھے، مُسکرائے چلے جاتے تھے
 اور جب احقر کو مخاطب فرماتے تو ”بیٹا“ کہہ کر مخاطب فرماتے تھے سارے ارشادات
 میں صرف اتنا یاد ہے کہ فرمایا ”بیٹا! میں تمہیں ایسے ایسے کشتے بتاؤں گا“
 احقر کے دل میں خیال آ رہا ہے کہ لوگوں نے خواہ مخواہ حضرت کو سخت مشہور کر رکھا ہے
 حالانکہ اس قدر شفیق ہیں جب آنکھ کھلی تو کُشتہ کے لفظ پر حکیم الامت کا وہ
 ملفوظ یاد آیا کہ لوگ تو تنور کے پاس بٹھاتے ہیں اور میں تو کُشتہ کھلاتا ہوں کہ کشمیر
 کی سردی بھی کچھ اثر نہ کر سکے۔ واللہ اعلم،

احقر غلام محمد

حضرت والار کا یہی نقشہ تھا، مُسکراتا اور یہ طرزِ خطاب محبت کی علامت ہے اور
 رضائی۔

یہ تاویل (کُشتہ سے متعلق) صحیح ہے، والسلام، یحمدان سلیمان

مکتوب (۸۸)

”مَحَلُّ الْأَبْصَارِ“

(یہ مکتوب انشاء اللہ اہل نفسیات اور مالکینِ طریق دونوں ہی کیلئے بصیرت افروز
 اور یقین پرورش ثابت ہوگا،)

غ۔ کراچی

۲۴ جون ۱۹۵۷ء

سیدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر کا عجیب حال ہے، جہاں تک ذکر و فکر یا حق تعالیٰ کی تجلیات کو محسوس کرنے کا تعلق ہے، یہ سب باتیں اور وارد شدہ کیفیات سب "تصویری" و ذہنی معلوم ہوتی ہیں، جیسے کوئی اپنے آپ کو ہنپانزا (Self-hypnotized) کرے تو جس ہنچ کا تصور باندھے گا، اسی قسم کی کیفیات وارد ہوں گی۔ گویا یہ معلوم ہو رہا ہے کہ انوار و تجلیات الہی یا اس قسم کی اور بایں محض اپنے تصور کی پیدا کردہ ہیں حقیقت میں ان کا وجود نہیں یا پھر جو موجود حقیقتیں ہیں ان کا دیدار نہیں ہوتا، ورنہ اگر یہ چیزیں حقیقی ہوتیں تو بلا تصور کے محض اوامر الہیہ کی پابندی اور نواہی سے اجتناب پر ان کے ظہور کا ادراک ہونا چاہیئے تھا اس کے لئے خاص طور پر تصور باندھنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے؟ جب عرصہ تک ایک ہی تصور قائم رکھا جائے گا تو اس سے ایک احساس کا پیدا ہونا امر فطری ہے اور اس میں تمام تر انحصار تصور کی اچھائی یا بُرائی پر ہے، ایسی صورت میں شے تصور کو اصل اور حقیقت کیسے کہا جائے؟

مستواں ہفتن در داز طیبیاں کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ بالا خلیجان پیش کرنے کی جسارت کی گئی ہے، حق تعالیٰ اس سراپا خطا کے لئے راہِ صواب کھول دے اور خیر مقدر فرمائے، والسلام

ننگِ خدام غلام محمد عفی عنہ

س۔ کراچی

عزیزی و حبیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما و عرفانا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
یہ شبہ بالکل صحیح ہے اسی لئے یہ انوار و تجلیات جن کو عام طور پر انوار و تجلیات
کا نام دیا جاتا ہے وہ نفسانی افکار ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے اسی عمل نفسیاتی

کے ذریعہ بعض علمائے نفسیات بیماری کا انار اور صحت کا حصول کرتے ہیں اور اسی نفسیاتی حصول سے صوفیہ امراض باطنی کا علاج کرتے ہیں اور حق تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرتے ہیں اب جس طرح پہلے یہ طے کیا جا چکا ہے کہ صحت اچھی چیز ہے اور بیماری بُری چیز ہے اور بیماری کو دور اور صحت کا حصول اس تندر نفسیاتی سے کیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی ہوتی ہے اسی طرح مشاہدہ واستحضار ربانی کی کیفیت جس کے حصول کا مطلوب ہونا الگ دلیل سے ثابت ہے اس کے حصول کیلئے یہ نفسیاتی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ اس طریق میں عموماً جو مشاہدات ہوتے ہیں وہ ذہنی ہی افکار ہوتے ہیں جیسا کہ امام نقشبند (خواجہ بہاؤ الدین نقشبند قدس سرہ) کا یہ فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے ”آنچہ دیدہ شود و دانستہ شود ہمہ غیر خدا است۔“
 بحمد اللہ کہ یہ حقیقت آپ پر ظاہر ہو گئی، غرض اصلاً یہ مشاہدات و تصورات مطلوب نہیں یہ تو بطور تندر میں اصل اون کے نتائج ہیں یعنی صحت ! والسلام
 یہ پھر داں سلیمان

(یہ جواب با صواب حضرت والا جیسی جامع حکمت و معرفت مہتی ہی کی زبان و قلم سے ادا ہو سکتا ہے، ہر کسی شیخ طریقت سے یہ عقدہ کشائی ممکن نہیں،
 ع کاچنیاں علم اذیلنے دیگر است)

مکتوب (۸۹)

جولائی ۱۹۵۷ء میں راقم الحروف اپنے والدین کو لانے کے لئے حیدر آباد دکن گیا ہوا تھا ذیل کا مکتوب اسی سفر سے متعلق ہے۔

غ۔ حیدر آباد

پیر۔ ۱۰ جولائی ۱۹۵۷ء

بخدمت فیض رحبت حضرت سیدی و مولائی مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۱) بحمد اللہ آج صبح ۹ بجے یہاں بخیر و عافیت پہنچا، اب تو یہ جگہ بالکل پرانی معلوم ہوتی ہے۔
(۲) حضرت اقدس کی خدمت میں حاضری بالعموم ۳ تا ۷ بجے شام رہتی تھی، ہفتہ کو چار پر ٹھیک تین بجے حضرت والدہ کی یاد آتی اور اس یاد کے ساتھ ہی حق تعالیٰ سے رجوع اور حضوری قلب کی دولت ملی، کثرت استغفار و درود و شریفیں ایک خط حاصل رہا، جب اس کیفیت میں کمی ہوتی تو پھر حضرت والدہ کا خیال آیا۔

(۳) اس حالت سے یہ بات مشاہد ہوئی کہ حُب شیخ حُب الہی کا ذریعہ ہے اور بنائے خود قائم رہنے والی چیز نہیں بلکہ یاد الہی کی بہترین موصل ہے اور اسی حد میں مقصود و مطلوب بھی، واللہ تعالیٰ اعلم، حضرت والدہ رہبری فرمائیں،
عزیز محرم نادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

س۔

(۱) الحمد للہ تعالیٰ کہ آپ بخیریت پہنچ گئے،

(۲) یہ کیفیت مبارک ہے، اللہ تعالیٰ اس کو میرے اور آپ کے دونوں کے لئے وجہ از دیاد برکات بنائے،

(۳) جی ہاں اسی طرح جس طرح کسی بڑے کام کی تکمیل میں معمولی سا آلہ بھی کام لے جاتا ہے۔

غ۔ پھر حضرت اقدس کے لئے اپنی زبان گندہ اور دل شرمندہ سے بے حد دعائیں نکلیں جن کا حاصل یہ تھا کہ حق تعالیٰ حضرت والدہ کو قطب الاقطاب بنائے اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کو خصوصاً بیش از بیش توفیق رجوع عطا فرمائے،

س۔ فقیر سب دوستوں کی دعا کا محتاج ہے، لیکن اس آپ کی دعا سے زیادہ اس دعا کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور مجھے اپنا بنائیں،

غ۔ اسی دن کی منسلہ شرب (یعنی شرب یکشنبہ) کو احقر نے جہاز ہی پر ایک خواب دیکھا جس

میں گویا احقر کی تشفی فرمائی گئی کہ حضرت شیخ کا مقام ایسا ہی خاص ہے، ———
 دیکھا کہ ایک مسجد میں بڑا اجتماع ہے اور وہاں شیخ الشیوخ حضرت مولانا تھانویؒ کی تقریر
 ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے یہ آیت شریف تلاوت فرمائی وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ
 اور پھر اس پر مختصر وعظ فرمایا، اس کے بعد جب مجمع جا چکا تو حضرت حکیم الامت کے بیشتر خلفاء
 اور کچھ عوام حضرت کے گرد حلقہ کر کے بیٹھ گئے، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ”اب تو
 مضامین بھی شکل ہی سے ذہن میں آتے ہیں“ پھر متبسم ہو کر فرمانے لگے ”ہم نے اتنا بانٹا
 اتنا بانٹا اور لوگوں نے اتنا لیا کہ ہم خود خالی رہ گئے“ ——— پھر آں مخدوم مدظلہ
 کی طرف رخ کر کے فرمایا ”آئیے حضرت سید صاحب آپ کی روحانیت سے کچھ مددوں“
 خود دو زانو بیٹھ گئے اور آں محترم بھی تعمیل ارشاد میں قریب دو زانو اس طرح بیٹھ گئے کہ
 دونوں بزرگوں کے گھٹنے باہم مس کر رہے تھے (صدریث جبریل والا سمایا دا گیا) ———
 حضرت تھانویؒ مراقب ہوئے اور پھر فرمایا ”ہاں جو مضمون آپ کے پاس ہے وہ بالکل
 میرے مطابق ہے“ دگو ظاہرہ کوئی گفتگو نہیں ہوئی، پھر ارشاد ہوا ”یہ روحانیت ہے سید
 صاحب کی بات ہی اوی ہے“۔

اس کے بعد محفل پر فراست ہونے لگی تو حضرت تھانویؒ اور سارے خلفاء کھڑے
 ہو گئے حضرت تھانویؒ رہنے ... صاحب (ایک خلیفہ) کی طرف اشارہ کر کے فرمایا
 کہ ”علم انہوں نے سیکھا ہے، فتویٰ پوچھنا ہو تو ان سے پوچھو لیکن روحانیت اور چیز ہے
 اس کے لئے حاجی محمد حسن صاحب (امرتسری ثم لاہوری مدظلہ)، حاجی محمد اذخاں صاحب
 (لکھنوی رحمہ اللہ) اور حاجی سید سلیمان صاحب (مراد سیدی رحمہ اللہ) سے پوچھو، دو
 ایک اور نام بھی لئے جو یاد نہ رہے ——— اس کے بعد حضرت حکیم الامت نے سب
 حضرات کو آں مخدوم سے مصافحہ کرنے کا اشارہ فرمایا اور سب نے مصافحہ کیا،
 احقر نے بعد پر فراست محفل فرط محبت و شوق سے آں مخدوم کے دست مبارک

کو خوب چُومنا اور محفوظ ہونا، اس روایہ سے حسب ذیل امور صاف نظر آتے۔

(۱) حضرت والادہؑ کا اور خلفاء میں خصوصی مقام

(۲) حضرت والادہؑ کے علوم باطنی کا ٹھیک ٹھیک حضرت تھانوی قدس سرہ کی آرزو کے مطابق ہونا،

(۳) حضرت والادہؑ کی طرف رجوعات کا زیادہ ہونا اور حضرت تھانوی قدس سرہ کی آرزو کے مطابق ہونا، واللہ تعالیٰ اعلم،

س۔ یہ روایہ بشارت ہے، اس سے زیادہ نہیں، فقیر تو اپنے کو حضرت والادہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے حلقہ میں صنفِ نبیال کے قابل بھی نہیں سمجھتا اور نہ میرے احباب اس سے زیادہ مجھے سمجھیں۔ مجھے اپنے اند کوئی بات بھی معلوم نہیں ہوتی، سرِ پا نقص اور مجموعہ عیوب، (تا آخر حیات حضرت والادہؑ اپنے کو ایسا ہی سمجھا کئے، فرماتے تھے ”بھئی میں تو نقلی خلیفہ ہوں اصل خلفاء تو اوڑھیں“ کہنے کو تو کوئی اور بھی یہی بات کہہ دے گا لیکن حضرت والادہؑ جس حالت میں ڈوب کر یہ بات فرماتے تھے وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھبرا کر اپنی برائت کا اظہار فرما رہے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ اس انکار پر مخاطب یقین کر لے)

غ۔ بحمد اللہ کہ سفر میں کوئی نماز قضا نہیں ہوئی،

س۔ مبارک،

غ۔ حضرت والادہؑ کراچی میں کب تک قیام فرمایا، خدا کرے کہ قلب مبارک وہاں کے قیام پر جم جائے، ہمارے حکیم صاحب (نواب مقصود جنگ) اور سب لوگ اسی کو انفع سمجھتے ہیں، اگے اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہو۔

س۔ اس باب میں ہونا شرح نہیں، حق تعالیٰ جو واقع فرمادیں اویسی پر راضی ہوں، حکیم صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہہ دیجئے،

غ۔ خادم کے لئے بطور خاص صلاح و فلاح دارین کی دعا فرمائیں،

ننگِ غلام غلام محمد

س۔ بدلِ دعا کے خیر کرتا ہوں، والسلام
۳۰ رمضان ۱۳۶۹ھ

مکتوب (۹۰)

(اب کراچی ہی میں پیش کئے ہوئے احوال نامے اور ان کے جوابات آرہے ہیں،)

غ۔ پتھنہ، ۲۳، اگست، ۱۹۵۰ء

حضرت سیدی و مرشدی و مولائی دامت فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک خواب لکھا تھا جو اس جمعرات کی رات دیکھا تھا، اس خواب کا حضرت قدس

اور اس ناکارہ کے درمیان ملازمت ہی مناسب ہے البتہ تعبیر سن لیجئے!

س۔ عزیز و محب و مخلص زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تعبیر ذہن میں ہی آتی ہے کہ شدت تعلق اور شدت تاثیر سے عبارت ہے!

غ۔ حق تعالیٰ کے احکام کا پاس اور اس کے رسول سے محبت اس درجہ میں تو بحمد اللہ پاتا

ہوں بلکہ خود حضرت والا سے بھی اس درجہ کی محبت ہے کہ حضرت کے حکم پر مال اور عزت

وجاہ کی قربانی سے تو انشاء اللہ قطعاً دریغ نہ ہوگا لیکن اگر جہاد لاحق ہو تو اس میں پہلے

درجہ میں اہلیہ کا خیال، پھر خود اپنی جان کا خیال بھی آتا ہے اور غالباً امکان یہ ہے کہ اس

میں تامل اور تاویل سے کام لوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ جان اور اہل و عیال کے اس

تعلق کو کیوں کر مضحل کروں، حضرت والا کوئی تدبیر بتلائیں تو انشاء اللہ عمل کی سعی

کروں گا،

وابتہ دامن احقر غلام محمد

س۔ حاصل یہ ہے کہ جان دینے کا موقع آئے تو اہل و عیال اور محبت جان کا خیال آئے گا تو خیال آنا کوئی بُری چیز نہیں لیکن اگر جہادِ عین کا وقت بالفرض کبھی آئے تو آپ کیا انسانا اللہ تعالیٰ معمولی مومن بھی پیچھے نہ رہے گا، اس وقت سکون کی حالت میں اس پر غور کر رہے ہیں لیکن قیام بالسیف کی ناگزیر حالت میں حالت دوسری ہو جاتی ہے اس وقت کا اس وقت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اور پھر اس حالت پر افسوس آنا خود بھی ایک نعمت ہے!

والسلام

مکتوب (۹۱)

غ۔ حضرت سیدی و مولائی و مطاعی و امت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معمولات پر بحمد اللہ پابند ہوں لیکن ان میں ترقی نہیں ہو سکی ہے، عزیز بڑی و محبتی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ علما و عملاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معمولات میں ترقی یہی ہے کہ اس میں تنزل نہ ہو، کسی کو اگر چھت پر چڑھنا ہو تو چھت پر چڑھنے کے بعد ترقی یہی ہے کہ اس کو بلا ضرورت نیچے نہ اترنا پڑے، یہ غالباً حضرت کے قرب اور حضرت کے ملفوظات سے تمتع کا نتیجہ ہے کہ ایک عرصہ سے کوئی بات (اصلاح حال سے متعلق) قابلِ عرض محسوس نہیں ہوئی،

والسلام ننگِ خدام

احقر غلام محمد

س۔ اس کے متعلق زبانی گفتگو ہو چکی، والسلام (جوار شاد فرمایا تھا اس کا حاصل یہ تھا کہ اس

میں شکایت کی کیا بات ہے،

مکتوب (۹۲)

غ۔ ۲ ستمبر ۱۳۵۷ھ

بخدمت فیض درجت سیدی مرشدی و مولائی دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر اپنے اندر دینی مسابقت کا جذبہ پاتا ہے اور جب یہ چاہتا ہے کہ حضرات اہل اللہ کی نگاہ میں عموماً اور حضرت والا مدظلہ کی نگاہ میں خصوصی مقاماً حاصل ہو جائے اس میں کھٹک یہ ہے کہ حدیث شریف میں تو آتا ہے کہ "اللہم اجعلنی فی عینی صغیراً و فی اعیین الناس کبیراً" اس میں "فی عینی صغیراً" کی شرط ایسی ہے کہ اس میں "مسابقت" پائی نہیں جاتی بلکہ "مسابقت" کے جذبہ کی جڑ ٹکٹ جاتی ہے یعنی بس یہ حسرت ہی حسرت کے درجہ میں رہے، اپنی بڑائی کا علم ہونے ہی نہ پائے، ————— حالانکہ محدث بالغتہ کے طور پر اپنی بہتری کا احساس بھی غالباً درست

ہی ہے حضرت والا حقیقت الامر سے آگاہ فرمائیں، والسلام

احقر غلام محمد

س۔ محبتی و مخلصی زاد کم اللہ تعالیٰ درجہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مسابقت الی الخیر جس میں غیر کی تحقیر اور اپنی بزرگی کا خیال نہ ہو بہتر ہے، —————

و سابقوالی معصرتہ اور فی ذلک فلیتنا فسن الملتنا فسون،

لیکن بجائے اہل اللہ کی نظر اور شیخ کی نظر میں مقام کے حصول کے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ

میں قبول کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ یہ بھی غیر اللہ ہیں، والسلام

سید سلیمان

مکتوب (۹۳)

”قُوْتُ الْقُلُوبِ“

خ۔ اکتوبر، ۱۹۵۵ء

حضرت اقدس سیدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جن اعمال کو اصطلاح شرعیہ میں نیک اعمال کہا جاتا ہے اُن پر جس حد تک پابندی ہو جاتی ہے وہ بھی بس ایک دھکوسلا معلوم ہوتا ہے، احقر کو اپنے اعمال نیک بھی سرب معلوم ہوتے ہیں، کسی کا رخیر میں یہ تشفی نہیں کہ یہ خالصتاً ”توجہ اللہ“ ہے، ہر عمل کی تہ میں نفس و خیل نظر آتا ہے ————— نہ معلوم کب تک میری عمر یوں ہی رائیگاں جائے گی،

س۔ عزیزِ ممتی و مخلص زادِ کم اللہ تعالیٰ معرفتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اگر آپ کو اپنے اعمالِ حسد کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرب ہیں تو ایسا سمجھنا اس بنا پر ہے کہ آپ کو ان میں چمک دمک اور لطف اور تڑپ نہیں محسوس ہوتی جو نتیجہ ہے محبتِ طبعی اور محبتِ عقلی میں فرق نہ کرنے کا، محبتِ طبعی یہی چیز ہے جس کے آثارِ ظاہرہ حیوانات تک میں محسوس ہوتے ہیں لیکن محبتِ عقلی میں کمالِ سادگی ہوتی ہے اور اس کا منشاء صرف طلبِ رضائے دوست اور اس کے حکم کی تعمیل ہے،

اس لئے آپ کے دل میں یہ دوسو نہ آئے کہ یہ کچھ نہیں ہے، ہاں یہ نتیجہ اس طرح ظاہر ہو کہ دوست کی رضا اور قبولِ معلوم نہیں کہ حاصل ہوا یا نہیں تو یہ صحیح ہے اور اس سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہنا چاہیے کہ یہ اثرِ خشیتِ الہی ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ

اس کا دوسرا رخ بھی سامنے رہے اور وہ رجاء کا رخ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے امید یہی رکھنی چاہیے کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ قبول ہی فرمائے جائیں گے، ایمان ان ہی دونوں کیفیتوں کے درمیان ہے جیسا کہ اس حدیث کا منسلک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا، کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا مجھے بھی نہیں لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لیں۔
اس کیفیت کو ہیبت کہتے ہیں۔

حضرت والار نے ایک مرتبہ تحریر فرمایا تھا اور ویسے زبانی بھی ارشاد فرمایا ہے کہ قلب و دماغ (قرآنی اصطلاح میں) دراصل دو شے نہیں بلکہ قلب کا مفہوم دل و دماغ دونوں کو شامل ہے، اس پر ایک اشکال فہم ناقص میں وارد ہوتا ہے جس کی تشریف مقصود ہے _____ طبعی نقطہ نظر سے قلب اور دماغ دو مختلف مرکز جذبہ بات ہیں، جیسے مباشرت ہی کے سلسلہ میں اطباء نے لکھا ہے کہ جو مباشرت نتیجہ ہو ذہنی تحریک کا اس میں گو مادہ کم خارج ہوتا ہے مگر ضعف زیادہ لاحق ہوتا ہے برخلاف اس کے جو مباشرت نتیجہ ہو قلبی تحریک کا اس میں گو مادہ زیادہ خارج ہوتا ہے لیکن اس سے انشراح میسر آتا ہے۔ یہ بات تجربہ بھی محسوس ہوتی ہے، ایسی صورت میں دل و دماغ کے فرق کو کیسے مٹایا جاسکتا ہے اور جو امور عقلاً ادا ہو جائیں ان کو ان امور کی طرح کیوں کر سمجھا جاسکتا ہے جو قلبی جذبہ کے ماتحت ظہور میں آئیں، اول الذکر نہایت درجہ سطحی و ناقص اور ثانی الذکر اصلی و کامل ہوں گے حضرت والار رہبری فرمائیں اور احقر کے قلب کی اصلاح کے لئے دعا فرمائیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پُر درد قلب اطہر سے کوئی ادنیٰ ترین مناسبت تو پیدا ہو جائے، والسلام

ناکارہ احقر غلام محمد

س۔ فہم کا قصور ہے، یہاں ذہنی کے معنی ہوس ذہنی کے اور قلبی کے معنی تقاضائے قوت

منویہ کے ہیں، اس کو دل اور دماغ کی بحث سے تعلق نہیں،
 دل اور دماغ سے مقصود صرف ایک ہی چیز ہے یعنی وہ عضو جس جو ہمارے ارادوں
 کا مرکز ہیں جس کی طرف ان حدیثوں میں اشارہ ہے انما الاعمال بالنیات اور
 الا ان فی الجسد لمغضۃ اذا صاحبت صلح الجسد کلہ الی الا وہی القلب
 کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شمائل میں اس عامیانہ تصوف کے جذبات
 کہیں نظر آتے ہیں؟ قلب میں خشیت الہی اور محبت الہی کے دو گونہ جذبات کا ظہور ہو
 اور جوارج سے ہمیشہ احکام الہی کی تعمیل اوس کی رضا کی خاطر ہو، اس کے لئے دل سے دُعا کرتا
 ہوں، والسلام،

(کراچی کے دوران قیام جو ریاضے پیش کئے گئے ان کے جواب کے ختم پر حضرت والدہ نے کبھی
 دستخط ثبت فرمائے ہیں اور کبھی نہیں بھی!)

مکتوب (۹۴)

غ۔ ۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء

یتدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتکم و فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معمولات پر کچھ اشارہ پا بند ہوں، اس سلسلہ میں کوئی بات قابلِ عرض نہیں، البتہ استقامت
 و ازدیاد عمل کی دعا کا خواہاں ہوں۔

حبیبِ خلص و وزیرِ خالص زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

س۔

اللہ تعالیٰ استقامت و ازدیاد حسنِ عمل عنایت فرمائیں، اس کے بعد حضرت والدہ کی
 ترتیبِ سوانح کا معروضہ اور اس کا جواب ہے جو دیباچہ تحدیثِ نعمت میں نقل ہو چکا،

اس لئے مکرر اس کی نقل غیر ضروری ہے)

غ۔ کچھ عرصہ سے کم راتیں ایسی گذرتی ہیں کہ عالم رویا میں حضرت والا کی دیر پر تک زیارت اور ملفوظات و نصائح سے استفادہ کی سعادت حاصل نہیں رہتی، اس سے یہ تو بہ طور لازماً ہوتا ہے کہ حضرت اقدس کو اپنے خدام سے کس قدر تعلق خاطر ہے، (یہ حالت مہینوں قائم رہی اور اس طرح کہ رات میں اگر کئی بار آنکھ کھلتی اور پھر لگتی تو پھر بھی حضرت والا کی زیارت و صحبت سے فیض یابی رہتی)

س۔ یہ سب آپ کی محبت کے کرشمے ہیں،

غ۔ یہ بھی حضرت والا کی غلامی کا صدقہ ہے کہ اس ناکارہ کو دیکھ دیکھ کر گھر کے لوگوں میں دین کی طرف غلطی اقدام کی ترغیب بڑھ رہی ہے، الحمد للہ کہ بلا کہے والدہ ماجدہ نماز تہجد کی پابند ہو گئیں، احقر کے چھوٹے بھائی میں بھی تقریباً سال بھر سے جو دینی تغیر پیدا ہے اس کی بھی احقر کو اُمید نہ تھی، یہ سب حضرت اقدس کا فیض ہے، حضرت سے درخواست ہے درخواست ہے کہ ہم سب کے لئے استقامت دین کی جُمافرائیں۔

ننگ خدام احقر غلام مخد

س۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی زندگی کو آپ کے اہل بیت کے لئے اور زیادہ موجب برکت بنائے، واجعلنا للمتقین اماماً۔
دل سے دعا کرتا ہوں، والسلام،

مکتوب (۹۵)

غ۔ ۵ جنوری ۱۹۵۱ء

مخدومی و سیدی و مطاعی ادام اللہ ظلمکم و اذیالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ————— ایک عرصہ سے اپنے حال بد حال میں

کوئی تفریق نہیں، البتہ کام میں لگا ہوا ہوں،

س۔ محبتِ صمیم و صدیق تو یک ادا اللہ تو قیقکم لما یحب و یرضی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ حال میں تفریق ہونا بھی نعمت ہے کہ بحمد اللہ زیادتی نہیں ہوتی تو کمی بھی نہیں ہوتی، جب انسان اپنی استعداد کے مطابق ایک مناسب قدر قیامت تک پہنچ جاتا ہے تو محسوس کمال یعنی قیامت میں زیادتی موقوف ہو جاتی ہے مگر غیر محسوس کمال معنوی قائم رہتا ہے گو احساس نہ ہو،

غ۔ البتہ صرف ایک بات ہے کہ حضرت اقدس کی محبت کو اپنے دل میں روز افزوں پاتا ہوں اور اسی کا سہارا لے کر بیٹھا ہوں، یہ دعا بہت دل لگا کر کرتا ہوں کہ توفیقِ مسلمانہ والحقنی بالصالحین اور اس وقت حضرت والدہ کی کا تصور خصوصی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ یہ حال فریقین کے لئے مبارک کریں،

غ۔ پرموس حضرت والدہ کی محفل میں حاضر تھا کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے اور میں محوِ نظارۂ جمال تھا کہ خود بخود ذہن میں چند اشعار آئے، پھر جب گھر آیا تو خود پر نظر گئی تو اور کچھ اشعار ہو گئے، اس طرح ایک نظم گویا اقبال مرحوم کے اس مصرعہ کا مصداق بن گئی،

چشم بروئے او کشا باز بہ خویشتن نگر!

چونکہ یہ محض آمد تھی اور شاہی مقصود نہیں، اس لئے جی چاہا کہ اس کو اپنے مخدوم و مطاع کی خدمت میں پیش کروں، اس لئے پیش ہے، گستاخی معاف فرمائی جائے۔

توجہ سے خالی نہیں ان کی باتیں	یہ باتیں نہیں، ہیں یہ الفت کی گھاتی
سکوت ان کا لیساکہ تقریرِ قرباں	یہ ہیں قلبِ گویا کی خاموش باتیں
نہیں ان کا دستور یونہی کہیں کچھ	ہیں سب دار و اہل جو ہیں ان کی باتیں
نہ تقریر کوئی اثر کر سکے پھر	جو جس نے کوئی اس مخدوم کی باتیں
زبانِ قلم سے، زبانِ عمل سے	بیاں ہو رہی ہیں محسوس کی باتیں

نئے اور پُرانے شغلیاب میں سب ہیں تریاق و اکیر سب اُن کی باتیں
 جلالِ کلیں ، جمالِ مسیحی حج ہو گئیں اُن میں کیا کیا نہ باتیں
 مجھے ہم نشینو! نہیں خوف پریش کہ لوگ کہاں ہیں کچھ اب انکی باتیں
 یہ اُن کے کرم کی ہے معجزہ نمائی دگر نہ کہاں میں، کہاں ایسی باتیں
 میں سو کر بھی دیدار سے ہوں شرف گذرتی ہیں صد شکر اب ایسی باتیں
 مجھے داغ اپنے نظر آ رہے ہیں منور سراپا ہیں سب ان کی باتیں
 بہت پرہیز تھا، مگر اُن کے صدقے اب اس نفس نے کھائی ہیں کتنی باتیں
 عجب کیا جو ہیں محو سب مُننے والے کہاں ہے مری اور میں اُن کی باتیں

عطا ہو مجھے کچھ تو جذبِ دروں سے

رہیں گی یہ کب تک یونہی باتیں

تنگ بارگاہِ احقر غلام محمد

س۔ یہ محبت کا کثر ہے کہ ملی را پچشمِ محبوں می بینند،
 اس نظم کا ہر شعر اچھا ہے اور صاف ہے مگر فنی اعتبار سے بلا قافیہ ہے۔ ”باتیں“ یا قافیہ
 ہے یا ردیف، بظاہر قافیہ معلوم ہوتا ہے، پھر ایک ہی قافیہ کا بار بار لانا عیب ہے،
 والسلام

مکتوب (۹۶) ”البشری“

لاس مزید کے پیش کرنے کے دوسرے روز خدمتِ شیخ میں حاضری ہوئی، جب خادم کے
 آمد کی اطلاع پہنچی تو حضرت اقدس دیوان خانہ میں برآمد ہوئے، سفید کپڑوں پر صندلی
 رنگ کی شمالِ ذیبت بن کئے ہوئے، ہاتھ میں احقر کا احوال نامہ، آنکھیں چارہ ہوستے ہی

چہرہ انور پر تبسم کی ہر دو دہائیوں اور اللہ کا لفظ زبان فیض سے اس قدر چڑھا اثر ہو کر نکلا کہ
سننے والے کے دل میں اتر گیا، ایک کیفیت انبساط طاری ہو گئی۔
اس لطف خاص سے جوابی مکتوب میرے حوالے فرمایا گیا، اللہ تعالیٰ حضرت شیخ
کی اس مسرت کو میرے لئے وجہ سعادت و کامرانی بنائے،

خ۔ کراچی، چہار شنبہ

۷ فروری ۱۹۵۱ء

بخدمت فیض درجہت والا مرتبت سیدی و مولائی دامت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف پایا۔ دیکھا کہ حضور پُر نور
صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب گاہ پر بغرض زیارت حاضر ہوں، جیسے ہی دروازہ کے قریب پہنچا
تو درود شریف پڑھنا شروع کیا تو درہی سے قبر اطہر پر نظر پڑی، دیکھا کہ اوپر سے کھلی ہے اور
حضور اکرم آدم فرما ہیں، درود شریف پڑھتا ہوا دوسرے دروازہ میں داخل ہوا جو قبر اطہر
سے متصل واقع تھا، یہاں پہنچتے ہی سردارِ دو عالم نے آنکھیں کھول کر احقر کو لطفِ نظر
بخشا اور فرقِ مبارک کو بلند فرما کر قریب تر آنے کا اشارہ فرمایا، احقر بڑھ کر فودِ اُسینہ
مبارک سے لپٹ گیا اور دہن مبارک کو دیر تک چومتا رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
اسی طرح لپٹائے رکھا، پھر نہایت شفقت و محبت اور قدرے برقت کے ساتھ کچھ
نصیحت فرمائی، الفاظ یاد نہ رہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ استقامتِ عمل کی تاکید
فرمائی، اس کے بعد احقر رخصت ہو گیا،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک اور جسم اطہر حضرت والدہ مدظلہ کی طرح
چہرہ انور پر گوشت اور سرخ و سفید، ریش مبارک حضرت مدظلہ ہی کی طرح ترش ہوئی مگر
اتنی گھنی نہ تھی، آنکھیں بڑی بڑی پُر نور اور پُر شفقت تھیں، صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا۔

خواب ہی میں احقر نے یہ بھی دیکھا کہ یادداشت کے لئے اس رویہ کو نقل کر رہا ہے کہ ایسے میں آنکھ کھل گئی، ۳ بجے رات کا وقت تھا، نماز تہجد و معمولات سے فارغ ہو کر (۱۰) مرتبہ درود ابراہیمی پڑھا اور استقامتِ دین اور حسنِ خاتمہ کی دعا کی (اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، حضرت والدہ سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے!)

س۔ محبتِ مخلص و صدیق عزیز زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا اور ہر نعمت کی قدر واجب ہے تاکہ مزید عطا ہو اور کوئی مرتکبِ عدمِ شکر ہو تو نہ صرف سلبِ نعمت کا خوف ہے بلکہ ابتلا کا بھی، اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ معمولات میں درود شریف کی ایک تعداد بھی داخل کریں جس کو بہرسانی پورا کر سکیں اگر ہر روز نہ ہو سکے تو جمعہ کو تو ضرور اہتمام کیجئے، خواہ معمولات میں کمی ہو جائے۔

دوسرا اہتمام یہ ہے کہ اب اس سینہ کو بُرائیوں سے پاک اور اس منہ کو ہر خلافِ شرع قول (غیبت و کذب وغیرہ) سے محفوظ رکھئے۔

صلی اللہ درود شریف کی ایک معین مقدار روزانہ کے معمولات میں اور ایک نانہ معین مقدار جمعہ کے معمولات میں داخل ہے، دوام کے لئے بندہ عاجز ہو رہی خواہ سے دعا کا ملتی ہے حضرت والدہ سے درود شریف کا صیغہ دریافت کیا تو دو صیغوں میں سے ایک کے انتخاب کے لئے ارشاد ہوا چنانچہ احقر نے وہ درود شریف اپنے لئے پسند کیا جو بقول حضرت اقدسؒ کے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کشف حاصل کردہ ہی یعنی حضرت شاہ صاحبؒ نے بین النور والیقظہ دیکھا کہ حضور اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں اور یہ درود شریف تلاوت کر رہے ہیں:-

”اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ نَبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلَى اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ“

یہ اپنے ضعفِ ہمت کے پیش نظر اس ضمن میں بھی ہر دینی بھائی سے صدقِ دل کے ساتھ دعا کا ملتی ہوں۔

غ۔ اس رویہ کا اثر مسرت کا و فورہ ہوا بلکہ اعمال کی ذمہ داری کے احساس نے حیرت کے درجہ تک فکر منہ بنادیا کہ کیونکر حضورؐ کے نقش قدم پر استقامت سے چلا جائے،

س۔ یہ بڑا احساس ہے اور یہ بھی نعمت ہے جس کا شکر واجب ہے،

غ۔ جی یہ چاہ رہا تھا کہ اب آنکھ، کان اور زبان کو بند کر لوں تاکہ یعنی، سماعی اور لسانی گناہ سرزد نہ ہونے پائیں،

س۔ جی چاہنا تو تمنا کے معنوں میں ہے، یہ معتبر و مفید نہیں، بلکہ ضرورت بہت کی ہے،

غ۔ اپنی کوتاہی کی وجہ سے حیرانی ہے کہ کس طرح خود کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بنائے رکھوں؟

س۔ علاج صرف دعا اور بہت ہے، بہت بہتی تو دین و دنیا میں کہیں کا درآمد نہیں،

غ۔ اس رویہ سے قبل، غالباً دو تین ہفتے ہوئے ہوں گے، جمعہ کا دن تھا، راستہ چلتے ہوئے درود شریف پڑھ رہا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور ہی سے ایک خاص حظ و سرور محسوس ہوا اور فوراً ذہن میں ایک شعر موزوں ہو گیا ہے

نخایش کہ کردہ دل و جان معطر چہ گری ز لطف وصال محمد

س۔ یہ احوال میں سے ہے، محمود ہے،

غ۔ اس کے ساتھ ہی حضرت والدہ مدظلہ کا خیال آیا کہ جو کچھ حاصل ہے وہ سب اسی ہستی

کے طفیل اور واسطہ سے ہے، اس پر دل سے دعا نکلی اور شعر میں موزوں ہو گئی ہے

فردوں بادیا رب کرم بر سلیمان کہ گفت است باماز حال محمد

پھر ایک شعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اور بن گیا (یہ سب شکل

سے ۴، ۵ منٹ میں ہوا) ہے

ہم نکتہ دان عروج اندامنا نزل است اصل کمال محمد

اس عرض کی جزئیات اب تک نہ ہوئی تھی، مگر اس وقت اظہار جذبات اطلاقاً ہو سکا،

س۔ یہ آثارِ محبت میں سے ہے اللہم اِنِّیْ اَسْأَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُحِبُّکَ میری نسبت اسی حد تک ہے جس حد تک ایک متوسط کو ایک دوست کا خطا دوسرے دوست تک پہنچانے کی ہے، ——— اکیا وجداً فرین جواب ہے اوکس قدر معرفت کو لبریز! غ۔ حضرت والا! مجھ ناگاہ کے لئے اتباعِ سنت پر استقامت کی دعا فرمائیں۔ فقط ننگِ غلام۔ احقر غلام محمد

س۔ میری دعا ہے کہ اتباعِ سنت کی مزید توفیق ہو۔ والسلام

مکتوب (۹۷)

غ۔ کراچی، ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ

شمس الہدایت والدین سیدی وسیدہ المسلمین وامت فیوضہم وبرکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس رمضان المبارک میں احقر کا یہ حال ہے کہ اپنی ہمت و عزیمت بالکل مسلوب محسوس ہوتی ہے اور صاف یہی محسوس ہوتا ہے کہ محض توفیقِ الہی سے جو کچھ طاعت ہو جاتی ہے ہو جاتی ہے، ہر نماز پر شکر ادا کرتا ہوں، تلاوتِ قرآن پاک و مناجات مقبول اور تکمیل معمولات پر ہر مزاد شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے پورا کر دیا ورنہ اپنی ہمت کی بناء پر تو ممکن ہی نہ تھا، اپنی ہمت کے بھروسے پر یہ تک یقین نہیں رہتا کہ نماز باجماعت ادا کر لوں گا لیکن جب ادا ہو جاتی ہے تو طبیعت میں خوشی محسوس ہوتی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مسجد تک لے گئے اور واپس لے آئے، سب انہی کا کرم ہے، یہ کیفیت مسلسل قائم ہے اور یہ ساختہ یہ شعورِ ہن میں آتا ہے اور اس کی حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ یہ کارِ لطفِ تست مشکِ انشانی اما عاشقان

مصلحت را تہمتے برا ہوئے چیں بستہ اند

اپنی اس حالت سے متعلق یقین نہ تھا کہ محمود ہے یا غیر محمود کیونکہ کبھی لگان یہ بھی ہوتا تھا کہ شاید طبیعت کے اضمحال کا اثر ہو لیکن رات حضرت والا مدنیوہ نے جامع مسجد میں حواریہ شاد فرمایا اس سے بات سمجھ میں آگئی اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، حضرت اقدس سے بھی دُعا کے خیر کا طالب ہوں،

س۔ اخلص عزیزاں واحبت دوستان زادکم اللہ تعالیٰ عرفانا
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ حال مبارک ہے، اودیہ اس شہر کی انتہا ہے، بحمد اللہ کہ یہاں تک رسائی میسر آئی،
بارک اللہ فیکم،

غ۔ حضرت والا در مرتبت کی زبان فیض اثر سے ایک رات بعد نماز تراویح جب یہ مصرع
ادا ہوا، عا عالم بخروش لا الہ الا ہوا است

تو یہ کیفیت طاری ہو گئی کہ سارا عالم اورو کچھ اس میں ہے سب مجازات و اضافات
پس جن کی نہ کوئی حقیقت ذاتی ہے نہ ان میں کوئی قیام و بقا ہے، کل شے
ہالکت الا وجہہ حضرت والا سے تصحیح فہم کا طالب ہوں،
س۔ یہ کیفیت بھی مبارک ہے،

غ۔ کل بعد نماز عصر احقر کے والد ماجد مدظلہ، محلہ کی مسجد میں معتکف ہو گئے، آج عصر کے
بعد ملاقات ہوئی تو گریہ طاری تھا، فرماتے تھے کہ کل جیسے ہی مسجد میں آ بیٹھا، عجیب
حالت طاری ہو گئی اور ایک شعر جو برسوں پہلے کبھی یاد تھا زبان پر جاری ہو گیا۔
بردر آمد بندہ بگرینختہ ابروئے خود بہ عصیاں ریختہ

لے بین سیرالی اللہ! چنانچہ خواجہ محمد معصوم قدس سرہ کا ارشاد ہے:۔ "پرسیدہ بود نہ کہ مطلوب را نہایت نیست پس
میبارکہ طلب طالب را ہم انتہا باشد پس ہستی گفتن بچہ معنی باشد، بدانند کہ ہستی کہے مت کہ بہا ابتدا مطلوب برسود
سیرالی اللہ واقع نمودہ داخل سیرتی اللہ گرد و بعد از ان در انتہائے مراتب مت باعتبار کمالات محبوب بعضہا فوق
بعض!" (مکتوب، ۱۳۸، دفتر سوم، مکتوبات خواجہ محمد معصوم)

احقر کو حضرت اقدس کے فیضِ محبت کے صدقہ میں جو تھوڑی سی فہم حاصل ہے، اُس کی بنا پر احقر نے اس کیفیت پر مبارک بادیش کی کہ یہ کیفیت نمود ہے اور موقع کے عین مناسب ہے اور گو یہ مقصود نہیں مگر جب یہ کیفیت طاری ہے اس کی رعایت بھی ملحوظ رہنی چاہیے کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور بقول ہمارے حضرت والاؒ مد فیوضہ کے یہ کیفیات اللہ میاں کے مہمان ہیں جن کی میزبانی کا حق بھی ادا کرنا ضروری ہے۔

تصور میں کیا کیا عنایت ہر اون کی میرے گھر میں آئے ہیں مہمان ہو کر
(حضرت سیدی)

اس بارے میں حضرت والاؒ کا جوارشاد ہو، والد صاحب تک پہنچا دوں گا۔
ننگِ خدام احقر غلام محمد

س۔ آپ کے والد صاحب کی یہ حالت بھی نمود ہے، جو کچھ آپ اون سے کہہ چکے وہ صحیح ہے، اب اس سے زیادہ اس باب میں اون سے کچھ نہ کہیے تاکہ اس حالت کی رفعت پر شکر کے بجائے عجب نہ پیدا ہو کہ سب ضائع ہو جائے۔ والسلام۔

مکتوب (۹۸)

غ۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ

حضرت سیدی و مولائی و مطاعی دامت فیوضہم و برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذشتہ ڈیڑھ مہینے میں بعض مرتبہ یکایک یہ حالت ہو جاتی ہے کہ خود متحیر ہو جاتا ہوں کہ اللہ میاں کو آخر کیسے پاؤں؟ کہاں پاؤں؟ میں ایک بندہ گندہ اس کی بارگاہِ اقدس

س۔ جب تک عصیاں سرزد نہ ہو، رک جانے کے کوئی معنی نہیں، ہر روز کا عمل انشاء اللہ تعالیٰ زیارت ہی کا باعث ہوگا،

غ۔ دیسے تو عمر می و معطلی ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ بھی ہمیشہ ہی حضرت والدہ کی مدح فرماتے رہتے ہیں اور احقر کو مختلف پیرایوں سے سمجھاتے رہتے ہیں کہ حضرت اقدس مدظلہ کی قدر پہچانے اور بیش ادبیش استفادہ کی کوشش کرے مگر پیوستہ انوار کو جب حضرت والدہ حیدر آباد سندھ تشریف لے گئے تھے تو حضرت مولانا نمود النبی صاحب مدظلہ سربخاندہ پر تشریف لائے اور نہایت مؤثر انداز میں فرمایا کہ:

” غلام محمد صاحب! بجلی کی روشنی لے کر ڈھونڈو گے تو پھر ایسی ہستی (حضرت والدہ) کا نام نامی لیا تھا (نہیں ملے گی) شکوک یا فنی کے جواب دینے والے بہت ہیں مگر ایسا عقیق کوئی نہیں، بہت نفیست جانو اور خود پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل سمجھو کہ ایسی ہستی سے تعلق حاصل ہے، کراچی میں لوگوں نے مولانا کی قدر نہیں پہچانی اور کیا پہچانیں گے، مگر تم بہ پابندی خدمت میں حاضر رہو اور وقت کو نیت سمجھو، حضرت والدہ رحمۃ اللہ علیہ (حکیم الامت مولانا تھانویؒ) کے بعد اب یہی سب کچھ ہیں“

اس نصیحت کا بے حد اثر ہوا، حق تعالیٰ کا دل سے شکر ادا کیا اور یہ بھی دُعا کی کہ حق تعالیٰ اس ناکارہ کو توفیق استفادہ بخشیں اور وہ ظرف عطا فرمائیں جو حضرت والدہ کے فیوض کا تحمل ہو، حضرت والدہ سے بھی دُعا کی (درخواست ہے،

غاک پائے سلیمانی

احقر غلام محمد

س۔ بزرگوں کے یہ مشفقانہ فقرے اذن کی محبت کے مظاہر ہیں ورنہ من آنم کہ من دامن، اپنے سے آپ ان بزرگوں کی بشارت اور ان حوصلہ افزا فقروں سے شرم آتی ہے، بحمد اللہ طرفین میں محبت ہے اور اُسی سے اُمید کامیابی ہے،

ایسند محبتِ احقر کے لئے ساری امانت سے زیادہ موقر اور انشاء اللہ سب کو بہتر زادِ آخرت ہی
دل سے دُعا کرتا ہوں۔ والسلام

الفقیر الی اللہ تعالیٰ، سلیمان

۹ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ

مکتوب (۹۹)

غ۔ کراچی

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء

بخدمت فیضِ درجیت حضرت سیدی و مولائی دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معمولات پر بحمد اللہ پابند ہوں، مزید استقامت کے لئے دعا کا طالب ہوں،

س۔ حبیبِ مخلص آنا کہ تقواکم و دفعِ احوائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مبارک ہو، استقامتِ فوقِ کرامت ہے اور اللہ تعالیٰ مزید عنایت فرمائیں،

غ۔ کیفیت و احوال سے متعلق بر بنائے تجربہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس وقت جو بھی طاری

رہے، اس کو میں مقتضائے حکمت سمجھا جائے اور اپنی طرف سے تبدیلیِ حال کی کوشش

بھی مُنہ پر ہے، بجز اس صورت کے کہ یہ انقلابِ حال اپنی کسی کوتاہی یا گناہ کی وجہ سے ہو،

_____ اصلاحِ خیال کے لئے حضرت واللہ کی خدمت میں عرض کیا ہے،

س۔ صحیح ہے، اور اللہ تعالیٰ مزید فہم دین عنایت فرمائیں،

غ۔ مات نماز فجر سے کچھ پہلے احقر نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑے کمرہ میں کچھ لوگ شربت

پی رہے ہیں اور اسی سے متصل ایک پھرنے کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حضرت واللہ فیوض

اپنے دست مبارک سے برفِ تودر ہے پس کہ اس کو شربت کے گلاسوں میں ڈال کر
 باہر بھجوائیں، احقر نے ہاتھ بٹانے کی خواہش ظاہر کی تو مگرہ کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ فرمایا
 جہاں چائے کی پیالیاں رکھی تھیں، احقر نے پیالیاں اٹھائیں اور قریب ہی ایک سماور میں
 گرم چائے تیار تھی اس میں سے پیالیاں بھر کر نوگوں کو پلانے لگا، احقر نے پہلے اس کو
 چکھا پھر دوسروں کو پلانا شروع کیا، چائے بہت عمدہ مگر تیز و تلخ تھی! ان پینے والوں میں
 احقر کے دو احباب بھی تھے جن میں سے ایک نے تو پی لی اور دوسرے نے کوئی بے جا حرکت
 کی تو حضرت والا نے ڈانٹ کر ان کو کمرہ سے نکال دیا اور وہ محروم رہے،

آٹھ گھنٹے پر طبیعت میں انشراح تھا اور خیال یہ آیا کہ حضرت مدفونہ کے ہاں
 دونوں ہی شرا میں ملتی ہیں "کان من اجہر کافوراً اور کان من اجہر زنجبیللاً"
 خواب کی حیثیت، جیسا کہ آپ جانتے ہیں بشارت ہے،

حضرت والا اکثر یہ پڑھا کرتے تھے جیسا کہ ملفوظات و مواظبات میں ہے،

کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

یہ مصرع آپ کے دونوں سوالوں کا جواب ہے، والحمد للہ تعالیٰ،

غ۔ عجیب تر بات یہ ہوئی کہ احقر جب نماز فجر کے لئے مسجد پہنچا تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور

اما صاحب کی زبان سے پہلی آیت جو کان میں پڑی وہ یہی تھی کہ "ان الابرار

یشربون من کاس کان من اجہا کافورا"

س۔ نعم الاتفاق۔

لہ حضرت سیدی رحمہ اللہ کا ذاتی لون نقشبندی ہی تھا، جوش و خروش کی بجائے سکون و وقار ہی کو ہمیشہ

پسند فرماتے ہیں،

لہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا تھانویؒ کا دعویٰ "المروق والحق للمروق والحق" ملاحظہ ہو، نہایت مؤثر

بھی ہے اور اوانِ چشتیہ و نقشبندیہ کی حقیقت بھی اس میں خوب سمجھائی گئی ہے،

غ۔ حضرت اقدس اس بے مثل کے لئے توفیق نیک اور استقامتِ دین کی دُعا فرمائیں،

وابستہ دامن

احقر غلام محمد

س۔ دل سے برگاہِ قاضی الحاجات دُعا ہے،

الفقیر الی اللہ تعالیٰ

سید سلیمان، ۲۸ محرم ۱۳۷۱ھ

مکتوب (۱۰۰)

(حضرت اقدس رحمہ اللہ لائیکیشن کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لے گئے تھے، تبدیلی آب و ہوا کے خیال سے دو تین ہفتہ قیام میں توسیع فرمادی تھی، اب جو بیفہ پیش کیا جا رہا ہے وہ لاہور ہی کے پتہ پر لکھا گیا تھا،)

غ۔ کراچی

۸ مارچ ۱۹۵۱ء

بخدمت فیضِ رحمت مخدومی، مطاعی و مولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مزاج اقدس!

اس ناکارہ کا عجیب حال ہے، رہ رہ کر داعیاتِ معصیت اُبھر آتے ہیں اور ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ ————— یہی نہیں بلکہ ایمانیات میں تک خدشات لاحق ہوتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً یہ بھی بس ادا ہاں ہی بس اپنے ہی دہن کے

لے سالک کی نظر اس نعمت سے چُپک جاتی ہے کہ شدتِ تعاضب کے ساتھ قوتِ عمل بھی کتنی بڑھ رہی ہے ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ تعاضب سے مطلوب ہو جاتا مگر ایسا نہیں ہوتا، اس لئے حضرت سیدیؒ نے فرمایا کہ یہ داعیاتِ عسوس و تمنیل ہوتے ہیں!! ففہم۔

پیدا کردہ ہیں۔ البتہ کبھی کبھی یقین کی یہ کیفیت حاصل ہے کہ گویا اب اس میں کوئی شبہ پیدا نہ ہوگا، حضرت والا! جیسی بلکال ہستی کی خدمت میں اتنے عرصہ تک رہنے کے باوجود اپنا یہ حال دیکھ کر اپنی نالائقی کا یقین ہوتا ہے اور مستقبل سے مایوسی پیدا ہوتی ہے،

حضرت! کسی صورت اس کشاکش سے نکال کر حاصل یقین تک پہنچا دیجے حتیٰ راسخ ہو جائے اور حقانیت کے آثار پیدا ہو جائیں، یہ کام حضرت والا ہی کے ہاتھوں ہو جائے تو ہو جائے ورنہ پھر یہ ظاہر کوئی اُمید نہیں ہے

الایا ایہا الساقی ادرکاساً وناولہا کہ عشق آسان خود اول لئے افتاد مشکہا

س۔ معنی وصدقی اذا قرہ اللہ تعالیٰ عرفانہ وانا لرہبانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے،

داعیات معصیت کا بھرنے کا نہیں، انسان سے معصیت کی قوت مسلوب نہیں ہوتی، اگر مسلوب ہو جائے تو مجاہدہ کہاں رہے جس کا حاصل مخالفت ہوئے نفس ہے، البتہ قوت مضاعف ہو جاتی ہے اور یہی اضلال غایت طریق ہے،

ان داعیات کے ابھرنے سے غم ہونا سالک کو اوس کے مومن ہونے کی دلیل ہے،

اگر خدا خواستہ ان سے انشراح ہو تو بے شبہ وہ کفر کی نشانی ہے، اس لئے آپ کو جو داعیات

و تمیہات مسوس و تمیل ہوتے ہیں وہ وسوسہ شیطانی ہیں، جب ایسا وسوسہ پیدا ہو

وسوسہ کی طرف سے ترک انتفات اوامراض کر کے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائیے، جو

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کا حاصل ہے اور یہ دعا پڑھیے،

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ، یا حدیث کی یہ دعا پڑھیے،

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ،

مغیبات کا ایمان مطلوب ہے، باقی طمانیت تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال ”کَيْفَ نَحْيِ الْمَوْتَى“ خلاف ایمان نہیں، اس لئے جب سوال ہوا، اَدَّكُمُ تَوْمِنَ“ تو جواب میں فرمایا ”بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لَّيَطْمَئِنُّ قَلْبِي“ یہ طمانیت معائنہ ہر ایک کو کہاں میسر ہے اِلَّا مَنْ رَجَعَدَرْتِي“

غ۔ حضرت والار کے ہاں ہر طرح خیریت ہے، میری اہلیہ مع نومولودہ کے مع الخیر ہے، صحت مزید کے لئے دعا کی درخواست ہے،

س۔ یہاں بھی خیریت ہے، آپ کے یہاں کی خیریت کے لئے دل لگا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ خیریت سے رکھے، (کیا شفقت و کرم ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ)

غ۔ معلوم ہوا تھا کہ واپسی میں کافی دن لگیں گے اس لئے بلا انتظار اپنا حال زاری پیش کر دیا، والسلام، منگب غلام، احقر غلام محمد

س۔ میں ۱۳/۱۴ تک یہاں ہوں، ۱۵/۱۶ کو لاٹل پور، ۱۸/۱۹ کو راولپنڈی پھر ۲۲/۲۳ کو لاہور میں مکیش ہے، یہاں سے ۲۲ کی شب کو روانگی کا قصد ہے، والسلام
الفقیر الی اللہ تعالیٰ، سلیمان

مکتوب (۱۰۱)

اب جو ریضا اور اس کا جوابی مکتوب درج کیا جا رہا ہے اس پر مراسلت ختم ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دس سالہ نیاز مندی کو یہ آخری سجدت و اعظم ادا تعلق مستحکم کی مل گئی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا حضرت والار کو کشفایہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس تحریر کے بعد اب انہما کرم کا موقع نہ ملے گا اس لئے ”اَن وِعدۃ پیشینش تار و زبیں باشند“ والا یقین عطا فرمادیا، یہ اُن کے لطف و کرم کی انتہا اور اس حقیر کے لئے توشہ آخرت ہے، مکاتیب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ایک بات یہ بھی صاف نظر آئے گی کہ احقر

عرض نیاز میں ہمیشہ چُست رہا حتیٰ کہ بعض مرتبہ ایک ہی مہینہ میں کئی کئی عریضے پیش کر دیئے مگر اب جو مکتوب درج کیا جا رہا ہے وہ تقریباً ایک سال چار ماہ کے بعد لکھا گیا ہے، اس طویل مدت میں کوئی عریضہ پیش نہیں کیا گیا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت والاؒ کے فیضِ صحبت کا اثر یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ گودہن میں اشکالات کبھی کبھی آ ہی جاتے تھے مگر جہاں ان خدشات کو نہ مدتِ اقدس میں پیش کرنے کی نیت سے قلم اٹھایا کہ ان کے نہایت تشفی بخش جوابات خود بخود دہن میں آجاتے تھے اور وہ اشکالات کا فوراً ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ اس در سے کہیں حضرت والاؒ کو (حوالہ نہ پیش کرنے کی وجہ سے) تغافل کا گمان نہ ہو میں نے یہی حال زبانی عرض کر دیا اور معافی کی درخواست بھی پیش کی تو ارشاد فرمایا کہ ”بھئی یہ تو خوشی اور شکر کی بات ہے یا شکایت و معافی کی، اللہ تبارک و تعالیٰ کا اس پر شکر ادا کیجئے، آخر سلسلہٴ مرسلت کب تک!“

فالحمد للہ علی ذلک

مندرجہ ذیل عریضہ کی پیش کشی کا باعث یہ ہوا کہ احقر اپنے اعزاز سے ملنے کی خواہش سے جولائی ۱۳۹۷ء میں حیدرآباد دکن گیا اور حضرت والاؒ سے ایک مہینہ کی رخصت چاہی تھی مگر بعض وجہ سے قیام ایک مہینہ او طویل ہو گیا، بعض خانگی الجھنوں اور مجبوریات سفر کی وجہ سے کچھ معمولات کی بے رٹلی اور کچھ اپنے تساہل کی وجہ سے قلبی کیفیات میں کمی محسوس ہونے لگی اور ساتھ ہی یہ احساس بھی بڑھا کہ شاید حضرت والاؒ کی توجہ احقر کے حال پر کچھ کم ہو چکی ہے، حالانکہ جب کراچی واپس پہنچا تو اس دم باطل پرانی شرمندگی اور حضرت شیخؒ کی طرف اس سوتے نظن سے ایسی ندامت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے، حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے احباب نے سنایا کہ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ حضرت والاؒ آپکا تذکرہ نہ فرماتے تھے، اور واپس کا انتظار تو اس درجہ تھا کہ ایک روز احقر کے چھوٹے بھائی سے ارشاد فرمایا کہ ”ایک مہینہ کے لئے کہہ کر گئے تھے، اب تو دو مہینہ ہونے کو آئے آخر آپ کے

بھائی صاحب کب آئیں گے؟ — غرض حقیقت تو یہ تھی لیکن اپنے عیار نفس نے
ظنِ باطل یہ پیدا کر دیا تھا کہ توجہاتِ شرع شاید کم ہو گئی ہیں میں نے حسبِ عادت جو کھٹک
پیدا ہو گئی تھی من و عن حضرتؒ کی خدمت میں پیش کر دی،
عریضہ یہ ہے۔

”خاتم المکاتیب“

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۴ اگست ۱۹۵۳ء

بخدمت فیضندرجت حضرت سیدی و مطاعی دامت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج والاروح الخیر ہوگا،

احقر بخیریت ہے، مگر سکونِ قلبی سے محروم، اس مرتبہ یہ عجیب بات ہے کہ ہمیشہ ایک
بے اطمینانی سی دلی پرطاوی رہتی ہے،

ہمیشہ کے برخلاف اس مرتبہ اس بات پر بھی حیرت ہے اور رنج بھی کہ دستِ شیخ
اذغائبان کوتاہ نیست“ والی بات ”محسوس“ نہیں ہو رہی ہے، گو عتلا حضرت والاروح کی
توجہات کا یقین رکھتا ہوں، حضرت والاروح اس عاجز اور طفلِ طریقت کے حال پر خصوصی
توجہ فرمائیں اور دعائے سرفراز رکھیں،
اور حالات لائقِ شکر ہیں،

محترمہ بیرانی صاحبہ کی خدمت میں اور سلمان میاں سلمہ اور ابو عامر صاحب کی خدمت
میں سلام عرض ہے، فقط
خادمِ حقیر
غلام محمد

س۔ کراچی

مسبب الاختصاص زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ
آپ کے جلنے کے بعد میں باقاعدہ بیمار ہو گیا اور ڈاکٹروں کا تحشتہ مشق بنا، سات
روز کے بعد بخار اترتا مگر ضعف اتنا ہو گیا کہ بخار اترے ایک مہینہ ہو گیا مگر ابھی تک پوری
قوت عود نہیں کی مگر بحولہ اللہ ترقی ہو رہی ہے،

آپ کے ساتھ معاملہ حاضر و غائب میں یکساں ہے، آپ کے خانگی تفکرات کے
باعث ایسا محسوس ہوتا ہو گا (کہ توجہ ملتفت نہیں)

میاں نقی (احقر کے برادر بخور) آپ کی جانشینی کر رہے ہیں، اکثر شام کو آتے ہیں۔
قربانی میں عید فی حقہ پڑھا تھا، نقی نے مسبب ادا کر دیئے، والسلام
الفقیر الی اللہ سید سلیمان

کلمہ آخر

سفر حیدر آباد سے جب واپس آیا تو حضرت دالدار فریش ہی تھے مگر دو چار ہی روز میں
طبیعت نے آخری بار منہا لالیا، اب اس کو میرا سونے ٹپن سمجھتا یا حضرت اقدس کے شوقی سفر آخرت
کا انعکاسی اثر کہ بار بار دل میں یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ اب یہ شیخ فروزاں بھی ہم پر دانوں کو جلد
ہی محروم ضیا کر جائے گی، بابا روہ شعر جو خود حضرت دالدار نے اپنے شیخ عالی مقام کے مرض الموت
میں حسرت بھرے دل سے کہا تھا اپنی زبان پر آجاتا تھا سہ

لے میٹھو یہ دُردِ تہر حُکام بھی پیو تیر سو گے پھر یہ جام پلایا نہ جائے گا

اُدھر چشمہ فیض سے جمہوری کا خیال اور ادھر اپنی ناکارگی پر نظر کر کے غیب پریشانی ہونے لگی کہ
اب کیا ہوگا، آخر ایک روز تنہائی میں عرض کر دیا کہ حضرت میں تو یوں ہی رہ گیا!
مستقیم ہو کر فوٹو عارف شیراز کا یہ مصرعہ موزوں فرما دیا، ع

گرتو نمی پسندی تغییر کن قضا را

یہ حضرتؑ کی زبان فیض کا اثر تھا کہ فوراً جواب کی تفصیلات ذہن میں آگئیں اور ایک گونہ تسکین بھی میسر آئی، پھر بھی اشارہ اشارہ تھا، تفصیلات تو اپنے ہی ذہن کی تخلیق تھیں، جی ہاں ہاں کہ صاف صاف تشفی بخش جواب مل جائے، چنانچہ تین چار روز بعد پھر اسی محرومی کا اظہار کیا کہ حضرت میں تو کچھ بھی نہ سُدھ سکا، اس پر ارشاد فرمایا کہ:-

”مجھ کو جو کچھ دینا تھا دے چکا، میں نے اپنا کام کر دیا، بس اب آپ اپنے کام میں لگے رہیے اور جس وقت اور جو کچھ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو اس پر قانع و شاکر رہیے۔“

یہ تھا آخری ارشاد یا آخری وصیت جو اس وابستہ دامن کو کی گئی،
میرادل مطمئن ہے کہ حضرت اقدسؑ نے میری خیر خواہی اور میری تربیت روحانی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، تدریس بھی کیں، دُعا ئیں بھی فرمائیں، غرض وہ کچھ کیا جو ایک شفیق اور کامل و مکمل شیخ اپنے مُرید کے ساتھ کر سکتا تھا (جزاء اللہ عنی احسن الجزاء) آگے اپنی قابلیت و استعداد تو بہر حال تقدیری ہی ہے!

چنانچہ اسی سال (۱۹۵۶ء) کے جولائی اگست میں پھر حیدرآباد دکن جانا | تصدیقی ارشاد | ہوا تو حضرت محترم مولانا سید عبداللہ صاحب مجددی مدنیہ صمدی کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی، حضرت رشدی قدس سرورہ کا ذکر آیا تو مولانا مدظلہ نے ارشاد فرمایا کہ حضرتؑ نے آپ کو کیا وصیت فرمائی؟ راقم آٹھم نے حضرت سیدی کا آخری ارشاد نقل کر دیا تو بے حد مستثر ہوئے اور قوت و اثر کے ساتھ ارشاد فرمایا:

”بے شک پرجہ ارشاد فرمایا، راہ سلوک میں شیخ بھی اپنے مُرید کی سی ایک حد تک ہی دستگیری کر سکتا ہے، پھر وہ بھی حق تعالیٰ کے آگے مجبور محض ہے!“

یہ تصدیقی ارشاد اس لئے مسناد دیا کہ کسی کو مجھ سراپا عیب کے احوال پر نظر کر کے حضرت مرشدی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کمالِ تربیت میں شبہ نہ ہو جائے کہ اگر وہ کامل تھے تو ان کا پروردہ آسٹوش سراپا نقص کیسے رہ گیا!

توثیقی بشارت | حضرت دالار کی شانِ تربیت کی توثیقی بشارت حضرت رح کے وصال کے کالی عرصہ بعد ایک اور بھی ملی، ایک ذات عالم رویا میں اس بے استحقاق کو سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین دہلوی قدس سرہ کی قیادت نصیب ہوئی، اس حقیر نے بڑی لجاجت سے عرض کی کہ "حضرت میرے لئے دُعا فرمائیے" جواب میں سلطان الاولیاء نے بالکل حضرت مرشدی ہی کی انداز میں سُکراتے ہوئے ارشاد فرمایا "آخر کس بات کی؟" ادب سے عرض رہا ہوا، "اس بات کی نسبت مع اللہ حاصل ہو جائے!" کمالِ کُطف کے ساتھ تشفی فرمائی گئی کہ:-

"جو چیز ملنے کی تھی وہ تو مل چکی، باقی اور چھوٹی موٹی چیزیں ہیں وہ بھی اپنے وقت پر مل جائیں گی!"

حضرت سلطان الاولیاء کے اس ارشاد پر معاً حضرت مرشدی رحمہ اللہ کا قول یاد آ گیا کہ:

"مجھ کو تو جو کچھ دینا تھا دے چکا"

فللہ الحمد! اب دُعا ہوا اور محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقبول میں کہ:

اللَّهُمَّ لَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرَفَةً	اے اللہ! مجھ کو بل بھر کے لئے بھی سپردِ نفس نہ
عَيْنٍ وَلَا تَنْزِعْ مِنِّي صَاحِبَ مَا أَعْطَيْتَنِي	فرما اور نہ جھین وہ نعمت جو تو نے مجھ کو عطا
اللَّهُمَّ إِنِّي أَفْضَلُ مَا تُؤْتِي عِبَادَكَ	فرمائی ہے، اے اللہ! مجھ کو وہ دے جو سب سے
الصَّالِحِينَ،	بڑھ کر چیز تو اپنے نیک بندوں کو دیتا ہو۔

اٰمِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ۝



ضمیمہ

چند اکابر عصر کے تاثرات

مولانا دیوبادیؒ

مولانا عبدالباقی ندویؒ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی

شاہ معین الدین احمد ندویؒ

سید صباح الدین عبدالرحمن

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

پروفیسر سید عبدالرشید فاضل

نواب مقصود جنگ بہادر

حضرت مولانا عبد الماجد دریابادیؒ محرک تالیف متحرک

دریاباد ضلع ہارہ جی

۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

عزیز مہتمم وعلیکم السلام

کتاب کی تالیف و تکمیل پر سب سے پہلے دلی و مخلصانہ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ رشک کی آمیزش کے ساتھ _____ بعض جگہ بہت ہی خوب ہیں اور متعدد جگہ ایسے ہیں جن کو میں واقعی مستفید ہو یعنی ذہن اپنی اصلاح حال کی جانب منتقل ہوا۔ اور یہ خاص الخاص برکت نسبت اشرفیہ کی ہے، یہ بات میں نے اپنے تجربہ میں کسی دوسرے بزرگ کے ہاں نہیں پائی تھی، سید صاحبؒ کے ارتحال کا منظر تو موثر و درد انگیز ہونا ہی تھا، باقی اور بھی دو ایک موصوں پر آٹھ میں آنسو آگئے مثلاً جہاں سید صاحب آخری بار اپنے مرشد سے رخصت ہوتے ہیں، اسی طرح صفحہ ۴۷ پر آپ کا پہلا حاشیہ بڑے کام کا ہے بات بڑی گہری کھدی ہے!

باب نہم کے ساتھ باب ششم و ہفتم کا کہنا ہی کیا ہے، سلوک سلیمانی کہنا چاہیے کہ پورا ہی آگیا اور یہ ایک بڑا کام ہو گیا۔ فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔

کتاب سے بحیثیت مجموعی طبعاً خوشی ہوئی کہ میرت سلیمانی کے لئے اس عزیز کا انتخاب جو اس خاکسار نے شروع ہی میں کیا تھا وہ بے جایا غلط ثابت نہ ہوا۔

داد و تحسین کا حصہ ہو چکا، گو اسے بہت کچھ بڑھایا اور پھیلایا بھی جا سکتا ہے لیکن آپ

بلکہ کو خط کشیدہ خود مولانا نے کیا ہے۔

”خود کا تعلق عقیدت پر بزرگوں کے کمال تقدس کی دلیل ہے کیونکہ اس سے وہ فطری تہ تکلف تک مطلوب ہو گئی ہے جو اولاد اور باپ کے درمیان ہوتی ہے اور جو محبت کے باوجود عقیدت کو قبول نہیں کرتی۔“

جیسے سلیم الطبع، مجھ جیسے عیب میں اور نکتہ چین کے قلم سے یقیناً منظر و متون تنقید کے ہوں گے، اس لئے جلد ہی سے اس حصہ پر بھی پہنچتا ہوں.....

(یہاں سے چند صفحات میں مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے طبع جدید میں بہت قبول
فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ پورا مکتوب مع حواشی راقم کی مرتبہ "رغباتِ ماجدیہ" میں
ملاحظہ فرمائیں)

والسلام
وعاگود وعاشوا
عبد الماچد

حضرت اقدس مولانا عبد الباری ندویؒ

بارڈنگ روڈ، لکھنؤ

۴ ربیع الاول ۱۳۷۷

۱۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

محبت جاں نواز وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تذکرہ سلیمان نے دل و نظر دونوں کو نوازا۔ بستر پر پڑا تھا اور ہوں، مگر پڑے ہی پڑے دو تین دن میں جب تک اس کا بہت جھٹ (دھڑا دھڑا کرے پڑھ نہ لیا معمولی اخبار تک پڑھنا آگراں ہا۔ ماشاء اللہ وبارک اللہ۔ آپ کے قلم سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مرحوم کا وہ حق ادا کر لیا جو ان کی عقیدت و محبت کے بڑے سے بڑے دعویداروں سے متوقع نہیں،

شاہ صاحبؒ کو میں نے لکھا تھا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب زندگی کا آخری باب ہی ان کی پوری زندگی کا جوہر ہے، ان کی سوانح زندگی میں اس کا پورا حق ادا ہونا ضروری ہے۔ اس کو پہلے کہاں تو یہ تحریر فرمایا تھا کہ سودہ محبہ کو اور ماجد میاں کو دکھلائے بغیر شائع نہ ہو گا کہاں پھسرنا قابل خطاب ہی ٹھہر گیا۔

بہر حال یہ سعادت آپ ہی کے حصہ کی تھی، دوسرا کیسے چھین لیتا، اللہ تعالیٰ ہر طرح اس سعی کو مقبول و شکور فرمائے۔

انتہ قلم نے مصافحہ بھڑوں کے چھتہ کو دو ایک جگہ چھڑ دیا ہے فقہ اخیر کرئے! خاندان والے مضمون کو بھی ذرا ہلکا کر دینے کی مصلحت تھی، خصوصاً آپ کے لئے، باقی یہ رسوا تو رسوا ہے ہی۔

والسلام، عبد الباری

لے شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم مدیر معارف، لے بھولڈ خیریت ہی رہی!

لے مولانا کا مضمون شائع شدہ ماہنامہ فائان (کراچی) بابۃ دسمبر ۱۹۵۷ء۔

محقق عصر ڈاکٹر محمد حبیب اللہ زاد فیضہ

4 - Rue de Tournon

Paris F. 75006

۲۸ ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ

جناب مولانا غلام احمد صاحب مؤلف "مذکرہ میلان"

محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پتہ معلوم نہ ہونے سے مجلس علمی (کراچی) کے توسط سے یہ عریضہ شکر گزارنا ہوں کتاب ملی اور اس غزلیہ عصیان کو کشتی نجات محسوس ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار ہوں اور آپ کا بھی۔ اور آپ سے طالب دعا ہوں کہ میری حالت درست ہو اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا اہل و باعث بن سکوں،

صفحہ ۲۴ پر چاشیہ میں اس گنہ گار کا جو ذکر، ذکر پا کاں میں آیا ہے، اس کے متعلق کچھ تفصیل شاید آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

مدوح مرحوم و مخفوراں ناچیز سے اسی طرح ملتے تھے جو ان کی عادت تھی یعنی ملتے والے کو خیال ہوتا کہ وہ اسے بہت چاہتے ہیں۔ خیر تو ایک مرتبہ (غالباً) حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تو یکے بعد دیگرے دو متبادل چیزوں کا ارشاد خود ہو کر فرمایا تھا، پہلی چیز ٹھیک یا نہیں بہر حال وہ غالباً یہ تھی کہ فرنگیوں کے سیرت نبویہ پر اعتراضات کا جواب لکھوں، میں نے عرض کیا، ان معلومات معترضانہ کا مسلمانوں میں پھیلنا خطرناک ہے، میرا جواب ضروری نہیں کہ تسلی بخش ہو مگر اعتراض کا ذمہ تو پھیل ہی جائے گا۔ اس پر فرمانے لگے اچھا تو ایک نئی سیرت نبویہ لکھ دو میں لے ربیع الثانی۔ "الغوث" کی جدت ڈاکٹر صاحب کی حضرت غوث الاعظم جیلانی قدس سرہ سے غایت محبت کی وجہ سے ہو سکتی ہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثر برعادت کی ابتداء محبت کے غلو ہی سے ہوئی ہے،

نے عرض کیا، سیرتِ نبوی اور رحمتِ عالم (مؤلفہ آس مدوح) کی موجودگی میں نہ مطلوب کی (اور نہ مختصر کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ فرمایا نہیں وہ اور رنگ کی چیز ہے، آپ اور طرح سے لکھیں اور میں بناؤں گا کہ کس طرح لکھیں۔ افسوس ہے کہ اس آخری چیز کی تفصیل پوچھے بغیر عرض کیا، کام آنا بڑا ہے کہ اس کی ہمت نہیں۔ اس پر نیم طریقہ انوارِ تلمیح انداز میں فرمایا، آپ تو کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے، نہ یہ نہ وہ۔۔۔۔۔ بات آئی کئی ہو گئی لیکن شاید مدوح کی توجہ اور کرامت تھی کہ غیر محسوس طور پر یہ کام انجام پاتا رہا چنانچہ سیرتِ نبویہ کے مختلف پہلوؤں پر وقتاً فوقتاً میرے مقالے چھپتے رہے اور ان کے جود و مجموعے اردو میں چھپے ہیں وہ واقعی ایک نئی وضع کی کافی جامع کتاب سیرت بن گئے ہیں، ابھی وہ مکمل نہیں ہیں، خاص کر خاتم النبیین کی روحانی تعلیم، اگر خدا نے مجھے اس کی فہم عطا فرمائی اور یہ کام بھی اس گنہگار سے لینا چاہا تو۔۔۔۔۔

شاہاں چہ عجب گرہ نواز ندگدارا

واللہ المستعان والیہ المتاب۔

جب میں کراچی سے بلادِ الخباثت واپس ہونے والا تھا تو آخری ملاقاتوں میں سے ایک میں فرمایا، نہ جاؤ، یہیں رہو کہ ایک نئے دارالمصنفین کی تجویز ہے جس میں آپ سے کام لینا ہے، میں نے عرض کیا، اس ادارے میں دو ہی طرح کے کام ہیں ایک انتظامی دوسرے تالیفی غالباً انتظام میں میری ضرورت نہ ہوگی (قطع کلام کر کے فرمایا، نہیں اس کا سوال نہیں) رہا تالیفی اس کے لئے میرے قیام کی ضرورت نہیں، ڈاک سے ہر خدمت پر حاضر ہوں، اس پر خاموش ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت بافیض رکھے، معلوم نہیں مولانا محمد علی وغیرہ کس حال میں ہیں، سب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے،

نیا زمند:

محمد حمید اللہ

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی زاد فضلہ

سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ، سندھ یونیورسٹی واسلام آباد یونیورسٹی

سندھ یونیورسٹی

حیدرآباد

۱۶ ستمبر ۱۹۷۷ء

مکرمی و محترمی . تسلیم

پچھلے ہفتہ راولپنڈی سے واپسی پر آپ کا گرانقدر تحفہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کا وصول ہوا، یاد فرمائی اور اس عنایت کے لئے بجز شکر گزار ہوں۔
ستمان صاحب سے جواب یہاں یونیورسٹی کے اساتذہ کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں آپ کا رہائشی پتہ حاصل کر کے اطلاع بھیجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو مل جائے گی۔

آپ نے جس غلوص اور جاں فشانی سے حضرت علامہ مرحوم کا تذکرہ تحریر فرمایا ہے اس کیلئے میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ میں نے اسے پورے ایک دن اور ایک رات میں ختم کیا ہے۔ حضرت سے جو عقیدت مجھے تھی، اس سے سوائے خود ان کے بہت کم دوسرے لوگ واقف تھے۔ جب کبھی وہ حیدرآباد تشریف لاتے تو مولانا مناظر اور مولوی عبدالباری صاحب کے ہاتھ ازراہ شفقت کبھی غریب خانہ پر تشریف لاتے اور اکثر میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا،

پاکستان جب مستقل قیام کرنے کا لوگوں نے اصرار کیا تو مجھ سے بھی مشورہ فرمایا تھا، بہر حال آپ کو خط لکھنے بیٹھا تو یہ چند باتیں اضطراری طور پر ذہن میں آ گئیں، امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے،

مخلص

رضی الدین

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

سابق مدیر معارف

دارالمصنفین

اعظم گڑھ

مکرمی! اسلام علیکم

آپ کا خط اور حیات سلیمانی کے نسخے پہنچے ہشتولیت کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، حضرت مہد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جلوے اتنے گونا گوں ہیں کہ ایک شخص کے لئے ان کا سمیٹنا بہت مشکل ہے۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گلچیں جمال تو ز دامن گلداد

جو رخ آپ کے لکھنے کا تھا، وہ آپ نے لکھ دیا اور ماشاء اللہ اس کا پورا حق ادا کر دیا مگر بعض واقعات جو قیام اعظم گڑھ کے زمانہ کے ہیں صحیح نہیں ہیں، آپ نے محض سماع پر اعتماد کر کے لکھ دیا، ریلوے میں اس کی نشاندہی کر دی جائے گی۔

عالم دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا اور جو بشارت عظمیٰ آپ کو ملی ہے اس پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ بہتوں کو یہ درجہ ساری عمر کے مجاہدہ کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا، آپ کو ابتداء ہی میں مل گیا۔ ذلک فضل اللہ یوتہ من یشاء۔

امید ہے کہ دعوات صالحہ میں اس گنہگار کو بھی یاد رکھا کریں گے،

عاصی پرمعاصی

معین الدین

۱۵ ستمبر ۱۹۸۶ء

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن

حال مدیر معارف

دارالمصنفین

اعظم گڑھ

برادرِ اسلام علیکم

تذکرہ میسران کی پہلی کاپی یہاں پہنچی تو ایک ہی نشست میں اس کو شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ پھر آپ نے میرے نام سے جو نسخہ بھیجا تو اس کو غور سے پڑھا اور لطف کے ساتھ لذت بھی حاصل کی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے علیحدہ سے ایک نسخہ بھیج کر اپنا ممنون کیا۔

آپ نے اپنی تیز گامی سے ہم لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا اور ایک ضخیم جلد تیار کر کے ایک نادر تحفہ سب کے ہاتھ میں پیش کر دیا۔ اس برق رفتاری پر رشک آیا لیکن آپ کو جو غیر معمولی لگاؤ اور تعلق خاطر رہا۔ اس لحاظ سے یہ کوئی تعجب انگیز بھی نہیں۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جلوہ ہزار رنگ کو سمیٹنا تو آسان کام نہیں، لیکن آپ نے جس جلوہ کو سمیٹا ہے وہ آپ کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی، اس رخ کو پیش کرنے میں آپ کا قلم نہ صرف رواں، دواں اور قصاں رہا ہے بلکہ اس میں رنگینیاں بھی ہیں اور عنایتاں ہیں، اس لئے امید ہے کہ دوسرے حلقوں میں بھی یہ تذکرہ ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

آپ نے جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کا کام بہت کچھ ہلکا کر دیا، گوان کا طرز اور اندازِ جبراً ہوگا، لیکن پھر بھی اس کتاب سے ان کو بڑی مدد ملے گی۔

آج کل خالی اوقات میں ہی تذکرہ پڑھتا ہوں اور آپ یاد دلاتے ہیں —

ع یہ ترجمہ بلندِ ملا حسن کو مل گیا،

لیکن اگر اجازت دیں تو یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ وہاں بیٹھ کر بہت سی باتوں کو پوری وضاحت کے ساتھ لکھ سکتے تھے لیکن معلوم نہیں اس پر آپ نے کیوں پردہ ڈال دیا۔۔۔۔۔ حضرت سید صاحبؒ کے سینہ میں نہ معلوم کتنی باتیں مدفون ہیں۔ آپ ہی کی کتاب سے معلوم ہوا کہ جو باتیں دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں ظاہر نہ کر سکے تھے وہ کراچی میں مختلف صحبتوں میں کرتے رہے اور وہ بھی میرا خیال ہے کہ کچھ احوال کے تحت کہہ گئے ہوں گے ورنہ ان کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ آخر میں پھر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے سبقت کر کے نہ صرف ہم لوگوں کا کام ہلکا کر دیا بلکہ ایک ایسا کام انجام دیا جو ہر لحاظ سے قابل تعریف اور قابلِ داد ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دیں۔ والسلام

سید صباح الدین عبدالرحمن

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم

صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ذکار اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
۱۲ ستمبر ۱۹۶۶ء

محترمی۔ سلام مننون

کتاب (تذکرہ سلیمان) موصول ہوئی۔ آپ کا احسان مند ہوں۔ اہل قلم کی سپاس گزاری کا یہ بڑا مستحسن طریقہ ہے۔ جس محبت اور خوش اسلوبی سے آپ نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ منفقور کے بے شمار عقیدت مندوں نیز علم دوست طبقہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ خدا آپ کو اجر عظیم دے۔

اللہ کے اجر عظیم کا ایک اسلوب وہ بھی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کر دیا ہے یعنی وہ اپنے نیک بندے کی طرف سے لوگوں میں اچھے خیالات پیدا کرتا ہے۔

امید ہے کہ آپ مسرور و بخیر ہوں گے،

مخلص،

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (چشتی)

سابق صدر شعبہ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی

لال ٹیکری ۸۲۷

۲۹ ستمبر ۱۹۷۷ء

برادر گرامی قدر، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج عالی!

دلی شکر تہذیب ذکرہ سلیمان کی محفل لطیف میں اس خاکسار کو آپ نے اس خلوص سے یاد فرمایا۔ ع، ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ کتاب کو اشتیاق سے ادھر ادھر سے دیکھتا رہا۔ سلیمان کی دلنواذ شخصیت کے کئی پہلو اس میں آگئے ہیں۔ جزاکم اللہ عنا خیر الجراء۔

مولانا نے مرحوم کے شمائل کا حصہ پڑھ کر کیسی یادیں تازہ ہو گئیں، وہ صورت، وہ کائنات، آنکھوں میں تصویریں پھر گئی، وہ صورت اور سیرت اور سیرت نگاہی بھولے نہیں بھولتی۔ خصوصاً اس زمانہ میں جو میلاد مبارک اور مجالس سیرت کا مبارک زمانہ ہے۔ آج کل مجالس سیرت میں شہرت کرنی پڑتی ہے تو خطبات ممد اس بھی اکثر مطالعہ میں رہتی ہے اور مولانا کی یاد بے ساختہ آجاتی ہے، دعائے رفعت درجات نکلتی ہے۔ جزواہ اللہ عنا خیر الجراء، میں آخر میں پھر آپ کا قلبی شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعائے خیر کرتا ہوں۔

پُرسان احوال کو سلام مسنون و پیام خیریت۔

رشید

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (مجددی) ^{نادر فیضہ}

سابق صدر شعبہ اُردو سندھ یونیورسٹی کراچی

حیدرآباد سندھ

۷۸۶

۲۳ ستمبر ۱۹۶۰ء

حامداً و مصلیاً

جناب محترم و مکرم دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کتاب آپ نے ارسال فرمائی، بہت ممنون ہوں جزاکم اللہ ماشاء اللہ
آپ نے حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی ایک عمدہ یادگار ہم سب کے لئے مہیا فرمائی ہے۔ اللہ
پاک آپ کے درجات میں بیش از بیش ترقی عطا فرمائے اور اجر عظیم سے بہرہ مند فرمائے
آمین!

سلمان صاحب یہیں میرے پاس تشریف فرما ہیں، ان کا سلام مسنون قبول
فرمائیں۔ والسلام

احقر

غلام مصطفیٰ خاں

پروفیسر سید عبدالرشید فاضل

سابق صدر شعبہ فارسی اردو کالج، کراچی

باسمہ تع

۵۰۵ پیر الہی بخش کالونی - کراچی

۲۴ مئی ۱۹۸۱ء

مکرمی و محترمی مولوی غلام محمد صاحب !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

”تذکرہ سلیمان“ کو واپس کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں مولوی صاحب ! میں تذکرے کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں جہاں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دین، علمی اور اخلاقی کمالات کے ساتھ چلتے پھرتے اور بولتے نظر آتے ہیں وہاں آپ کی ہمہ جہتی صلاحیتیں بھی اپنی پوری شان کے ساتھ نظر آرہی ہیں، اور ایک مصنف کا یہ بہت بڑا کمال ہے۔ یقین کیجئے مجھے ان گراں قدر صلاحیتوں کا شاہدہ پہلی بار اس کتاب کا مطالعہ سے ہوا ہے۔ پھر صلاحیتیں بھی اس درجہ متنوع کہ شعرو سخن کا مذاق ہے تو بڑا پاکیزہ نثر نگاری کا انداز ہے تو نہایت شگفتہ سلیجھا ہوا اور دل نشین۔ اور شریعت و طریقت کی رمز آشنائی ہے تو ”بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق“

کی نزاکتوں کا پورا پورا لحاظ رکھے ہوئے۔

یہ کتاب اردو زبان کے علمی و ادبی سرمائے میں نہایت قیمتی اضافہ ہے، اس میں علم و حکمت کے پختے بھی ہیں، شعر و ادب کے چٹخارے بھی ہیں اور تصوف کے اعتبار سے تو اس کتاب کو ایک تربیتی نصاب کہنا چاہیے، اس تصوف کا جو عین اسلام ہے۔ میں شروع ہی سے

تصوف کا طالب علم رہا ہوں اور اس معاملے میں ”مکتبہ ذہر گوشہ یافتہ“ پر عمل کیا ہے چنانچہ اس کتاب سے بھی میں نے بہت کچھ نئی باتیں سیکھیں ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجوداء۔

میری رائے میں اگر خط و کتابت کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو فادائی حیثیت سے بہت اچھا ہو کہ یہ خطوط دینی و علمی جواہر کا ایک انمول خزانہ ہیں مگر ساتھ ہی اس بات کا افسوس ہو کہ جس کتاب کو بار بار طبع ہو کر زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچنا چاہیے تھا وہ نایاب ہے۔ خدا را اس کی اشاعت ثانی کی طرف خصوصی توجہ فرمائیے۔

ایک صاحب نے فرمایا کہ ایسی نادر کتاب کو واپس کر گئے آپ اپنی بے ذوقی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ ”غیر فایابی نے تو اپنے دیوان کے بارے میں محض ڈینگ ماری تھی۔ یہ کتاب واقعی ایسی ہے کہ ”در کعبہ بدزد اگر رہا بی“ میں نے عرض کیا، بھائی! اگر میں اجتماعی مفاد پر اپنے ذاتی انفرادی مفاد کو ترجیح دینے والا ہوتا تو یقیناً اس کتاب کو واپس نہیں کرتا مگر یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ گردش میں رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کریں۔

ایمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص:

عبدالرشید

مخدومی حکیم مقصود جنگ بہادر مرحوم

طیب شاہی و ناظم طبابت حکومت اصفیہ حیدرآباد دکن،

حیدرآباد دکن

۱۰ ستمبر ۱۳۵۷ھ

عزیزم سلمہ

اسلام علیکم

آپ کی روانہ کردہ کتاب "تذکرہ سلیمان" مجھے ملی۔ میں اسے پڑھ کر بہت خوش ہوا مولانا مرحوم کے میرے ساتھ تعلقات بہت مخلصانہ تھے، آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ واقعی وہ ایسے ہی تھے، اس قسم کی کتاب پڑھنے سے ایمان زیادہ ہوتا ہے۔ میرا شکریہ قبول فرمائیے۔

میرے مرض کی حالت بدستور ہے، خدا شفاء دینے والا ہے، آپ کے والدین کی خدمت میں سلام۔ عزیزہ رقیہ سلمہا کو دعا، بچوں کو پیار۔ یہاں سب بخیریت ہیں۔ فقط

مقصود علی خاں

میں مکتوب نگار کی نواسی اور مکتوب الیہ کی رقیہ حیات،

میں سقوط حیدرآباد کے بعد سے "مقصود جنگ" کے بجائے صرف نام لکھنے لگے تھے،



اشارہ

مرتبہ
لطیف اللہ
اُستاد ادبیاتِ اُردو
گورنمنٹ کالج ناظم آباد۔ کراچی

اشارة

٥٣٦ ويكشف السور

٥٩١ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ

ان الذين يبايعونك انما يبايعون

الله يد الله فوق ايديهم فمن تكلم

فانما ينكث على نفسه ومن

ادنى بما عاهد عليه الله فسيؤتيه

٣٨٠ اجرا عظيما

ان كنتم تحبون الله فاتبعوني

٣٧٩ يحببكم الله

ان الابرار يشرّبون من كأس

٧٤٠ كان مزاجه كافورا

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ

٣٣٧

انا عرضنا الامانة

انا لله وانا اليه راجعون

١٢٨ - ١٨١ - ٣٠٣

أَنطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ

٣٣٤ شئ

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ

آيات قرآني

ادعوني استجب لكم - ١٥٥ - ٣٤٥

٣٤٣ اذكرني اذكركم

استغفر الله ربّي من كل ذنب

٣٤٩ - ٣٣٤ - ٣٤٠

فلا ينظرون الى الا بل كيف خلقت

٥٣٢

الا بدكر الله تطمئن القلوب

٣٧٤

إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبِّي

٧٤٣ الذين انعم الله عليهم من النبيين

والصديقين والشهداء والصالحين

٣٤٣

الله نور السموات والارض

٣٩٣

الله يحببني اليه من يشاء

ويهدي اليه من يتيب - ١٥٦

ان الله لا يستحي من الحق - ١٠٥

امن محيب المضطر اذا دعا

ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ

٥٠٩

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَاسْرَافَنَا فِي

أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ . ٢١٥

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ

الْعَلِيمُ وَتَبَّ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ . ٢١٢

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً

إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ . ٢٠٢

رَبَّنَا لَا تَوَخُّذْنَا أَنْ نَسِينَا أَوْخَانَنَا

..... وَعَفَا

وَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا ۖ ١٢٢

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُو عَنْهُ ٣٠٢

٢١٢

ذ

ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ

يَشَاءُ . ٢٥٣ - ٢٤٢

س

سَمِعَ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي

الْعُلَمَاءُ . ٢٢٨

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ

إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي . ٢٠٢

أَنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ مَجِيبٌ . ٥٩٩

أَنَّهُ لَا يُبَاسُ مِنْ رُوحِ اللَّهِ إِلَّا

الْكَافِرُونَ . ٢٢٥

أَنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا

أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ . ٥٢٢

إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ

الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ . ٢٢٠

أَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ

الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ

عَلَيْهِمْ وَالضَّالِّينَ . ١٢٢

ب

بَلْ تَقْدِرُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ

يَوْمَ مَعَهُ قَدْ أَهْوَمَ أَهَقُ . ٢٢٠

ت

تَوَدَّ نَحْنُ مُسْلِمًا وَالْحَقُّنِي بِالصَّالِحِينَ

٢٥٩

ث

فاطر السموات والارض انت
ولى في الدنيا والاخرة توفى
مسلماً والحقى بالصالحين
٥٦٥

فايما قولوا فثم وجه الله - ٣٩٨
فتبارك الله احسن الخالقين
٣٣٣

تَذَكَّرْ اِنَّ لِّفَعْتِ الذِّكْرَى - ٥١٠
فسبهم بحمدك واستغفرك
١٤١

فصخرنا الريح بامره راء
حيث اصاب والشيطين كل
بناء وغواص وآخرين مقرنين
في الاصفاد - ١٣٨

فطرة الله التي فطر الناس
عليها - ٢٨٨

فاعتبروا يا اولي الابصار - ١٣٠
فَلَمَّا أَكْمَلُوا لُوْدَى مِنْ شَأْنِي
الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ
مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يَأْمُرَنِي
أَنَا اللَّهُ رَبَّ الْعَالَمِينَ - ٩٣

خلق فسوى والذي قدس
فهدي والذي اخرج المرعى
٥٣٠

سنريهم آياتنا في الافاق وفي
انفسهم حتى يتيبين لهم انه
الحق اولم يكف بربك انه على
كل شئ شهيد - ٥٣٢

ض

ضُرِيتْ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةُ أَيُّنَ
مَا تَقِفُوا إِلَّا لِمَجْئِلٍ مِنَ اللَّهِ
وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ - ٢٨٢

ضُرِيتْ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ
٢٨١

ع

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ - ٦٠٩

علم الانسان ما لم يعلم - ٣٠٣
عليكم بانفسكم لا يضركم من ضلَّ
اذا اهتديتم - ٥٨٤

فَاللَّهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ
الرَّاحِمِينَ - ٥٨٣

فاذا فرغت فانصب - ٣٨٣

ق

قال لن ترائي ولكن انظر الى
الجبل فان استقر مكانه فسوف
ترائي.

قَدْ أَفْتَمَ مِنْ تَزَوُّجِي.
قُلِ اللَّهُ ثُمَّ اسْتَغِيْمُ

قل ان الهدى هدى الله
قل هو الله احد

ك

كان مزاجه نرجسيا -
كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ
٤٦٥

كل يوم هو في شان
كنتم خير امة اخرجت للناس
تامرون بالمعروف وتنهون عن
المنكر.

كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى
أَوَلَمْ تُؤْمِنِ
وَلَكِنْ لَيْسَ لَكَ قَلْبِي.

ل

لا احب الآفلين.

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ
الْمُبِين.

لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ.

٣٨٨
٥٣٩

لا خوف عليهم ولا هم يحزنون -
لا ملجأ ولا منجى من الله الا اليه

٣٩٩
لا يحزنك قولهم

لا يكلف الله نفسا الا وسعها.
لقد كان لكم في رسول الله اسوة

حسنه.

لو انزلنا هذا القرآن على جبل -
٣٥٨

م

من جاء بقلب سليم -
من ذا الذي يقرض الله قرضا
حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ أَضْعَافًا كَثِيرًا.

٣٩٣
من بعد ما قنطوا.

مما خلقكم وفيها نعيدكم ومنها

نخرجكم تارةً أخرى. ٣٠٣

ن

ن. قَالَ قَلِمٌ دَمَا يَسْطُرُونَ ٣٣٨

و

وَاذْكُرْكَ بِكَ فِي نَفْسِكَ نَضْرَعًا

خيفةً ودون الجهر من القول. ٣١٥

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَهَمَّ

النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ

هِيَ الْمَأْوَىٰ. ٥٠٨

وَجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ٤٥٨

وَسَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ. ٤٥٣

وَأَشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا ٤٠٦

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا. ٣٠٣

وَالَّذِينَ آمَنُوا شَدِيدًا لِلَّهِ. ٣٦٨

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يَسْرِفُوا وَلَا

يَقْتَرُوا وَكَانَ بَيْنَهُمْ ذَلِكَ قَوَامًا

٣٣٥

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

٣٨٤

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلًا

سُبُلَنَا وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا ذُرَآءُ هُمْ

هُدًى. ٥٠٣ - ٣٨٠

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ

٥٨٨

وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ

٤٥٣

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ٥٣٢

وَقَلِيلًا مَّا يَشْعُرُونَ ٤١

وَكُرْهُ الْيَهُودَ الْكَفَرُ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ

٥٣٢

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا

تَشْعُرُونَ. ٣٢٤

وَلَا تَنْسَ أَنْصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ

أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ.

٥٣٢

وَلَقَدْ يَسْرُنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ

مِنْ مَذْكُرٍ. ٣٢٨

وَكُرْهُ الْيَهُودَ الْكَفَرُ وَالْفُسُوقَ

وَالْعِصْيَانَ ٥٣٤

وَاللَّهُ يُجْتَبَىٰ إِلَيْهِ مِنْ يَشَاءُ

٨٤

يد الله فوق أيديهم - ٣٨١

احاديث

الايمان بين الخوف والرجاء

٥٩٢ - ٥٣١

التائب من الذنب كمن لا ذنب

له - ٣٨٠

الحجريين الله يصالحهم بها

المؤمنين - ٢٢٤

الحسد يأكل الحسنات كما

تأكل النار الحطب ٢١٩

اصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم

اهديتم - ٥١٤

الا ان في الجسد لمغضة اذا

صلحت صلح الجسد كله -

الاوهى القلب ٣٤٣ - ٢٥٤

اللهم اجعلني في عيني صغيراً

وفي آعين الناس كبيراً - ٣٤٢

٢٥٢

اللهم اغنى عني سؤالي

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ

٣٠٩

ولله يسجد من في السموات

والارض طوعاً وكرها وظللهم

بالغدر والاصل - ٥٤٣

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ

إِنِّي لَأَجِدُ بَيْنَكُمْ يَوْسَفَ لَوْلَا إِنْ

تَفْقِدُون - ٢٤٨

وَمَا أَتَّبِعُ نَفْسِي

وَمَا أَفَرُّ سُلَيْمَانَ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ

كَفَرُوا - ٢٠٢

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ - ٢٥٠

ومن احسن من الله صبغة - ١٣٢

وهو وليكم بما كنتم تعملون - ٣٥٣

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

٢٨٨ - ٣٤٦ - ٣١٢

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ

تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ

٥٩٤

يحبهم ويحبونه - ٣٤٨ - ٣٤٦

٣١٢

۴۳۹ وارزقنی من عندک .

اللهم انی اجعلک فی نحوهم

واعوذ بک من شرورهم . ۵۶۹

اللهم انی اسئلك حبک وحب

من یحبک وحب عمل یقرب

الی حبک . ۱۳۰ - ۶۶۳

اللهم انی اسئلك العفو

والعافیة فی دینی ودنیائی و فی

نفسی واهلی وعلی . ۳۳۵

اللهم لاتکلی الی نفسی طرفة

عین ولا تنزع متی صام ما

اعطیتنی . اللهم اتنی افضل

ما توفی عبایدک الصالحین . ۶۷۱

المرد مع من احب . ۱۵

انا جلیس من ذکر فی . ۳۹۳

انا عند عبد ظنی بی . ۵۲۹

ان الله یبعث فی امتی علی راس

کل مائة من یجد لها دینها

۴۰۶

انها الاعمال بالنیات

وانما کل امری ما نومی .

۲۷۲ - ۳۱۴ - ۵۲۸ - ۶۵۷

عُدَّ نَفْسُکَ مِنَ الْأَمْوَاتِ ۵۰۵

قلب العبد بین اصبعین من

اصابع الرحمن . ۴۸۰

كَأَلْفَقْرٍ أَنْ يَكُونَ كَفْرًا ۴۶۳

کن فی الدنیا کانتک غریب .

۴۰۱

لا یومن احدکم حتی اکون

احب الیه من ولده ووالده

والناس اجمعین . ۸۰ - ۱۳۳

۵۳۲

من جعل الهمیم همًا واحدًا

هَمُّ آخِرَتِهِ كِفَاءُ اللَّهِ ۳۹۸

من تواضع لله رفعه الله .

۱۲۵ - ۵۰۹

وجعلت قرۃ عینی فی الصلوة

۴۷۱

وقلبه معلق بالصلوة . ۴۳۳

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي

عَلَى دِينِكَ ۶۷۲

(جاری ہے)

الف

ابن قیم، حافظ ۱۶۰ - ۳۰۹
 ابو احمد مجد دی بھوپالی، شاہ ۳۱ - ۳۲
 ۲۱۰ - ۳۳۱ - ۵۷۲ - ۵۷۳
 ابو احمد بن سلطان فرسنافہ ۱۵۷
 ابواسحاق شامی چشتی ۱۵۷
 ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ۲۸۲ - ۳۳۷
 ۳۸۵ - ۳۸۶
 ابو بکر صدیق رضی ۳۹۳ - ۵۱۶ - ۶۱۵
 ابو حامد محمد بن محمد غزالی، امام ۲۷ - ۳۶
 ۳۸ - ۹۱ - ۱۳۱ - ۱۷۱ - ۲۱۳ - ۳۱۳
 ابو حنیفہ دیکھے سید ابو حنیفہ
 ابوالحسنات، سید عبداللہ حیدر آبادی
 دیکھے سید عبداللہ حیدر آبادی
 ابوالحسن علی ندوی، مولانا ۲۸۲ - ۳۵۹
 ابو حنیفہ، امام اعظم ۳۲۸
 ابوالخیر عرسوسی ۳۸۳ - ۳۰۲
 ابوسعید نعمانی گنگوہی ۱۵۶
 ابوظفر ندوی، مولانا ۳۳ - ۴۰
 ابوالعباس احمد بن محمد قرشی المصری ۱۳۲
 ابوالفضل محمد حفیظ اللہ، مولانا ۴۳ - ۵۰
 ابوالقاسم قشیری، امام ۲۰۰

آزاد ابوالکلام مولانا ۵۷ - ۵۸ - ۱۶۸
 ۱۶۹ - ۲۵۰
 آزاد سحافی، مولانا ۸۷ - ۸۸ - ۸۹
 آلوسی بغدادی ۱۸۳
 آئینہ تزیینت ۱۰۷
 ابرار الحق، مولانا ۲۷۰
 ابراہیم احمد بادانی ۳۲۹
 ابراہیم بن ادہم طبری ۱۵۸
 ابراہیم رشیدی مکی ۳۲۸
 ابریز ۱۳۱ - ۵۵۷
 ابن تیمیہ، حافظ ۱۶۰ - ۳۱۳
 ابن جریر طبری، امام ۱۸۳
 ابن جوزی، حافظ ۱۸۳
 ابن رشد ۳۸
 ابن سعود ۶۷ - ۶۸ - ۲۲۴
 ابن سیرین، علامہ ۳۷۵ - ۶۰۶
 ابن شاذلی بنحیف القاری الفسوفانی
 ابن عربی، محی الدین ابن عربی، شیخ اکبر
 ۲۱۳ - ۳۵۲ - ۴۵۱

۲۳۰	احمد عبداللہ المسدوی	۵۷	ابواللیث
۳۲۵	احمد علاؤ الدین، احمد نواز جنگ	۱۵۷	ابو محمد سید حشمتی
۳۲۵	احمد علی سہا پوری، محدث		ابو محمد عبداللہ بن ابی حمزہ الازدی اندلسی
۱۳۱	احیاء العلوم	۶۰۳	
۲۰۰	الرسالہ		ابو حنیفہ، دیکھئے سید سلیمان ندوی
۶۵ - ۶۳ - ۵۹	ارض القرآن	۴۱۹ - ۳۰۲	ابو ہریرہؓ
۵۴۷	ارواح ثلاثہ	۱۵۷	ابو یوسف ناصر الدین بن سمان
۵۱	الزین المرائی	۵۱	ابن بکر محمد بن عبداللہ الجوزقی
۹۶ - ۹۳	الاستقصاء	۵۱	ابی الحسن یحییٰ النیسابوری
۳۶۸ - ۳۸ - ۳۷۷	اسماعیل شہید، مولانا	۵۰	ابی الفتح الطادوسی
۵۹۵ - ۵۹۳ - ۵۸۹		۵۱	ابی القاسم، حافظ
	اشرف دیکھئے اشرف علی تھانویؒ	۵۱	ابی لقمان یحییٰ بن عمار الشافعی
	اشرف علی تھانویؒ، حکیم الامت مولانا،	۵۱	ابی نصر الخطیب
۳۸ - ۳۷ - ۳۳ - ۲۳ - ۲۲ - ۱۶		۱۰۲	اتنیسہ الطبری فی تنزیہ ابن العربی
۹۶ - ۹۳ - ۹۳ - ۷۵ - ۴۳ - ۴۳		۲۳۹	احتشام الحق تھانوی، مولانا
۱۰۵ - ۱۰۳ - ۱۰۲ - ۱۰۱ - ۱۰۰ - ۹۷		۶۳۲ - ۶۳۷	
۱۱۷ - ۱۱۱ - ۱۱۰ - ۱۰۹ - ۱۰۸ - ۱۰۷		۵۱	احمد بن الحجاز
۱۲۳ - ۱۲۳ - ۱۲۱ - ۱۲۰ - ۱۱۹ - ۱۱۸		۵۱ - ۵۰	احمد بن العجل الیمینی
۱۳۸ - ۱۳۷ - ۱۳۵ - ۱۳۴ - ۱۳۳ - ۱۳۲			احمد بن المبارک السجلماسی، حافظ علامہ
۱۳۶ - ۱۳۵ - ۱۳۳ - ۱۳۲ - ۱۳۰ - ۱۲۹		۱۳۱	
۱۵۲ - ۱۵۱ - ۱۵۰ - ۱۴۹ - ۱۴۸		۱۸۵	احمد حسن کاپڑی، مولانا

اشفاق الحسین بریلوی، حکیم ۱۳۸ - ۳۰۷	۱۵۶ - ۱۵۹ - ۱۵۸ - ۱۶۳ - ۱۶۴ - ۱۶۶
اشفاق الرحمن کابڑھلوی، مولانا ۲۱۱	۱۶۷ - ۱۶۹ - ۱۷۰ - ۱۷۶ - ۱۷۷ - ۱۷۸
۲۱۲ - ۲۱۳ - ۲۱۷ - ۳۳۶	۱۷۹ - ۱۸۰ - ۱۸۱ - ۱۸۲ - ۱۸۵ - ۱۸۷
اصلاح الرسوم ۳۶۹	۱۸۸ - ۱۸۹ - ۱۹۲ - ۱۹۳ - ۲۰۳ - ۲۱۲
اظہار علی، مولانا ۲۵۸ - ۲۶۰	۲۳۳ - ۲۳۶ - ۲۳۷ - ۲۵۳ - ۲۵۵
اعلاء السنن ۹۷	۲۷۲ - ۲۸۳ - ۲۹۳ - ۳۰۹ - ۳۲۶ - ۳۲۷
اغلاط العوام ۳۶۹	۳۳۳ - ۳۳۸ - ۳۵۲ - ۳۵۳
افضال حسین قادری، ڈاکٹر ۳۲۹	۳۶۸ - ۳۶۹ - ۳۷۵ - ۳۷۶ - ۳۷۹
اقبال محمد اقبال ڈاکٹر علامہ ۶۰ - ۶۳ - ۶۷	۳۷۸ - ۳۸۰ - ۳۸۸ - ۳۸۹
۶۸ - ۱۰۸ - ۲۵۰	۳۹۹ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۶ - ۴۰۸ - ۴۱۸
اکبر اکبر حسین اکبر آبادی ۳۳۳	۴۲۲ - ۴۲۳ - ۴۳۰ - ۴۳۵
اکبر شاہ خان نجیب آبادی ۴۳۰	۴۴۱ - ۴۵۱ - ۴۵۳ - ۴۵۵ - ۴۶۱
الکشف ۵۸۲ - ۱۰۲	۴۶۲ - ۴۶۶ - ۴۷۸ - ۴۸۱ - ۴۹۳
الغزالی ۱۷۲	۴۹۴ - ۴۹۶ - ۵۰۲ - ۵۰۳ - ۵۱۵
الفاروق ۴۲۰	۵۲۳ - ۵۳۷ - ۵۵۲ - ۵۶۱ - ۵۶۳
الفتح الربانی ۵۶۱	۵۷۲ - ۵۸۲ - ۵۹۰ - ۵۹۶ - ۶۱۳
امجد حیدر آبادی ۳۰۸ - ۳۰۵	۶۲۳ - ۶۲۴ - ۶۲۷ - ۶۳۹ - ۶۴۳
۴۳۸	۶۴۵ - ۶۴۶ - ۶۵۰ - ۶۵۱ - ۶۶۸
امداد علی ۵۲۱	۴۰۵ اشرف الحیات
امداد الفتاویٰ ۹۴	۴۶۱ اشرف السوانح ۱۳۶ - ۵۰۲
امداد اللہ مہاجر مکی حاجی ۹۳ - ۱۲۳	۶۴۴

۱۶۳	اہلسنت والجماعت	۳۷۳ - ۱۸۵ - ۱۸۱ - ۱۷۸ - ۱۵۶ - ۱۳۰
	ب	
۵۱	بابا یوسف النہروانی	۵۵۳ - ۳۹۲ - ۳۷۳ - ۳۶۱ - ۳۸۰
۲۷	بایزید بسطامی	۵۶۲ - ۵۹۵ - ۶۶۷
۱۸۵	بکرا العلوم، مولانا	۵۷۹ - ۵۷۸ - ۲۷۰
۸۳	بخاری	۴۶۱ - ۱۷۸
۳۲۶	بخاری، سید محمد پادشاہ	۱۱۰
۲۵۰ - ۶۷	برید فرنگ	۳۲۹
	بڑے پیر صاحب	۳۸۳
	دیکھئے عبد القادر جیلانی شیخ	۵۱
۵۸۲	بشارت کریم مجددی حافظ مولانا	۳۳۵
۲۷	بشر حافی	۶۸۱
۵۹۱ - ۷۱	بشری	۳۷۸
۵۰۶	بلاغ المبین	۳۲۶
۲۸۳	بوادیر النوادر ۱۰۲ - ۱۷۷ - ۱۷۸	۳۲۸
۳۷۶ - ۳۵۳		۳۲۹
۶۰۵ - ۱۱۶	بوستان	۶۸
۳۶۰	بوعلی سینا، حکیم	۱۸۳ - ۷۷ - ۷۶
۹۱	بوعلی فارمدی	۶۵
۳۲۸ - ۳۲۲	بہادر یار جنگ نواب	انیس الحسن دیکھئے سید سلیمان ندوی
۵۰۰ - ۳۶۶ - ۳۵۲ - ۳۳۵ - ۳۳۰		۹۱
		۱۱۷
		الایضاح لما فی الافصاح

تذکرہ سلیمان ۸-۹-۱۰-۱۱-۱۸۲

۶۸۳-۶۸۷-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۳

۶۹۴

تعلیم الدین ۳۳۳-۳۶۹

تفسیر حقانی ۵۵۷

تقویت الایمان ۳۷-۳۸

تحفۃ الدین خاں، مولوی ۲۹۸-۲۹۹

توراة ۳۸۳

ث

ثناء اللہ امرتسری، مولوی ۳۸۶

ج

جانبی، عبد الرحمن مولانا ۳۵۵

جامع المجیدین ۳۰۶-۳۰۸-۳۰۳

جشن رشید ۲۶۲

جشن مین ۲۶۲

جعفر حسین، مجتہد ۲۳۷

جعفر صادق، امام ۲۹

جعفری، شاہ محمد مکی ۱۵۶

جگر مراد آبادی علی سکندر، جگر مراد آبادی

۳۰۸

جلال الکھنوی ۳۹۵

۵۸۷-۵۰۱

بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی ۱۲۲

بہاء الدین نقشبند خواجہ ۳۹۹-۴۳۸

بجعت النفوس ۶۰۳

بہشتی زیور ۳۰۰-۳۶۹

بہشتی گوہر ۳۰۰

بیان القرآن ۹۷-۱۸۳

۵۵۸-۵۵۷

بیدل عبد اللہ خان بیدل پروفیسر ۲۲۵

۲۳۳

بیضادی ۲۱۱

ت

تاریخ اسلام ۲۲۰

تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور

ان کے مفصل جوابات ۹

تجدید تصوف و سلوک ۳۰۵-۶۰۳

تجدید تعلیم و تبلیغ ۳۰۵-۶۰۳

تجدید معاشیات ۶۰۳

تجمل حسین، حافظ ۳۲

ترہیت السالک ۱۰۷

ترمذی ۵۲۸

۱۶۵	حسام الدین چلیپی	جلال الدین سیوطی، علامہ	۸۳ - ۱۸۳
۲۱۸	حسان بن ثابتؓ	جمال میاں فرنگی محلی	۳۲۳
۱۵۸	حسن بصری	جمیل احمد، مولانا	۱۶۴ - ۱۷۷
۶۱۳	حسن شاہ	جناب، قائد اعظم محمد علی جناح	۵۷۶
۵۱	حسن البصری الکی	جنرل محمد ضیاء الحق صدر پاکستان	۳۲۳
۵۵۲	حسن العزیز	جنید بغدادی	۳۳۳
۳۲۵	حسن نظامی خواجہ	جوہر لال نہرو	۲۵۰
۶۰۱ - ۲۹	حسین ابن علیؓ، امام	جواد المراتب	۳۲۷
۲۵۰ - ۱۲۶ - ۹۶	حسین احمد مدنی ہولانا	جوش، شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی	
۴۷۸			۲۱۷ - ۲۱۸ - ۳۰۸
	حضرت تھانویؒ	جوہر، محمد علی مولانا	۵۳ - ۶۶ - ۶۷
	دیکھئے اشرف علی تھانویؒ		۶۸ - ۲۵۰ - ۲۵۷ - ۶۸۴
۳۰۵	حفیظ ہوشیار پوری	ح	
۶۵۰	حقداد خاں، حاجی	چنگیز خاں	۲۱۸ - ۲۱۹
	حکیم الامتؒ	ح	
	دیکھئے اشرف علی تھانویؒ، مولانا		۱۵۷
۱۰۹ - ۹۶	حکیم الامتؒ (کتاب)	حاجی شریف زعفرانی	۱۶۸ - ۲۵۹ - ۳۸۵
۱۱۱		حافظ شیرازی	۶۷۶
۴۵۰	حلاج، حسین بن منصور	حجۃ اللہ ابالنفہ	۵۷ - ۲۱۵ - ۵۱۳
۱۱۱ - ۱۱۰ - ۱۰۹ - ۴۷	حمید الدین فراہی	حذیفہ بن الیمانؓ	۴۵۵
۱۱۹ - ۱۱۸ - ۱۱۷ - ۱۱۶		حذیفہ مرعشی	۱۵۷

خلیل احمد سہارنپوری، مولانا	۳۵۸	حمید اللہ خاں، نواب	۲۰۸
خواجہ شہاب الدین	۲۲۵ - ۲۲۸	حواشی قرآن	۵۹
	۲۳۰ - ۲۳۷	حیات اشرف ۱۸۲ - ۲۰۳ - ۲۰۴	۲۰۵
خواجہ نقشبند (بہاء الدین نقشبند)		حیات بہادر یار جنگ	۳۴۱
دیکھئے بہاء الدین نقشبند خواجہ		حیات سلیمانی	۲۰۱
خواجہ صاحب دیکھئے مجذوب		حیات ثعلبی	۳۳ - ۳۴ - ۳۶
خنیام عزیز خانیام	۶۰	۴۷ - ۴۸ - ۴۹ - ۳۳۳ - ۳۳۶	۳۴۳ - ۳۴۴
داراشکوہ	۳۳۷	حیات مالک	۸۶
دروس الادب	۵۶	حیوۃ المسلمین	۳۵۵
ڈاکٹر صاحب		خ	
دیکھئے محمد عبداللہ ڈاکٹر		غالب حسین قادری ڈاکٹر	۹۱
راجندر پرشاد، ڈاکٹر	۲۵۰	خالق باری	۱۱۶
رازی، امام	۳۸ - ۱۸۳ - ۳۱۳	خان عبد القیوم خاں	۲۷۵
راس معلود	۲۵۰	خدائی نامہ	۱۱۶
راغب احسن ۲۹۸ - ۲۹۹	۳۲۷	خسرو امیر خسرو ۱۵۸ - ۱۶۶ - ۱۶۷	
	۳۲۸ - ۳۲۹ - ۳۳۰	خضر علیہ السلام	۲۵۴
رام چندری	۲۱۹	خطبات مدراس ۸۲ - ۸۵ - ۳۰۳	
راون	۲۱۸ - ۲۱۹	۳۱۵ - ۳۲۳ - ۶۹۰	
		خطیب بغدادی، حافظ	۱۸۳

۴۲۴	زجاجته المصابيح	۴۸۳	رحمت عالم
۲۹	زين العابدين، امام مس		الرسالة المحمدية (عربي ترجمه خطبات مدراس)
		۸۳	
۲۴۳	سجل جمعيتہ القرئي		رسالت پناه (صلی اللہ علیہ وسلم)
			ديکھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۴۸۳	سرچو گندرسنگھ	۸۰	رسول وحدت
۳۵	سرشاه سليمان		رشيد احمد گنگوہي، مولانا
۵۹	سرفراز، عبد القادر، شيخ واکثر	۳۵۸ - ۱۷۸	۵۹۵
۴۷	سر لانا مبارج		رضوي راحت علی
		۲۵۳ - ۲۵۳	۲۷۲
۳۲۲	سعد اللہ چشتي، مولانا		رعد رحمت اللہ رعد
۴۷	سعد پاشا زاغلول	۱۸۵	رفيع الزماں
۷۷ - ۷۳	سعيد احمد اکبر آبادي	۱۰	رقعات ماجدی
۴۲۶	سعد اللہ، شاہ	۴۸۱	روح المعاني
	سعدی شیرازی، مصلح الدين سعدی شیرازی	۱۸۳	روحي، جلال الدين مولانا
۲۳۹ - ۲۷۹ - ۳۳۸ - ۴۳۲		۹۱ - ۳۶ - ۲۷	۳۶۸ - ۳۱۳ - ۱۹۱ - ۱۸۵ - ۱۷۱ - ۱۶۵
۳۸۶ - ۲۵۰ - ۱۲۱	سفرنامه افغانستان		۳۸۵ - ۳۹۱ - ۴۱۱ - ۳۵۶ - ۵۲۲
۲۱۹ - ۲۱۸	سقراط		۵۲۳ - ۵۲۵ - ۵۳۳
	سلطان الاولياء، نظام الدين اوليا، شيخ		رياض، رياض احمد رياض خير آبادي،
۱۷۴ - ۳۱۵ - ۵۹۳ - ۶۷۸ - ۶۸۶			۲۶۰ - ۱۵۲
۵۵	علم		ز
۹	سلوک سلیمانی		زبير، ڈاکٹر
۵۹۰ - ۳۳۳ - ۳۳۵ - ۵۷۸ - ۵۹۰	سلیم	۳۸۱	

۳۶۸-۱۸۲	سید احمد بریلوی، شهید	۳۲۲	سلیمان
۴۱۶	سید احمد فرید الدین	۳۸۳-۱۳۹-۱۳۸	سلیمان علیہ السلام
۲۲۴	سید احمد کبیر قاضی	۵۷۸	
۲۹	سید اسحاق	۳۵	سلیمان، مشرق، مولانا
۲۹	سید امیر	۴۴-۳۳-۳۵	سلیمان پھلوار، وی، شاہ
۶۸	سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین	۳۵	سلیمان منصور پوری، قاضی
۲۲۳-۲۶۳-۲۵۲-۱۲		۳۴	سلیمان نافذ
۳۲۰	سید بدر عالم، مولانا	۳۱۳	سنائی، حکیم
۲۹	سید برہان	۲۱۹	سینا
	سید صاحب دیکھے سید سلیمان ندوی	۳۷	سید ابوحیب، مولانا ۳۱-۳۲-۳۷
۲۹	سید حسن (اول)	۵۷۳-۳۰-۳۸	۴۹-۱۳۰-۲۱۰-۵۷۳
۲۹	سید حسن	۳۳-۳۰-۲۹	سید ابوالحسن
۲۳۵-۲۲۳-۱۵۱-۱۳۲	سید حسین		سید ابوالعاصم
۴۸۹-۴۸۴-۳۸۱-۳۲۶-۲۹۰-۲۷۷		۲۴۷-۲۴۲-۲۴۱-۲۴۰	۳۴۷-۲۴۲-۲۴۱-۲۴۰
۵۸۰-۴۹۲-۴۹۰		۲۹۰-۳۸۹-۳۸۵-۳۸۰-۲۷۳	۲۹۰-۳۸۹-۳۸۵-۳۸۰-۲۷۳
۴۰-۳۹	سید حنیف، مولوی	۲۹۵-۲۹۳-۲۹۲-۲۹۱	۲۹۵-۲۹۳-۲۹۲-۲۹۱
۲۹	سید خلیل	۳۲۶-۳۲۳-۳۰۱-۲۹۹-۲۹۶	۳۲۶-۳۲۳-۳۰۱-۲۹۹-۲۹۶
۳۱۹-۳۱۸	سید خلیل، مولوی	۵۰۷-۳۶۶-۳۶۰-۳۲۹-۳۲۸	۵۰۷-۳۶۶-۳۶۰-۳۲۹-۳۲۸
۲۹	سید حبیب علی	۵۸۰-۵۷۹-۵۷۸-۵۷۵-۵۷۲	۵۸۰-۵۷۹-۵۷۸-۵۷۵-۵۷۲
	سید سلمان دیکھے سید سلمان ندوی ڈاکٹر	۶۷۵-۶۴۳-۶۴۰-۶۳۹	۶۷۵-۶۴۳-۶۴۰-۶۳۹
	سید سلمان ندوی، ڈاکٹر	۲۹	سید احمد

۲۰۱ - ۱۹۶ - ۱۹۵ - ۱۹۳ - ۱۹۲
 ۲۱۶ - ۲۰۸ - ۲۰۷ - ۲۰۵ - ۲۰۲
 ۲۳۲ - ۲۳۰ - ۲۲۸ - ۲۲۵ - ۲۲۲
 ۲۵۰ - ۲۴۳ - ۲۴۰ - ۲۳۷ - ۲۳۶
 ۲۵۸ - ۲۵۶ - ۲۵۵ - ۲۵۳ - ۲۵۲
 ۲۷۸ - ۲۷۵ - ۲۷۴ - ۲۶۴ - ۲۶۲
 ۳۰۸ - ۳۰۷ - ۳۰۲ - ۲۹۹ - ۲۸۶
 ۳۲۰ - ۳۱۹ - ۳۱۸ - ۳۱۷ - ۳۱۶ - ۳۱۰
 ۳۳۱ - ۳۳۹ - ۳۳۵ - ۳۳۳ - ۳۳۱
 ۳۶۴ - ۳۵۹ - ۳۵۷ - ۳۴۶ - ۳۴۵
 ۳۶۲ - ۳۶۷ - ۳۰۸ - ۳۰۵ - ۳۰۸
 ۴۳۶ - ۴۳۳ - ۴۳۱ - ۴۲۷ - ۴۲۴
 ۴۵۹ - ۴۵۵ - ۴۴۳ - ۴۴۱ - ۴۳۹
 ۴۷۵ - ۴۷۴ - ۴۷۰ - ۴۶۷ - ۴۶۲
 ۴۸۶ - ۴۸۵ - ۴۸۳ - ۴۸۱ - ۴۷۸
 ۴۹۷ - ۴۹۵ - ۴۹۲ - ۴۹۰ - ۴۸۹
 ۵۱۱ - ۵۰۷ - ۵۰۴ - ۵۰۱ - ۵۰۰
 ۵۲۵ - ۵۱۹ - ۵۱۷ - ۵۱۴ - ۵۱۳
 ۵۴۲ - ۵۴۰ - ۵۳۷ - ۵۳۶ - ۵۳۳
 ۵۴۹ - ۵۴۷ - ۵۴۶ - ۵۴۵ - ۵۴۴
 ۵۵۸ - ۵۵۶ - ۵۵۵ - ۵۵۳ - ۵۵۱

۴۴۳ - ۱۸۸ - ۱۸۷ - ۱۷۹ - ۱۷۰ - ۳۴
 ۲۹۳ - ۲۹۲ - ۲۹۰ - ۲۷۳ - ۲۴۸ - ۲۴۰
 ۲۹۹ - ۲۹۸ - ۲۹۶ - ۲۹۵ - ۲۹۴
 ۳۲۶ - ۳۱۷ - ۳۰۳ - ۳۰۱ - ۳۰۰
 ۵۲۱ - ۴۰۵ - ۳۶۶ - ۳۵۰ - ۳۴۹
 ۶۲۵ - ۵۸۳ - ۵۸۳ - ۵۷۰ - ۵۲۹
 ۶۹۱ - ۶۷۵ - ۶۴۰

۲۹ سید سلیمان

سید سلیمان نرودی، علامه

۲۷ - ۲۵ - ۲۴ - ۱۸ - ۱۵ - ۱۱ - ۱ - ۹
 ۴۱ - ۳۶ - ۳۵ - ۳۴ - ۳۳ - ۳۰ - ۲۹
 ۵۵ - ۵۴ - ۵۳ - ۵۱ - ۵۰ - ۴۷ - ۴۶
 ۶۴ - ۶۳ - ۶۲ - ۶۱ - ۵۸ - ۵۷ - ۵۶
 ۷۸ - ۷۷ - ۷۶ - ۷۵ - ۷۳ - ۷۲ - ۷۵
 ۱۰۹ - ۱۰۸ - ۹۶ - ۹۴ - ۹۱ - ۸۴ - ۸۰
 ۱۲۳ - ۱۲۱ - ۱۲۰ - ۱۱۸ - ۱۱۱ - ۱۱۰
 ۱۳۸ - ۱۳۶ - ۱۳۵ - ۱۳۷ - ۱۳۵
 ۱۴۷ - ۱۴۶ - ۱۴۴ - ۱۴۲ - ۱۴۰ - ۱۳۹
 ۱۵۴ - ۱۵۳ - ۱۵۲ - ۱۵۱ - ۱۴۸
 ۱۶۴ - ۱۶۳ - ۱۶۲ - ۱۵۸ - ۱۵۶
 ۱۹۰ - ۱۸۴ - ۱۷۴ - ۱۷۱ - ۱۷۰ - ۱۶۸

۱۵۶	سید عبدالرحیم افغانی	۵۶۰-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۶-۵۶۷
۱۱۳	سید عبدالسلام	۵۶۸-۵۷۲-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۱
۱۲	سید عبداللہ حیدر آبادی، مولانا	۵۸۳-۵۸۵-۵۸۷-۵۸۹-۵۹۲
۴۱۳-۴۱۵-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷		۵۹۳-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۹-۶۰۱
۴۳۱-۴۳۲-۴۳۶-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰		۶۰۳-۶۰۵-۶۰۷-۶۰۹-۶۱۱
۲۹	سید عثمان	۶۱۳-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۹-۶۲۰
۲۹	سید عرب اول	۶۲۴-۶۲۸-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۳
۲۹	سید عرب ثانی	۶۳۵-۶۳۷-۶۴۰-۶۴۲-۶۴۳
۱۵۶	سید عبداللہ بن امروہوی	۶۴۵-۶۴۶-۶۴۸-۶۴۹
۲۹	سید عظمت علی	۶۶۹-۶۷۱-۶۷۳-۶۷۶-۶۸۰
۱۵۷	سید علاء الدین علی بن احمد صابر گفیری	۶۸۲-۶۸۵-۶۸۷-۶۸۸-۶۹۰
	سید العلماء دیکھتے سید سلیمان ندوی	۶۹۸
۱۹۳	سید علی تنجاوڑی	سید السوانخ
۳۲۸	سید عظیم الاحسان، علامہ	سید ابوسبیل
۴۲	سید فضل اللہ الجیلانی مولانا	۱۸۷-۲۹۰-۳۲۵
	سید قطب الدین بختیار کاکی اوشی ثم دہلوی	سید شمس الدین
۱۵۷		سید شمس الدین (اول)
۲۹	سید مالک	سید صدر الدین
۲۹	سید محمد	سید الطائفہ ثانی دیکھتے سید سلیمان ندوی
۲۹	سید محمد شیر	سید عارف
۴۲-۴۱	سید محمد علی مونگیری، مولانا	سید عبدالجبار حیدر آبادی
		۵۰۵-۵۰۹
		سید عبدالرحمن

۹	شاہراہ معرفت	۳۷۸-۱۵۱	سید محمد عیسیٰ، مولانا
۳۳۳	شبلی بخدادی	۱۵۶	سید محمدی اکبر آبادی
	شبلی، علامہ شبلی نعمانی	۳۰-۲۹	سید محمدی المعروف حکیم محمدی
۴۸-۴۷-۴۶-۴۵-۴۳-۴۲-۱۶		۳۳-۳۳	
۵۹-۵۸-۵۷-۵۵-۵۴-۴۹		۲۹	سید معین محمد
۷۷-۷۳-۷۲-۶۹-۶۴-۶۲-۶۱		۲۹	سید میر
۱۱۲-۱۱۱-۱۱۰-۱۰۹-۹۶-۷۹-۷۸		۲۹	سید میر محمد
۱۱۹-۱۱۸-۱۱۷-۱۱۵-۱۱۳-۱۱۲		۳۲۵	سید تقی اشرف
۲۸۴-۱۸۷-۱۷۶-۱۷۵-۱۷۴-۱۷۳		۲۹	سید وحید الدین شہدی
۳۲۷-۳۲۰-۳۱۳-۳۱۲-۳۱۱-۳۱۰-۳۰۹		۲۹	سید وحید الدین
		۲۹	سید یعقوب
۱۷۸	شبیر علی، مولانا	۲۹	سید یوسف
۲۶۳	شجاع الدین، خلیفہ		سیر افغانستان دیکھئے سفرنامہ افغانستان
۶۱۲	شرف الدین بکینی میری شاہ ۵۹۴	۱۱	سیرت سلیمانی
۶۸	شرف عدنان	۸۳-۸۳	سیرۃ عائشہ رضی
۶۷	شریف حسین (شریف مگر)		سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)
۲۰۷	شروانی، حبیب الرحمن خاں ۴۲	۶۱-۶۳-۷۲-۷۸-۷۹-۸۲-۸۳	
۳۲۷	شعیب قریشی	۱۶۴-۳۰۳-۳۱۲	
۳۳۰-۳۱۲	شفیق احمد (علیگ) ماسٹر		ش
۱۷۱-۹۱	شمس تبریز	۲۱۷-۲۱۵	شاہ جہاں بیگم
۸۶	شمس الدین، ذہبی محدث		شاہ صاحب دیکھئے سلیمان پھلوانوی

۲۹۹	صدیقی، عبدالرحمن ض	۴۳۳-۵۸۰	شمعون
		۲۹۴	شوق وطن
۵۸۵-۵۷۱	ضیاء الحسن حکیم ط	۱۱۹	شوکت علی، مولانا ۶۵-۶۸-۶۹
		۲۹۲-۲۵۷	
۵۳	طبقات ابن سعد	۱۳۳-۱۲۲	شہاب الدین سہروردی شیخ
۵۱۲	طوفان محبت ظ	۲۶۴	شیخ کواکی
		۱۸۱	شیخ محمد تھانوی، مولانا
۲۵۶	ظاہر قاسمی، قادی ظفر احمد، مولوی دیکھئے عثمانی ظفر احمد مولانا		ص
		۵۰	صالح العلانی
		۳۳۱	صائب تبریزی
۶۹۳	ظہیر قادیانی ع		صباح الدین عبدالرحمن، سید
		۲۴۳-۱۳۱-۱۲۰-۶۹-۳۳-۲۰	
		۶۸۸-۶۸۷-۶۷۹-۳۳۵-۲۰۹	
	عارف تھانوی، دیکھئے اشرف علی تھانوی مولانا عارف تھانوی حکیم الامت	۱۸۳	صدیق حسن خاں، نواب
۲۸۷	عادل میاں	۸	صدیقی، بشیر احمد
	عارف شیراز دیکھئے حافظ شیرازی		صدیقی، رشید احمد پروفیسر ۷۷-۷۸
۱۳۱	عاشق الہی میرٹھی، مولانا	۱۹۵	
	عاصم دیکھئے سید ابو عاصم	۶۸۹-۶۷۹-۳۳۹	
۴۶۱	عالم الدین مجددی	۳۲۸-۲۶۶	صدیقی، رضی الدین ڈاکٹر
۳۹	عالی، جواد علی خاں مولوی	۶۸۵-۶۷۹	
۶۴۳	عامریاں	۳۲۹	صدیقی، شجاعت علی
		۱۵۶	صدیقی، عبدالباری امر دہلوی

عبدالحق، ڈاکٹر دیکھے محمد عبدالحق، ڈاکٹر	عائشہ صدیقہ ۶۹ - ۸۲ - ۱۶۱
عبدالحق، فرنگی علی مولانا ۴۳	عبدالله بن مسعود ۸۶
۳۴۲ - ۱۸۳ - ۵۰ - ۴۵ - ۴۳	عبدالله السکری الدمشقی ۵۰
عبدالحق، پروفیسر ۲۳۷	عبدالله القلے ۵۱
عبد الرحمن بن منده ۵۱	عبدالباری، ڈاکٹر مولانا ۳۲۹
عبد الرحمن الکریم ۵۰	عبدالباری فرنگی علی، مولانا ۲۵۰ - ۶۷
عبد الرحمن، حکیم مولانا ۴۲۵	عبدالباری ندوی، مولانا
عبد الرحمن کامپلوری مولانا ۲۷۰ - ۱۲	۱۱ - ۱۲ - ۲۲ - ۵۵ - ۷۶ - ۱۱۰ - ۱۱۱
عبد الرحمن، وکیل ۱۲۱	۱۲۵ - ۱۲۶ - ۱۲۸ - ۱۳۰ - ۱۳۱ - ۱۳۲
عبد الرحیم دہلوی شاہ ۶۶۲	۱۳۳ - ۱۸۲ - ۱۸۹ - ۱۹۶ - ۱۹۹ - ۲۰۰
عبد الرحیم، مولوی ۶۶۷	۲۰۵ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۳۲۱ - ۳۳۲
عبد الرؤف بھوپالی قاری ۲۱۶ - ۲۱۵	۳۶۲ - ۴۰۵ - ۴۰۸ - ۴۱۶ - ۴۲۲ - ۴۲۶
۳۴۶	۴۴۲ - ۴۶۹ - ۴۸۲ - ۴۸۵
عبد السلام ندوی، مولوی ۳۰۹	عبدالحق فتحپوری، مولوی ۱۸۲
عبد العزیز دباغ ۵۵۷ - ۱۴۱	عبدالحق، شاہ محدث ۳۱۳
عبد العزیز، دعا جو، شاہ ۲۷۰	عبدالحق، مولانا ۱۹۴
عبد الغنی بھول پوری، مولانا ۱۹۴	عبد الحکیم دیسنوی ۱۶۷ - ۱۰۷ - ۵۳
عبد الغنی، شاہ محدث ۴۳۱ - ۵۰	عبد الحکیم حافظ ۸۸
عبد الغنی النابلسی ۵۱	عبد الحمید خطیب ۳۲۷ - ۲۵۶ - ۸۳
عبد القادر توفیق مدنی شیخ الاسلام الحنفی	عبدالحق سہارنپوری مولوی ۱۰۷
۵۱ - ۵۰ - ۱۱	

عثمان ہرولی، خواجہ ۱۵۷

عثمانی، جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی

۱۵۷

عثمانی، شبیر احمد مولانا

۲۳۶ - ۱۱۹ - ۱۱۶ - ۹۵ - ۵۹ - ۳۶

۲۹۹ - ۲۵۶ - ۲۳۶ - ۲۳۹ - ۲۳۷

۴۳۹ - ۳۴۳ - ۳۲۳ - ۳۰۲

عثمانی، شیخ الاسلام مولانا

دیکھئے عثمانی شبیر احمد مولانا

عثمانی مظفر احمد تھانوی مولانا ۹۳ - ۴۵

۲۳۶ - ۲۲۸ - ۱۰۸ - ۱۰۵ - ۱۰۳ - ۱۰۰

۲۶۵ - ۲۰۳ - ۹۰

عراقی، فرید الدین عراقی ۳۹۵

عربوں کی جہاز رانی ۷۱ - ۷۱

عرب دہند کے تعلقات ۷۱ - ۷۱

عرفان، مولوی ۲۷۳

عربی شیرازی ۳۸۵ - ۳۶۷

عطّار، فرید الدین شیخ ۲۷

عقیدۃ الاسلام ۶۵ - ۶۴

علاج السالکین ۴۲۵

علماء کا شاندار ماضی ۵۹۵

عبد القادر جیلانی شیخ ۲۷ - ۳۳۸ - ۵۶۱

۶۸۳

عبد القدوس بہاری ۲۹۸

عبد القدوس نعمانی گنگوہی ۱۵۷

عبد اللطیف، مولانا مفتی ۹۳ - ۴۳

عبد الماجد دریا بادی، مولانا ۱۲ - ۱۷ - ۲۲

۵۴ - ۴۷ - ۴۵ - ۹۶ - ۱۰۸ - ۱۱۱

۱۱۸ - ۱۲۵ - ۱۳۹ - ۲۷۱ - ۳۲۱ - ۳۶۳

۴۷۸ - ۴۷۹ - ۴۸۹ - ۴۷۹ - ۶۸۰

۶۸۱

عبد الحمید قریشی ۳۱۸

عبد المثنیٰ ۳۰۳

عبد الواحد بن زید ۱۵۸

عبد الوہاب عزم بے ۲۵۶ - ۳۲۷

عبد الہادی امر دہوی ۱۵۶

عثمان خاں، حاجی

دیکھئے محمد عثمان خاں حاجی

عثمان دہلوی، حافظ

دیکھئے محمد عثمان دہلوی حافظ حاجی

عثمان علی خاں، میر نواب ۳۳۹ - ۵۸۷

عثمان غنیؓ ۳۰۳ - ۵۱۶ - ۶۰۱

غلام الثقلین	۳۶	غلام کشمیری دیکھے انور شاہ کشمیری	۳۵۹
غلام دستگیر رشید، پروفیسر	۴۶۹ - ۳۳۸	علی احمد کیانی	۵۸۰ - ۵۷۸
۶۹۰		علی حسن	۱۵۸ - ۲۹
غلام علی دہلوی، شاہ	۳۲۶	علی مرتضیٰ بن ابی طالبؑ	۵۱۶ - ۱۶۳
غلام محمد مجددی، پیر	۳۱۹	علی ملکا کرنامی	۲۷۰
غلام محمد سرہندی، پیر	۳۲۷	علیم الدین حیدر آبادی میر	۲۷۰
غلام محمد ملک	۳۲۰	علیم الرضی ڈاکٹر	۳۲۹
غلام مصطفیٰ خاں ڈاکٹر	۶۹۱ - ۶۷۹	علی موسیٰ رضا، امام	۲۹
غلام محمد، مولانا ڈاکٹر		علوی شمس الدین ترک پالی پتی	۱۵۷
۱۰ - ۱۲ - ۱۷ - ۲۱ - ۲۹۳ - ۳۲۹ - ۳۵۷		علوی ضیاء الحسن	۴۵
۳۳۲ - ۳۳۶ - ۳۴۱ - ۳۴۳ - ۳۵۹		علوی مشاد علوی دقوری	۱۵۷
۳۶۲ - ۳۶۷ - ۳۷۰ - ۳۷۷		عمر بن الخطابؓ فاروق اعظم	۸۶ - ۲۱۶
۳۷۸ - ۳۸۱ - ۳۸۲ - ۳۸۵ - ۳۸۶		۳۲۰ - ۵۱۶ - ۶۰۱ - ۶۱۵	
۳۸۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۳۹۵ - ۳۹۷		عمر بہاء الامیری (سفیر شام)	۸۳
۵۰۰ - ۵۰۳ - ۵۱۱ - ۵۱۳ - ۵۱۴		نور الدف المعارف	۱۴۳
۵۱۶ - ۵۱۹ - ۵۲۱ - ۵۲۵ - ۵۳۳		یحییٰ علیہ السلام	۲۱۸ - ۲۱۹
۵۳۶ - ۵۳۹ - ۵۴۱ - ۵۴۳ - ۵۴۵		عین الاصابہ فیما استدرکتہ السیدہ عائشہؓ	
۵۴۶ - ۵۴۹ - ۵۵۱ - ۵۵۳ - ۵۵۵		علی صحابہؓ	۸۳
۵۵۸ - ۵۶۰ - ۵۶۱ - ۵۶۳		غ	
۵۶۵ - ۵۶۷ - ۵۶۸ - ۵۸۳		غالب، اسد اللہ خاں	۳۴۰ - ۵۳۷
۵۸۹ - ۵۹۲ - ۵۹۳ - ۵۹۶ - ۵۹۷			

۶۰ فردوسی
۶۲۷ فضل الله، مولانا
۴۱-۳۲-۹ فضل حسن گنج مراد آبادی
۶۲۳-۶۲۳
۳۲ فضل رحمانی
۶۲۳ فضل الله الصمدی توضیح الادب المفرد
۴۲

۱۵۸-۲۷ فضیل بن عیاض
۲۷۰ فقیر عمر، مولانا

ق

۳۸۵ قاضی
۱۱۶ قاضی نامہ
۵۲۲ قارون
۵۹۵-۱۸۱ قاسم ہالوتوی، مولانا
۵۰۰ قاضی مکتب
۵۳۸ قدسی، محمد جان قدسی
قرآن مجید

۲۳۶۰-۲۱۳-۱۱۶-۱۱۵-۱۱۳-۱۱۳-۵۷
۳۳۵-۳۳۳-۳۳۲-۳۳۷-۲۸۳-۲۸۱
۴۰۹-۳۷۳-۳۵۶-۳۴۹-۳۴۸
۴۷۹-۴۷۶-۴۶۹-۴۵۸-۴۵۴

۶۱۶-۶۱۳-۶۱۱-۶۰۷-۶۰۵-۵۹۹
۶۲۹-۶۲۸-۶۲۶-۶۲۲-۶۱۸-۶۱۷
۶۲۰-۶۳۷-۶۳۵-۶۳۳-۶۳۱
۶۵۳-۶۵۲-۶۴۷-۶۴۶-۶۴۲
۶۶۳-۶۶۰-۶۵۸-۶۵۶-۶۵۴
۶۷۵-۶۷۳-۶۷۱-۶۶۸-۶۶۶
۶۸۳

ف

فاروق اعظم دیکھیے عمر بن الخطاب
۳۲۹ فاروقی، بہان احمد ڈاکٹر
۱۵۶ فاروقی، جلال الدین تھانیسری
۳۷۹ فاروقی، ڈاکٹر
۱۵۷ فاروقی، شیخ احمد عبدالحق ابدال
۱۵۷ فاروقی، شیخ عارف ردولوی
۱۵۷ فاروقی، شیخ فرید الدین گنج شکر
۱۵۷ فاروقی، شیخ محمد ردولوی
۱۵۶ فاروقی، نظام الدین تھانیسری
۱۵۶ فاروقی، محب اللہ آبادی
۶۷۹ فاضل، سید عبدالرشید فاضل
۶۹۳-۶۹۲
فاضل ہوشیارپوری، غلام محمد مولانا ۴۵

۱۸۵ - ۱۸۴

کبید شستوی
گ

گاندھی جی کرم چند موہن داس ۶۵ - ۲۱۸

۲۵۰ - ۲۲۰

۶۰۵ - ۲۳۹ - ۱۱۶ گلستان

۳۲ گنج رحمانی

ل

۱۱۹ لطف اللہ شاہ جامپوری مولوی

۵۶ لغات جدیدہ

۳۳۷ لیاقت علی خاں، قائد ملت

۲۶۲ - ۲۳۷ - ۲۳۹

۵۸۲ لواٹج جاتی

۸۴ لیونگ پروفٹ

Living Prophet

م

۸۷ - ۸۶ مالک بن انس، امام

۴۵۲ مہر القادی، مولانا

۳۸ مبادی تصوف

۳۱ - ۲۷ مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی

۱۲۵ - ۱۲۲ - ۱۰۰ - ۸۹ - ۸۸ - ۸۷

۴۶۲ - ۴۶۱ - ۳۵۲ - ۳۱۴ - ۱۸۲

۵۲۲ - ۵۳۱ - ۵۲۷ - ۵۱۸ - ۵۰۳

۵۸۷ - ۵۸۶ - ۵۷۳ - ۵۵۴ - ۵۴۸

۶۳۶ - ۶۴۳

۳۰ قرابادین محمدی

۴۵۰ قریشی، غلام محمد

۳۶۹ - ۱۰۵ - ۱۰۳ - ۱۰۳ - ۱۰۳

۴۲۵ - ۴۱۳

قطب الدین محمد بن احمد التہودانی مفتی مکہ

۵۰

ک

۲۶۳ کاشف الغطاء

۵۱۳ کرم بخش

۲۹۴ - ۲۷۹ - ۲۷۶ کرنل رحمن، ڈاکٹر

۲۹۵

۲۷۵ کرنل سرور، ڈاکٹر

۲۷۹ کرنل شاہ، ڈاکٹر

۹۵ - ۹۴ کشف الدجائع عن وجہ الربوا

۱۰۰

۵۲۹ کشن پرشاد، مہاراجہ

کفایت اللہ دہلوی، مولانا فقیہ الامت

۲۵۰ - ۱۷۹ - ۱۷۸ - ۱۷۵ - ۱۲۰ - ۱۱۹

۵۶	محمد ابوالعرفان خاں	۳۶۵-۳۸۰-۵۹۴-
۳۲۹	محمد احسان اللہ، ڈاکٹر	مجتوب، خواجہ عزیز الحسن غوری ۱۶
۴۳۸	محمد احمد، خواجہ	۲۰-۱۲۷-۱۳۳-۱۳۵-۱۶۶-۱۷۵
۳۰۰-۳۹۹	محمد ادیس، صوفی	۱۷۶-۱۹۳-۱۹۴-۳۳۳-۳۸۳-۵۵۲
۳۳۰-۲۷۰-۹	محمد اشرف خاں، مولانا	۵۱
۴۵۰	محمد الیاس برنی	محب الدین
۵۹۰-۳۰۸-۲۱۷	محمد الیاس، مولانا	مجالس الابار ۵۵۲
۲۶۴	محمد امجد داوی	محسن الملک، مہدی علی خاں نواب
۳۶۲	محمد اویس بخاری، مولانا	۴۳-۴۳
۲۹	محمد باقر، امام	محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۲۶۴	محمد البشیر الابرہیمی	۴۷-۴۹-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳
۵۱-۵۰	محمد بن اسماعیل، بخاری امام	۱۱۴-۱۲۰-۱۵۶-۱۵۸-۱۷۱-۲۲۳
۵۰	محمد بن سنہ	۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۳۰۲-۳۰۹-۳۱۴
۶۱۷	محمد بن عبدالوہاب	۳۱۸-۳۱۹-۳۲۲-۳۰۲-۳۱۶-۳۱۹
۶۱۷	محمد بن عبدالوہاب نجدی (کتاب)	۳۲۸-۳۳۳-۳۳۸-۳۵۳-۴۷۱
۵۱	محمد بن یوسف	۳۸۰-۳۸۳-۳۹۴-۳۹۶-۴۹۷
	محمد بہادر خاں دیکھتے بہادر یا جنگ	۵۰۱-۵۰۵-۵۰۷-۵۱۵-۵۱۶
۳۸۴	محمد جمیل احمد ایم اے	۵۳۶-۵۶۵-۵۷۲-۵۹۱-۵۹۳
۱۹۴-۱۲۷	محمد حسن کاکوروی مولوی	۵۹۵-۵۹۹-۶۱۹-۶۵۶-۶۵۷
۲۹۸		۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۸۳-
	محمد حسن، مفتی ۱۰-۱۲-۲۰-۲۲-۲۳	محمد آفاق، شاہ ۴۶۱
		محمد ابراہیم رائدیری، حکیم ۵۵۲

۲۴۶-۲۳۲-۲۰۵-۱۹۳-۱۴۹-۱۴۷	۲۴۴-۲۴۰-۲۴۲-۲۵۹-۲۵۸-۱۹۵
۲۹۸-۲۸۷-۲۸۶-۲۸۵-۲۸۴	۳۳۳-۳۳۱-۲۴۵
۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۳۶-۳۹۰-۲۹۸	محمد حسن، مولانا شیخ ۹۲
محمد عبدالرحیم حیدر آبادی ۳۵۲-۳۵۷	محمد حسین حیدر آبادی، مولانا ۹۲-۳۱۳
محمد عتیق فرنگی محلی، مولانا ۵۱	۳۵۰-۳۵۱
محمد عثمان خاں، حاجی ۱۲۸-۱۳۶	محمد حمید اللہ، ڈاکٹر ۲۳۷-۲۴۰-۲۵۰
۱۴-۶۳۳	۲۶۵-۳۲۷-۳۲۸-۴۷۹-۶۸۳
محمد عثمان دہلوی، حافظ حاجی ۱۵۳-۱۷۹	محمد زکریا، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا ۹
محمد علی حیدر آبادی، مولانا ۳۷۹-۵۱۲	محمد سورتی، مولانا ۲۵۰
۵۲۸	محمد شفیع، مفتی مولانا
محمد عمران خاں ندوی مولانا ۳۸-۲۱۵	۲۲-۸۹-۹۳-۱۰۷-۱۳۶-۱۳۹-۱۴۷
محمد فاروق چیا کوٹی، مولانا ۴۳	۱۳۹-۱۸۸-۲۳۷-۳۶۳-۲۶۶
محمد محمود احمد، پروفیسر ۳۲۸	۳۶۸-۲۴۰-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۲
محمد محمود صواف ۲۶۳	۳۰۳-۳۲۰-۶۳۳-۶۴۱
محمد مظہر، خان بہادر ۴۰۳-۴۰۴-۴۱۳	محمد شفیع بجنوری، حاجی ۴۱۵-۶۲۳
۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۴۸-۴۴۷	محمد شفیع، پروفیسر مولوی ۲۶۶-۳۲۷
محمد معصوم، خواجہ ۶۶۵	محمد صابر حیدر آبادی، مولانا ۵۵-۵۸۲
محمد میاں مراد آبادی ۵۹۵	۶۳۵
محمد ناظم ندوی، مولانا ۵۶-۸۳	محمد طیب، مولانا ۱۱۹
محمد یحییٰ، حافظ ۱۲	محمد عبدالحمی، ڈاکٹر
محمد یحییٰ ندوی، مولانا ۲۵۶	۲۲-۲۳-۱۲۸-۱۳۵-۱۳۶-۱۴۲

مولانا تھانویؒ دیکھے اشرف علی تھانوی	۶۲۵-۶۵۱	مقصود جنگ بہادر حکیم
مولانا دیبا بادی دیکھے عبدالماجد دیبا بادی	۶۴۹-۶۹۳	
مولانا دوم دیکھے رومی جلال الدین مولانا	۱۶۸-۲۵۰	مکاتیب ابوالکلام
مولانا گیلانی دیکھے مناظر حسن گیلانی	۶۰-۶۳	مکاتیب اقبال (اقبال نامہ)
مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت	۶۴-۶۷-۲۵۰	
۳۰۸	۳۸-۱۳۱-۱۹۲	مکاتیب سلیمان
۳۴۳ میر حسن، ڈاکٹر	۲۷۶	
۵۸۶ میر تقی میر	۶۶۵	مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ
۲۹ میراں خٹک سوار شہید	۳۱۹	مکلا شہر بازار افغانی
ن	۲۷۵	متناز دولتانہ، میان
نادوغان، شاہ	۱۲۱-۱۳۳	مناظر حسن گیلانی، سید مولانا
نصیر الدین، مجددی دہلوی	۳۱-۳۲-۳۹	۱۸-۲۲-۲۳-۳۰-۳۱-۳۲-۳۹
نصیر الدین ندوی، جیکم	۸۹-۲۷۶	۵۹-۶۳-۹۲-۹۳-۱۲۸-۱۳۹
۳۲۸	۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۲۰۶	۲۲۳
نقوش سلیمانی	۲۵۰-۳۰۸-۳۰۹-۳۰۸	۳۱۶
نقشی میان	۳۱۷-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۶	۳۳۳
نواب صاحب	۳۲۸-۳۵۰-۳۵۴-۴۰۱	۴۸۵
دیکھے عسک الملک مہدی علی خاں	۲۵۰	موتی لال نہرو
نوح علیہ السلام	۳۱۵	موسیٰ علیہ السلام
نور محمد بٹ الخراج	۱۰	موسیٰ کاظم، امام
نور محمد جھنجھانوی	۱۵۶-۳۶۱	۸۶
		موطا

۳۲۷ - ۳۱۷ - ۹۲	۳۰	نور محمدیہ
۳۲۸ - ۲۶۶ - ہاشمی، عبدالقدوس ندوی	۶۷	نوری سعید پاشا
۳۲۹	۸۶	نوری، امام
۱۵۷	۶۳	نیاز فتحپوری
۳۱۸	۳۱۸ - ۲۱۹	نیرود
ہوش بگرامی، ناظر الحسن ہوش یار جنگ	۲	
۵۱۵ - ۵۱۲ - ۳۰۸	۳۱۹ - ۳۱۸	وارث علی شاہ مکنوی
ی، ے	۵۰	والدہ عبدالعلیم
یادرفنگان	۳۲۷	وجیبہ الدین، حاجی
۱۹۳ - ۱۹۳ - ۱۷۹ - ۱۷۳ - ۵۹ - ۴۳	۴۳	وحشی شاہجہاںپوری، ظہور احمد
۴۴۱ - ۳۴۴ - ۳۲۴ - ۲۵۰	۴۵۰	ولی الدین، میر ڈاکٹر
۵۱		ولی اللہ، محدث، شاہ
۶۰۱	۳۱۳ - ۲۱۵ - ۱۶۰ - ۱۰۰ - ۵۰	۵۰
۱۸۱	۵۰۶	۵۰۶
یوسف حسین خاں، ڈاکٹر	۵	
۱۹۹ - ۸۱	۸۹ - ۱۳ - ۱۰	ہاشم جان سرہندی، میر